MAIS213CCT

اسلام ہندوستان میں

(Islam in India)

ایم۔اے۔(اسلامک اسٹڈیز)

(دوسرا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-انڈیا

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course: Islam in India
ISBN: 978-93-95203-96-8
First Edition :**October, 2023**

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University
Publication	:	2023
Copies	:	600
Price	:	335/-(The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing	:	Dr. Mohammad Haziq, DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Masters in Islamic Studies
Islam in India
2nd Semester

On behalf of the Registrar, Published by:
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), India
*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

Editors	ایڈیٹرس
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja Assistant Professor (Islamic Studies) DDE, MANUU, Hyderabad	**ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ** اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامک اسٹڈیز) نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Language Editors	**لینگوتج ایڈیٹرس**
Dr. Mohammad Haziq *Guest Faculty/Assistant Professor (Contractual), Islamic Studies, DDE, MANUU*	**ڈاکٹر محمد حاذق** گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اسلامک اسٹڈیز، ڈی ڈی ای، مانو
Dr. Mohd. Akmal Khan *Guest Faculty/Assistant Professor (Contractual), Urdu, DDE, MANUU*	**ڈاکٹر محمد اکمل خان** گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

Editorial Board	مجلس ادارت
Prof. Abdul Ali *Former Head, Dept. of Islamic Studies, AMU, Aligarh*	پروفیسر عبدالعلی سابق صدر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Prof. S. M. Azizuddin Husain *Former Head, Dept. of History & Culture JMI, New Delhi*	پروفیسر ایس۔ ایم۔ عزیزالدین حسین سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohammad Ishaque *Prof. of Islamic Studies, JMI, New Delhi*	پروفیسر محمد اسحاق پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohd. Fahim Akhter *Head, Dept. of Islamic Studies, MANUU*	پروفیسر محمد فہیم اختر صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Ghazanfar Ali Khan *Prof., of Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU*	پروفیسر غضنفر علی خان پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja *Asst. Prof., Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Mohammad Haziq *Guest Faculty/Assistant Professor (Contractual), Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد حاذق گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Syyeda Amina *Guest Faculty/Assistant Professor (Contractual), Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر سیدہ آمنہ گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

کورس کو آرڈی نیٹر

ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ، اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامک اسٹڈیز)
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
مولانا عمر عابدین مدنی۔	1،2،3،4
پروفیسر فہیم اختر ندوی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	5،6،7،8
پروفیسر غضنفر علی خان، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، کشمیر کیمپس	9،10
ڈاکٹر عرفان احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	11،12
ڈاکٹر عمر فاروق، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	13،14،15،16

پروف ریڈرس:

اول : ڈاکٹر محمد حاذق

دوم : ڈاکٹر سیدہ آمنہ

فائنل : ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کو آرڈی نیٹر	9

بلاک 1 :ہندوستان میں اسلام کی آمد

اکائی 1	عرب وہند تعلقات	11
اکائی 2	ابتدائی مسلم آبادیاں	25
اکائی 3	شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد	37
اکائی 4	سندھ میں عربوں کی حکومت	57

بلاک 2 :دہلی سلطنت(1206-1526)

اکائی 5	دہلی سلطنت کا قیام اور مشہور سلاطین	78
اکائی 6	دہلی سلطنت کا نظم ونسق	99
اکائی 7	دہلی سلطنت میں نظام عدل اور سماجی ومذہبی حالات	118
اکائی 8	دہلی سلطنت میں علمی خدمات اور فن تعمیر	134

بلاک 3 :علاقائی حکومتیں

اکائی 9	بہمنی حکومت	155
اکائی 10	عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتیں	175

بلاک 4 : مغل حکومت(1857-1526)

اکائی 11	مغلیہ حکومت کا قیام و عروج	191
اکائی 12	مغلیہ حکومت کا نظم ونسق	210
اکائی 13	مغلیہ حکومت میں قیام عدل اور سماجی و مذہبی حالات	230
اکائی 14	مغلیہ حکومت میں علمی خدمات	250
اکائی 15	مغلیہ حکومت میں فن تعمیر	271
اکائی 16	مغلیہ حکومت کا زوال	296
	نمونہ امتحانی پرچہ	316

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1)اردو زبان کی ترویج وترقی (2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4)تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد ومنشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند "ادبی" اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل واخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت وبقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گردوپیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر ان شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرینِ علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ دو برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل وابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کما حقہٗ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 144 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centers) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centers) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کالنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہو گا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے لیے یہ بات انتہائی باعث مسرت ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی)، ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو (ڈی ای بی) کے 2017 ضابطوں اور دوسرے ترمیمی ضوابط 2018 کے مطابق اسلامک اسٹڈیز کے موضوع پر اردو زبان میں درسی مواد تیار کیا گیا ہے۔ یو جی سی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبہ کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں ایک نظام تعلیم کے طلبہ کے لیے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

ان ضوابط کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا، اور اس کے مطابق درسی مواد کی تیاری کی گئی جو بیک وقت دونوں نظام تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے ذریعہ استفادہ بن سکے۔ یہ مواد بی اے کے تین سالہ (چھ سمسٹرز) کورس اور ایم اے کے دو سالہ (چار سمسٹرز) کورس کے لیے تیار کروایا گیا ہے۔ اس درسی مواد کی تیاری میں ملک بھر کے ماہرین اسلامک اسٹڈیز، دانشوران اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علما کی معیاری خدمات یونیورسٹی کو حاصل رہیں، اور اس میں اسلامک اسٹڈیز کے تقریباً تمام ہی موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعے تیار ہونے والا یہ درسی مواد ایک معیاری، ہمہ گیر اور اسلامک اسٹڈیز کے پورے کورس پر محیط بن کر تیار ہوا، جس سے نہ صرف یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوئی بلکہ اسلامی مطالعات کے میدان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف واضافہ اور جدید تحریر کے ساتھ مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی جو دونوں روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے نظام کی ضرورت بیک وقت پوری کرسکے۔

یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی جس میں نئے نصاب کے مطابق پرانے تحریر شدہ مواد میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حذف وترمیم اور تبدیلی کی ضرورت تھی۔ کئی مقامات پر کم یا زیادہ اضافہ بھی مطلوب تھا۔ بعض ذیلی عناوین پر بالکل نئی تحریر لکھنے کی ضرورت تھی اور بعض جگہوں پر مکمل اکائی کے اضافہ کی بھی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے علاوہ مواد کی ترتیب کو نئے نصاب کے مطابق بنایا گیا۔ نیز ہر اکائی کے تحت اکتسابی نتائج اور متنوع قسم کے سوالات کے تفصیلی نمونے شامل کیے گئے۔ ان تبدیلیوں کے بعد تیار ہونے والا مواد قدیم وجدید کا مجموعہ بن کر سامنے آیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم ایم اے کے کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ دوسرے سمسٹر کے اس پرچہ کا عنوان 'اسلام ہندوستان میں' ہے۔ یہ روایتی تعلیم کے تحت ایم اے سال اول کے لیے ہے۔ اس پرچہ میں کل سولہ اکائیاں ہیں، جو چار بلاک میں منقسم ہیں۔ اس کتاب میں ہندوستان میں اسلام کی آمد سے قبل عرب وہند کے تعلقات، اس کے بعد برصغیر ہند میں اسلام کی آمد ابتدائی آبادیاں، تجارتی احوال اور صوفیا کے کردار کے ساتھ ساتھ اموی دور میں محمد بن قاسم کے ذریعہ قائم ہونے والی پہلی اسلامی حکومت، اس کے بعد دہلی سلطنت اور اس کے زوال کے دوران قائم ہونے والی اہم علاقائی حکومتوں کے اہم کارناموں اور خدمات پر مواد شامل کیا ہے۔ آپ اس میں اس دور کی سیاسی سماجی اور تمدنی احوال کا بھی مطالعہ کرسکیں گے۔

ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ (الازہری)

کورس کوآرڈی نیٹر

اسلام ہندوستان میں

Islam in India

اکائی 1: عرب وہند تعلقات

اکائی کے اجزا:

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 عرب وہند کے تعلقات کی بنیاد

1.2.1 عرب وہند تعلقات کتنے قدیم ہیں

1.2.2 عرب وہند کے مابین تجارتی تعلقات

1.2.3 تجارتی اشیاء کی مختصر فہرست

1.2.4 ہندوستانی جانوروں کی تجارت

1.2.5 ہندوستان میں کیا چیزیں درآمد ہوتی تھیں

1.2.6 عربی شاعری میں ہند سے مشتق الفاظ

1.3 عرب وہند کے مابین علمی تعلقات

1.3.2 طبی کتابوں کے ترجمے

1.3.3 عربی زبان میں ہندوستانی دوائیں

1.3.4 حساب وریاضی علوم

1.3.5 نجوم اور ہیئت

1.3.6 متفرقات

1.4 عرب وہند کے سماجی تعلقات

1.5 اکتسابی نتائج

1.6 نمونہ امتحانی سوالات

1.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

ہندوستان سے عربوں کا تعلق آریوں سے بھی زیادہ قدیم ہے کیونکہ آرین قوم کو ہندوستان آئے محض چند ہزار سال گزرے ہیں جب کہ عربوں کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت آدم جنت سے ہندوستان میں اتارے گئے تھے، اس تعلق سے کتب تفسیر وحدیث میں متعدد روایتیں موجود ہیں، اس لئے بقول مولانا سید سلیمان ندوی ہندوستان عربوں کا "پدری" ملک ہوا۔ اور ہندوستان گرم مصالحوں اور خوشبو وعطریات میں جس طرح پوری دنیا میں قدیم زمانے سے ممتاز ہے کہا جاتا ہے کہ یہ چیزیں حضرت آدم جنت سے لے کر آئے تھے۔ اس کے علاوہ رسول پاکؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ مجھے ہندوستان سے ربانی خوشبو آتی ہے جس کو اقبال نے کہا ہے "میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے"۔ یہ روایتیں سند کے اعتبار سے مضبوط نہیں لیکن ان روایات کا مجموعی مطالعہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ ہندوستان کو اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ کچھ نہ کچھ اختصاص ضرور رہے۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ یہ جان سکیں کہ عرب وہند کے تعلقات کتنے قدیم اور گوناگوں ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوگا کہ سمندر کے آمنے سامنے بسنے والی ان دونوں عظیم قوموں کے روابط کیسے تھے۔ آپ عرب وہند کے درمیان تجارتی تعلقات علمی اور مذہبی تعلقات اور اسی کے ساتھ فروغ اسلام اور سیاسی تعلقات کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

1.2 عرب وہند کے تعلقات کی بنیاد

ہندوستان وسائل سے مالامال ملک ہے اور عرب وسائل سے یکسر تہی دامن ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ ان دو ممالک کے درمیان تجارت، لین دین اور برآمد ودرآمد کا تعلق ہو، اس کے علاوہ یہ دونوں ممالک سمندر کے کنارے بسے ہیں یعنی ان کے درمیان سمندر حائل ہے۔ ایک طرف ہند ہے اور دوسری طرف عرب ہے۔ سمندر کے کنارے بسنے والے ممالک اور شہر فطری طور پر تجارتی ہوتے ہیں۔ عرب کے تجارت پیشہ افراد ہزاروں برس سے ہندوستانی پیداوار کو مصر وشام بلکہ یوروپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے۔

1.2.1 عرب وہند تعلقات کتنے قدیم ہیں

جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے عرب وہند کے آپسی تعلقات قدیم تاریخ کے ہر دور میں قائم رہے۔ چنانچہ سندھ وعراق کے تعلقات سومیری عہد(250-3000 قبل مسیح)کادی عہد(2400-2100 قبل مسیح)،بابلی تہذیب(1800 قبل مسیح)میں موہنجوداڑو اور پھر ہڑپا سے قائم تھے۔ اسی طرح فینون(1200 قبل مسیح) حتیوں اورآریوں میں، پھر عہد سکندری وبطلیموس میں وعرب ومصر کے درمیان گوناگوں تعلقات استوار رہے۔ لینورڈ کوٹیرل نے اپنی کتاب لوسٹ سٹیز میں اور کورڈن چالڈ نے اپنی کتاب واٹ ہیپن ان میں زمانہ ماضی میں عرب وہند تعلقات پر تفصیل سے لکھا ہے۔

انڈس ویلی تہذیب کی عمر 2000 قبل مسیح بتائی جاتی ہے۔ اسی طرح ہندو عرب تعلقات کی عمر چار ہزار سال ہوتی ہے۔ جدید ہندوستانی مورخین تاریخی شواہد کی بناء پر اب یہ لکھنے لگے ہیں کہ وادی انڈس کے قدیم ترین ہندوستانی اور قدیم عرب ایک دوسرے سے متعارف اور باہم تجارت کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”اس بات کی واضح شہادت موجود ہے کہ وہ نہ صرف ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بلکہ مغربی ایشیاء کے دور دراز ممالک سے بھی تجارت کرتے تھے۔ انڈس ویلی تاجر عراق سے بری اور بحری دونوں راستوں سے تجارت کرتے تھے“۔

اس سلسلے میں تاریخ ادبیات، مسلمانان پاکستان وہند کے مصنف ممتاز احمد پٹھان لکھتے ہیں:

”سندھ کے عرب دنیا سے تعلقات خصوصاً عراق، یمن اور عمان سے تاریخ کی ابتدا سے چلے آرہے تھے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ سمیر لوگ جنھیں نے بعد میں بابل کی سامی تہذیب کی بنیاد رکھی، وادی سندھ سے ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ سندھ ، بلوچستان، فارس اور خورزستان کے بعض علاقوں کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ سے لیکر فرات تک سمیریوں کی بہت بڑی سلطنت تھی، انہوں نے مغربی ایشیاء کو تہذیب سکھائی اور دوسری چیزوں کے علاوہ لکھنے کا فن خط کوفی سے متعارف کرایا، ہل اور پہیہ سب سے پہلے ان ہی لوگوں کی وجہ سے ان دو دریاؤں کی سرزمین میں ہوئے“۔

1.2.2 عرب وہند کے مابین تجارتی تعلقات

عرب تاجروں کا ہندوستانی اشیاء کو مصر وشام اور یوروپ تک اور یوروپ ومصر وشام کی اشیاء کو ہند وچین تک پہنچانے کا راستہ مولانا سید سلیمان ندوی اپنے خطبات میں یہ بتاتے ہیں۔ ”عرب تاجر مصر وشام کے شہروں سے چل کر خشکی بحر احمر (ریڈ سی) کے کنارے کنارے حجاز کو طے کر کے یمن تک پہنچتے تھے اور وہاں سے بادبانی کشتیوں پر بیٹھ کر کچھ تو افریقہ اور حبشہ کو چلے جاتے تھے اور کچھ وہیں سے سمندر کے کنارے کنارے حضر موت، عمان، بحرین اور عراق کے کناروں کو طے کر کے خلیج فارس کے ایرانی ساحلوں سے گزر کر یا تو بلوچستان کی بندرگاہ 'تیز' میں اترتے تھے یا پھر آگے بڑھ کر سندھ کی بندرگاہ دیبل (کراچی) میں چلے آتے تھے اور پھر آگے بڑھ کر گجرات اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہ تھانہ (مہاراشٹرا) کھمبایت چلے جاتے تھے۔ پھر آگے بڑھتے بڑھتے سمندر کے کنارے کنارے کالی کٹ اور راس کماری پہنچتے تھے

اور پھر کبھی مدراس کے کسی کنارے پر ٹھہرتے تھے اور کبھی سراندیپ، انڈمان، ہو کر پھر سیدھے مدراس (چنئی) کی مختلف بندر گاہوں پر چکر لگاتے ہوئے خلیج بنگال میں داخل ہوتے اور بنگال کی ایک دو بندر گاہوں کو دیکھتے ہوئے برما اور سیام ہو کر چین چلے جاتے تھے اور پھر اسی راستہ سے لوٹ جاتے تھے۔ اس نقشہ سے یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے ہند میں جہاز رانی کی تاریخ، تاریخ کی یادداشت سے پہلے سے ہے۔

1.2.3 تجارتی اشیاء کی مختصر فہرست

عرب تاجر ہندوستان سے کیا کچھ لے کر جاتے تھے اس کے تعلق سے عرب سیاحوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ہندوستان کو قدرت نے معدنی وسائل کے علاوہ نباتاتی وسائل یعنی مسالے اور عطریات، ہندوستانی فولاد اور ہیرے موتی سے بڑی فیاضی سے نوازا تھا اس لئے عرب تاجر یہ اشیاء لیکر شام و مصر اور پھر یوروپ تک پہنچاتے تھے۔ واضح رہے کہ یوروپ گرم مسالوں کا شوقین ہے اور اسی گرم مسالے کی کھوج میں کولمبس نے امریکہ کی خاک چھانی اور واسکوڈی گاما ہندوستان کی سرزمین تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔

ابن خرداذبہ (متوفی سنہ 250ہجری) جس کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری کے بعد کا ہے۔ وہ ہندوستان کی ان پیداواروں اور سامان تجارت کی جو عرب اور عراق جاتی تھیں، ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ خوشبودار لکڑیاں، صندل، کافور، لونگ، جائے پھل، کباب چینی، ناریل اور سن کے کھوے اور روئی کے مخملی کپڑے اور ہاتھی، اور سراندیپ سے ہر قسم کے یاقوت، موتی، بلور، اور سنباذج جس سے جواہرات کی تراش خراش کی جاتی ہے اور ملیبار سے سیاہ مرچ اور گجرات سے سیسہ، اور دکن سے بکم اور سندھ سے بانس اور بید۔

مشہور عرب مورخ مسعودی جس کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا ہے اور بشاری جو تقریباً اسی کا ہم عصر ہے، دونوں نے کھمبایت (کاٹھیاواڑ) کے جوتوں کی تعریف کی ہے جو یہاں سے بن کر باہر جاتے تھے۔ تھانہ (ممبئی سے متصل) کے کپڑے مشہور تھے۔ ان دونوں کے ہم عصر ایک اور سیاح مسعر بن مہلہل نے جنوبی ہندوستان کے ٹراونکور (چنئی) کی سیاحت کی تھی وہ اس بارے میں لکھتا ہے "یہیں وہ مٹی کے برتن تیار ہوتے ہیں جو ہمارے ملک میں چینی کر کے بکتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ چینی نہیں ہوتے۔ کیونکہ چین کی مٹی کولم کی مٹی سے زیادہ سخت ہوتی ہے اور آگ پر زیادہ دیر ٹھہر سکتی ہے۔...... یہاں ساگون کی لکڑی اتنی لمبی ہوتی ہے کہ کبھی کبھی 100 ہاتھ تک پہنچ جاتی ہے۔ نیز بقم (بکم) بید، نیزہ کی لکڑی بھی وہاں بہت ہے اور ریوند چینی، تیزپات جو نہایت کمیاب ہے اور جو آنکھوں کی بیماری میں بہت مفید ہے اور یہیں سے عود، کافور اور لوبان بھی تاجر لے جاتے ہیں۔ یہ جان کر حیرت ہو گی کہ ہندوستان سے صرف ان ہی چیزوں کو تاجر نہیں لے کر جایا کرتے تھے بلکہ زہر بھی ہندوستان سے عرب جایا کرتا تھا۔

1.2.4 ہندوستانی جانوروں کی تجارت

جانوروں میں ہندوستان سے ہاتھی عراق کو جایا کرتے تھے، دو کوہان والے سندھی اونٹ کی بہت مانگ تھی، اسی سندھی اونٹ کی نسل سے مصر و فارس کے عمدہ بختی اونٹ تیار کئے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ مور کی خوبصورتی بھی مشہور عالم ہے۔ ہندوستان سے مور یمن اور مصر و شام لے جائے جاتے تھے اور پھر وہاں ان کی افزائش نسل ہوتی تھی مگر بقول عرب سیاح ان میں ہندوستانی موروں والی خوبصورتی

نہیں ہوتی تھی۔ ہندوستانی گینڈوں کے سینگوں کی مانگ بھی بہت زیادہ تھی۔ گینڈوں کے سینگوں پر تصویریں بنائی جاتی تھیں جو نہایت بیش قیمت فروخت ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک جانور جس کے پسینہ سے خوشبو کشید کی جاتا تھی اس کو عرب تاجر ہندوستان سے مراکش تک لے جاتے تھے۔

1.2.5 ہندوستان میں کیا چیزیں درآمد ہوتی تھیں

ان اشیاء کے بدلے ہندوستان میں کس چیز کی درآمد ہوتی تھی؟ اس کی تفصیلی اطلاعات نہیں ہیں لیکن متفرق معلومات اور عرب سیاح جو تاجروں کے ساتھ سفر کرتے تھے ان کے چشم دید مشاہدات کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ بعض جزیرے والے توان سے کپڑے لیتے تھے، کچھ جزیرے ایسے تھے جہاں کے لوگ کپڑے نہیں بلکہ لوہا لیتے تھے۔ مصر سے زمرد کی انگوٹھی آتی تھی جو ڈبیوں میں رکھی جاتی تھی۔ شراب بھی مصر سے یہاں آیا کرتی تھی۔ روم سے ریشمی کپڑے، سمور اور پوستین اور تلواریں آتی تھیں۔ فارس سے عرب گلاب عرب تاجر لے کر آتے تھے۔ بصرہ سے دیبل (سندھ) کی بندرگاہ میں کھجوریں آتی تھیں، کارومنڈل میں عرب سے گھوڑے آتے تھے۔

عرب اور ہند کے تعلقات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شہنشاہ ایران کا قبضہ سندھ اور بلوچستان پر بھی رہا، اسی نسبت سے سندھ کے جنگجو قبیلے بالخصوص جاٹ اور مید وغیرہ ایران کی فوج میں شامل ہو گئے۔ جب عرب مسلمانوں نے ایران پر حملہ کیا تو ہوا کا رخ دیکھ کر جاٹ بھی بعض شرائط کے ساتھ مسلم فوج میں شامل ہو گئے۔ سپہ سالار نے ان کو مختلف قبیلوں میں شامل کرادیا۔ اس کے علاوہ یہ واضح رہے کہ نچلی ذاتوں کے افراد کو ہندوستانی راجا مسلمانوں کے پاس رکھ کر کشتی رانی اور ملاحی کا فن سکھاتے تھے تاکہ ان کی تجارت اور بحری بیڑے پر کوئی فرق نہ پڑے جب کہ اونچی ذات کے ہندو سمندری سفر کو گناہ خیال کرتے تھے۔ عرب میں ہندوستانی بھی آباد تھے اور آنحضرتؐ اور دیگر صحابہ ہندوستانی شکل وصورت والوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ امام ترمذی امثال کے باب میں روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آنحضرت ﷺ کے پاس کچھ اجنبی شکل والوں کو دیکھا تو فرمایا: ان کا چہرہ تو جاٹوں کی طرح ہے۔ جاٹوں نے کچھ ہی دنوں میں اپنی وفاداری سے صحابہ کرامؓ کا اعتماد حاصل کر لیا تھا چنانچہ حضرت علیؓ نے جنگ جمل جیسے نازک موقع پر بصرہ کے خزانہ پر انہیں جاٹوں کو نگراں متعین کیا تھا۔ پھر امیر معاویہؓ نے ان کو رومیوں کے مقابلہ کیلئے شام کے ساحلی شہروں میں بسایا اور ولید بن عبدالملک نے ان کی انطاکیہ میں بازآبادکاری کی۔

1.2.6 عربی شاعری میں ہند سے مشتق الفاظ

اس کے علاوہ یہ بات بھی حیرت کی ہے کہ لفظ ہند سے مشتق ہندہ عربوں کو اتنا پیارا معلوم ہوا کہ عرب خواتین کے نام کا نہ صرف جزو بنا بلکہ عرب کی شاعری میں یہ نام ایسا ہی کثیر الاستعمال ہے جیسے ہندوستان میں ہیر، فارسی میں لیلیٰ اور شیرین ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ رہی ہو اور جیسا کہ عرب مورخین اور سیاحوں نے بھی لکھا ہے کہ اہل ہند عربوں کے نزدیک شروع سے ہی معزز اور محترم تھے اور وہ ان کو حکمت ودانائی میں چینیوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے عطریات اور خوشبودار لکڑیاں اور ہیرے جواہرات کے جانے سے خوش ہو کر اپنے یہاں کی صنف نازک کا نام ہی ہندہ رکھ دیا ہو کہ جس کے اندر یہ تمام خوبیاں موجود ہوں یعنی

خوشبو، قیمتی اور حکمت و دانائی۔

عرب جس قدر جنگجو اور بہادر تھے اور بات بات پر طیش میں آنے والے اور اپنی آن پر کٹ جانے والے تھے ایسے میں ان کی سب سے زیادہ محبوب چیز تلوار ہی ہو سکتی تھی۔ لیکن جس تلوار کو وہ پسند کرتے تھے اور جس پر جان دیتے تھے وہ ہندوستانی تلوار تھی، یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی تلوار کی تعریف و توصیف سے عرب کی شاعری بھری ہوئی ہے۔

1.3 عرب و ہند کے مابین علمی تعلقات

عرب اور ہند کے یہ تعلقات کتنے قدیم تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مہابھارت میں جب کوروں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈووں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو ودر جی نے یدھشٹر کو عربی میں بتایا اور یدھشٹر نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا، یہ بات سوامی دیانند نے لکھی ہے۔ دوسری جانب یہ دیکھیے کہ قرآن کریم میں ہندی کے تین الفاظ موجود ہیں جسے ہند و عرب تعلقات کی وسعت اور گہرائی ثابت ہوتی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں ”اس مسئلہ میں اچھا خاصا علما میں اختلاف رہا ہے کہ قرآن پاک میں کسی غیر زبان کا لفظ ہے یا نہیں لیکن فیصلہ یہی ہوا کہ غیر زبان کے ایسے الفاظ موجود ہیں جو عربوں کی زبان میں آ کر مستعمل ہو گئے تھے اور وہ اپنی پہلی صورت بدل کر عربی زبان کے لفظ ہی بن گئے۔ حافظ ابن حجرؒ اور حافظ سیوطی نے ایسے الفاظ جمع کئے ہیں۔ ہم ہندیوں کو بھی فخر ہے کہ ہمارے دیس کے بھی چند لفظ (تین) ایسے خوش نصیب ہیں جو اس پاک اور مقدس کتاب میں جگہ پا سکے..........اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جنت کی تعریف میں اس جنت نشان ملک کی تین خوشبوؤں کا ذکر ضرور ہے۔ یعنی مسک (مشک) زنجبیل (سونٹھ یا ادرک) اور کافور (کپور)“۔

عرب ہندوستانی علوم وفنون کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور وہاں کے علماء نے اس کا جا بجا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ جاحظ لکھتا ہے:

”رہے ہندوستان کے باشندے تو ہم نے ان کو پایا ہے کہ وہ جیوتش (نجوم) اور حساب میں بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کا ایک خاص ہندی خط ہے۔ طب میں بھی وہ آگے ہیں اور طب کے بعض عجیب بھید ان کو معلوم ہیں اور سخت بیماریوں کی دوائیں خاص طور سے ان کے پاس ہیں۔ پھر مجسموں اور اسٹیچو بنانا، رنگوں سے تصویر پیدا کرنا اور تعمیر وغیرہ میں ان کو بڑا کمال ہے۔ پھر شطرنج کے وہ موجد ہیں جو ذہانت اور سوچ کا بہترین کھیل ہے.........ان میں رائے اور بہادری ہے اور جو بعض خوبیاں ان میں ہیں چینیوں میں بھی نہیں، ان میں صفائی اور پاکیزگی کے بھی اوصاف ہیں“۔

مشہور مورخ اور سیاح یعقوبی (متوفی 278 ہجری) نے بھی ہندوستان کی عظمت کا گن گایا ہے۔

”اور ہندوستان کے لوگ عقل اور غور والے ہیں اور وہ اس حیثیت سے سب قوموں سے بڑھ کر ہیں۔ جیوتش اور نجوم میں ان کی باتیں سب سے زیادہ درست نکلتی ہیں۔ سدھانت انہیں کی ذہانت کا نتیجہ ہے۔ جس سے یونانیوں اور ایرانیوں تک نے استفادہ کیا۔ طب میں ان کا فیصلہ سب سے آگے ہے۔ اس فن میں ان کی کتاب ”چرک اور ندان“ ہے.........اور بھی طب میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ منطق اور فلسفہ میں ان کی تصنیفات ہیں۔ اور بہت سی ان کی تصنیفات ہیں جن کی بڑی تفصیل ہے“۔

ہندوستان سے ایک بڑی تعداد میں وید اور پنڈت بغداد بلائے گئے لیکن جیسا کہ عموماً ہوتا ہے کہ ایک زبان کے نام دوسری زبان میں کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں جیسے عربوں کے نام لاطینی اور انگریزی میں بالکلیہ بدل گئے ہیں اسی طرح ان ویدوں اور پنڈتوں کے نام بھی اس طرح بدل گئے ہیں کہ اب اصل نام کی تلاش و جستجو مشکل ہو گئی ہے۔ پھر اس میں ایک اور پیچ یہ ہے کہ یہ لوگ زیادہ بودھ مذہب کے پیروکار تھے اور ان کے نام برہمنی یا ویدک ناموں سے الگ ہوتے ہیں اس ان کے اصل ناموں کا سراغ لگانا وہ بھی بارہ صدیوں بعد آسان نہیں۔

1.3.1.1. ہندوستان طبیبوں اور ویدوں کی بغداد آمد

عہد عباسی میں خاندان برامکہ نے بڑا نام پیدا کیا تھا ان کی شان و شوکت اور چمک دمک کے آگے قصر خلافت کا رنگ بھی پھیکا پڑنے لگا، مشہور عام یہ ہے کہ برامکہ آگ کے پجاری یعنی مجوسی تھے لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک مفصل بحث کے بعد لکھا ہے کہ برامکہ درحقیقت بودھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور بدھوں کی کسی بڑی مندر کے پجاری تھے۔ جب ان کو خلافت عباسیہ میں عروج حاصل ہوا تو انہوں نے ہندوستانی علوم وفنون کی جانب توجہ دی اور ہندوستان سے متعدد پنڈت اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین کو بغداد بلایا گیا اور ان کو علمی کتابوں کے ترجمہ اور تصنیف و تالیف کا کام سونپا گیا۔

منکہ

ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں لکھا ہے کہ یہ طب اور علاج میں بہت ماہر تھا۔ ہارون رشید کے بیمار پڑنے پر جب اطباء علاج سے عاجز آ گئے تو اس کو ہندوستان سے بلایا گیا اور اس کے علاج سے ہارون رشید کو افاقہ ہوا تو ہارون رشید نے اسے کثیر مال و دولت سے نوازا۔ اس کی لیاقت کو دیکھتے ہوئے اسے دارالترجمہ میں سنسکرت کی کتابوں کے ترجمہ کے کام پر مقرر کیا گیا۔

صالح بن بہلہ

یہ بھی ہندوستانی طبیب تھا اور ہارون رشید کے چچازاد بھائی کو جب سکتہ لاحق ہوا اور شاہی طبیب جبرئیل بخت یشوع نے اس کی موت کا اعلان کر دیا تو جعفر برمکی نے اس کو ہارون رشید کی خدمت میں پیش کیا اور اس نے علاج کر کے سکتہ ختم کرایا اور ہارون رشید کا چچازاد بھائی گویا دوبارہ زندہ ہو گیا جس سے اس کی بڑی شہرت ہوئی۔

ابن دہن

برامکہ نے خلافت عباسی میں اپنی فیاضی سے رفاہ عام کے کئی کام انجام دیئے تھے ان میں سے ایک شفاخانہ کا قیام ہے۔ ابن دہن برمکیوں کے شفاخانہ کا افسر اعلیٰ تھا جس کو ہم آج کی اصطلاح میں چیف میڈیکل افسر یعنی سی ایم او کہتے ہیں۔ پروفیسر زخاؤ کا کہنا ہے کہ اصل نام دھنیا یا دھنن ہو گا، اور یہ نام رکھنے کی وجہ شاید یہ ہو گی کہ منوشاستر میں دیوتاؤں کے طبیب کا نام دھنونتری ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد ہندوستانی طبیب اور حکیم دربار عباسی اور بغداد میں موجود تھے لیکن تطویل کے خوف سے ان کے نام کو ہم نظر انداز کرتے ہیں۔

1.3.2 طبی کتابوں کے ترجمے

عربی زبان میں سنسکرت اور ہندی کی متعدد طبی کتابوں کا ترجمہ ہوا ایک نظر ہم ان کتابوں پر ڈالتے ہیں۔ ششرت کی کتاب دس باب میں تھی اس میں بیماریوں کی علامات اوران کے علاج ودوا کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ چرک نام کے ہندوستانی رشی اور مشہور طبی ماہر کی کتاب اولا فارسی میں منتقل ہوئی پھر عبداللہ بن علی نے اس کو فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ سندھشان نام کی طبی کتاب کا ترجمہ شفاخانہ بغداد کے افسر اعلیٰ ابن دہن نے کیا تھا۔ ندان نام کی طبی میں چار سو بیماریوں کی پہچان بتائی گی ہے اس کا بھی ترجمہ ہوا تھا۔ ایک طبی کتاب جو جڑی بوٹیوں کے نام پر مشتمل تھی اس کو منکہ پنڈت نے سلیمان بن اسحاق کیلئے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ ایک کتاب جس میں ہندی اور یونانی طبیبوں کی دواؤں کے سرد و گرم مزاج، دواؤں کی کیا قوت ہے؟ اور موسم کے اعتبار سے اس کی قوت میں کیا کمی اور زیادتی ہوتی ہے، کی تفصیل تھی عربی میں ترجمہ ہوئی۔ طب ہندی کی کتاب استانگر کو ابن دہن نے عربی کا جامہ پہنایا تھا، ایک وید کی دو کتابوں کا ترجمہ کیا گیا جس میں 100 بیماریوں اور 100 دواؤں کا ذکر تھا اور دوسری کتاب میں بیماریوں کے وہم اور اسباب کا بیان تھا۔

علاج کا وہ طریقہ جس میں مریض کو جڑی بوٹیوں کو ملا کر یا ان کا عرق کشید کر کے مشروب تیار کیا جاتا ہے ایسی کتابیں بھی عربی میں ترجمہ کی گئیں، ابن ندیم نے کتاب کا نام اطر لکھا ہے ہوسکتا ہے کہ یہ اتری نام کے وید کی طرف منسوب ہو اسی طرح ایک اور پنڈت کا ذکر ابن ندیم نے کیا جس کا نام ساوبرم لکھا ہے۔ ایک پنڈتہ کی کتاب کا ترجمہ ہوا جس میں عورتوں کی بیماریوں کے علاج بیان کئے گئے تھے۔ ایک اور کتاب حاملہ عورتوں کی بیماریوں اور علاج کے سلسلے میں ترجمہ کی گئی۔

1.3.3 عربی زبان میں ہندوستانی دوائیں

عربی میں جب اس قدر ہندوستانی طبی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ غیر ممکن تھا کہ عربی میں ہندی دواؤں کے نام رواج نہ پا جاتے۔ بعض دوا کے نام تو آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی میں ہے یعنی قسط ہندی کا ذکر خود صحیح بخاری میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ زنجبیل یعنی سونٹھ کا ذکر تو قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ عربی میں اطریفل نام کی دوا مشہور ہے۔ محمد خوارزمی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ ہندی لفظ تری پھل ہے کہ یہ تین پھلوں، ہلیلہ، بلیلہ اور آملہ سے بنتا ہے۔ خوارزمی نے مفتاح العلوم میں ایک اور دوا انبجات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "انبہ" (آم) ہندوستان کا ایک پھل ہے اس کو شہد، لیموں اور ہلیلہ میں ملا کر انبجات تیار کیا جاتا ہے، شاید یہ گڑمبہ یا آم کا کسی قسم کا اچار ہو۔ الہ آباد اکیڈمی میں دیئے گئے خطبات کے مجموعہ "عرب و ہند کے تعلقات" میں علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک منفرد تحقیق یہ پیش کی ہے کہ عرب کی دوائی میں جس کا نام خوارزمی نے بہطہ لکھا ہے اور اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ یہ بیماروں کی غذا کی قسم ہے۔ یہ لفظ سندھی ہے۔ یہ دودھ اور گھی میں چاول کو پکا کر تیار کیا جاتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"آپ سمجھے؟ یہ ہمارا ہندوستانی بھات ہے جو عربوں کے نزدیک بیماروں کیلئے ایک نرم اور ہلکی غذا ہو گی اس کو اب کھیر سمجھئے یا فیرینی"۔

1.3.4 حساب وریاضی علوم

حساب کی اہمیت سے کوئی ناواقف نہیں، اس کے بغیر زندگی کا کارخانہ اور لین دین سب کچھ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ہر زبان میں حساب وکتاب کیلئے کچھ الفاظ ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ بات حیرت کی ہے کہ ارقام یا نمبرات عربوں نے ہندوستانیوں سے اخذ کئے اس لئے عربی میں ان کو ارقام ہندیہ یعنی ہندوستانی نمبرات سے تعبیر کرتے ہیں اور جب یہ نمبرات عربوں کے ذریعہ یوروپ پہنچے تو اہل یوروپ نے ان کو عربک فیگرز یعنی عربی نمبرات کہا۔ اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ عربی میں تحریر دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے لیکن نمبرات بائیں سے دائیں لکھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اس ضمن میں قدیم کتبات اور کتابوں سے جو ثبوت وشواہد بہم پہنچائے ہیں اسے دیکھ کر ایک نگاہ میں ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ اعداد وشمار ہندی ہیں اور یہیں سے وہ عرب اور پھر یوروپ پہنچے۔

اندازہ ہے کہ سنہ 156 ہجری میں منصور کے عہد اقتدار میں جو پنڈت سدھانت لے کر بغداد آیا تھا اسی نے عربوں کو یہ نمبرات بتائے ہوں گے۔ علاوہ ازیں سدھانت کی کتاب میں خود ایک باب نمبرات اوراعداد وشمار پر موجود تھا جس سے عربوں نے استفادہ کیا اور اسے اپنایا۔ نمبرات کو عربی قالب میں ڈھالنے کا کام محمد بن موسیٰ خوارزمی (780-840ء) نے انجام دیا ہے۔ یوروپ میں حساب کے ایک خاص شعبہ کو الگاریتھم اور الکاریتم اور الکورزم کہتے ہیں جب کہ یہ تمام نام الخوارزمی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ الخوارزمی کے بعد ہندی حساب کو علی بن محمد نسوی (980-1040ء) نے فروغ دیا۔ اس نے المقنع فی الحساب الہندی (ہندی حساب میں کفایت کرنے والی) نامی کتاب لکھی، اس کے بعد دیگر مصنفین نے اس پر طبع آزمائی کی۔ ہندی حساب کو خواص سے گزر کر عوامی مقبولیت بھی حاصل ہو چکی تھی چنانچہ ابو علی سینا کے ذکر میں آتا ہے کہ بچپن میں اس نے ہندی حساب سیکھا تھا۔

1.3.5 نجوم اور ہیئت

نجوم اور ہیئت ہندوستان کے خاص علوم ہیں۔ سنہ 154 ہجری میں سندھ سے جو وفد بغداد روانہ ہوا تھا اس میں سے ایک پنڈت ہیئت کی کتاب لے کر گیا تھا۔ سنسکرت میں اس کتاب کا نام برہمپت سدھانت تھا، اس کا عربی ترجمہ السند ہند کے نام سے مشہور ہوا۔ سنسکرت کی دوسری کتاب جو عربی میں ترجمہ ہوئی اس کا نام ارجبہذ بتایا جاتا ہے۔ سنسکرت کی اصل کتاب کا نام آریہ بھٹ تھا۔ اس کے بعد آرکند نام سے سنکسرت کی ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا جس کا نام سنسکرت میں کھنداکھدیک ہے۔

ہندی پنڈت جس نے بغداد میں پہلی مرتبہ سدھانت عربی میں ترجمہ ہوئی اس کے دو عرب شاگرد ابراہیم فزاری اور یعقوب بن طارق ہیں۔ ان دونوں نے اپنے اپنے طور پر سدھانت کو عربی میں منتقل کیا۔

عربی زبان میں ہیئت اور نجوم کی کتابوں کے ترجمہ کا اثر یہ ہوا کہ سنسکرت کے الفاظ عربی میں راہ پاگئے اور عربوں نے اسے معرب کر کے اپنی زبان کا ہی لفظ بنالیا۔ جیسے قدیم عربی ہیئت میں کردجہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جب کہ اس کی اصل سنسکرت کر مجھا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ ریاضی میں استعمال ہونے والا جیب کا لفظ عربی کے گریبان کے معنی سے مشتق نہیں بلکہ یہ سنسکرت کے لفظ "جیوا"

کا معرب ہے۔

1.3.6 متفرقات

اس کے علاوہ متفرق طور پر دیگر فنون پر مبنی ہندوستانی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ ہوا، جیسے سانپوں کی اقسام اوران کے جھاڑ پھونک اور منتر ہندوستان میں مشہور ہیں اوراس فن کا نام سرپ ودیا ہے۔رائے نام کے ایک پنڈت کی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا جس میں سانپوں کی اقسام اوران کے زہروں کا بیان تھا۔

شاناق پنڈت کی کتاب جو سیاست اور بادشاہت کے آداب پر مبنی تھی کی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا، شاناق پنڈت ہو سکتا ہے کہ چانک یا چانکیہ ہو جس کا ایک باب کھانااورزہر تھا،اس کے علاوہ اسی پنڈت کی ایک کتاب خاص زہر کے بارے میں بھی تھی اور یہ تو مشہور عالم ہی ہے کہ ہندوستان میں راجہ اپنے حریف راجہ کو زہر دے کرمارنے میں کمال رکھتے تھے اوراس غرض سے ''بس کنیائیں'' تیار کی جاتی تھیں۔ یہ بچیاں بچپن سے ہی منتخب کرلی جاتی تھیں اوران کی خوبصورتی پر خاص دھیان دیا جاتا تھا اوران کو بچپن سے ہی تھوڑا تھوڑا زہر کھانے کی تربیت دی جاتی تھی جس کی وجہ سے زہر ان کے پورے جسم میں رچ بس جاتا تھا اور یہ حریف راجہ کو اپنے حسن کا شکار کر کے بآسانی موت کے منہ مین ڈھکیل دیتی تھیں۔ زکریا قزوینی نے بھی " آثار البلاد " میں زہر دیکر راجاؤں کو مارنے کا ذکر کیا ہے۔

ان کے علاوہ جیوتش، جفر اور رمل وغیرہ پر مبنی سنسکرت کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ ہوا، خلافت عباسیہ میں پہلے ایرانی ستارہ شناسوں کا غلبہ تھا لیکن بعد ازاں ہندوستانی منجموں نے اپنا عمل دخل بڑھا لیا۔ خلافت عباسیہ میں جو منجم یا ستارہ شناس پنڈت رہتے تھے اس میں کنکہ نامی پنڈت بہت مشہور تھا، ابن ندیم نے اس کی چار کتابوں کا ذکر کیا ہے۔(1) کتاب فی الاعمار، یعنی عمروں کے بیان میں کتاب (2) کتاب اسرار المو الید، پیدائش اورولادت کے اسرار کے بیان میں (3) کتاب القرانات الکبیر، بڑے قران یا لگن کے بیان میں ،اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ایک ہی وقت میں دوستارے ایک برج یا ایک مقام میں ہوں (4) کتاب القرانات الصغیر، چھوٹے لگن کے بیان میں۔اسی پنڈت کی دو کتابوں کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے۔(1) کتاب فی التوہم، مسمریزم یا خیال بندی کے بیان میں (2) کتاب فی احداث العالم والدور فی القران، دنیا کے واقعات اور ستاروں کے لگن میں گردش کے بیان میں۔اس کے علاوہ دیگر پنڈتوں کی بھی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا جس میں پیدائش کے وقت زائچہ کھینچنے وغیرہ کی باتیں ہیں۔ ہندوستان کی ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا جس کا موضوع ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر حال بتانا تھا۔

1.4 عرب وہند کے سماجی تعلقات

سندھ کو جب عربوں نے فتح کیا تو ان کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ سندھ کے بودھوں اور ہندؤں کو کیا مقام دیا جائے ،اس سلسلے میں عرب فاتحین نے یہ فیصلہ کیا کہ سندھ کے عربوں کو مشابہ اہل کتاب کا درجہ دیا جائے یعنی ان سے نکاح کے سلسلہ کو چھوڑ کر بقیہ تمام دیگر معاملات میں ان کیساتھ اہل کتاب یہود ونصاریٰ جیسا سلوک کیا جائے۔ بودھوں اور برہمنوں کے مندروں کے سلسلہ میں محمد بن قاسم

نے کہا کہ "ہندوستان کا بت خانہ عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور مجوس کے آتش کدوں کی طرح ہے۔جب کہ چچ نامہ کے مصنف نے اس سلسلے میں یہ لکھاہے:"محمد بن قاسم نے برہمن آباد کے لوگوں کی درخواست قبول کی اور ان کو اجازت دی کہ سندھ کی اس اسلامی سلطنت میں اسی حیثیت میں رہیں جس حیثیت میں عراق اور شام کے یہودی عیسائی اور پارسی رہتے ہیں۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ کے جن شہروں کو فتح کیاوہاں کسی مندر کو نہ منہدم کیااور نہ کوئی تبدیلی کی بلکہ بودھوں اور برہمنوں کو پوری آزادی دی کہ وہ اپنے طریقہ سے عبادت کریں۔

عربوں کی اس رواداری کا اثر غیر مسلموں پر بھی پڑا چنانچہ سندھ کے ایک مقام پر جب غیر مسلم قابض ہوگئے تب بھی انہوں نے مسجد کو ہاتھ نہیں لگایامسلمان اس میں حسب سابق نماز پڑھتے رہے تھے۔نیز متعدد عرب سیاحوں نے نقل کیاہے کہ جنوبی ہند اور گجرات کے شہروں میں جہاں کے راجہ غیر مسلم تھے وہاں مسلمان مذہبی اعتبار سے آزاد تھے،ان پر کوئی داروگیر نہیں تھی،ان کی اپنی مسجدیں تھیں جن میں وہ بلاروک ٹوک عبادت کرتے تھے۔ان کے معاملات کا فیصلہ شرعی اعتبار سے ہوتا تھااوران کیلئے قاضی مقرر تھا۔حد یہ ہے کہ تجارتی اغراض سے ملیبار کے راجہ تواپنی رعایاکے افراد کے مسلمان ہونے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور نہ صرف حوصلہ افزائی بلکہ چھوٹے بچوں کو مسلمانوں کے حوالے کر دیتے تھے اور وہ ان کی اسلامی طور پر تربیت کرتے تھے اور پھر آگے چل کر ان کو جہازراں بنایاجاتا تھا۔

اس میل جول اوراختلاط کا اثر یہ ہوا کہ عربوں میں ہندوں کے مذہب کی تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔یحیی برمکی نے ایک شخص کو خاص طور پر ہندوستان اس لئے بھیجاکہ وہ وہاں جاکر مذہب کی تحقیق کرے،جو شخص اس غرض سے بھیجاگیا اس کی بعینہ روداد محفوظ نہیں ہے مگر ابن ندیم نے اپنی کتاب میں یعقوب بن اسحاق کندی کے ہاتھ کی لکھی ایک تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے ہندو مذہب کے کچھ فرقوں اوران کے عقیدوں کا حال بیان کیاہے۔

ابن ندیم کے ہم عصر اور بیت المقدس کے ایک عرب مورخ مطہر نے اپنی کتاب میں ہندوستانی فرقوں کا حال تفصیل سے بیان کیاہے جس سے پتہ چلتاہے کہ کتنی گہرائی سے ہندو مذہب کی واقفیت حاصل کی تھی۔مطہر البدءوالتاریخ میں لکھتاہے۔

”ہندوستان میں نو سو فرقے ہیں لیکن ان میں صرف ننانوے کا حال معلوم ہے۔اور یہ سب 45 مذہب کے اندر ہیں اور یہ بھی چار اصول کے اندر محدود ہیں اورانکی اصل موٹی تقسیم دو ہے۔سمنی(بودھ)اور برہمنی۔سمنی یاتو خداکے قائل نہیں یاایسے خداکے جو بے اختیار ہے۔برہمنی مذاہب والوں میں تین فرقہ ہیں:ایک توحید اور جزاوسزاکا قائل ہے مگر رسالت کا قائل نہیں،دوسرا تناسخ کے اصول پر جزاوسزاکو مانتاہے لیکن نہ توتوحید کا قائل ہے اورنہ رسالت کا۔“

مصنف مذکور مسلمانوں کے تعلق سے ہندوں کے طرزعمل کے سلسلہ میں لکھتاہے:

”مسلمان ان کے نزدیک ناپاک ہیں۔وہ ان کو اور جس چیز کو وہ چھولیں اسکو نہیں چھوتے،اور گائے ان کے نزدیک ماں کی طرح ہے۔اس کی جان لینے کی سزاان کے یہاں قتل ہے اور غیر عورت سے ہم بستری کرنا،بے بیوی والوں کیلئے ان کے ہاں جائز ہے تاکہ نسل کم نہ

ہو۔اور بیوی والا اگر برا کام کرے تو اس کی سزا قتل ہے اور جب ان میں سے کوئی مسلمانوں کے ہاتھ پڑ کر ان کے یہاں واپس جاتا ہے تو اس کو مارتے نہیں بلکہ اس کے بدن کے تمام بال مونڈ کر اس کو پراش چیت کرتے ہیں۔ قرابت میں وہ نکاح نہیں کرتے ،برہمنوں کے نزدیک شراب حرام ہے اور ذبیحہ بھی"۔

اس کے بعد مختلف دیوتاؤں کی پوجا کرنے والوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور ہر دیوتا کی صورت بتاتے ہوئے مہادیو، کالی، مہاکالیا اور لنگ پوجا وغیرہ کا حال لکھا ہے۔

1.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ہزاروں سال قبل مسیح سے ہندوستان اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات تھے۔ عرب تاجر ہندوستان کی پیداوار جس میں خوشبودار لکڑیاں، عطریات، گرم مسالے، ہیرے جواہرات اور یہاں کی خاص چیزیں جیسے کپڑے اور جوتے اور بانس و بید وغیرہ مصر و شام اور وہاں سے روم یعنی یوروپ پہنچاتے تھے۔ چھٹی صدی ہجری میں جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا اور اس کی کرنوں نے اپنے ارد گرد کے ماحول کو روشن کرنا شروع کیا تو دھیرے دھیرے اس کی پر امن شعاعوں نے جزائر ہند کو بھی منور اور روشن کیا۔
- جب دو قوموں کا ایک دوسرے سے میل ملاپ اور اختلاط ہوتا ہے تو دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں۔ ایسا ہی عربوں اور ہندیوں میں بھی ہوا اور پھر مختلف گونا گوں تعلقات عربوں اور ہندیوں کے درمیان قائم ہوئے، تجارتی تعلقات دونوں کے درمیان زمانہ قدیم سے اہم رابطہ تھا۔اس تجارت سے جنوبی ہند اور گجرات کے علاقے مال مال ہو گئے تھے کیونکہ زیادہ جہازوں کی آمد کا مطلب زیادہ محصول اور زیادہ مالی فراوانی تھی۔اس لئے جنوبی ہند کے حکمرانوں بالخصوص ملیبار کے حکمرانوں نے مسلمانوں کی عزت افزائی اور آؤ بھگت کی۔
- تعلقات کی ابتدا تجارت سے ہی ہوئی تھی لیکن دھیرے دھیرے علمی اور مذہبی تعلقات بھی قائم ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ کعبہ کیلئے کچھ بت ہندوستان سے بھی روانہ ہوئے تھے اور سسلی کی فتح کے بعد وہاں سے ایک بیش قیمت بت ملا تھا جسے حضرت امیر معاویہ ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم جو مسلمانوں کے مصالح پر خرچ ہو بہتر سمجھتے تھے لہذا اس بت کو سندھ بھیج دیا جہاں اس کی فروخت سے بڑی رقم ملی (دیگر مورخین نے اس کی تردید کی ہے صرف بیرونی نے سندھ میں بت بھیجے جانے کی بات کہی ہے)۔
- ہندوستان ابتدائے زمانہ سے ہی علوم وفنون میں شہرت رکھتا تھا اور اسی لئے دنیا کی دیگر تمام قومیں ان کے نزدیک حقیر اور جاہل تھیں عربوں نے ہندوستان سے ریاضی، ہیئت کے ساتھ جیوتش، جفر اور رمل بھی سیکھا اور اسی کے ساتھ متعدد طبی

کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ ان تراجم اور ہندوستان طبیبوں کی بغداد میں بودوباش نے عربی زبان وادب کو متاثر کرنے کے ساتھ عرب طبیات کو بھی متاثر کیا۔

- چونکہ برامکہ خاندان خود ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیق ہے اور خلافت عباسیہ میں ان کا بڑا زور تھا تو انہوں نے ہندوستان سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کو بغداد بلایا اوران کو دارالترجمہ میں مختلف علوم وفنون کی ہندوستانی کتابوں کے ترجمہ کی خدمت سونپی جسے انہوں نے پوری جانفشانی سے انجام دیا۔
- بعد کے ادوار میں ہم دیکھتے ہیں کہ البیرونی اور دیگر سیاح ہند آتے ہیں وہ یہاں کی کچھ چیزوں کی تعریف بھی کرتے ہیں اور کچھ چیزوں پر تنقید بھی کرتے ہیں،ہندوستان کے افراد بالخصوص براہمن البیرونی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے،اس کے علاوہ ہندوستان میں ذات پات کی جو سخت بندش تھی اس کو بھی اسلام کے تصور مساوات نے ڈھیلا کیا۔

1.6 نمونہ امتحانی سوالات

1.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جانوروں میں ہندوستان سے ہاتھی کہاں جایا کرتا تھا؟

(a). عراق (b). بنگلہ دیش (c). پاکستان (d). افغانستان

2. عربوں نے ہندسے اور ارقام کس قوم سے اخذ کیے؟

(a). روم (b). یونان (c). ہندوستان (d). مصر

3. ہارون رشید کا کس ہندوستانی طبیب نے علاج کیا تھا؟

(a). منکہ (b). ابراہیم فزاری (c). صالح بن بہلہ (d). ابن دہن

4. صالح بن بہلہ کہاں کا طبیب تھا؟

(a). ہندوستان (b). عرب (c). انگلینڈ (d). فرانس

5. برمکیوں کے شفاخانہ کا اعلیٰ افسر کون تھا؟

(a). صالح بن بہلہ (b). منکہ (c). ابن دہن (d). سب غلط

6. سندھشتان نام کی طبی کتاب کا ترجمہ کس نے کیا تھا؟

(a). صالح بن بہلہ (b). منکہ (c). ابن دہن (d). سب غلط

7. برامکہ کس مذہب سے تعلق رکھتے تھے؟

(a). بودھ مذہب (b). اسلام (c). سکھ مت (d). عیسائی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY
Estd. 1998

8. عربی ترجمہ "السند ھند" کا موضوع کیا ہے؟

(a). نجوم وہیئت (b). تصوف (c). سیرت (d). فقہ

9. کس کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ہارون نے دار الترجمہ میں سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے پر مقرر کیا؟

(a). صالح بن بہلہ (b). منکہ (c). ابن دہن (d). تمام صحیح

10. طب ہندی کی کتاب "استانگر" کو عربی جامہ کس نے پہنایا؟

(a). صالح بن بہلہ (b). منکہ (c). ابن دہن (d). تمام صحیح

1.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. عرب وہند تجارتی تعلقات کی قدامت پر روشنی ڈالیے۔
2. عرب وہند کے مابین تجارتی تعلقات پر نوٹ لکھیے۔
3. ہندوستان میں کیا چیزیں درآمد ہوتی تھیں؟ بیان کیجیے۔
4. عرب شاعری میں ہند سے مشتق الفاظ پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
5. ہندوستانی طبی کتابوں کے ترجمہ پر اظہار خیال کیجیے۔

1.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عرب وہند کے تعلقات کی بنیاد اور تجارتی اشیاء کی فہرست پر مضمون لکھیے۔
2. عرب وہند کے علمی تعلقات کی نوعیت بیان کیجیے۔
3. عرب وہند کے سماجی تعلقات پر جامع نوٹ لکھیے۔

1.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. عرب وہند تعلقات کے تعلقات : علامہ سید سلیمان ندوی
2. عرب ممالک اور صوبہ گجرات کے تعلقات : مولانا اقبال محمد ٹنکاروی
3. عرب وہند عہد رسالت میں : قاضی اطہر مبارک پوری
4. عربوں کی جہاز رانی : علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 2: ابتدائی مسلم آبادیاں

اکائی کے اجزا:

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 مسلم آبادیوں کا آغاز

2.3 ابتدائی مسلم آبادیاں۔ جزائر(Islands)

2.3.1 سراندیپ

2.3.2 ملیبار کی مسلم آبادی

2.3.3 کولم

2.4 ابتدائی مسلم آبادیاں۔ سندھ کی فتح کے بعد

2.4.1 مکران

2.4.2 ملتان

2.4.3 منصورہ

2.4.4 محفوظہ

2.5 ابتدائی مسلم آبادیاں۔ گجرات

2.5.1 سندان

2.6 اکتسابی نتائج

2.7 نمونہ امتحانی سوالات

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

ہندوستان اور عرب کے سواحل آمنے سامنے واقع ہیں اور دونوں ہی قدرت کے خصوصی فیضان کا مظہر ہیں۔ ہندوستان کے سواحل پر ناریل کے باغات ہیں تو عرب کے سواحل پر کھجور کے نخلستان ہیں۔ عربوں نے سندھ کا علاقہ فتح کرنے کے بعد وہاں اپنی نو آبادیاں قائم کیں۔ قریش، کلب، تمیم، اسد اور یمن و حجاز کے بہت سے قبیلے یہاں آکر مختلف شہروں میں آکر آباد ہوئے اور تیسری صدی ہجری کے بیچ تک ان کی حکومت ملتان سے لے کر سمندر تک کسی نہ کسی طرح قائم رہی لیکن آخر کار یمنی اور حجازی عربوں کی باہمی خانہ جنگی نے ان کو برباد کر دیا اور بہت سے علاقے ان کے ہاتھوں سے نکل گیے۔ تاہم ملتان اور منصورہ دو ریاستیں ان کی ایسی تھیں جو سلطان محمود غزنوی کے حملے تک قائم رہیں۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ یہ جان سکیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا مرکز سراندیپ ہے۔ اسلام سے پہلے عرب تاجر ان علاقوں میں تجارت کی غرض سے آتے تھے اور اس علاقے کے لوگ عرب بھی جایا کرتے تھے۔ اس لیے سراندیپ کے راجہ کو اسلام اور مسلمانوں کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا اور صحابہ کرام کے دور میں ہی مسلمان ہو گیا۔ اس کے علاوہ دوسرا مرکز مالدیپ کا جزیرہ تھا۔ تیسرا مرکز ملیبار تھا۔ اس اکائی میں آپ جانیں گے کہ ہندوستان میں مسلم آبادیاں کہاں آباد ہوئیں۔

2.2 مسلم آبادیوں کا آغاز

یہ ایک حقیقت ہے کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر یورش کا آغاز کیا اور شہاب الدین غوری نے ہندوستان میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی؛ اس سے بہت قبل جنوبی ہندوستان اور ملک کے دیگر خطوں میں مسلم آبادیاں بس چکی تھیں اور اسلام کی اشاعت تجارت اور تصوف کے ذریعہ ہوئی۔ ہندوستان کی ابتدائی اسلامی آبادی کے تعلق سے جنوبی ہند خصوصاً گجرات اور کیرالہ و مدراس وغیرہ اس میں شامل ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھانہ تک اسلامی فوج نے یلغار کی تھی، لیکن حضرت عمرؓ نے سپہ سالار عثمان بن ابو العاص کی اس روش پر ناراضگی ظاہر کی کیونکہ وہ دربار خلافت سے اجازت کے بغیر کیے گیے تھے اور اس میں اسلامی فوج کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ اس کے بعد حضرت عثمان نے ہندوستان کے تعلق سے تحقیق کیلئے ایک شخص کو بھیجا جس نے ہندوستان کی منفی صورت حال بیان کی جس کی بناء پر حضرت عثمانؓ نے ہندوستان پر فوج کشی کا خیال ترک کر دیا۔ محمود غزنوی کے حملہ سے پہلے ہندوستان کے مختلف ساحلی علاقوں میں مسلم آبادیاں قائم ہو چکی تھیں۔

2.3 ابتدائی مسلم آبادیاں۔ جزائر (Islands)

2.3.1 سراندیپ

سب سے پہلے بستی کہاں قائم ہوئی، اس بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے لیکن عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ دیار ہند میں اولین مسلم بستی سراندیپ میں قائم ہوئی، مشہور مورخ فرشتہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''چونکہ اسلام کے پہلے ہی سے عرب ان جزیروں میں تاجرانہ آتے تھے اور یہاں کے لوگ عرب جایا کرتے تھے۔ اس لئے سراندیپ کے راجہ کو اسلام اور مسلمانوں کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہی زمانہ میں سنہ 40 ہجری یعنی ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں وہ مسلمان ہو گیا تھا''۔

اس کی تائید مشہور سیاح اور ناخدا ابزرگ بن شہریار کی تصنیف عجائب الہند سے بھی ہوتی ہے۔ وہ سراندیپ کے بیان میں لکھتا ہے۔

''ہندوستان کے پجاریوں، سنیاسیوں اور جوگیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک "بیکور" ہوتے ہیں جن کی اصل سراندیپ سے ہے۔ یہ مسلمانوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کی طرف بہت میلان رکھتے ہیں۔ وہ گرمی کے موسم میں ننگے رہتے ہیں۔ صرف چار انگل کی لنگوٹی، کمر میں ایک ڈوری لٹکا کر باندھ لیتے ہیں اور جاڑوں میں گھاس کی چٹائی اوڑھ لیتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایک ایسا کپڑا پہنتے ہیں جس کو مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکروں سے جوڑ کر سی لیتے ہیں اور بدن پر مردوں کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ مل لیتے ہیں اور سر اور ڈاڑھی مونچھ کے بال منڈاتے ہیں اور دوسرے بال بڑھاتے ہیں۔ گلے میں انسان کی ایک کھوپڑی لٹکاتے رہتے ہیں اور عبرت اور خاکساری کیلئے اسی میں کھاتے ہیں''۔

سراندیپ اور آس پاس والوں کو جب پیغمبر اسلام کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے میں سے ایک سمجھدار آدمی کو تحقیق حال کیلئے عرب روانہ کیا۔ وہ رکتے رکاتے جب مدینہ پہنچا تو رسول اللہؐ وفات پا چکے تھے، ابو بکر صدیق کی خلافت بھی ختم ہو چکی تھی اور حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ وہ ان سے ملا اور رسالت مآبؐ کے حالات دریافت کئے، حضرت عمرؓ نے بتفصیل بیان کئے۔ جب وہ واپس ہوا تو مکران (بلوچستان) کے پاس پہنچ کر مر گیا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک ہندو نوکر تھا۔ وہ صحیح سلامت سراندیپ پہنچ گیا۔ اس نے رسول اللہؐ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سارا حال بیان کیا اور ان کے فقیرانہ اور درویشانہ طور و طریق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں اور مسجد میں سوتے ہیں۔ اب یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ جو اس قدر محبت اور میلان رکھتے ہیں وہ اسی سبب سے ہے۔

فرشتہ کی بیان کردہ روایت کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ امویوں کی طرف سے مشرقی ممالک بشمول عراق کا گورنر حجاج تھا اور جزائر ہند کی طرف سے عراق کی بندرگاہ پر ہی جہازوں کی آمد و رفت ہوتی تھی۔ سراندیپ کے راجہ نے مسلمانوں سے یگانگت اور اور محبت کے اظہار کے طور پر ایک جہاز میں تحفوں کے ساتھ ان مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کو عراق روانہ کیا جن کے باپ وہاں تجارت

کرتے تھے اور وہیں ان کی مسافرت میں بے والی ووارث چھوڑ کر مر گئے تھے۔ اس سے اتنا ثابت ہوتا ہے پہلی صدی ہجری کے اختتام سے قبل سراندیپ میں مسلم آبادی قائم ہو چکی تھی۔

2.3.2 ملیبار کی مسلم آبادی

متعدد روایتیں اس امر کی ملتی ہیں کہ اسلام اور عربوں کا ایک بڑا مرکز وہ تھا جسے ملیبار کہتے ہیں۔ ملی کے معنی پہاڑ اور بار کا معنی ملک کا ہے۔ تحفہ المجاہدین میں ملیبار میں مسلم آبادی اوراشاعت اسلام کے تعلق سے لکھا ہے۔

''اسلام سے پہلے اوراسلام کے بعد یہودی اور عیسائی سوداگر یہاں آیا کرتے تھے۔ اور یہاں بودوباش اختیار کر چکے تھے جب اسلام پر دوسو برس گزرے، عرب اور عجمی مسلمان درویشوں کی ایک جماعت حضرت آدم علیہ السلام کے نقش قدم کی زیارت کیلئے سراندیپ جس کو لنکا کہتے ہیں جارہی تھی۔ اتفاق یہ ہے کہ ان کا جہاز ہوا کے جھونکوں سے بہک کر ملیبار کے شہر کدنکلور کے کنارے آکر لگا۔ شہر کے راجہ زیمور (سامری) نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی، باتوں باتوں میں اسلام کا ذکر آگیا، راجہ نے کہا میں نے یہودیوں اور عیسائیوں کی زبانی تمہارے پیغمبر اور مذہب کا حال سنا ہے اب تم خود سناؤ! درویشوں نے اسلام کی حقیقت اس موثر انداز سے بیان کیا کہ راجہ کا دل موہ لیا۔ راجہ نے ان سے وعدہ لیا کہ واپسی میں بھی وہ ادھر سے ہی گزرتے جائیں۔ چنانچہ وعدہ کے مطابق وہ آئے۔ راجہ نے سب امرا کو بلا کر کہا کہ اب میں خدا کی یاد کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہہ کر ملک برابر برابر سب افسروں میں تقسیم کر دیا اور خود چھپ کر ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا اور مسلمان ہو گیا اوران درویشوں سے کہا کہ ملیبار میں اسلام کے پھیلانے کی صورت یہ ہے کہ تم لوگ ملیبار سے تجارت شروع کردو اوراپنے امراء کے نام ایک وصیت نامہ لکھ کر سپرد کیا کہ ان پردیسی سوداگروں کے ساتھ ہر قسم کی مہربانی اور لطف کا برتاؤ کیا جائے اور ہر نیک کام میں ان کی مدد کی جائے اوران کو اپنی عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت دی جائے اوراس طرح ان سے سلوک کیا جائے کہ ان کو وہاں رہنے کی اوراس کو وطن بنانے کی خواہش پیدا ہو۔ اس وقت سے عرب سوداگر اس ملک میں آنے جانے اور رہنے لگے۔ تحفۃ المجاہدین کی ایک روایت کے مطابق راجہ کا واقعہ پیغمبر اسلام کے عہد کا ہے لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے اس روایت کو غلط مانا ہے۔ تحفۃ المجاہدین کی تیسری روایت اس سلسلے میں یہ ہے کہ:

''ہندوستان کے مغربی ساحل کے بندر گاہوں میں مختلف ملکوں سے تاجر بکثرت آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے شہر آباد ہو گئے ہیں اور مسلمانوں کی تجارت سے ان میں آبادی بڑھ گئی ہے اور مکانات کثرت سے بن گئے ہیں۔ یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر سختیاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ باوجویکہ یہ سردار اوران کی سپاہ بت پرست ہے۔ مگر وہ مسلمانوں کے مذہب اوران کے شعائر کا بہت کچھ پاس ولحاظ کرتے ہیں۔ بت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد سے اس لئے اور تعجب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں.......... بحیثیت مجموعی ملیبار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے۔ کیوں کہ ان کے ملک میں زیادہ شہروں کا آباد ہو جانا انہیں مسلمان تاجروں کی بودوباش کا نتیجہ ہے۔''

ملیبار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تارکین وطن آگے چل کر نائط اور موپلا کے نام سے مشہور ہوئے اور پرتگیزوں

سے پہلے ان کے ہاتھوں میں جہازرانی کی باگ ڈور تھی۔ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو دیسی باشندوں میں سے مسلمان ہو گئے یا شادی بیاہ کے ذریعہ برادری میں شامل ہو گئے ہیں۔

2.3.3 کولم

عرب جہازراں بہت قدیم زمانے سے اس کا نام لیتے آئے تھے اور اس کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ مسالوں والے ملک کا آخری شہر ہے۔یہاں سے جہاز عدن کو جاتا تھا اور یہاں مسلمانوں کا ایک محلہ آباد ہو گیا تھا اور یہاں ان کی ایک جامع مسجد بھی تھی۔

2.4 ابتدائی مسلم آبادیاں۔سندھ کی فتح کے بعد

محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ مشہور ہے لیکن اس سے بھی قبل سندھ میں مسلم آبادی کا ثبوت ملتا ہے۔بنو امیہ کے ہی دور اقتدار میں پانچ سو عربوں نے محمد علافی کی ماتحتی میں بغاوت کی تھی اور عبدالرحمن بن اشعث کے مقابلہ میں شکست کھانے کے بعد روپوشی اختیار کی اور پھر پوشیدہ طور پر عبدالرحمن کو مارڈالا۔اور اپنے قبیلہ کے پانچ سو آدمیوں کو لیکر عمان کی راہ سے سندھ پہنچے،وہ راجہ داہر کے زیر حکومت امن کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔راجہ داہر کے خلاف راجہ رنمل بڑی فوج لیکر حملہ آور ہوا،راجہ داہر نے گھبرا کر وزیر سے مشورہ کیا،وزیر نے کہا:سب سے بہتر بات تو یہ ہے کہ لڑ کر غنیم کو شکست دینی چاہئے،اور نہ ہو سکے تو صلح اچھی ہے اور مال سے کام چل سکے تو بھی ٹھیک ہے کہ بادشاہ اسی دن کیلئے خزانہ بھر ارکھتے ہیں۔اس کے علاوہ آج کل کچھ عرب آئے ہوے ہیں ان سے بھی مشورہ لینا اچھا ہے کیونکہ یہ لوگ اچھے جنگجو اور سیاست داں ہوتے ہیں۔راجہ داہر ان کے پاس گیا اور مشورہ کیا اس نے کہا کہ اول تو تم یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ایک خندق کھود کر ٹھہر و اور مجھے کچھ فوج دو تاکہ ان کا حال معلوم کر کے کوئی تدبیر کروں،راجہ داہر نے اس پر عمل کیا،علافی فوج لے کر دشمنوں کے حالات معلوم کرنے گیا اس کو یہ معلوم ہوا کہ رات کے وقت یہ کوئی احتیاط نہیں کرتے اور غافل رہتے ہیں پس محمد علافی نے اپنے ماتحت پانچ سو سواروں کو لیکر رات کے وقت شب خون مارا اور اس شدت سے حملہ کیا کہ رنمل کی فوج بے تاب ہو کر بھاگ نکلی،ہزاروں مارے گئے اور ہزاروں گرفتار ہوئے،پچاس ہاتھی بھی عربوں کے ہاتھ لگے۔

راجہ داہر کو ان سے غیر متوقع مدد ملی تو بہت خوش ہوا اور ان عربوں کی بڑی عزت افزائی کی۔محمد علافی کی بغاوت کا واقعہ سنہ 75 ہجری کا ہے۔پانچ سو افراد سے ایک چھوٹی بستی بسائی جاسکتی ہے اور یہ لوگ سندھ میں رہتے تھے تو کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی اولین آبادیاں جو قائم ہوئیں اس میں سے ایک سندھ بھی ہے۔پھر اس کے بعد محمد بن قاسم کے حملہ کے بعد جب سندھ مکمل طور پر خلافت اموی کے زیر نگیں آگیا تھا تو محمد بن قاسم نے ہر اہم قلعہ میں مسلم فوجیوں اور عہدہ داروں کو حفاظتی نکتہ نظر سے رکھ چھوڑا تھا ایسے میں اس کو بھی اولین مسلم آبادی شمار کرنا چاہیے۔

2.4.1 مکران

مکران کافی عرصہ تک سندھ کا مقبوضہ رہا ہے اس لئے اس کو بھی سندھ میں شامل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔مکران کے

تعلق سے علامہ حموی کہتے ہیں کہ یہ لفظ عجمی ہے۔ عربی کے اعتبار سے یہ ماکر-کی جمع ہو سکتی ہے۔ جیسے کہ فارس کی جمع فرسان، جب کہ ایک دوسرے لغوی حمزہ کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں ماہ کرمان تھا بدلتے بدلتے مکران ہو گیا۔ مکران کے اولین فاتح کے سلسلے میں اختلاف ہے کچھ نے زیاد بن ابوسفیان کو مکران کا فاتح بتایا ہے اور کچھ نے حکیم ابن جبلہ عبدی کو، مکران میں مختلف ادوار میں بغاوتیں ہوتی رہیں اوران کو فرو کیا جاتا رہا لیکن اسی کے ساتھ اس میں ایک معتد بہ مسلم آبادی ہمیشہ بر قرار رہی۔

2.4.2 ملتان

محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا حاکم امیر داؤد نصر بن ولید عمانی کو بنایا اور پھر بعد میں جب محمد بن قاسم کو اچانک معزول کر دیا گیا اور سندھ انتظامی اعتبار سے طوائف الملوکی کا شکار ہوا تو امیر داؤد نصر بن ولید نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اوراس کے افراد خاندان یہاں ایک طویل یعنی تیسری صدی ہجری تک حکومت کرتے رہے، اور پھر بعد میں اسماعیلی شیعہ یہاں قابض ہوئے جن کا اقتدار سلطان محمود غزنوی نے ختم کیا۔ اتنے طویل عرصہ تک حکومت کا قیام یہ بتاتا ہے کہ یہاں پر ایک اچھی خاصی مسلم آبادی ہو گی کیونکہ اس کے بغیر مسلم حکومت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

2.4.3 منصورہ

منصورہ کے تعلق سے علامہ حموی کہتے ہیں کہ منصورہ ہند کے ایک علاقہ کی راجدھانی ہے۔ یہ ایک بڑا اور انتہائی سر سبز وشاداب شہر ہے۔ یہاں کی مسجد کے ستون ساگوان کے ہیں۔ متصل دریائے سندھ ہے۔ حمزہ کہتے ہیں کہ قدیم برہمن آباد ہی منصورہ ہے لیکن یہ غلط ہے۔ منصورہ نام کے شہر کی بنیاد محمد بن قاسم کے بیٹے عمر نے اس وقت رکھی تھی جب وہ سندھ کے باغیوں کی سرکوبی کر کے آ رہا تھا، اسی خوشی میں اس نے سندھ کے دوآبہ کے مقام پر یہ اس شہر کی بنیاد رکھی، یہ شہر برابر ترقی پذیر رہا، اس کو اصل شہرت تب ملی جب منصورہ کو ہباری خاندان نے اپنا پایہ تخت بنایا اور طویل عرصے تک یہاں سے سندھ پر حکومت کی، منصورہ پر بھی اسماعیلی قابض ہو گئے تھے لیکن ان کے اقتدار کی مدت زیادہ نہیں رہی، ملتان کی طرح منصورہ بھی سلطان محمود غزنوی نے اسماعیلیوں سے چھین لیا۔ منصورہ مسلم اکثریتی آبادی پر مشتمل شہر تھا بالخصوص یہاں پر عربوں کی بڑی تعداد آباد تھی۔ عربوں کے بڑے گروہ دو تھے، ایک حجازی (نزاری) اور دوسرا قحطانی (یمنی) ان دونوں گروہوں میں ہمیشہ چپقلش ہوتی رہتی تھی، حجازی خلافت عباسیہ میں اتنے طاقتور ہو گئے کہ سندھ کے والی تک ان سے دبنے لگے اور وہ سندھ کے والی کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے لگے، اس کے ساتھ روزانہ یمنیوں اور حجازیوں میں جھگڑے ہونے لگے جس کی وجہ سے پورے سندھ میں بدامنی پھیل گئی تھی۔ بالآخر ہارون رشید نے اس فتنہ کے سدباب کیلئے داؤد مہلبی کو سندھ کا والی بنا کر بھیجا اوراس نے حالات کا جائزہ لے کر محسوس کیا کہ بدامنی اور فتنہ وفساد کی جڑ حجازی ہیں لہذا وہ فتنہ فساد برپا کرنے والوں کے ساتھ انتہائی سختی سے پیش آیا اوران کی قوت وشوکت ختم کر دی۔ اس نے جب دیکھا کہ سخت کارروائی کے بعد بھی حجازی اپنی شرارت سے باز نہیں آ رہے ہیں تو اس نے منصورہ میں حجازیوں کے محلات اور مکانات کو منہدم کرا دیا، حجازیوں میں سے کچھ قتل ہوئے، کچھ بھاگ گئے اور کچھ کو جلاوطن اور ملک بدر کر دیا گیا۔ اس طرح منصورہ میں آباد حجازی عربوں کی بڑی تعداد ختم ہو گئی۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

2.4.4 محفوظہ

خلافت اموی میں تمیم کے سندھ کے والی رہتے ہوئے انتہائی بدامنی ہوگئی تھی ایسے میں خالد قسری جو مشرقی ممالک کا گورنر جنرل تھااس نے حکم بن عوانہ کلبی کو سندھ کا والی بنا کر بھیجا، اس نے دیکھا کہ آس پاس کی تمام ریاستیں غیر مسلم ہیں اور مسلمانوں کیخلاف حملہ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کیلئے جائے پناہ کہیں نہیں ہے ایسے میں اس نے مناسب محسوس کیا کہ ایک ایسا شہر بسایا جائے جہاں حملوں کی صورت میں مسلمان پناہ لے سکیں۔ اس شہر کیلئے اس نے مشیروں سے نام تجویز کرنے کیلئے کہا، کسی نے حمص اور کسی نے کچھ کہا، ایک نے تدمر نام رکھنے کی جانب اشارہ کیا تو اس کی زبان سے نکلا، دمرک اللہ (اللہ تمہارے برباد کرے) اور واقعتاً ایسا ہی ہوا کہ محفوظہ کچھ عرصہ بعد ہی غیر محفوظ یعنی ختم ہوگیا۔ لیکن ایک عرصہ تک وہاں مسلم آبادی رہی تھی۔

2.5 ابتدائی مسلم آبادیاں۔ گجرات

سنہ 107/ ہجری میں عراق کے حاکم خالد نے عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کی حکومت سے الگ کر کے جنید بن عبد الرحمن کو سندھ کا حاکم بنایا، جنید جے پور (سندھ) سے براہ ریگستان خر دمد (ماڑواڑ) میں پہنچا، معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں یہ راستہ بڑا بارونق تھا۔ یہاں سے چل کر عربی فوج مانڈل پہنچی، یہ مقام آج بھی ویر گام کے پاس چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ممکن ہے اس عہد میں شہر کی حیثیت رکھتا ہو۔

نقشہ دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہاں پہلی جنگ ہوئی کیونکہ مرمد پہنچنے کے بعد یقیناً حریف نے مدافعت کی پہلی کوشش کی ہوگی اور پھر مانڈل میں دونوں عربی فوجوں کا تصادم ہوا ہوگا اور فتح پانے پر ہی جنید آگے بڑھا ہوگا۔ یہاں سے چل کر جنید دھنج پہنچا جو نہر والا پٹن اور پنچاسر کے پاس ہے۔

پنچاسر چوڑا (چاوڑا) راجہ کا پایہ تخت تھا جو گجرات کاٹھیاواڑ اور کچھ کے رن کے درمیان رادھن پور کے پاس تھا۔ سولنکی (گوجر) کے عہد میں وہی پایہ تخت رہا۔ عربوں سے شکست کھانے کے بعد یہ شہر بے رونق ہوگیا۔ لیکن اصل ویرانی کا سبب یہ ہوا کہ عربوں نے جب سولنکیوں کی طاقت توڑدی تو چاوڑا خاندان کا شہزادہ پھر اٹھ کھڑا ہوا، اور آخر بن راج نے اپنے باپ کی کھوئی ہوئی سلطنت پھر حاصل کرلی اور سیاسی مصلحت کی بنیاد پر انہل واڑہ (نہر والا پٹن) آباد کر کے پایہ تخت بنایا جس کے سبب پنچاسر ویران ہوگیا۔

پنچاسر اس عہد میں شمالی گجرات کا پایہ تخت تھا اور چاوڑا خاندان سے چھین کر سولنکی کے قبضہ میں آچکا تھا۔ سولنکی خاندان تمام کاٹھیاواڑ، کچھ، شمالی اور جنوبی گجرات اور دکن کے بڑے علاقے پر قابض تھا۔ اس خاندان کے حکمراں بڑے مغرور تھے۔ فقط اتنی سی بات پر کہ ایک برہمن شاعر نے اس کے دربار میں چاوڑا راجہ کی بڑی تعریف کی اور اس کے سوال کرنے پر وزیر نے کہا کہ وہ اپنے ماتحت راجاؤں میں سے نہیں ہے اس ملک پر حملہ آور ہو کر اس ملک کو چھین لیا۔ اس کا پایہ تخت کلیان تھا جو آج بیدر ضلع میں ایک گاؤں کی شکل میں ہے۔

جنید کے حملہ کرنے کی وجہ کیا تھی اس تعلق سے مورخوں نے وضاحت نہیں کی ہے لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی بات پر سولنکی راجہ نے سخت اور مغرورانہ رویہ اختیار کیا ہوگا اور بات یہاں تک پہنچی ہوگی کہ جنید کو یہاں آنا پڑا۔ دھنج کے مقام پر دونوں فوجیں جنگ

آزماہوئیں اور گجراتی فوج شکست کھا کر بھاگی اور جنید نے آگے بڑھ کر پایہ تخت گجرات پنچاسر پر قبضہ کر لیا اور ایک ہی جنگ میں سولنکی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا۔ سولنکی فوج کیساتھ یہاں سے بھاگ کر برائے امداد جنوبی گجرات پہنچا اور بھروچ میں جنگی تیاری کرنے لگا پھر جنید کو معلوم ہوا کہ اجین (مالوہ) میں جنگی تیاریاں کی جارہی ہیں تو اس نے اپنے ایک افسر حبیب نامی کو اس طرف بھیج دیا جس نے اجین اور مالوہ کو گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے روند ڈالا۔ فاتح اپنے ملک سے بہت دور نکل آئے تھے۔ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھیلمان میں ایک بڑے معرکہ کی حریفوں نے تیاری شروع کر دی۔ جنید کو بھی اس کا احساس تھا کہ بھیلمان میں اگر گوجروں کی زیادہ طاقت جمع ہو گئی تو واپسی میں دشواری ہو گی اس لئے بھروچ سے خود بھی بھیلمان کی طرف واپس ہو گیا اور دوسری جانب سے حبیب نے بھی مالوہ سے ماڑواڑ اور شہر پناہ پر حملہ آور ہو کر آگ لگا دی اور فتح یاب ہو کر جنید سے جاملا۔

تمام فوجیں مجتمع ہو کر بھیلمان پہنچیں اور پر زور حملہ سے غنیم کو شکست دینے میں جنید کامیاب رہا، اس کے بعد گوجروں نے جہاں کہیں مقابلہ کیا شکست کھائی جنید ان فتوحات کے بعد سندھ واپس ہو گیا۔ ان فتوحات کی تائید ان کتبوں سے بھی ہوتی ہے جو اثری تحقیقات کے تحت دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ چالوکیہ راجہ کے عہد کا نوساری سے دستیاب ہوا ہے۔ چنانچہ پول کیشی جناشر کے عہد کا ایک کتبہ ہے جس میں لکھا ہے: ”عرب لشکر نے سندھ، کچھ، سوراسٹھ، چاوڑا، موریا (ماڑواڑ یا مالوہ) اور بھیلمان کی سلطنت کو حیران کیا“۔

یہ کتبہ پول کیشی کے عہد یعنی 738 عیسوی کا ہے گویا اصل واقعہ سے دس بارہ برس بعد کا ہے۔ ان فتوحات کی نتیجہ میں جنید کو اس قدر مال و دولت ہاتھ آیا کہ ملنے والوں اور دوستوں کو دے دلا کر بھی چار کروڑ درہم اس کے پاس بچا رہا اور اسی قدر اس نے پایہ تخت کے خزانہ میں داخل کیا۔ جنید نے غنیمت میں ملنے والے مال کو بڑی فیاضی سے خرچ کیا چنانچہ عرب شاعروں نے جنید کی بڑی تعریف کی ہے۔

جنید کے حملہ کے تقریباً 30 یا 32 برسوں تک گجرات کی طرف عربوں نے رخ نہیں کیا۔ دوسری صدی ہجری میں اموی حکومت کا ورق الٹا اور عباسی خلافت برسر اقتدار آئی، عباسیوں نے دمشق کے بجائے بغداد کو دارالخلافہ بنایا۔ اس انقلاب نے ہندوستان کو عرب کے بہت قریب کر دیا۔ ابو جعفر منصور نے نے ہشام بن عمرو التغلبی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، ہشام نے آتے ہی سندھ کے اندرونی حالات کو درست کیا اور اس کے بعد گجرات کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ گجرات کے ایک مرکزی مقام باربد (بھار بھوٹ، ضلع بھروچ) کی طرف عمرو بن جمل کی سرکردگی میں ایک بحری فوج روانہ کی۔ غالباً اس وقت اس کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ اس لئے جلد واپس چلا گیا اور بہت ممکن ہے کہ صرف حالات کا جائزہ لینے آیا ہو۔ کچھ عرصہ بعد ہشام نے فوجی تیاری کر کے جہازوں کا ایک بڑا بیڑا لے کر گندھار (ضلع بھروچ) پر حملہ کیا اور فتحیاب ہونے کے بعد کچھ دنوں یہاں قیام کیا اور اپنی فتح کی یاد میں ایک مسجد تعمیر کی۔ یہ سندھ کے علاوہ ہندوستان میں پہلی مسجد تھی۔

2.5.1 سندان

تیسری صدی ہجری میں خلیفہ مامون کے دور میں بنو سامہ کے ایک آزاد کردہ غلام فضل بن ہامان نے سندھ سے ہٹ کر گجرات کے ایک مشہور اور مرکزی شہر سندان پر قبضہ کیا، اس نے یہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کے بعد دوراندیشی اور سیاسی بصیرت سے کام

لے کر خلافت عباسیہ سے حلیفانہ تعلقات قائم کر لئے اور مامون کی خدمت میں ایک ہاتھی روانہ کیا اور مامون کو اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔ اس نے سندان میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی، اگرچہ گجرات میں اس سے پہلے ایک مسجد تعمیر ہو چکی تھی لیکن یہ مسجد اپنی وسعت اور دیدہ زیبی میں اپنی مثال آپ تھی۔ فضل کے انتقال کے بعد تخت کا وارث اس کا بیٹا محمد بن فضل ہوا، اس نے ستر کشتیاں مہیا کر کے سمندری قزاقی کا پیشہ اختیار کرنے والی مید قوم پر حملہ کر دیا اور کالڑی نام کے شہر کو فتح کر کے آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ خبر آئی کہ اس کے بھائی ہامان نے سندان پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ سن کر وہ واپس ہوا جب سندان کے نزدیک پہنچا تو خبر سچ ثابت ہوئی، بھائی کی بے وفائی سے وہ بہت غمزدہ ہوا، اس نے خلافت عباسیہ میں مدد کی اپیل کی، اس وقت معتصم بر سر اقتدار تھا اور اپنی عرضی کے ساتھ ساگوان کا ایک اتنا بڑا ٹکڑا بطور تحفہ بھیجا جیسا عراق والوں نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ معتصم کی جانب سے مدد آنے والے سے پہلے ہامان نے سندھیوں کو اپنی طرف کر لیا اور محمد کے فوجی سرداروں کو بھی توڑ لیا اور جب محمد بن فضل کے پاس بہت کم فوج رہ گئی تو اس نے سندان کے قلعہ سے باہر نکل کر حملہ کر دیا۔ محمد کو شکست ہوئی اور اسے گرفتار کر کے سولی دے دی گئی۔ ہامان سندھ اور خلافت عباسیہ دونوں سے بے نیاز تھا لیکن اس کی یہ بے نیازی زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکی، کچھ دنوں بعد ہندو راجاؤں نے اس پر حملہ کر دیا اور بے تعلقی کی وجہ سے سندھ اور خلافت عباسیہ کہیں سے بھی اس کی مدد نہیں ہوئی۔ شہر پر ہندو راجاؤں کا قبضہ ہو گیا لیکن انہوں نے مذہبی رواداری سے کام لیتے ہوئے مسجدوں کو محفوظ رکھا جس میں مسلمان نماز پڑھتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں خلیفہ بغداد کیلئے دعا کرتے تھے۔

قدیم مسلمان آبادیوں کے تعلق سے ہندوستان کے کسی بھی گوشہ اور خطہ سے کتبات جیسے ثبوت نہیں ملے صرف گجرات ہی ایک ایسا صوبہ ہے جہاں سے حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ نے بارہویں صدی کے مجموعی طور پر 9 کتبے تلاش کئے ہیں۔ یہ اس دور کے ہیں جب گجرات میں چالکیہ اور واگھیلا خاندان بر سر اقتدار تھا۔ یہ تمام کتبات کھمبایت، ویراول، جوناگڑھ، انہل واڑ پٹن اور سومناتھ سے ملے ہیں جو 1218ء سے لے کر 1291 عیسوی کے ہیں۔ شعبہ تحقیق آثار قدیمہ کچھ بھوج کے تعاون سے حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ کو جولائی 1961ء میں صرف بھدر یسور سے ہی 8 کتبات ملے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں مسلم آبادیاں کچھ میں اور بطور خاص بھدر یسور میں زیادہ تعداد میں بڑھی ہو گی۔

2.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- عرب جہاز راں بہت قدیم زمانے سے ہندوستان کا نام لیتے آئے تھے اور اس کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ مسالوں والے ملک کا آخری شہر ہے۔ یہاں سے جہاز عدن کو جاتا تھا اور یہاں مسلمانوں کا ایک محلہ آباد ہو گیا تھا اور یہاں ان کی ایک جامع مسجد بھی تھی۔
- سب سے پہلے بستی کہاں قائم ہوئی، اس بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے لیکن عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ دیار ہند میں اولین مسلم بستی سراندیپ میں قائم ہوئی۔
- متعدد روایتیں اس امر کی ملتی ہیں کہ اسلام اور عربوں کا ایک بڑا مرکز وہ تھا جسے ملیبار کہتے ہیں۔ ملی کے معنی پہاڑ اور بار کا معنی ملک کا ہے۔

- محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ مشہور ہے لیکن اس سے بھی قبل سندھ میں مسلم آبادی کا ثبوت ملتا ہے۔ خلافت بنوامیہ دوراقتدار میں پانچ سو عربوں نے محمد علافی کی ماتحتی میں بغاوت کی تھی اور عبدالرحمن بن اشعث کے مقابلہ میں شکست کھانے کے بعد اپنے قبیلہ کے پانچ سو آدمیوں کو لیکر عمان کی راہ سے سندھ پہنچا، وہ راجہ داہر کے زیر حکومت امن کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔
- تیسری صدی ہجری میں خلیفہ مامون کے دور میں بنوسامہ کے ایک آزاد کردہ غلام فضل بن ہامان نے سندھ سے ہٹ کر گجرات کے ایک مشہور اور مرکزی شہر سندان پر قبضہ کیا، اس نے یہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کے بعد دوراندیشی اور سیاسی بصیرت سے کام لے کر خلافت عباسیہ سے حلیفانہ تعلقات قائم کرلئے اور مامون کی خدمت میں ایک ہاتھی روانہ کیا اور مامون کو اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔
- سنہ 107ھ ہجری میں عراق کے حاکم خالد نے عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کی حکومت سے الگ کرکے جنید بن عبدالرحمن کو سندھ کا حاکم بنایا، جنید جے پور (سندھ) سے براہ ریگستان خردمد (ماڑواڑ) میں پہنچا، معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں یہ راستہ بڑا بارونق تھا۔ یہاں سے چل کر عربی فوج مانڈل پہنچی، یہ مقام آج بھی ویر گام کے پاس چھوٹا سا گاؤں ہے۔
- منصورہ ہند کے ایک علاقہ کی راجدھانی ہے۔ یہ ایک بڑا اور انتہائی سرسبز وشاداب شہر ہے۔ یہاں کی مسجد کے ستون ساگوان کے ہیں۔ متصل دریائے سندھ ہے۔ حمزہ کہتے ہیں کہ قدیم برہمن آباد ہی منصورہ ہے لیکن یہ غلط ہے۔ منصورہ نام کے شہر کی بنیاد محمد بن قاسم کے بیٹے عمر نے اس وقت رکھی تھی جب وہ سندھ کے باغیوں کی سرکوبی کرکے آرہا تھا، اسی خوشی میں اس نے سندھ کے دوآبہ کے مقام پر یہ اس شہر کی بنیاد رکھی، یہ شہر برابر ترقی پذیر رہا۔
- مکران کے تعلق سے علامہ حموی کہتے ہیں کہ یہ لفظ عجمی ہے۔ عربی کے اعتبار سے یہ ماکر۔کی جمع ہوسکتی ہے۔ جیسے کہ فارس کی جمع فرسان، جب کہ ایک دوسرے لغوی حمزہ کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں ماہ کرمان تھا بدلتے بدلتے مکران ہوگیا۔

2.7 نمونہ امتحانی سوالات

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. ہندوستان میں مسلم سلطنت کی بنیاد کس نے رکھی؟

(a) شہاب الدین غوری (b) محمد بن تغلق (c) رضیہ سلطانہ (d) سکندر لودھی

2. مسلمانوں کی اولین آبادیاں کہاں قائم ہوئی۔

(a) سندھ (b) دہلی (c) لکھنو (d) سب غلط

3. دیار ہند میں مسلم اولین بستی کہاں قائم ہوئی؟

(a) سراندیپ (b) اترپردیش (c) بہار (d) سب صحیح

4. منصورہ نام کے شہر کی بنیاد کس نے رکھی۔

(a) عمر بن محمد بن قاسم (b) داؤد مہلبی (c) محمد علافی (d) حکم بن عوانہ کلبی

5. محفوظہ شہر کی بنیاد کس نے رکھی۔

(a) حکم بن عوانہ کلبی (b) عمر بن قاسم (c) داؤد مہلبی (d) محمد علافی

6. محمد بن فضل نے سندان کی مدد کے لیے جب عباسی خلافت سے مدد مانگی تو اس وقت کون خلیفہ تھا۔

(a) معتصم باللہ (b) مستعصم باللہ (c) ابو جعفر منصور (d) متوکل

7. ملتان کو کس نے فتح کیا۔

(a) محمد بن قاسم (b) محمد علافی (c) داؤد مہلبی (d) سب غلط

8. مسالوں والے ملک کا آخری شہر کسے کہا جاتا تھا؟

(a) کولم (b) لکھنؤ (c) بنارس (d) تمام صحیح

9. بنو سامہ کے آزاد کردہ غلام جس نے سندان پر قبضہ کیا؟

(a) فضل بن ہامان (b) محمد علافی (c) محمد بن قاسم (d) داؤد مہلبی

10. راجہ داہر کے خلاف جب راجہ رنمل نے چڑھائی کی تو کس عرب نے مدد کی۔

(a) فضل بن ہامان (b) محمد علافی (c) محمد بن قاسم (d) داؤد مہلبی

2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ابتدائی مسلم آبادی سندھ و ہند میں کہاں کہاں تھی؟
2. سندھ میں ابتدائی مسلم آبادی کی وجوہات کیا تھیں؟
3. گجرات کی ابتدائی اسلامی فتوحات پر روشنی ڈالیے۔
4. سراندیپ میں اشاعت اسلام کے اسباب بیان کیجیے۔
5. ہندوستان میں نئے شہر کون سے اور کب آباد کیے گئے۔

2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. فتح سندھ سے قبل ابتدائی مسلم آبادی کہاں کہاں قائم ہوئی، تفصیل سے لکھیے۔
2. فتح سندھ کے بعد ہندوستان میں مسلم آبادیاں کہاں اور کیسے قائم ہوئیں۔
3. گجرات کی فتح اور سندان کی مسلم ریاست کا حال بیان کیجیے۔

2.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. عرب وہند تعلقات کے تعلقات : علامہ سید سلیمان ندوی
2. عرب ممالک اور صوبہ گجرات کے تعلقات : مولانا اقبال محمد ٹنکاروی
3. عرب وہند عہد رسالت میں : قاضی اطہر مبارک پوری
4. عربوں کی جہازرانی : علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 3: شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد

اکائی کے اجزا:

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد

3.2.1 موجودہ ہندوستان کی چار خطوں میں تقسیم

3.3 پنجاب

3.4 بنگال

3.5 بہار

3.6 دہلی اوراترپردیش

3.6.1 اشاعت اسلام میں صوفیائے کرام کا حصہ

3.7 اکتسابی نتائج

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

3.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

اسلام ایک ابر کرم تھا جو ساری دنیا کو سیراب کرنے اور ہر خطے کو چمن زار بنانے آیا تھا، اس کا فیض جہاں چین وروما پر برسا، ایران وتوران کو اس نے اپنا حلقہ بگوش بنا اور ایشیا سے گزر کر افریقہ ویوروپ تک اپنا دست کرم دراز کیا وہیں اس کے کرم کی برسات گنگ وجمن کی

زرخیز وادی پر بھی ہوئی اور یہاں بھی اسلام نے اپنے شاندار نقوش ثبت کئے جو یادگار زمانہ ہیں اور یادگار رہیں گے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ جان سکیں کہ شمالی ہند میں مسلمان کب داخل ہوئے اور مسلمانوں کا اثر ونفوذ یہاں کیسے شروع ہوا۔ اسی کے ساتھ اس باب میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ شمالی ہند میں اسلام کی نشر واشاعت کا کام فاتحین کی تلواروں سے نہیں بلکہ صوفیائے کرام کے نرم اور میٹھے بولوں سے ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ مسلم فاتحین سے نفرت کرتے ہیں لیکن صوفیائے کرام کے خلاف کوئی ہندو خواہ وہ کتنا ہی متعصب کیوں نہ ہوں، زبان نہیں کھولتا لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صوفیائے کرام کی تبلیغ و توسیع اسلام کی کوششوں کو مسلم فاتحین سے ایک گونہ مدد ضرور ملی۔

3.2 شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد پہلی صدی ہجری میں ہی ہو گئی تھی حضرت عمرؓ کے دور میں مکران جو سندھ وایران کا علاقہ ہے فتح ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں ہی اسلامی لشکر کا سیل رواں ممبئی کے تھانے تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد جب راجہ داہر نے فتنہ انگیزی کی تو اس کی سرکوبی کیلئے اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد حکومت میں حجاج بن یوسف ثقفی نے اپنے داماد محمد بن قاسم کو سندھ کے راجہ کی گوشمالی کیلئے بھیجا۔ محمد بن قاسم نے راجہ داہر اور اس کی فوج کو ہر معرکے میں شکست دی اور بالآخر وہ مارا گیا اور پھر محمد بن قاسم نے آگے بڑھ کر پنجاب کا علاقہ ملتان فتح کرلیا اور پھر دمشق میں اقتدار کی تبدیلی یعنی سلیمان بن عبدالملک کی خلافت کے ساتھ ہی ہند میں اسلامی فتوحات کا سیل رواں رک گیا اور تقریباً دوڈھائی سو سالوں تک رکا رہا۔ سندھ اور ملتان میں مختلف مسلم خاندان برسر اقتدار آئے لیکن وہ آگے نہیں بڑھ سکے بلکہ جتنا محمد بن قاسم فتح کرکے گیا تھا اسی کے دائرے میں محصور رہے اور پھر اسلامی فتوحات کا دور سلطان محمود غزنوی کے والد امیر سبکتگین کے دور سے شروع ہوتا ہے جنہوں نے پشاور اور کابل کو فتح کرکے شمالی ہند میں فتوحات کی بنیاد رکھی۔ پھر اس کے لائق فرزند سلطان محمود غزنوی نے تو ہندوستان کو اپنے پے درپے حملوں سے دہلا دیا لیکن سلطان محمود غزنوی کا مقصد محض حملہ اور مال غنیمت ہوا کرتا تھا اس نے کبھی پائیدار سلطنت ہندوستان میں قائم کرنے کے بارے میں نہیں سوچا اتنا ضرور ہوا کہ اس نے اپنے حملوں سے ہندوستانی راجاؤں کی آپسی چپقلش اور کمزوری کو ظاہر کر دیا اور سلطان شہاب الدین غوری کیلئے راستہ ہموار کر دیا۔

سلطان شہاب الدین غوری نے دہلی میں اپنے گورنر قطب الدین ایبک کو قائم کرکے شمالی ہند میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی اور پھر یکے بعد دیگر مختلف خاندان دہلی کے تخت اقتدار پر جلوہ افروز ہوتے رہے اور اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرتے رہے۔ پہلے خاندان غلاماں آیا، پھر خلجی خاندان آیا، پھر تغلق خاندان آیا، پھر لودھی خاندان آیا پھر مغلیہ خاندان آیا اور مغلیہ خاندان کے دور حکومت میں ہی ایک قلیل عرصے کیلئے شیر شاہ شوری اور اس کی اولاد برسر اقتدار ہوئی، شیر شاہ شوری کا دور حکومت اگرچہ مختصر تھا لیکن اس کے حکومت کے بعض کارنامے پوری مغلیہ سلطنت پر بھاری پڑتے ہیں۔

3.2.1 موجودہ ہندوستان کی چار خطوں میں تقسیم

موجودہ ہندوستان کی اگر خطوں کے اعتبار سے تقسیم کی جائے تو وہ چار خطوں میں بٹا ہوا ہے۔ جنوبی ہندوستان، شمالی ہندوستان مغربی ہندوستان، مشرقی ہندوستان ،ہر خطہ کی اپنی الگ اہمیت ہے اس کے باوجود شمالی ہندوستان کو ایک علاحدہ امتیاز حاصل ہے۔ کیونکہ مسلم دور حکومت سے مراد شمالی ہندوستان ہی عموماہوتاہے اور دہلی کے شمالی ہندوستان میں ہونے کی وجہ سے بیشتر عسکری تگ وتاز یہیں ہوئی، مسلم علم وفن، تہذیب وثقافت کازیادہ تر ظہور یہیں ہوا۔

شمالی ہندوستان سے کیامراد ہے

شمالی ہندوستان سے مراد ہندوستان کا وہ خطہ ہے جو دہلی سے قریب ہے یعنی پنجاب ،اترپردیش، بہار، بنگال اورآسام،اس میں سے بھی زیادہ تر مسلم فاتحین کی تگ وتاز پنجاب اوراترپردیش اور بنگال میں رہی ہے۔ بہار کو بھی اگرچہ مسلم فاتحین نے ابتدائی دور میں ہی فتح کرلیاتھالیکن بنگالہ پر جس قدر مسلم فاتحین نے یورش کی، اس قدر بہار پر یورش نہیں ہوئی اورآسام تومسلم فاتحین کے دست رس سے اور بھی زیادہ دور تھالیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ آسام پر مسلم فاتحین نے شہاب الدین غوری کے دور حکومت میں ہی یورش کی تھی اور کامروپ کو فتح کرکے وہ تبت پر چڑھائی کاارادہ رکھتے تھے۔

3.3 پنجاب

اس نام کااطلاق برصغیر پاک وہند کے اس علاقے پر ہوتاہے جو دریائے ستلج، بیاس،راوی، چناب، جہلم اور سندھ کے درمیان واقع ہے۔ اس کی حدود مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہیں۔ آج کل اس کا مغربی حصہ پاکستان کے موجودہ صوبہ پنجاب پر مشتمل ہے۔اور مشرقی حصہ بھارت کے تین صوبوں ہماچل پردیش،صوبہ پنجاب اور صوبہ ہریانہ میں منقسم ہوچکاہے۔ مختلف زمانوں میں اس کی حدود مختلف رہی ہیں، پنجاب کی وجہ تسمیہ کیاہے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں، مفتی سرور نے مخزن پنجاب میں لکھاہے کہ پہلے اس کا نام پنج دوآب تھا،بعد میں دوکالفظ زبان سے حذف ہوگیااور پنجاب کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کی حدود میں پنجاب دریا بہتے ہیں۔

پنجاب میں مسلم فاتحین کی آمد

پنجاب میں مسلمانوں کی آمد آٹھویں صدی کے اوائل میں ہی محمد بن قاسم کی فوج کشی کے وقت سے ہی ہوگئی تھی اورملتان کو محمد بن قاسم نے فتح کرلیاتھالیکن عربوں کی فتوحات مشرق میں ملتان اور شمال میں پنج ندی سے آگے نہیں بڑھیں،پنجاب میں مسلمانوں کا داخلہ صحیح معنوں میں غزنویوں کے زمانے میں ہوا،ان دنوں ملتان میں قریشی امیروں کی ریاست قائم تھی جو مذہباباطنی تھے۔

1001ءمیں محمود غزنوی نے پشاور میں جے پال کو شکست دے کر دریائے جہلم کے کنارے نندنہ کے مضبوط پہاڑی قلعے پر قبضہ کرلیااوریوں پنجاب کی پہلی گھاٹی اس معرکے میں سرہوگئی۔اس کے بعد محمود غزنوی کی فتوحات کبھی جنوب اور کبھی مشرق کی طرف بڑھتی گئیں۔ان میں سومنات، نگرکوٹ، اور قنوج کی کشور کشائیوں کو اہمیت حاصل ہے۔ سنہ 413ھ مطابق 1022ءمیں سلطان محمود نے پنجاب کا

الحاق کرلیا اور لوہور یالہاوور میں ایاز کو اپنا نمائندہ (صوبہ دار) مقرر کیا۔اس کے بعد غزنوی حکومت کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور جالندھر، جہلم، ملتان اور سندھ وغیرہ غزنی سلطنت کے مختلف اضلاع قرار پائے، پھر کشور کشائی کا یہ سلسلہ تھانیسر، میرٹھ اور بنارس تک جا پہنچا۔

اس دور میں پنجاب میں وارد ہونے والوں میں البیرونی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ علاوہ ازیں فرضی اور عنصری نے اپنے قصائد میں محمود غزنوی کی فتوحات ہند پر روشنی ڈالی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مسعود سعد سلمان نے اس زمانے میں جو تین دیوان مرتب کئے ان میں ایک فارسی آمیز ہندی میں تھا جسے اردو کا نقش اول سمجھا جاسکتا ہے۔

582ھ مطابق 1186 میں شہاب الدین محمد غوری نے لاہور فتح کیا اور پنجاب کی حکومت غزنویوں کے ہاتھ سے نکل کر غوریوں کے قبضے میں آگئی۔ ایبک کی تخت نشینی کے بعد اسلامی سلطنت کا مرکز دہلی منتقل ہو گیا لیکن پنجاب اور سرحد کو اپنے حریفوں کی دست برد سے بچانے کیلئے سلطان کا قیام زیادہ تر لاہور میں ہی رہا اور یہیں اس نے 607ھ مطابق 1210 میں شہادت پائی۔

خاندان غلاماں اور خلجیوں کے عہد میں سیاسی حالات کے تحت پنجاب کو بڑی سیاسی اہمیت ملی، اس کی ایک وجہ شمال سے مغلوں کے پے درپے حملے بھی تھے، جن کا مقابلہ کرنے کیلئے ان سلاطین کو لاہور، دیپال پور اور ملتان وغیرہ میں فوجی استحکام کے خاصے اقدامات کرنے پڑے تھے۔ ان حملوں میں لاہور اور ملتان مغلوں کی خاص زد میں رہے اور لاہور کو کئی بار سخت بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے التمش نے اپنے فرزند رکن الدین فیروز شاہ کو اور ناصر الدین محمود نے شیر خان کو لاہور کا اور بلبن نے اپنے شہزادے سلطان محمد شہید کو اور جلال الدین خلجی نے اپنے ولی عہد ارکلی خان کو لاہور اور ملتان کا صوبے دار بنایا۔

سلطنت دہلی کے اس دور میں پنجاب سے متعلق کئی مقتدر اشخاص، مشائخ اور مشاہیر اہل علم کے نام ملتے ہیں، مثلاً ملک عین الدین علیشہ کوہ جودی، قاضی رکن الدین اور مولانا ضیا الدین، لاہور سے مولانا علا الدین، قصور سے مولانا سراج الدین اور مشائخین عظام میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اور شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اکبر کی تخت نشینی کے وقت پنجاب سیاسی اعتبار سے دو حصوں میں منقسم تھا، ایک حصہ براہ راست مغلوں کی عملداری میں تھا لیکن یہاں کی صورت حال اطمینان بخش نہ تھی۔ دوسرا حصہ زیادہ شمالی جانب تھا جو خود مختار کوہستانی راجاؤں اور سرداروں کی چھوٹی بڑی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ان میں کانگڑہ، جموں، کشمیر، مظفر آباد، راجوری، پونچھ، بھمبر اور کوٹلی وغیرہ قابل ذکر ہیں، اکبر کے زمانے میں یہ علاقہ پوری طرح مغلیہ حکومت کے زیر نگیں آگیا۔ اس عہد میں پنجاب کے مختلف حصے دہلی، لاہور ملتان اور کابل کے صوبوں میں شامل تھے۔ اس خاندان کے شہنشاہ اکثر لاہور میں طویل عرصہ تک قیام کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے عہد میں دہلی کی طرح لاہور بھی ایک علمی اور ثقافتی مرکز بنا رہا۔ دور مغلیہ کے دوسرے حصے میں بالخصوص یہاں علوم وفنون کو بڑی ترقی ہوئی۔

پنجاب میں اشاعت اسلام میں صوفیا کرام کا کردار

برصغیر پاک وہند میں اشاعتِ اسلام کا سہرا صوفیہ کرام کے سر ہے جن کی مساعیءِ جمیلہ سے دیارِ ہند میں ہر سو صدائے لا الہ الا اللہ

گونجنے لگی، اس خطہ ارض میں قدم رنجہ فرمانے والے صوفیہ عظام نے اپنے اعلیٰ کردار کے ذریعے یہاں کے باسیوں کے دل موہ لیے اور وہ جوق در جوق دولتِ اسلام سے بہرہ ور ہونے لگے۔ یہ انہی بزرگانِ دین کے قدوم میمنت لزوم کا اثر ہے کہ آج یہاں کروڑوں مسلمان موجود ہیں۔

سلطان محمود غزنوی نے یوں تو عسکری طور پر لاہور کو فتح کیا تھا لیکن لاہور کو اسلامی رنگ میں رنگنے کا کام صوفیا کرام نے انجام دیا سب سے قبل جن بزرگ نے لاہور میں اشاعت اسلام کا کام انجام دیا وہ شیخ اسماعیل بخاری ہیں۔ وہ اس زمانے میں جب کہ لاہور باقاعدہ طور پر محمود غزنوی کی سلطنت میں شامل نہیں تھا بلکہ وہاں کا راجہ سلطان محمود غزنوی کو خراج دیتا تھا۔ شیخ اسماعیل بخاری لاہور میں آئے۔ وہ علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ وہ یہاں آکر وعظ و تبلیغ کرنے لگے۔ ان کی مجلس میں ہزاروں افراد شریک ہوتے تھے اور ہر روز صدہا لوگ اسلام قبول کرتے تھے۔ تذکرہ علمائے ہند میں ان کی بابت لکھا ہے وہ گراں قدر محدث اور مفسر تھے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم حدیث اور تفسیر سے لاہور کو منور کیا، ہزاروں لوگ ان کے وعظ میں شریک ہوتے تھے اور ان کا وعظ سن کر اسلام قبول کرتے تھے۔ خزینۃ الاصفیا کے مولف لکھتے ہیں کہ جب شیخ اسماعیل لاہور تشریف لائے اور جمعہ میں وعظ کہا تو ایک ہزار افراد مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

دوسرے بزرگ جنہوں نے لاہور کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا وہ شیخ علی بن عثمان ہجویری معروف حضرت داتا گنج بخش لاہوری ہیں۔ مختلف اسلامی ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے علما و مشائخ سے کسب فیض کیا اور سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے اخیر عہد حکومت میں لاہور آئے اور یہاں آکر تصنیف و تالیف اور تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا، کئی لوگ آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے جس میں خاص طور پر قابل ذکر لاہور کا رائے راجو ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد آپ نے اس کا نام شیخ ہندی رکھا۔ آپ نے تصوف میں متعدد کتابیں لکھیں جس میں سے کشف المحجوب بطور خاص مشہور ہے۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی ہے جب ابن عربی کی فصوص اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف ابھی نہیں لکھی گئی تھی اس لئے اس کی خاص اہمیت ہے اس کے علاوہ اپنی دل آویز زبان کی وجہ سے فارسی ادب میں بھی اس کی خاص اہمیت ہے۔

ان کے علاوہ دیگر بزرگوں میں سید احمد المعروف سلطان سخی سرور یا لکھ داتا ہیں آپ ملتان میں پیدا ہوئے اور زبان زد خلق روایت کی بنیاد پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے کسب فیض کیا اور پھر موضع سودھرہ (پنجاب) میں اقامت اختیار کی اور خلقت آپ پر پروانے کی طرح ٹوٹ پڑی، غیر مسلم بطور خاص آپ سے عقیدت رکھتے ہیں بلکہ غیر مسلموں کی اس علاقے میں ایک نئی قوم بستی ہے جسے سلطانی کہتے ہیں اور وہ کئی باتوں میں مسلمانوں سے مشابہ ہیں اور ان کا سب سے بڑا تہوار سلطان سخی سرور کے مزار کی زیارت ہے۔

ان کے علاوہ دیگر مشائخ میں سید احمد توختہ ترمذی ہیں آپ ترمذ سے لاہور تشریف لائے اور ہزاروں مخلوق خدا کو فیض پہنچایا۔ ان کے علاوہ سید یعقوب صدر دیوان زنجانی ہیں، آپ ترکستان سے لاہور آئے۔

حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ اور اشاعت اسلام

شیخ فرید ین الدین گنج شکر کے آبا و اجداد چنگیزی حملے کے دوران کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور ملتان کے کھوتوال میں ان کے دادا قاضی مقرر ہوئے۔ یہیں شیخ فرید الدین جن کا اصل نام مسعود تھا، پیدا ہوئے، کھوتوال میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ملتان تشریف لے گئے اور حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں اٹھارہ برس کی عمر میں خواجہ قطب الدین سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ آپ دہلی کی طرف چلے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے ان کو نصیحت کی کہ وہ پہلے علوم ظاہری کی تکمیل کر لیں اور پھر ان کے پاس دہلی آئیں۔ پانچ سال تکمیل تعلیم کیلئے قندھار میں گزارے اور پھر دہلی آئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں شیخ قطب الدین نے آپ کو نعمت ہائے روحانی سے مالامال کر دیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ دہلی میں لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے یکسوئی نہیں ہوتی تو مرشد کی اجازت سے ہانسی چلے گئے، آپ کے روحانی استعداد سے خواجہ معین الدین اجمیری بھی متاثر تھے، سیر العارفین میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے مرید خواجہ بختیار کاکی سے کہا: بابا بختیار، شہباز عظیم بقید آوردہ کہ جز بہ سدرالمنتھی آشیاں نگیرد، این فرید شمعیست کہ خانوادہ درویشان منور سازد، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خواجہ بختیار کاکی کی وفات کے بعد آپ پاک پٹن چلے گئے، وہاں آپ جنگل میں رہتے، پھٹے پرانے کپڑے پہنتے، پیلو اور جنگل کے پھل پھول پر گزارہ کرتے بلکہ زیادہ تر روزہ سے رہتے۔ جہاں آپ رہتے وہ جگہ وحوش وحشرات الارض کا مسکن تھا فوادالفواد میں متعدد مقامات پر سانپ سے مختلف درویشوں کے ڈسے جانے کا ذکر ملتا ہے، خود وہاں کے لوگوں کی نسبت بھی لکھا ہے کہ وہ زیادہ ترکج طبع اور درشت مزاج اور بداعتقاد تھے۔ آہستہ آہستہ آپ کی عبادت وریاضت کی شہرت عام شروع ہوئی اور پھر تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ آنے لگے حتی کہ شاہان وقت بھی آپ سے ملاقات کے متمنی رہنے لگے۔

آپ کی حیثیت سلسلہ چشتیہ میں موسس ثانی کی ہے کیونکہ آپ کے خلفا میں بڑے نامی گرامی حضرات شامل ہیں جیسے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا جو محبوب الہی اور سلطان الاولیا کے نام سے معروف ہیں اسی طرح حضرت علاء الدین صابر کلیری ہیں۔

بیعت وارشاد کے ساتھ ہی آپ کی توجہ اشاعت اسلام کی بھی جانب تھی چنانچہ راجپوتوں کی کئی برادریاں آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئیں، اس سلسلے میں ضلع ملتان اور ضلع منٹگمری کے گزیٹر میں درج ہے کہ اشاعت اسلام میں جتنی کامیابی آپ کو ہوئی ہے۔ حضرت خواجہ بختیار کاکی کو شاید ہی ہوئی ہو۔ مغربی پنجاب کے کئی بڑے بڑے قبیلے آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ مثلاً سیال، راجپوت، وغیرہ۔ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ان کے دست حق پرست پر 16 قوموں (برادریوں) نے اسلام قبول کیا۔

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی اور اشاعت اسلام

شیخ بہاؤالدین زکریا سہروردی ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کے موسس اعلی ہیں۔ شیخ بہاء الدین ملتان میں پیدا ہوئے۔ آپ بارہ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا، اس کے بعد آپ خراسان چلے گئے اور سات برس تک علوم ظاہری وباطنی کی تکمیل کی، پھر بخارا میں یہ سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد حج کے لیے تشریف لے گئے اور مدینہ منورہ میں پانچ سال تک روضہ نبویؐ کی مجاوری کی اور شیخ کمال الدین

محمد یمنی سے علم حدیث کی سند لی۔ پھر بغداد گئے اور شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی ے مرید ہوئے۔ خلعت خلافت سے سرفراز کرنے کے بعد بالغ نظر مرشد نے آپ سے کہا اب آپ ملتان جائیں اور وہاں اقامت اختیار کرکے وہاں کے لوگوں کو مقصود تک پہنچائیں۔ چنانچہ آپ ملتان آئے اور جلد ہی وہاں آپ کو بڑا اعتبار اور وقار حاصل ہو گیا۔ آپ کے درگاہ کے خادمان نے ایک کتاب انوار غوثیہ کے نام سے شائع کی ہے جس میں خاندانی اور سینہ بہ سینہ روایات بھی جمع کی گئی ہیں۔

حضرت بہاؤالدین زکریاکے مریدین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آپ کے خلفا نے سلسلہ سہروردیہ کی ترویج کے ساتھ ساتھ اشاعتِ اسلام کا فریضہ بطریقِ احسن سرانجام دیا۔ آپ نے حضرت سید جلال الدین سرخ بخاری کو خرقہ خلافت عطا فرما کر روحانی علوم کی دولت سے مالامال کر دیا۔ وہ تیس برس تک آپ کی خدمت میں رہے پھر حضرت صدرالدین عارف (فرزندِ اکبر و سجادہ نشین درگاہ زکریا) کے حکم پر اوچ تشریف لے گئے۔ ان دنوں اوچ کے گردونواح میں ہندووں کا تسلط تھا۔ سید جلال الدین نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ دینِ اسلام کی تبلیغ کی اور کفار کو راہِ راست پر لانے کی ذمہ داری قبول کی اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔

غیر مسلموں کا اعترافِ عظمت

حضرت بہاؤالدین زکریاملتانی قدس سرہ العزیز کی تبلیغی مساعی اور سلسلہ عالیہ سہروردیہ کی ترویج کے لیے خدمات کا اعتراف غیر مسلم قلم کاروں نے بھی کیا۔ ان کا ذکر متعدد مستشرقین کی کتب میں ملتا ہے۔ یہاں بطور نمونہ بعض غیر مسلم مصنفین کی کتب سے حضرت شیخ الاسلام سے متعلق اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

سر تھامس آرنلڈ (Sir Thomas W. Arnold) سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اپنی تصنیف ''دعوتِ اسلام'' میں رقم طراز ہیں:

پنجاب کے مغربی صوبوں کے باشندوں نے بہاؤالحق ملتانی (جو شیخ بہاوالدین زکریا کے نام سے بھی معروف ہیں) اور بابا فرید پاک پتنی کی تعلیم و تلقین سے اسلام قبول کیا۔ یہ دونوں بزرگ تیرہویں صدی کے قریب خاتمہ اور چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں گزرے ہیں۔

معروف مستشرق اے۔ جے۔ آربری (A.J.Arbery) اپنی کتابِ تصوف "Sufism" میں حضرت زکریاملتانیؒ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

شیخ شہاب الدین (سہروردی) نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں لکھی ہیں جن میں سب سے معروف اور اثر انگیز ''عوارف المعارف'' ہے جو اس سلسلے کی بنیادی درسی کتاب بن گئی ہے۔ ان کی تعلیمات ہندوستان میں بہاؤالدین زکریا ملتانی کے ذریعے پہنچیں۔ اس لیے فوری قبولیت پائی۔

3.4 بنگال

نام اور سرحد

بنگال یا بنگالہ کا نام بنگا یا ونگا سے نکلا ہے۔ یہ ایک غیر آریائی قوم تھی جس کا ذکر سنسکرت کی قدیم رزمیہ کتابوں اور دھرم شاستروں نیز بودھی ادب (میلند اپنہو) میں ملتا ہے۔

آئین اکبری اور تزک جہانگیری میں بنگال کی تقریباً وہی حدود ملتی ہیں جو برطانوی ہند کے صوبہ بنگال کی تھیں یعنی شمال میں ہمالیہ کی ترائی سے خلیج بنگال تک اور مغربی میں راج محل کی پہاڑیوں سے مشرق میں گارو، کھاسی اور چاٹگاؤں تک۔ اس کی طبعی سرحد نے اسے تبت، چین اور برما سے علاحدہ کیا ہے۔

لفظ بنگالہ پہلے پہل بلبن کے زمانے میں استعمال ہوا، جسے ضیاء الدین برنی نے "فاتح اقلیم لکھنوتی و عرصہ بنگالہ" لکھا ہے۔ بنگال کے یہ دو مختلف حصے (لکھنوتی اور بنگالہ) سلطان الیاس شاہ کے عہد میں متحد ہوئے اور دونوں حصوں کا نام بنگالہ ہوا، چنانچہ سلطان الیاس شاہ نے شاہ بنگالہ (یا شاہ بنگالیاں) کا لقب اختیار کیا، اس زمانے سے بنگالہ سے وہ وسیع جغرافیائی خطہ مراد لیا جانے لگا جو تلیا گڑھی سے چاٹگاؤں تک ہمالیہ کی ترائی سے خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے اور یہاں کے لوگ فارسی ادب اور چینی اور ترکی کی کتابوں میں بنگالی کے نام سے موسوم ہوئے۔

اسلامی دور

1199ء میں قطب الدین ایبک کے ترک سپہ سالار اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی نے جنوبی بہار میں مسلم سلطنت کی توسیع کرنے کے بعد بنگالہ کی طرف کوچ کیا اور اپنی فوج کو پیچھے چھوڑ کر صرف 1800 سواروں کے ساتھ 1201ء میں سین راجہ کے دارالحکومت ندیا میں داخل ہوا۔ لکشمن سین کو جب خبر ملی تو وہ کھانا چھوڑ کر محل کے پچھلے دروازے سے بھاگ گیا اور ندیا پر بغیر جنگ و جدال کے مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور جلد ہی وریندرا اور گور بھی مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس کی قائم کردہ حکومت لکھنوتی کی وسعت شمال میں پورنیا سے دیوکوٹ اور رنگپور تک، مشرق میں ٹیسٹا اور کروتیا تک، جنوب میں گنگا تک اور مغرب میں کوسی سے راج محل کی پہاڑیوں تک تھی۔ وندھیاچل سے راج محل کی پہاڑیوں تک جنوبی بہار اور گنڈک کے دہانے سے کوسی تک کے علاقے بھی لکھنوتی میں شامل کر لیے گئے۔ یہ چھوٹی سی سلطنت بعد میں گوڑ کی ایک بڑی خود مختار حکومت بنی۔ کچھ عرصے بعد محمد بن بختیار خلجی دس ہزار فوج لے کر تبت پر حملہ کرنے کیلئے روانہ ہوا لیکن پہاڑی راستوں کی دشواری اور نیم وحشی قبائل کی لڑائیوں نے فوج کو بددل کر دیا اور وہ مراجعت پر مجبور ہو گیا جب وہ اپنی حدود میں پہنچا تو تین چوتھائی فوج ضائع ہو چکی تھی۔ فوج کے جانی نقصان کا اسے سخت صدمہ ہوا اور اسی صدمہ میں لکھنوتی کے راستے ہی میں دیوکوٹ کے مقام پر 1205ء میں فوت ہو گیا۔ بختیار خلجی فوج کے ضیاع اور اپنی ناکامی پر بار بار یہ کہتا تھا کہ خدانخواستہ کہیں شہاب الدین غوری کا انتقال تو نہیں ہو گیا جس کی وجہ سے ہم جو اس کی برکت سے ہمیشہ فتح مند ہوتے تھے ناکام ہو گئے، اور واقعہ ایسا ہی تھا کہ انہی ایام میں سلطان شہاب الدین غوری کا انتقال ہوا تھا۔

1211ء میں حسام الدین خلجی سلطان غیاث الدین کے لقب سے بادشاہ بن گیا۔ اس کے زمانے میں بنگال نے بڑی ترقی کی۔ حدود سلطنت میں توسیع ہوئی۔ اڑیسہ ،کامروپ اور وکرم پور کے راجا خراج دینے لگے اور دارالحکومت دیوکوٹ سے گور (لکھنوتی) میں منتقل ہو گیا۔ 1219ء میں اس نے جہازوں کا ایک بڑا بیڑا بنایا، 1225ء میں سلطان التمش بہار و بنگال پر حملہ آور ہوا تو اس نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔

سلطان بلبن (عہد حکومت 1265ء تا 1286ء) میں اس کے غلام صوبیدار نے بلبن کی موت کی افواہ اڑنے کے بعد خود مختاری کا اعلان کر دیا، بلبن نے اس کی سرکوبی کی اور اس صوبے کی گورنری اپنے بیٹے بغرا خان کے سپرد کر دی۔ 1287ء میں خاندان غلامان کے ہاتھ سے دہلی کی سلطنت جاتی رہی اور 1290 میں خلجیوں اور پھر 1320ء میں تغلقوں کا اس پر قبضہ ہوا تاہم بنگال میں بلبنی خاندان بدستور حاکم رہا اور سلاطین دہلی نے بھی ان پر کسی طرح کا جبر کرنا پسند نہیں کیا۔

آزاد مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں بنگال نے بڑی آسودگی پائی، ملک کے گوشے گوشے میں سرکاری عمارات، قلعے، مسجدیں، مدرسے، اقامت خانے، سرائیں اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں، تالاب کھودے گئے اور سڑکیں تیار ہوئیں، اس عہد میں دو شاہی خاندان حکمراں رہے۔ ایک حاجی الیاس کا اور دوسرا علاء الدین حسین کا۔

بنگال کو مسلم حکمرانوں نے اتنا وسیع کر دیا کہ مغربی آسام (کامروپ) کوچ بہار اور جاج نگر (اڑیسہ) کے اقطاع اور شمالی و جنوبی بہار کا علاقہ پٹنہ تک ان کے زیر حکومت رہا۔ اسی دور میں مسلم فوجوں نے دریائے میگھنا کو عبور کیا جو پہلے ان کی پیش قدمی میں سد سکندری بنا رہا تھا اور سلہٹ، مغربی پٹرہ اور نواکھلی (بشمول چاٹگاؤں) تک مسلط ہو گیں۔ اس مملکت کے مرکزی شہر تین تھے۔ غوریا گور جو قدیم لکھنوتی کا نیا نام تھا اور وسط بنگال (موجودہ ضلع مالدہ میں گنگا کے کنارے واقع اور چند وقفوں کے ساتھ بہت عرصہ تک پایہ تخت رہا۔

1342ء میں حاجی (ملک) الیاس مغربی بنگال کے حاکم علی مبارک کو قتل کرکے تخت پر قابض ہوا اور سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔ اس نے مغرب میں اپنی سلطنت ترہٹ سے آگے چمپارن، گورکھپور اور بہرائچ تک بڑھالی۔ دوسری جانب اس نے اپنی سلطنت کو بڑھاتے بڑھاتے کامروپ، ناگرا، اور ورندا (راج شاہی اور دیناپور کے اضلاع) تک بڑھالی۔

1442 سے 1459 تک ناصر الدین محمود شاہ نے بھاگلپور، سات گاؤں، باگرہاٹ، فرید پور اور نصرت آباد سے اپنے سکے جاری کر دیئے۔ اس کے لڑکے رکن الدین بارک شاہ نے اڑیسہ کے راجا سے جنگ کی اور قلعہ مندارن پر دوبارہ قبضہ کیا، اس کے فوجی افسر اسماعیل نے کامروپ کے راجا کو ماہی سنتوش (ضلع دیناجپور) کے قریب شکست دے کر اپنی سرحد دریائے کروٹیا تک بڑھالی، بارک اور اراکان کے راجا کے درمیان چاٹگاؤں کیلئے بھی جنگ ہوتی رہی۔ جیسور اور کھلنا کا علاقہ جنوب میں فتح کیا گیا۔ اس کے بعد بھی بنگال میں یکے بعد دیگر افراد اور خاندان برسر اقتدار آتے رہے اور جاتے رہے۔

اس مختصر تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ موجودہ دور سے 600 سو سال قبل ہی مسلمانان ہند بنگال کے بیشتر مواضع میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن یہ فاتحانہ پیش قدمی تھی سپاہیوں سے قلعے فتح کئے جاتے ہیں لیکن سپاہیوں کی تعداد چاہے جتنی بھی زیادہ ہو وہ عوام کے مقابل میں

کم ہوتی ہے، ضرورت اس بات کی تھی کہ عوام کو اسلام کے حلقہ بگوش کیا جائے اور یہ کام علماء اور صوفیاء حضرات کا تھا اور صوفیاء حضرات نے اس کام کو بخوبی انجام دیا، اب ہم ذیل میں حضرات صوفیاء کی بنگال میں تبلیغ و توسیع اسلام کیلئے کاوشوں اور جانکاہیوں پر مختصر روشنی ڈالیں گے۔

بنگال میں تبلیغ و توسیع اسلام میں صوفیاء کرام کی کاوشیں

سب سے پہلی جو بزرگ شمالی ہند کے راستے بنگال تشریف لے گئے، شیخ جلال الدین تبریزی تھے۔ آپ ایرانی نسل سے تھے، پہلے پہل شیخ ابو سعید تبریزی کے مرید ہوئے اور ان کی وفات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردی سے کسب فیض کیا۔ شیخ جلال الدین گھومتے دہلی تشریف لائے، یہاں ان کی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے اچھی دوستی ہو گئی۔

سیر العارفین میں لکھا ہے کہ جب آپ بنگالہ پہنچے تو وہاں مخلوق خدا پروانہ وار آپ کے گرد نثار ہونے لگی وہاں آپ انہوں نے آپ کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کی اور کئی باغ اور بہت سی زمین خرید کر لنگر کے لیے وقف کی۔ اس جگہ کو بندر دیو محل کہتے ہیں، یہاں ایک بڑا تالاب تھا جس کے قریب ایک ہندو راجہ نے زر کثیر صرف کر کے ایک بت خانہ تعمیر کیا تھا۔ آپ نے اس جگہ بہت سے غیر مسلموں کو مسلمان کیا اور بت خانے کو اپنی جائے قیام بنایا، اب آپ کا مزار اسی جگہ ہے اور اس مندر کی نصف آمدنی آپ کے لنگر کیلئے وقف ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق کا خیال ہے کہ شیخ جلال الدین تبریزی بنگالے میں 1195ء اور 1200ء کے درمیان کسی ایسے وقت میں پہنچے جب وہاں لکشمن سین کا راج تھا اور مسلمانوں نے ابھی بنگالہ کو فتح نہیں کیا تھا۔ بنگالہ میں تبلیغ اسلام کی وجہ آپ کی یہ کرامت بنی کہ شیخ جلال الدین جب دیوہ محل آئے تو ایک کمہار یا مالن کے یہاں قیام کیا، دیکھا کہ اس کے گھر میں آہ و شیون کا طوفان برپا ہے، پوچھا تو پتا چلا کہ اس کے شہر میں ایک رسم یہ تھی کہ راجا کے حکم کے مطابق ہر روز ایک نوجوان دیو کے سامنے بھیجا جاتا تھا اور وہ اسے کھالیتا تھا۔ اس روز شیخ کے میزبان کے بیٹے کی باری تھی، شیخ نے کہا کہ اپنے بیٹے کو نہ بھیجو مجھے بھیجو، لیکن وہ نہ مانا کہ اگر دیو نے تمہیں قبول نہیں کیا تو راجا مجھے قتل کرا دے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو نہلایا، دھلایا، نئے کپڑے پہنائے اور اسے بت خانے میں لے گیا، شیخ بھی ساتھ تھے، بت خانے میں پہنچ کر شیخ نے نوجوان کو تو رخصت کر دیا اور خود دیو کا انتظار کرنے لگے، جب دیو اپنے معمول کے مطابق ظاہر ہوا تو شیخ نے اسے اپنے عصا کی ضرب سے ہلاک کر دیا، صبح کو راجا اپنے لشکریوں کے ساتھ بت کی پرستش کو آیا تو دیکھا کہ اس بت خانے میں ایک آدمی سیاہ کپڑے اور سیاہ ٹوپی پہنے کھڑا ہے اور لوگوں کو بلا رہا ہے، لوگ یہ دیکھ کر حیران تھے، راجا خود آگے بڑھا، شیخ نے کہا کہ تم بلا کھٹکے آگے آؤ، دیو کو میں نے ہلاک کر دیا ہے۔ لوگوں نے دیکھا تو واقعی ایسے ہی تھا، چنانچہ سب لوگ ایمان لائے اور مسلمان ہوئے، شیخ جلال الدین کی وفات کب ہوئی اس تعلق سے مختلف روایات ہیں سیر العارفین اور آئین اکبری کے مطابق آپ کی وفات 642ھ یعنی 1244ء میں ہوئی، یہی تاریخ خزینۃ الاصفیاء میں بھی درج ہے لیکن مشہور اسلامی سیاح ابن بطوطہ کہتا ہے کہ اس نے سنہ 746ھ مطابق 1345ء میں شیخ کی زیارت کی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے

"سات گام سے میں نے کامروپ کے پہاڑوں کی طرف کا راستہ اختیار کیا جو یہاں سے ایک مہینہ کی مسافت پر ہے، میرا ارادہ اس

ملک میں جانے سے یہ تھا کہ میں شیخ جلال الدین تبریزی کی جو مشہور اولیاء اللہ تھے، زیارت کروں، یہ ان کے ہاتھ پر اس ملک کے اکثر باشندوں نے اسلام قبول کیاہے۔اس ملک کے ہندو مسلمان سبھی شیخ کی زیارت کرتے ہیں اوران کے واسطے تحفے لاتے ہیں۔"

پروفیسر گب کا خیال ہے کہ ابن بطوطہ نے جس شیخ جلال الدین کی زیارت کی تھی وہ شیخ جلال الدین تبریزی نہیں بلکہ جلال الدین سلہٹی تھے، لیکن اس نظریہ کو ماننے میں بھی الجھن ہے کیونکہ شیخ جلال الدین کی اس نے جو صفات بیان کی ہیں یعنی بغداد کی زیارت، خلیفہ مستعصم کا تاتاریوں کے ہاتھ قتل وغیرہ تووہ شیخ جلال الدین تبریزی پر صادق آتی ہیں۔

شیخ سراج الدین عثمانی: شیخ سراج الدین عثمان کا وطن بنگال کا دارالخلافہ لکھنوتی تھا لیکن وہ عہد طفولیت سے ہی دہلی آگئے تھے اور حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کا دامن پکڑ لیا تھا شیخ نے ان کو تحصیل علم کی ہدایت کی اور پھر ان کو خلافت سے نوازا، شیخ نظام الدین اولیاء کے بعد اپنی تکمیل کا احساس انہیں حضرت چراغ دہلی کے یہاں لے گیا انہوں نے ان کی مزید تربیت کی اور پھر ان کو بنگال کی جانب روانہ کیا، بنگال میں ایک بزرگ شیخ علاء الدین پہلے سے موجود تھے لیکن ان کی روحانی برتری کا شیخ علاء الدین نے برملا اعتراف کیا اوراپنی مشیخت درکنار کرتے ہوئے ان کے مرید ہوگئے اوراپنے شیخ کی بڑی خدمت کی۔ شیخ سراج الدین کی وفات کے بعد ان کے جانشیں بنے اور مخلوق خدا کی رہبری کی بالخصوص آپ کا لنگر ہر ایک کیلئے عام تھا اور جودوسخا کی گرم بازاری تھی یہاں تک بادشاہ وقت اس پر معترض ہوا اور آپ کو لکھنوتی چھوڑ کر سنار گاؤں جانے کا حکم دیا۔ آپ کی وفات 1398ء میں ہوئی۔ مزار مبارک پنڈوہ میں ہے۔ شیخ علاء الحق سے بھی زیادہ فروغ ان کے صاحبزادے نورالحق المعروف نور قطب عالم نے پایا جن کی نسبت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں

"شیخ نورالحق والدین رحمتہ اللہ علیہ المشہور بہ شیخ نور قطب عالم فرزند ومرید خلیفہ علاء الحق است از مشاہیر اولیائے ہندوستان وصاحب عشق ومحب وذوق وشوق وتصرف وکرامت۔

جب بنگال کے راجہ غیاث الدین کو راجا گنیش نے قتل کرکے تخت سنبھالا تو گنیش نے مسلمانوں اور علماء ومشائخ کا قتل شروع کیا اس کا ارادہ تھا کہ بنگال سے اسلام کا نام ونشان مٹادے، یہ دیکھ کر شیخ قطب عالم نے جونپور کے حکمراں ابراہیم شاہ شرقی کو مدد کیلئے خط لکھا، اس نے بڑی فوج بھیجی، گنیش نے فوج کے آنے کی خبر سن کر معافی مانگی شیخ نے کہا کہ تم کافر ہو تمہاری ہم مدد کیسے کرسکتے ہیں، گنیش نے کہا کہ میں دنیا ترک کرتا ہوں اور حکومت سے علاحدہ ہوتا ہوں، آپ میرے بیٹے جدو کو مسلمان کرلیں چنانچہ جدو کو جلال الدین کا نام دیا گیا، فوج کے واپس جانے کے بعد گنیش نے بیٹے کو پھر سے غیر مسلم بنانا چاہا تو جدو نے انکار کردیا اور سلطان جلال الدین کے نام سے تخت بنگالہ پر رونق افروز ہوا۔

شیخ جلال الدین سہلٹی: آپ کا مزار مسلمانان بنگلہ دیش کی بڑی اہم زیارت گاہ ہے۔ ضلع سہلٹ کے سرکاری گزیٹر میں لکھا ہے "گوڑ یا سہلٹ کو مسلمانوں نے 1384ء میں فتح کیا آخری ہندو راجا کو سکندر غازی کی فوجوں سے زیادہ شاہ جلال کی کرامات نے بے بس کردیا، شاہ صاحب کی وفات کے بعد یہ علاقہ صوبہ بنگالہ میں داخل کیا گیا اور نظم ونسق کیلئے ایک علیحدہ صوبیدار مقرر ہوا، اس ضلع کے تقریباً53 فیصدی باشندے گزشتہ مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق مسلمان ہیں۔1303ء میں سلہٹ فتح ہوا اور 20ذی قعدہ 740ء کو شاہ

جلال نے وفات پائی، قیام سلہٹ کے 37 سال میں کچھ وقت تو شیخ جلال نے ظاہری انتظامات میں گزارا اور باقی عبادت اور ارشاد و ہدایت میں۔ ضلع سہلٹ میں چار ایسے مقامات مشہور ہیں جہاں شیخ جلال نے اپنے ساتھی پیروں کو بسایا اور ان سیار شاد و ہدایت کا کام لیا یعنی سلہٹ، لاتو، باپنیہ ٹیلہ، ہمنگ ٹیلہ۔

بنگال کے غازی بابا

بنگال میں اشاعت اسلام کی ایک بڑی وجہ بنگال کے "غازی اولیاء ہیں جن کی اصل دلچسپی تو خدا اور دوسری دنیا سے تھی لیکن جنہیں حالات کے تحت عسکری مہمات میں حصہ لینا پڑا اور جن کی مدد سے اسلامی حکومت کی توسیع کے ساتھ اسلام کی اشاعت بھی ہوئی۔ مثلاً ہگلی میں ایک مقام پنڈوہ اہل علم اوراشراف مسلمانوں کی بستی ہے۔ اس بستی کی تاریخی روایتیں یہ ہیں کہ یہ چھ سات سو سال قبل یہاں شاہ صفی الدین رہتے تھے۔ انہیں مقامی راجے نے تنگ کیا تو انہوں نے مسلمان بادشاہوں کے پاس جاکر شکایت کی اور فوج بلاکر پنڈوہ کو فتح کیا، ایک دوسرے اسلامی مرکز بنگل کوٹ ضلع بردوان کے پیر راہی کی نسبت بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ سات گاؤں میں ظفر خان اسی قسم کے مجاہد ولی تھے جو مقامی روایات کے مطابق ہندو راجا کے ساتھ لڑائی میں شہید ہوئے لیکن ان کے بیٹے نے یہ مقام فتح کرلیا۔ شاہ اسماعیل غازی کے تعلق سے ایک مخطوطہ میں یہ ملتا ہے کہ راجا کامروپ کے ساتھ لڑائی میں گوڑ کے مسلمان بادشاہ نے شاہ اسماعیل غازی سے مدد لی اور فتح کے بعد اس علاقے کی حکومت ہی ان کے سپرد کردی۔ اسی طرح ڈھاکہ (بنگلہ دیش کا صدر مقام) بابا آدم شہید کا مزار ہے جن کی نسبت مشہور ہے کہ وہ ہندو راجا کے ساتھ کشمکش میں شہید ہوئے۔ مزار کے قریب ایک مسجد ہے جو 1483ء میں بادشاہ بنگالہ نے تعمیر کرائی تھی۔

بنگال میں اشاعت اسلام کی وجوہات

بنگال میں صوفیائے کرام نے اشاعت اسلام میں جو کارہے نمایاں انجام دیئے ان کے متعلق ڈاکٹر کالی راجن قانون گو بنگال میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں لکھتے ہیں

" بلبنی سلاطین کے عہد حکومت میں نہ صرف بنگالے میں اسلام کو وسعت نصیب ہوئی بلکہ اس کی بنیادیں بھی گہری ہوگئیں، یہ وہ زمانہ تھا جب اولیائے کرام نے جو برہمنوں اور ہندو سادھوؤں سے عملی پارسائی، قوت عمل اور دوراندیشی میں بڑھ کر تھے، وسیع پیمانے پر تبلیغ شروع کی۔ جس کی کامیابی کا باعث طاقت نہ تھی بلکہ ان کا مذہبی جوش اوران کی عملی زندگی۔ وہ نچلے طبقہ کے ان ہندوؤں میں رہتے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے جو اس وقت بھی توہم پرستی اور معاشرتی دباؤ کے پنجے میں گرفتار تھے۔ دیہاتی علاقوں کے یہ باشندے مسلمان ہوکر اسلامی حکومت کیلئے ایک نئی تقویت کا ذریعہ ہوگئے۔ بنگالے کی عسکری اور سیاسی فتح کے سو سال بعد صوفیانہ سلسلوں کی مدد سے جو ملک کے کونے کونے میں پھیل گئے تھے۔ اس سرزمین میں اخلاقی اور روحانی غلبے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مندروں اور ہندو خانقاہوں کو تباہ و برباد کرکے ابتدائی مسلمان فاتحین نے صرف ان کے زروجواہر پر قبضہ کیا تھا۔ لیکن تلوار کے زور سے تاریخی روایات ختم نہ ہوسکتی تھی اوران ہی کے غیر فانی روحانی خزائن کا خاتمہ ہوسکتا تھا جن پر ہندو قومیت اور ہندو مذہب کی بنیادیں قائم تھیں۔ مسلمان اولیاء نے اخلاقی اور روحانی فتح کے

عمل کو مکمل کیااوراس مقصد کیلئے ہندو دھرم اور بدھ مدت کے پرانے استھانوں پر (جواب برباد ہوگئے تھے) ایک پالیسی کے مطابق درگاہیں اور خانقاہیں قائم کردیں۔ اس کے دو نتیجے ہوئے۔ ایک تو بت پرستی کے ان قدیم استھانوں سے ہندومت کے احیاء کا امکان جاتا رہا اور دوسرے عوام الناس میں ایسے قصے کہانیاں رائج ہوگئیں جن کے مطابق یہ نووارد قدیمی مقدس ہستیوں کے جانشیں ہوگئے۔ ہندو عوام صدیوں سے ان مقامات کو مقدس مانتے آئے تھے وہ ان کی پرانی تاریخ کو بھول گئے اور بڑی آسانی سے انہوں نے اپنی ارادات کا سلسلہ ان پیروں اور غازیوں سے وابستہ کردیا جو ان مقامات پر قابض ہوگئے.................ہندو سوسائٹی بالخصوص نچلے طبقے کے ہندواولیاء اور غازیوں کی کرامات کے ایسے قصوں کی بدولت جوبسا اوقات قدیم ہنداور بودھی روایتوں پر مبنی تھے۔ آہستہ آہستہ اسلام کی طرف مائل ہوگئے۔ شاید ہندو تیرتھوں پر اس اثر کی سب سے نمایاں مثالیں دو ہیں۔ ایک راجگیر میں سرنگی رشی کنڈ کا مخدوم کنڈ بن جانا اور دوسرے دیو او تار روایات کے معجزہ باز بدھ کا ایک مقدس مسلمان مخدوم ولی بن جانا۔

بنگال کے ممتاز مورخ سر جادوناتھ سرکار کا خیال یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت زیادہ تر ان علاقوں میں ہوئی جہاں ہندو مذہب کی تعلیمی حالت اچھی نہ تھی اور نہ وہی وہاں برہمن اور ہندوؤں کو تعلیم دینے والے موجود تھے لہذا مسلم مبلغین کو میدان خالی ملا اور انہوں نے اشاعت اسلام میں نمایاں کردار ادا کیا۔

جب کہ ایک انگریزی مورخ اس سلسلے میں لکھتاہے کہ بنگال میں اشاعت اسلام کو نمایاں کامیابی ملنے کی وجہ اسلام کا "درس مساوات" ہے جس کی وجہ سے ذات کے چکر میں جکڑے کم تر ذات کے لوگوں نے اسلام میں اپنی ہر قسم کی محرومی کا مداوا دیکھا اور اسے قبول کرلیا۔

3.5 بہار

ہندوستان کا ایک صوبہ جس کے مغرب میں اتر پردیش، شمال میں نیپال، مشرق میں بنگال اور جنوب میں اڑیسہ ہے۔ اس صوبے کا نام "شہر بہار" کے نام سے موسوم ہوا۔ گو خود یہ شہر جس کے اردگرد بدھ مت کی خانقاہیں سنسکرت(vihara) تھیں، اب کسی اہمیت کی حامل نہیں۔ بہار سلطنت دہلی سے دور ہونے کی وجہ سے کبھی ہائی لائٹ میں نہیں رہا جس طرح کے اتر پردیش کے علاقے دہلی سے قریب ہونے وجہ سے مورخین کی نگاہ میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی تاریخ بطور صوبہ مکمل کرنا ایک مشکل کام ہے بس کچھ شہر ایسے ہیں جن کی تاریخی حیثیت ہے اور اسی بناء پر اس کا ذکر آجاتا ہے۔

اسلامی دور

بہار میں اسلام کے قدم تب پڑے جب اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی کے بہار پر حملہ کے دوران 589ھ مطابق 1193ء میں مونگیر فتح ہوا۔ اور وہ قطب الدین ایبک سلطان دہلی کے زیر سیادت اسی اختیار الدین کے قبضے میں رہا۔ 730ھ مطابق 1330ء میں محمد بن تغلق نے اسے دہلی میں شامل کرلیا۔ 799ھ مطابق 1397ء میں یہ جونا پور سے ملحق ہوا۔ 893ھ مطابق 1488ء میں سکندر لودھی کے حملہ

کے بعد پھر دہلی میں شامل کر لیا گیا اور کچھ مدت کے بعد جب تک کہ بنگال پر مغلوں کا تسلط نہیں ہو گیا یہ شاہان بنگال کے قبضے میں رہا۔ ساتویں صدی ہجری مطابق تیرہویں صدی عیسوی میں بہار کے کچھ حصوں کو انتظامی وحدت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ 626ھ مطابق 1225ء میں شمس الدین التتمش نے بہار میں ایک صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ اکبری عہد میں 990ھ مطابق 1582ء میں یہ ایک صوبہ قرار دیا گیا۔ جس میں آٹھ "سرکاریں" تھیں اور یہ صوبہ بنگال کے ماتحت تھا۔ اس کا صدر مقام شہر بہار ہی رہا۔ یہاں تک کہ شیر شاہ نے نویں صدی ہجری مطابق پندرہویں صدی عیسوی میں اس کے بدلے پٹنہ مقرر کیا۔ یہ علاقہ سلطنت مغلیہ کے قیام سے قبل اودھ اور بنگال کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا تھا۔ لیکن جب مغل آئے تو اسے اودھ اور بنگال کے درمیان ذریعہ مواصلات ہونے کی اہمیت حاصل ہو گئی، جسے مغلیہ شاہان کے بنائے ہوئے بہت سے نفیس پل ثابت کر رہے ہیں۔

جس طرح پنجاب یا بنگال میں صوفیاء کرام کی تبلیغی کوششوں کی تاریخ ملتی ہے بہار میں اس طرح کی تاریخ عام طور پر دستیاب نہیں ہے اور شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بہار کے اہل علم نے پتہ نہیں کس بناء پر خود کو تصنیف و تالیف سے ہمیشہ دور رکھا ہے۔ بہار میں اہل علم بہت گزرے ہیں لیکن ان کی نسبت سے ان کی تصنیفات دیکھیے تو حیرت ہوتی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ رہی ہو گی کہ تصنیف و تالیف کیلیے جو ذرائع اور وسائل اور ماحول چاہیے وہ سلطنت دہلی سے دور ہونے کی بناء پر اہل علم کو میسر نہیں آیا۔

اشاعت اسلام میں صوفیائے کرام کا کردار

مسلم فاتحین کے فتوحات کا سیل بہار کے تمام شہروں تک نہیں پہنچا اس کے باوجود بہار میں مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی ہے جو یہ بتا رہی ہے کہ صوفیاء کرام کی تبلیغی کوششیں یہاں از حد بارآور ثابت ہوئیں، بہار کا کوئی ضلع اور کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں مسلم نہ بستے ہوں۔

سیمانچل کا علاقہ یعنی کشن گنج، اررریہ، کٹیہار، پورنیہ، دیناجپور کا علاقہ جو بنگال میں یا بنگال سے قریب ہے وہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اگرچہ معاشی اور تعلیمی طور پر پسماندہ ہیں لیکن بطور مذہب اسلام کے ماننے والے اکثریت میں ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس علاقے میں بنگال کے صوفیاء کرام جن کا ذکر بنگال کے باب میں ہو چکا ہے نے اشاعت اسلام میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

پٹنہ اور اس سے ملحقہ علاقے چوں کہ صوبائی راجدھانی میں یا اس کے قریب رہے ہیں لہذا اسلامی ہلچل اور صوفیائے کرام کی خانقاہیں یہاں زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں، بطور خاص شیخ شرف الدین یحیی منیریؒ کا ذکر کرنا بیجا نہیں ہو گا جنہوں نے اس علاقے میں اسلام کی شمع روشن کی اور وہ بھی شمالی ہند میں اسلام کے ابتدائی دور میں۔ اللہ نے انہیں طویل عمر دی تھی جس کا انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے راج گیر کے جنگل میں شدید ریاضتیں کیں اور پھر ایک متروک ہندو سادھو کے استھان کو اپنا مقام بنایا اور آج یہ جگہ مخدوم کنڈ کے نام سے ہی روشن ہے۔ شیخ شرف الدین یحیی منیریؒ کے خلفاء کی بڑی تعداد نے بہار میں اشاعت اسلام میں نمایاں کردار ادا کیا ہے جنہوں نے حکومت و سلطنت کی اعانت کے بغیر محض تزکیہ قلب اور بلند کرداری کی بناء پر مقامی آبادی کو متاثر کیا۔ شیخ شرف الدین یحیی منیری کے اندر اشاعت اسلام کا جذبہ اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا لیکن اس کی تبلیغی کوششوں کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ تذکروں میں کچھ متفرق واقعات ملتے ہیں۔ ایک واقعہ

یہ ہے کہ ایک جوگی نہایت حسین و جمیل تھا، اس کو دیکھ کر شیخ مخدوم کے مریدوں کے دل میں خیال آیا کہ ایک کافر کتنا حسین و جمیل ہے۔ چونکہ جوگی صفائے باطن کا حامل تھا اس لئے ان کے خیال سے آگاہ ہوگیا اوران کو اس طرح کے وساوس پر تنبیہ کی اور پوچھا کہ تمہارا گرو کون ہے لوگوں نے بتایا کہ شرف الدین یحیٰ۔ جوگی ان کے گرو کو دیکھنے ان کے ساتھ چلا لیکن جوں ہی اس کی نظر حضرت مخدوم پر پڑی، بے تحاشا بھاگا،لوگوں نے پوچھا کہ کیوں بھاگتے ہو، اس نے جواب دیا کہ مخدوم تارروپ ہوگئے ہیں یعنی متصف بصفات حق ہیں (یہ صوفیہ کی اصطلاح ہے) اگر میں ان کے قریب گیا تو جل جاؤں گا۔ حضرت مخدوم کو اس کی خبر ملی تو مسکرائے اوران کو بلوایا۔ یہ دیر تک مجلس میں بیٹھا رہا۔ حضرت مخدوم نے اسلام کی تلقین کی۔ تین دن تک اپنی صحبت میں رکھا اور خلافت عطا کر کے رخصت کیا۔

حضرت شیخ شرف الدین کی اولاد میں شاہ دولت نامی ایک شخص بڑے پائے کے صوفی اور بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے یہاں امراء اور صلحاء کی آمد رہتی تھی۔ ان کے اندر اشاعت اسلام کا بڑا جذبہ تھا۔ جس کا اندازہ مآثر الامراء کے اس اندراج سے ہوتا ہے۔

"راجہ مان سنگھ بنگال جاتے ہوئے منیر میں شاہ دولت سے ملے، انہوں نے راجہ کو اسلام کی تلقین کی، راجہ اسلام کی طرف مائل تھا اوراسی غرض سے اس نے ایک ماہ وہاں قیام کیا تھا لیکن نہ جانے کیا چیز مانع ہوئی کہ اسلام قبول نہیں کیا"۔

شیخ شرف الدین کے والد تاج فقیہہ کے اندر اشاعت اسلام کا بڑا جذبہ تھا اور آپ ہی کی بدولت منیر اوراس کے اطراف میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ شیخ شرف الدین یحیی منیری کے سوانح نگار سید ضمیر الدین لکھتے ہیں

"مولانا تاج فقیہ کی ذات سے منیر اور مضافات میں اسلام کی بہت کچھ اشاعت ہوئی۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں اذان و تکبیر کی آواز نہ سنائی دیتی ہو۔ مولانا کے باعث منیر میں ایک باوقعت اور باقوت جماعت مسلمانوں کی پیدا ہوگئی تھی۔"

3.6 دہلی اوراترپردیش

یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ دہلی کے تخت پر مسلمانوں کا قبضہ شہاب الدین غوری کے دور میں ہوا پھر جب اس نے اپنا نائب دہلی میں قطب الدین ایبک کو بنایا تو یہاں سے خاندان غلاماں کی ابتداء ہوتی ہے۔ قطب الدین ایبک کا دور حکومت 1206ء تا 1210ء رہا۔ بنارس اور دہلی قطب الدین ایبک نے فتح کیا تھا، پھر قطب الدین ایبک کے غلام ایلتتمش نے اس میں موجودہ اترپردیش کے راجاؤں کی سلطنت کا خاتمہ کر کے ان کی ریاست کا الحاق دہلی سلطنت سے کیا، ایلتتمش کا دور حکومت 1211ء تا 1236ء رہا۔ رضیہ سلطانہ کو امراء کے جھگڑوں سے فرصت نہیں ملی اور رضیہ سلطانہ کے بعد دہلی کے تخت پر بیٹھنے والے اس کے بھائی امراء کے ہاتھ میں بے دست وپا تھے جب ناصر الدین کو حکومت ملی اوراس نے بلبن کو سیاہ وسفید کا مالک بنایا تو بلبن کو نصیحت کی کہ کوئی ایسا کام نہ کرنا جس کی وجہ سے مجھے کل قیامت میں شرمندگی ہو، ناصر الدین کا عہد اقتدار 1246 تا 1266ء رہا۔ ناصر الدین کی وفات کے بعد امراء نے بلبن کو بادشاہ منتخب کیا۔ بلبن کا دور بطور بادشاہ 1266ء تا 1286ء رہا۔ بلبن نے فتوحات سے زیادہ مقبوضات کے استحکام پر زور دیا، اس کے دور میں مغل بار بار لاہور پر حملہ کر رہے تھے۔ بلبن نے مغربی علاقوں کو فوجی اعتبار سے مستحکم کیا اور وہاں اپنے بیٹے اور جانشیں سلطان محمد کو تعینات کیا۔ مغلوں سے لڑتے ہوئے سلطان محمد

کی موت ہوگئی جس کے غم میں کچھ عرصہ بعد بلبن بھی مر گیا۔

خلجی خاندان میں سے سلطان علاء الدین ان پڑھ ضرور تھا مگر اس کے اندر سلطنت کرنے کی پوری لیاقت تھی، مغلوں کی یورش کم ہو چکی تھی اب اس نے فتوحات کی جانب توجہ دی اور اس نے کشمیر اور نارتھ ایسٹ کو چھوڑ کر تقریباً پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا، اس کی فتوحات کا علم گجرات، دکن، راس کماری جیسے دور دراز مقامات تک لہرانے لگا۔ موجودہ یوپی جو دہلی سے متصل ہے تقریباً پوری کی پوری اس نے فتح کرلی تھی۔ سلطان علاء الدین کا عہد حکومت 1299ء تا 1319ء رہا۔ یہ بات واضح رہے کہ بعض شہر جیسے جونپور، فیروز پور وغیرہ بعد میں سلطان فیروز شاہ تغلق نے بسائے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی موجودہ یوپی کے کچھ حصے مزید بعد میں بسے ہیں۔

دہلی سلطنت کے قیام سے قبل اترپردیش میں اسلامی آبادی

یہ ایک حیرت کی بات ہے لیکن حقیقت ہے کہ شہاب الدین غوری کے حملہ سے قبل موجودہ یوپی کے کچھ علاقوں میں مسلم آبادی کا ثبوت ملتا ہے۔ شمالی ہند کے اندرونی علاقوں جیسے قنوج، بنارس، بدایوں وغیرہ میں بھی مسلمان آباد تھے۔ مسعودی نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ قنوج میں مسلمانوں کا ایک محلہ تھا۔ بنارس میں مسلمانوں کی خاصی تعداد آباد تھی بلکہ بنارس کے راجہ کی فوج میں کافی مسلمان شامل تھے۔ اس کا تذکرہ ابن اثیر نے الکامل فی التاریخ میں کیا ہے۔ بدایوں، بہرائچ، بلند شہر اور بلگرام میں بھی مسلمانوں کی موجودگی کے شواہد ملتے ہیں۔

سلطان محمود کی معاصر شخصیت سید سالار مسعود غازی کی ہے۔ 421ھ مطابق 1031ء میں سید سالار نے اپنا سفر شروع کیا اور بہت کم وقفہ میں متعدد فتوحات حاصل کیں۔ اجمیر اور دہلی کے درمیان دھندہ گڑھ، ریواڑی کے قریب راجا کرن پال نے ان پر شب خون مارا، اس کا بدلہ لینے کیلئے انہوں نے راجہ کرن پال کا تعاقب کیا اس نے تجارہ کے راجا تیج پال کے یہاں پناہ لی، لیکن راجہ تیج پال کو بھی شکست ہوئی، راجہ تیج پال مسلمان ہو گیا، اس کا نام جلال خان رکھا گیا۔

نواح دہلی میں میواتیوں کی بستیاں قدیم زمانہ سے آباد ہیں اور سالار کی قسم، سالار کا جھنڈا وغیرہ ان کے یہاں معروف ہیں۔ جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ بھی ان سے ہی متاثر ہو کر مسلمان ہوئے ہوں گے۔ سید سالار نے ستر کی (بارہ بنکی) کو اپنا مستقر قرار دے کر گردونواح میں اشاعت اسلام کیلئے اپنے ماتحتوں کو بھیجا، خود بھی جہاد کرتے رہے اور 424ھ مطابق 1035ء میں ان کی شہادت ہوئی۔

محمود غزنوی کے بعد غوری حکومت کے قیام سے قبل شمالی ہند میں مسلمانوں کی خاصی تعداد کی موجودگی کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً بہرائچ میں سالار مسعود غازی شہید ہوئے لیکن ان کا پختہ مزار دہلی سلطنت کے ابتدائی ایام میں تعمیر ہوا۔ اس سے قیاس ہے کہ اس وقت بہرائچ میں یقیناً کچھ مسلم آبادی رہی ہو گی جنہوں نے مزار بنایا۔ بعض دیگر مقامات پر بھی اس عہد کے مسلم مزار کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً میران ملہم کا مزار بدایوں میں، خواجہ مجد الدین کا بلگرام میں، گوپامئو میں لال پیر کا مزار، اناؤ میں گنج شہیداں، منیر (بہار) میں امام تقی فقیہہ کا مزار، یہ تمام مزار غوری حملہ سے قبل کے ہیں۔ سید سالار کے تعلق سے مشہور ہے کہ وہ اس علاقہ سے گزرے اور بہرائچ جا کر راجا بالادت

کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ سلطان مسعود کے حملہ سے قبل سرستی نام کی ہندوستانی ریاست میں مسلمان موجود تھے۔

بلند شہر جس کا قدیم نام برن ہے اس کو سلطان محمود غزنوی نے 1019ء میں فتح کیا تھا، یہاں کا راجہ ہردت مسلمان ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ دس ہزار مزید افراد مسلمان ہو گئے تھے۔ قطب الدین ایبک (متوفی 607ھ مطابق 1210ء) نے 1194ء میں علی گڑھ فتح کیا اور یہاں کے متعدد لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

فیروز شاہ تغلق ایک مرتبہ نواح دہلی میں شکار کھیل رہا تھا کہ شیر نے اس پر حملہ کیا، شیر کو رائے چھجمل نے مار دیا۔ اس کو ناہر بہادر کا خطاب ملا۔ بعد میں ناہر بہادر مسلمان ہو گیا۔ اس کے اخلاف آج بھی ملک اور خان زادہ کے نام سے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ چوہان راجپوتوں کی ایک شاخ جو الور کے قریب قبصہ منڈ اور اس کے نواح میں آباد تھی وہ بھی فیروز شاہ کے ذریعہ مسلمان ہوئی۔ مراۃ الانساب میں مولوی ضیاء الدین علوی نے لکھا ہے کہ راؤ حاجی چاند بکری سمیت 1499 میں فیروز شاہ کے عہد میں مسلمان ہوئے اور شاہی خاندان سے اس کے مصاہرتی تعلقات قائم ہوئے۔ بابر کے ساتھ ایک جنگ میں اودھ کا بڑا زمین دار قید ہو گیا، اس نے اسلام قبول کر لیا تو بابر نے اعزاز میں اس کو رہا کر دیا۔ آرنلڈ نے لکھا ہے کہ یہ خاندان اس وقت اودھ کا سب سے زیادہ بااثر راجپوت مسلم خاندان ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں لال خانی مسلمان ہو گئے تھے۔ لال خانیوں کے مسلمان ہونے کے بارے میں کئی روایتیں ہیں لیکن معتبر اور صحت سے قریب روایت وہی ہے کہ لال خانی حکمراں سالباھن اپنی اولاد کے ساتھ شاہ جہاں کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا۔ شاہ جہاں کے دور کا اہم واقعہ یہ ہے کہ اس نے ہندو مسلمانوں کی آپسی شادی کی ممانعت کر دی تھی اس فیصلہ کے بعد چار تا پانچ ہزار ہندو جن کی بیویاں مسلمان تھیں مسلمان ہو گئے۔ یہ واقعہ بھدنور کا ہے۔

3.6.1 اشاعت اسلام میں صوفیائے کرام کا حصہ

خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 633ھ مطابق 1236ء) کا قیام اگرچہ بنیادی طور پر اجمیر میں رہا لیکن ان کی روحانی فتوحات کا دائرہ پورا ہندوستان تھا۔ خواجہ اجمیر کی تبلیغی مساعی کے سلسلے میں آرنلڈ نے لکھا ہے کہ

"خواجہ اجمیر آئے، جہاں کا راجہ ہندو تھا۔ اور ملک میں ہر طرف بت پرستی پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچنے کے بعد جس ہندو کو آپ نے سب سے پہلے مسلمان کیا وہ راجہ کا جوگی گرو تھا، رفتہ رفتہ اس کی مریدوں کی ایک جماعت آپ کے پاس جمع ہو گئی۔ جنہوں نے آپ کی تعلیم و تلقین سے بت پرستی چھوڑ کر اسلام اختیار کر لیا۔ آپ کی شہرت سن کر بہت سے ہندو اجمیر آئے اور آپ کی ترغیب سے مسلمان ہو گئے۔ روایت ہے کہ اجمیر جاتے ہوئے دہلی کے مقام پر ٹھہرے تو وہاں آپ کے ہاتھ پر 700 ہندوؤں نے اسلام قبول کیا"

سیر الاولیاء کے مولف امیر خورد کرمانی (متوفی 770ء) جس نے خواجہ کی وفات کے محض 100 برس بعد حالات کا بچشم خود معائنہ کیا وہ آپ کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"ان (خواجہ اجمیری) کی دوسری کرامت یہ ہے کہ آپ کے آنے سے پہلے پورے ہندوستان میں کفر و بت پرستی کا راج تھا اور ہند کا ہر ایک سرکش انا ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتا تھا اور وہ سب پتھر، ڈھیلے، درخت، چوپایوں اور گائے

اوراس کے گوبر کو سجدہ کرتے تھے اور کفر کی تاریکی سے ان کے دلوں کے تالے مضبوط ہو رہے تھے۔"

داراشکوہ نے بھی لکھا ہے کہ خواجہ اجمیری کی آمد کی وجہ سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ اگر صوفیانہ خوش اعتقادی کو راہ دی جائے تو بعض روایتوں کے بقول 90 لاکھ افراد آپ کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے۔

خواجہ بختیار کاکی کے ہاتھوں پر قبول اسلام کے سلسلے میں روایتیں نہیں ملتی ہیں۔ ان کے مرید حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر کے ہاتھوں راجپوتوں کی کئی برادریوں نے اسلام قبول کیا۔ لیکن ان کا دائرہ عمل پنجاب کا علاقہ تھا۔ حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے مرید حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ہاتھوں پر بھی تبلیغ اسلام کے واقعات نہ کے برابر ملتے ہیں لیکن ان کے دل میں اس کی تڑپ ضرور تھی کہ غیر مسلم مسلمان ہو جائیں، ان کا تجربہ اور احساس یہ تھا کہ کہنے سننے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا ہاں اگر ان کو کسی مرد صالح کی صحبت نصیب ہو جائے تو اس کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے گا۔

شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی متوفی (1140ھ مطابق 1727ء) کی فکر کا محور اشاعت اسلام تھا۔ انہوں نے خود بھی اس کیلئے کوشش کی اور اپنے مریدوں کو اس جانب متوجہ کیا۔ ان کے مکتوبات اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق کی نصیحت سے بھرے پڑے ہیں۔ ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں

"ہر حال میں کلمۃ الحق کی سربلندی کیلئے کوشش کیجئے اور مشرق سے مغرب تک ہر جگہ اسلام حقیقی قائم کیجئے" ایک دوسرے مکتوب میں وہ لکھتے ہیں "اب یہ ضروری ہے کہ جہاں رہیں، اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے جدوجہد کریں اور اس راہ میں جان و مال کی قربانی دیں۔ اپنے ایک مرید کو تاکید کرتے ہیں کہ جو لوگ پوشیدہ طور پر مسلمان ہو گئے ہیں اب وہ اپنے اسلام کا اظہار بھی کریں۔

"بھیا یاد رام اور دوسرے بہت سے ہندو اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن اپنے اہل قبیلہ سے اسلام پوشیدہ رکھتے ہیں۔ میرے بھائی اس کا اہتمام کیجئے کہ یہ عظیم الشان کام ظاہر ہو جائے"۔ ان کے علاوہ بھی بہت سارے صوفیائے کرام نے یوپی میں دعوت اسلام کا اہتمام کیا اور ان کی کوششوں سے مقامی آبادی مسلمان ہوئی۔

3.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کی شہرت یوں تو فاتحانہ ہے لیکن بعض تاریخی مصادر یہ بھی بتاتے ہیں کہ محمود غزنوی کے حملوں سے قبل شمالی ہند میں متعدد مسلم آبادی موجود تھی۔ محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کے دوران ملتان بھی فتح کیا تھا جو پنجاب کا ایک حصہ ہے۔ اس کے بعد سندھ میں متعدد حکومتیں قائم ہیں۔
- غزنی سلطنت کے زوال کے بعد شہاب الدین غوری نے شمالی ہند کی جانب توجہ کی اور لاہور کو فتح کرنے کے بعد دہلی کو بھی فتح کیا۔ دہلی فتح کرنے کے بعد شہاب الدین غوری نے قطب الدین ایبک کو دہلی میں اپنا گورنر مقرر کیا، یہاں سے دہلی اور شمالی ہند میں ایک مضبوط

اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی۔

- صوفیائے کرام نے پنجاب، بنگال، بہار میں زبردست تبلیغی خدمات انجام دیں، آج ان علاقوں میں جو مسلمان ہمیں نظر آتے ہیں یہ سب ان کی ہی کاوشوں اور جانکاہیوں کا ثمرہ ہے۔
- اترپردیش کو دہلی سے قربت کا بڑا فائدہ حاصل ہوا، متعدد بزرگوں نے جو بخارا، سمرقند، ماوراء النہر اور شام و مصر سے ہندوستان آئے، دہلی سے قربت کی وجہ سے یوپی کے علاقوں میں سکونت اختیار کی۔ ان بزرگوں نے بھی اشاعت اسلام کا کام بڑے پیمانہ پر انجام دیا جس کی وجہ سے آج یوپی میں مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد ہمیں نظر آتی ہے۔

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کے موسس اعلی کون ہیں؟

(a) شیخ بہاء الدین زکریا (b) عثمان ہجویری (c) شیخ عبد القادر جیلانی (d) سید احمد معروف

2. سب سے پہلے کون سے بزرگ شمالی ہند کے راستے بنگال تشریف لے گیے؟

(a) شیخ جلال الدین تبریزی (b) شیخ بہاء الدین زکریا (c) شیخ عبد القادر جیلانی (d) سب غلط

3. غازی بابا کا تعلق کس ریاست سے تھا؟

(a) بہار (b) پنجاب (c) گجرات (d) بنگال

4. ان میں سے کون شیخ فرید الدین گنج شکر کے شاگرد ہیں۔

(a) نصیر الدین چراغ دہلوی (b) نظام الدین اولیاء (c) بہاؤالدین سہروردی (d) سب صحیح

5. شہاب الدین محمد غوری نے لاہور کب فتح کیا۔

(a) 1186ء (b) 1250ء (c) 909ء (d) 1171ء

3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. دہلی سلطنت کے قیام سے قبل اترپردیش میں مسلم آبادی کہاں کہاں تھی؟
2. بنگال میں اشاعت اسلام کی وجوہات کیا رہیں؟
3. .پنجاب میں اسلامی دور حکومت کی تاریخ بیان کیجئے۔
4. شیخ بہاء الدین زکریا اور شیخ فرید الدین گنج شکر کی پنجاب میں تبلیغی مساعی کا کیا اثر ہوا؟

5. بنگال کے غازی بابا کون تھے اور ان کی کیا خدمات رہیں؟

3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. بہار اور اتر پردیش میں اشاعت اسلام میں صوفیاء کا کیا کردار تھا؟
2. بنگال میں اسلام کی تبلیغ میں صوفیاء کرام کی مساعی کیا رہیں؟
3. پنجاب میں اسلامی دور اور صوفیائے کرام کی تبلیغی مساعی پر اپنی معلومات تحریر کیجئے۔

3.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4. آب کوثر : شیخ محمد اکرام
5. دعوت اسلام : آرنلڈ، ترجمہ عنایت اللہ
6. ہندوستان اسلام کے سائے : شیخ عابد علی وجدی
7. تاریخ اشاعت اسلام : شیخ اسماعیل پانی پتی

اکائی 4: سندھ میں عربوں کی حکومتیں

اکائی کے اجزا:

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 سندھ کی قدیم تاریخ

4.2.1 سندھ کا جغرافیہ، موسم اور معدنیات

4.3 اسلامی دور سے قبل کے حالات

4.3.1 خانہ جنگی اور راجہ داہر کی تخت نشینی

4.3.2 راجہ داہر کی شادی

4.3.3 رنمل کی بغاوت اور عربوں کی امداد

4.4 عربوں کے ہند اور سندھ پر حملہ کی تاریخ

4.4.1 ولید بن عبدالملک کے دور میں سندھ پر حملہ کے اسباب

4.4.2 محمد بن قاسم کی آمد اور سندھ کی فتح

4.4.3 ہندوستان میں عربوں کی حکومت کے چار دور

4.5 سندھ خلافت اموی میں

4.6 خلافت عباسیہ کے دور میں سندھ میں عربوں کی حکمرانی

4.6.1 سندان پر عربوں کا قبضہ

4.6.2 سلطنت خاندان بنو سامہ

4.6.3 ملتان میں اسماعیلی حکومت

4.6.4 سومرہ حکمراں

4.7 اکتسابی نتائج

4.8 نمونہ امتحانی سوالات
4.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
4.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
4.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
4.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

سندھ کی تاریخ بہت قدیم ہے اور زمانہ قدیم سے اس پر تاخت و تاراج ہوتا رہا ہے۔ سکندر اعظم نے بھی سندھ کے بعض علاقوں کو تاخت و تاراج کیا تھا، عرب کا سندھ سے قدیم تعلق تجارت کا تھا لیکن جب عرب اسلام کی روشنی سے منور ہوا اور منتشر عرب یکجا ہو کر ایک بڑی سیاسی طاقت بنے اور ایران وروم کی حکومتوں کو زیر کرنا شروع کیا تو آس پاس کی سلطنتیں اس نئی طاقت سے چوکنی ہو گئیں۔ عرب شاید کافی طویل عرصہ تک سندھ کی جانب پیش قدمی نہ کرتے اگر راجہ داہر اپنی طاقت کے غرور میں آکر بار بار عربوں کو للکارنے کی جرأت نہ کرتا، اس نے کبھی اسلامی حکومت کی مخالف قوتوں کی فوجی مدد کی تو کبھی اسلامی حکومت کے باغیوں کو پناہ دی۔ سندھ کا پورا علاقہ محمد بن قاسم نے تقریباً فتح کر لیا تھا اور اگر اسے مہلت ملتی تو شاید پورا ہندوستان وہ اکیلا فتح کر لیتا لیکن قضاو قدر کو یہ منظور نہیں تھا۔ سندھ کی حکومت عمومی طور پر خلافت اموی یا خلافت عباسی کے ماتحت رہی ہے بیچ بیچ میں کچھ ایسے وقفے ضرور آئے جب سندھ کے والیوں نے بغاوت کر دی یا بدامنی سے فائدہ اٹھا کر حکام اور قلعہ داروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا لیکن جلد یا بدیر ان سب کو پھر سے حلقہ اطاعت میں پرو دیا جاتا تھا۔ لیکن جب خود ہی خلافت عباسیہ کمزور پڑنے لگی تو سندھ میں ہباری خاندان نے اولاً خلافت عباسیہ کی اطاعت کی اور اپنی طاقت اور خلافت عباسیہ کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے بعد میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سومرہ اسماعیلی شیعہ کی حکومت کا دور آتا ہے۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ سندھ کی قدیم تاریخ، اسلامی دور حکومت، اموی اور عباسی دور خلافت میں سندھ اور گجرات کے ساحلی علاقوں میں حکمرانی کی تاریخ اور سلطنت ہباری و سومرہ کے دور حکومت کی تاریخ سے بھی واقف ہو جائیں گے۔

4.2 سندھ کی قدیم تاریخ

سندھ کی تاریخ بہت قدیم ہے، وادی سندھ کی قدیم تہذیب کا پتہ موہن جوداڑو، عامری اور کوٹ ڈیجی کی تاریخی تحقیقات اور دریافت سے ہوتا ہے۔ اس تہذیب 175-3200 ق م کے بعد ایک ہزار سال کے حالات پر تاریکی اور گمنامی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ سندھ

کی حقیقی تاریخ کا آغاز شہنشاہ داریوش اول (515-520 ق م) کے تحت اس کے ایران سے تعلقات قائم ہونے سے ہوتا ہے جب سندھ کو فتح کر کے ایرانی سلطنت میں شامل کر لیا گیا، تقریباً دو صدیوں کے بعد (326-325 ق م) نے سندھ پر حملہ کیا، سکندر شمال کی جانب سے سندھ میں داخل ہو کر اروڑ (موجودہ روھڑی کے قریب) کے علاقہ سے گزرا اور آگے بڑھ کر موجودہ لاڑکانہ ضلع کے زرخیز خطہ کو فتح کرتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے سیوہن (سہون) کی قدیم بستی سے گزرتا ہوا وسطی ڈیلٹائی شہر پٹالا سے گزرا اور جنوب میں ساحلی بندرگاہ بابریکان میں لنگر ڈالا، پھر سندھ سے گدروشیا (مکران) کے راستے بابل روانہ ہوا۔ سکندر کی وفات کے بعد سندھ سیلوکس نکیتر، چندر گپت موریا (305 ق م)، باختری یونانیوں، پارتھیوں (دوسری و تیسری صدی ق م) سیتھیوں اور کوشانوں (100 ق م تا 200ء) کے زیر تسلط رہا۔ سیتھیوں نے سیستان اور سیوی کی طرح سندھ میں سیوہن اور سیوستان پر اپنے نام کی مہر ثبت کر کے ایک مستقل نشان چھوڑا۔ بھنبھور (کراچی سے ۳۹/ میل جنوب مشرق) کی کھدائی نے سیتھیائی مواد پر روشنی ڈالی ہے جس سے سندھ کے ساحلی خطے تک ان کے قبضے کی تصدیق ہوتی ہے۔ کوشان فرمانروا کنشک (100-78ء) کے زیر اثر سندھ نے بدھ مت قبول کر لیا۔ تیسری سے ساتویں صدی تک سامانی ایران کی سیاسی برتری کے زیر اثر رہا (اگرچہ ہیاطلہ اور سفید ھنوں نے پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک مختصر عرصہ کیلئے اقتدار قائم کیا) چھٹی صدی عیسوی میں سندھ میں مقامی سمہ قبائل کے رائے خاندان کی مستقل حکومت قائم ہوئی۔ رایان سمہ غالباً ایرانی شہنشاہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ روسائے سمہ کا قدیم روایتی لقب "جام" اسی حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ بالآخر ساتویں صدی میں ایک برہمن پنڈت چچ نے سندھ میں رایان سمہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور سندھ پر برہمنوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ جس میں بدھ مت کے بھکشوؤں کے ساتھ سختی برتی گئی اور رعایا پر منو کے قوانین عائد کیے گیے جو ذات پات پر مبنی تھے، چھوت چھات کی سختیوں کی وجہ سے رعایا ناراض ہو گئی اور جب محمد بن قاسم کی برہمن راجا داہر سے 711ء میں مزاحمت ہوئی تو بودھوں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا اور اس طرح سندھ میں اسلامی اقتدار کی راہ ہموار ہوئی۔

4.2.1 سندھ کا جغرافیہ، موسم اور معدنیات

زمین: سندھ کی زمین کا وصف یہ ہے کہ یہاں زمین میں ریت زیادہ ہے جس کی بناء پر یہ ناقابل زراعت ہے۔ سندھ کے محض کچھ ہی ایسے حصے ہیں جہاں کی زمین قابل زراعت ہے۔ شمال سے جنوب ایک لمبی پٹی گئی ہے جس کے ایک جانب دریائے سندھ اور دوسرے پہلو پر مغربی نارو ہے جو دریائے سندھ سے ایک جداگانہ شاخ کی طرح نکل کر ایک سو میل تک بہتا چلا گیا ہے۔ یہاں دوآبہ ہونے کی وجہ سے زمین بہت زرخیز ہے۔ چھوٹے چھوٹے کوہسار بھی ہیں۔

موسم: یہاں سردی اور گرمی میں سخت گرم پڑتی ہے، مثل مشہور ہے کہ یہاں کی گرمی گورے کو کالا کر دیتی ہے۔ دھوپ کی تپش بے حد زیادہ ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ گرمی جیکب آباد میں ہوتی ہے وسط علاقہ میں آب و ہوا معتدل ہے بالخصوص حیدرآباد کا موسم بہت اچھا رہتا ہے۔ دریا کی طغیانی کی موسم میں مچھروں اور پسوؤں کی بن آتی ہے۔

ساحل: سندھ کے مقابل خشکی سے دو میل ہٹ کر ایک ٹکڑا زمین جو کراچی سے کچھ تک پھیلا ہوا ہے یہی سندھ کا ساحل ہے۔ زمین کا یہ ٹکڑا تین میل چوڑا ہے یہ اتنے نشیب میں ہے کہ سمندر کے چڑھاؤ میں پانی میں غائب ہو جاتا ہے اور جب پانی اترتا ہے تو نمایاں ہو کر جزیرہ

کی شکل میں نظر آتا ہے۔

پیداوار: زیادہ تر جوار ہوتا ہے، مکئی اور باجرہ کی بھی فصل ہوتی ہے پھلوں میں کھجور فراوانی سے ہوتا ہے۔لاڑکانہ اور لار ضلع میں سفید اور لال چاول کی فصل ہوتی ہے۔ گنا کی پیداوار حیدرآباد میں جب کہ گیہوں کی پیداوار دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر، تل تھرپا کر ضلع میں، جیکب آباد میں تربوز، سنگترہ، پپیتا، ناریل وغیرہ کی پیداوار ہوتی ہے۔

معدنیات: معدنیات میں لوہے اور کوئلے کی کانیں ہیں۔ پہاڑوں سے تعمیرات کیلئے پتھر نکالے جاتے ہیں۔ جنوبی پہاڑوں سے گچی مٹی نکالی جاتی ہے جب کہ کچھ کے رن اور تعلقہ کھپرو جھیل سے نمک کی پیداوار ہوتی ہے۔

قومیں: تاریخ کی روشنی میں اس ملک کی قدیم آبادی جاٹ اور مید تھے۔ یہ دونوں ہی دریائے سندھ کے کنارے آباد تھیں، اب بھی بڑی تعداد ان میں جاٹوں اور بلوچیوں کی ہے جو شہروں اور گاؤں میں آباد ہیں۔ ایک تیسری قوم یہاں حبشیوں کی بھی ہے جو بطور غلام یہاں آئے تھے۔ اس وقت یہاں مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی آباد ہیں۔

زبان: یہاں کی موجودہ زبان سندھی ہے جس میں قدیم زبان کے ساتھ عربی اور فارسی کے لفظ ملے ہوئے ہیں۔ یہ زبان عربی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ لہجہ کے اعتبار سے شمال اور جنوب میں فرق ہے۔ خط خداوادی نام ایک مزید خط ہے جس کا استعمال عموماً غیر مسلم بالخصوص ہندو کرتے ہیں۔ سندھ کی حدود جہاں دیگر ریاستوں سے ملتی ہیں تو سرحدی علاقوں میں ان علاقوں کی زبان جیسے بروہی، بلوچی، گجراتی، کچھی، مکرانی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔

4.3 اسلامی دور سے قبل کے حالات

سندھ میں چھٹی صدی عیسوی میں راجہ ساہ سی کا بیٹا شری ہرش راجہ بنا، اس کا دارالحکومت الور نام کا شہر تھا۔ شری ہرش ایک عرصہ تک اطمینان سے حکومت کرتا رہا کہ اچانک ایرانیوں (حاکم نیمروز) نے حملہ کر دیا۔ راجہ کو حملہ کی اطلاع ملی تو اس نے پہلے سمجھا کہ یہ معمول کی سرحدی جھڑپ ہے لیکن جب نیمروز فتح کا ڈنکا بجاتا ہوا مکران تک پہنچ گیا تو راجہ کو تنبیہ ہوئی اور اس نے بھی ایک زبردست لشکر تیار کیا اور نیم روز سے مقابلہ کیلئے روانہ ہوا۔ ایرانیوں اور سندھیوں میں خونریز جھڑپ ہوئی، دوپہر کے وقت ناگاہ ایک تیر شری ہرش کو لگا اور وہ مر گیا، راجہ کے مرنے سے سندھی فوج حواس باختہ ہو گئی اور جس کا منہ جدھر اٹھا بھاگنے لگا، بہت سارے سندھی سپاہیوں کو ایرانیوں نے تعاقب کر کے قتل کیا اور پھر فتح کا علم لہراتا ہوا نیم روز واپس چلا گیا۔ راجہ کے مرنے کی خبر الور پہنچی تو دارالحکومت میں کہرام مچ گیا اور لوگ رونے پیٹنے لگے۔ ارکان دولت نے راجہ کے بیٹے کو جو ولی عہد تھا راجہ بنایا اور اس کو رائے ساہسی کا خطاب دیا۔

رائے ساہسی نے ابتداء میں ایک سال تو حکومت کے انتظامات پر توجہ دی اور ملک میں امن وامان قائم کیا لیکن پھر اس کے بعد اس نے سارا انتظام اپنے وزیر 'رام' کو سونپ دیا۔ یہ وزیر بہت ہوشیار اور عقل مند تھا اس نے سندھ کے سارے انتظامات بخوبی سنبھالے اور راجہ کی عدم توجہ کا کسی کو احساس ہونے نہیں دیا۔

چچ کی آمد: اسی دوران ایک دن ایک برہمن جس کا نام چچ تھا رام کے پاس آیا اور کہا کہ اس کا والد الور کا شہری اور ایک مندر کا پجاری ہے ،رام نے اس کی لیاقت وصلاحیت اور اس کی شیریں زبانی سے متاثر ہو کر اس کو دیوانی کا عہدہ سونپ دیا۔ ایک دن رام غائب تھا اور کچھ سرکاری کاغذات لکھے جانے تھے کہ چچ نے راجہ سے کہا کہ وہ بھی ان کاغذات کو لکھ سکتا ہے۔ راجہ نے یہ ذمہ داری دی اور اس نے بہترین انداز میں سرکاری فرامین تحریر کئے۔ راجہ اس کی لیاقت سے خوش ہوا اور اپنے وزیر رام سے اس کا تذکرہ کیا، رام نے اس کو اپنا نائب بنالیا۔ کچھ مدت کے بعد رام کی موت ہو گئی اور چچ راجہ کا وزیر بن گیا۔ اہم کاغذات پر راجہ کا دستخط لینے کیلئے رام محل سرا کے اندر جاتا رہتا تھا۔ ایک دن چچ بھی محل سرا میں گیا۔ رانی نے یہ سوچ کر پردہ نہیں کیا کہ یہ تو برہمن ہے۔ اس کی شیریں زبانی سے راجہ تو متاثر تھا ہی، اس نے رانی کا دل بھی موہ لیا۔ دھیرے دھیرے رانی کو اس سے عشق ہو گیا اور اس نے چچ سے اظہار محبت کیا، چچ نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ راجہ کا فادار ہے۔ اس دوران کئی لوگوں نے راجہ کو چچ اور رانی کے بارے میں باخبر کیا لیکن راجہ اس پر اندھا اعتماد کرتا تھا اس نے اسے حاسدین کا حسد سمجھا اور کوئی تحقیق و تفتیش نہیں کی۔

انہوں دنوں راجہ ایک سخت مرض میں مبتلا ہوا، اطباء اور حکما اس کے علاج سے عاجز آگئے ،رانی نے یہ دیکھ کر چچ کو پیغام بھیجا کہ راجہ کی کوئی اولاد نہیں ہے اگر تم مجھ سے شادی پر آمادہ ہو جاؤ تو میں تمہیں سندھ کا راجہ بنوادوں گی۔ چچ نے اس پیغام کو قبول کر لیا۔ رانی نے تمام ارا کین حکومت کا اجلاس طلب کیا اور راجہ کے ہاتھ سے اس کی خاص انگوٹھی نکال کر خفیہ طور پر چچ کو دیدی اور کہا کہ راجہ نے چچ کو اپنا قائم مقام بنایا ہے اور یہ انگوٹھی جو چچ کے پاس ہے اس کا ثبوت ہے۔ ارا کین دولت نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چند دنوں بعد راجہ مر گیا تو رانی نے ایسے تمام افراد کو تنہا تنہا بلایا جو حکومت کے دعویدار ہو سکتے تھے ان کو کہا گیا کہ راجہ آپ کیلئے وصیت کرنا چاہتے ہیں اور سبھی کو دھوکے سے قتل کرادیا، چنانچہ ایک طرف راجہ کی لاش جلائی گئی اور دوسری طرف چچ سندھ کی حکومت پر براجمان ہوا۔

راجہ بننے کے بعد چچ نے سابق راجہ کی رانی سوبھن دیوی سے شادی کر لی اور خزانہ سے روپیہ نکال کر عوام اور رعایا میں تقسیم کیا، چچ کی فیاضی سے عوام اور فوج خوش ہو گئی۔

راجہ رائے ساہسی کے مرنے کے بعد چچ کے راجہ بننے کی خبر جب جے پور کے راجہ کو ملی جو رائے ساہسی کا رشتہ دار ہوتا تھا (چچ نامہ کی روایت کے مطابق جے پور کا راجہ رائے ساہسی کا بھائی تھا، جے پور سے مراد بھی آج کا جے پور نہیں جو راجستھان میں ہے کیوں کہ یہ شہر تو مغل دور میں بسایا گیا ہے بلکہ وہ شہر ہے جو جیسلمیر اور سندھ کی سرحد پر تھا) ایک لشکر جرار لے کر سندھ کی جانب روانہ ہوا۔ اس نے چچ کو پیغام بھیجا کہ تم تو برہمن ہو، تمہیں حکومت سے کیا کام، کہیں تنہائی میں کچھ علمی اور دینی کام کرو۔

چچ نے رانی سوبھن دیوی سے اس صورت حال میں مشورہ لیا تو رانی نے اسے طعنہ دیا کہ بہتر ہے کہ تم میرے زنانہ کپڑے پہنو اور اپنے کپڑے مجھے دے دو، پھر رانی سے اسے مشورہ دیا کہ فوج کو روپے پیسے دے کر خوش کیا جائے، چنانچہ ایک بڑا لشکر تیار کر کے وہ جے پور کے راجہ سے مقابلہ کیلئے روانہ ہوا۔

چچ کی مکاری: جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو جے پور کے راجہ مہرت نے کہا کہ فوج کو لڑانے اور ہزاروں کی جان گنوانے

سے کیافائدہ، بہتر ہے کہ ہم تم آپس میں لڑیں، جوجیت جائے اسی کی فتح تسلیم کی جائے، چچ نے مجبوراًاوراپنی شرم رکھنے کیلئے یہ شرط منظور کرلی۔ شرط میں یہ بھی شق شامل تھی کہ دونوں پاپیادہ مقابلہ کریں گے۔

چچ نے اپنے خاص غلام کو کہہ رکھاتھا کہ جیسے ہی ہم میدان میں پہنچیں توتم گھوڑالے کر پہنچ جانا، چنانچہ راجہ مہرت بغیر گھوڑے کے تھااور مقابلہ کاوقت آتے ہی چچ کاغلام گھوڑالے کر پہنچ گیا، گھوڑے پر سوار ہو کر چچ نے ایسی تلوار ماری کہ راجہ مہرت کا سر گردن سے الگ ہو گیااوراسی دوران چچ کی فوج نے مہرت کی فوج پر حملہ کر دیا، راجہ مر ہی چکاتھافوج تتر بتر ہو گئی اور چچ اپنی فتح کا جشن مناتاہواالور پہنچ گیا۔

چچ کواب فتح کامزہ مل چکاتھااس نے اس پر ہی بس نہیں کیابلکہ اس نے اردگرد کی حکومتوں کو بھی زیر کرنے کی سوچی اورایک جرار فوج لے کر اور دارالحکومت میں اپنے بھائی چندر میر کو اپنانائب بناکر نکل کھڑاہوا۔ اس نے اولاً قلعہ پابیافتح کیاپھر چچ اسکلندہ کی جانب متوجہ ہوا اوراس کوفتح کیااوراس کے بعد سکہ کو بھی فتح کیا۔ ان سب فتوحات کے بعد چچ ملتان کی جانب متوجہ ہوااور ایک بڑی جنگ کے بعد ملتان فتح کیا اور دارالحکومت الور آگیا۔ ایک سال بعد وہ مغربی سندھ کو فتح کرنے کیلئے نکلااور برہمن آباد کوفتح کرلیا۔ اس نے کرمان کو بھی فتح کیااور پھر دارالسلطنت الور آگیا۔ چالیس سال حکومت کرنے کے بعد سنہ 40ھ، مطابق 660ء میں دنیاسے رخصت ہو گیا۔

راجہ چندر: چچ کی موت کے بعد چندر کوسندھ کااقتدار ملا، یہ بدھ مذہب کا پیروتھا، اس نے لوگوں کوبدھ مذہب کے قبول کرنے پر مجبور کرناشروع کیا۔ اس وقت سندھ میں عام افراد بدھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے لیکن حکومت کے دروبست پر قابض افراد برہمن تھے۔ چندر کے دور حکومت میں یہ واقعہ رونماہواکہ سیوستان کے حاکم مہتہ نے قنوج کے راجہ سری ہرشار (متوفی ۷۲ھ مطابق ۶۴۷ء) کواس بات کی ترغیب دی کہ وہ سندھ کی حکومت پر قبضہ کرے، قنوج کاراجہ اس ترغیب سے متاثر ہوااور ہرہاس بن کسایس کی سپہ قیادت میں ایک فوج روانہ کی، چچ کانواسہ جوکشمیر کے سرحدی علاقوں کاخودمختار حاکم تھاوہ بھی قنوج کے راجہ کی فوج سے مل گیا۔ ہرہاس نے جے چندر کوایک دھمکی آمیز خط لکھ کر اطاعت قبول کرنے کیلئے کہا، چندر کیلئے یہ ذلت موت سے بھی بدتر تھی اس نے بھی جنگ کی تیاریاں شروع کر دی اوراسی کے ساتھ قلعوں کے استحکام پر پوری توجہ دی اس کانتیجہ یہ ہواکہ حملہ آور فوج ناکام ونامراد واپس چلی گئی، اس افتاد کے بعد مزید ۷سال چندر نے حکومت کی اور 48ھ مطابق 866ء میں اس دنیائے ناپائیدار سے رخصت ہو گیا۔

4.3.1 خانہ جنگی اورراجہ داہر کی تخت نشینی

عام طور پر جیساکہ ہوتاہے ایک بڑی سلطنت کے حکمراں کے مرنے کے بعد حکومت پر دعویٰ کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہونے کی صورت پر خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے، یہاں بھی یہی صورت حال پیش آئی، ارور (الور) کے تخت پر چچ کاچھوٹالڑکاراجہ داہر گدی نشیں ہو گیااور برہمن آبادمین چندر کے لڑکے 'راج' نے خودمختاری کااعلان کر دیا۔ ایک سال بعد جب راج کی موت ہوئی توراجہ داہر کے بڑے بھائی دھر سنگھ نے برہمن آباد پر قبضہ کرلیا۔ راجہ دھر سنگھ نے برہمن آباد کے انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد پہلے مشرقی اطراف پر قبضہ کیا، پھراس نے برہمن آباد کے جنوبی علاقہ کی طرف توجہ کی اوروہاں چھ ماہ مقیم رہ کر ارور کے قلعہ کو مضبوط کیا۔ راجہ داہر اور دھر سنگھ میں سندھ کی حکومت تقسیم ہو گئی اور شمالی سندھ پر راجہ داہر اور جنوبی سندھ پر دھر سنگھ قابض ہو گئے۔

4.3.2 راجہ داہر کی شادی

راجہ داہر کی بہن رانی بائی جوان ہو گئی اوراس سے شادی کی درخواست راجہ بھاٹیہ نے کی تھی۔ لیکن اسی دوران ایک درباری نے نجومی کی پیش گوئی اسے بتائی کہ جو رانی بائی سے شادی کرے گا وہ سندھ کا راجہ ہو گا، یہ پیش گوئی سن کر داہر متفکر ہو گیا، وزیر نے بہن سے شادی کا مشورہ دیا، راجہ نے عوامی چہ میگوئیوں کا عذر کیا، وزیر نے ایک تدبیر سے بکری کے بالوں میں سے گھاس پیدا کی اوراس کو شہر میں گھمایا اولاً توخوب چرچا ہوا پھر تین دن بعد لوگ اس کے عادی ہو گئے، وزیر نے اس تدبیر سے راجہ داہر کو بتایا کہ عوام جلد ہی کسی بات کو بھول جاتے ہیں اس کو بھی بھول جائیں گے۔ راجہ داہر نے اپنی بہن پر چادر ڈال دی، مطلب یہ کہ وہ اس کی بیوی بن گئی، لیکن اس سے بیوی والے تعلقات قائم نہیں کئے بلکہ صبح ہوتے ہی اسے واپس بھیج دیا۔

داہر کے بڑے بھائی کا رد عمل: جب اس کی خبر داہر کے بڑے بھائی دھر سنگھ کو ملی تواسے بہت صدمہ ہوا اور ملاقات کیلئے طلب کیا لیکن وزیر نے اسے جانے سے باز رکھا، اس پر دھر سنگھ ایک بڑا لشکر لے کر الور کی جانب بڑھا، راجہ داہر بھی فوج لے کر الور سے نکلا، کچھ معززین نے دونوں کے درمیان صلح صفائی کرائی اور راجہ داہر کی ماں نے دھر سنگھ کو شادی کی حقیقت سے آگاہ کیا کہ یہ محض ستارہ کی نحوست کے ازالہ کیلئے اٹھایا گیا قدم ہے، دھر سنگھ نے بظاہر اس کا قصور معاف کر دیا لیکن بباطن وہ داہر کی اس حرکت پر مشتعل تھا اور اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ خفیہ تدبیر کی کہ راجہ داہر سے کہا کہ تم قلعہ سے میرے ساتھ باہر چلو تا کہ ہم دونوں کو یکجا دیکھ کر سبھی کو ہمارے اتحاد کا یقین ہو جائے۔ راجہ داہر مان گیا لیکن جیسے ہی قلعہ کے دروازہ کے قریب پہنچا تواسے احساس ہوا کہ وہ پھنس چکا ہے اس نے وزیر سے مشورہ مانگا، وزیر نے قلعہ کے دروازہ میں لٹک جانے کا مشورہ دیا، اس نے ایسا ہی کیا اور خالی ہاتھی بغیر دروازہ کے قلعہ سے نکل گیا جب دھر سنگھ نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو دوسرے ہاتھی پر راجہ داہر نہیں تھا اور قلعہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اپنے فریب کی حقیقت کھلنے پر اسے بہت صدمہ ہوا۔ وہ بخار میں مبتلا ہو گیا اوراس کے بدن پر بڑے بڑے آبلے نکل گئے اور تیسرے دن سنہ 52ھ مطابق 670ء مر گیا۔ دھر سنگھ کے مرنے کے بعد راجہ داہر نے برہمن آباد کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا، دھر سنگھ کی بیوہ سے شادی کر لی اور دھر سنگھ کے بیٹے چچ کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آیا۔ یہ تمام تفصیل سندھ کی تاریخ چچ نامہ سے لی گئی ہے۔

4.3.3 رنمل کی بغاوت اور عربوں کی امداد

59ھ مطابق 677ء میں بھاٹیا کے راجہ رنمل نے داہر پر حملہ کر دیا۔ داہر پر حملہ کرنے کے اسباب کیا ہوئے وہ واضح نہیں ہے۔ (قیاس کیا جاسکتا ہے کہ راجہ بھاٹیا نے اولا داہر کی بہن رانی بائی سے شادی کا رشتہ بھیجا تھا اوراسے منظور بھی کر لیا گیا تھا لیکن نجومی کی پیش گوئی کی وجہ سے شادی نہیں ہو سکی اور قانونی طور پر راجہ داہر نے اسے اپنی بیوی بنالیا، داہر کی اس حرکت کو اس نے اپنی توہین خیال کیا اور اسی بناء پر داہر پر حملہ آور ہوا) رنمل کے پاس بڑی زبردست فوج تھی۔ جیسا کہ آپ نے پچھلی اکائیوں میں پڑھا کہ راجہ رنمل کے خلاف راجہ داہر نے محمد علافی سے مدد لی اور فتح یاب ہوا۔

محمد علافی کے اس کارنامہ سے راجہ داہر بہت خوش ہوا اوراس نے محمد علافی اوراس کے ساتھیوں کی بڑی آؤ بھگت کی اور بعض

روایات کے مطابق اس کو سندھ کی حکومت کا وزیر اعظم بھی بنادیا۔اس کے بعد داہر پورے اطمینان سے حکومت کرتا، یہاں تک کہ 33ء سال کے بعد راجہ داہر کی خلافت امویہ سے ان بن ہوئی اور بالآخر محمد بن قاسم نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ واضح رہے کہ اس موقع پر محمد علافی اوراس کے ساتھی راجہ داہر کی حمایت میں محمد بن قاسم اوراس کی فوج سے لڑے تھے اور داہر کی سلطنت کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

4.4 عربوں کے ہند اور سندھ پر حملہ کی تاریخ

عربوں کے سندھ پر حملہ کرنے کی تاریخ عام طور پر محمد بن قاسم کے وقت سے بیان کی جاتی ہے لیکن در حقیقت سندھ اور ہند پر حملہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ہی ہوا تھا۔ سنہ 15ھ میں عثمان بن ابی عاص ثقفی بحرین اور عمان کے گورنر ہوئے انہوں نے ایک بحری بیڑا تیار کر کے ہندوستان پر حملہ کرنے کیلئے روانہ کیا، یہ بیڑا ممبئی سے متصل تھانہ تک پہنچا، حضرت عمرؓ نے عثمان بن ابی العاص ثقفی کی اس حرکت پر ناراضگی کا اظہار کیا، عثمان بن ابی العاص ثقفی نے دوبارہ بحری بیڑا تیار کر کے فوج کو روانہ کیا، اس بار یہ بحری بیڑا سندھ کے ساحلی شہر دیبل تک پہنچا اور دشمنوں کو شکست دے کر مال غنیمت کے ساتھ واپس آیا۔ حضرت عمر کے دور میں ہی مکران پر عبد اللہ بن عامر بن ربیع نے قبضہ کرلیا، خلافت عثمانی میں کابل فتح ہوا لیکن یہ فتح وقتی تھی۔ ہندوستان پر پہلا حملہ بھی خلافت عثمانی میں ہوا جب کہ ربیع بن زیاد نے زرنج کو فتح کرلیا۔ زرنج کو فتح کرنے کے بعد ربیع بن زیاد آگے بڑھے اور زرنج اور کش کا درمیانی علاقہ جو اب بلوچستان میں شامل ہے اس کو فتح کرلیا، بلوچستان نام کا اس وقت کوئی صوبہ نہیں تھا بلکہ اس کو ہندوستان کا علاقہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ خلافت مرتضویہؓ میں زیادہ وقت آپسی خانہ جنگی اور خارجیوں کے فتنے کو فرو کرنے میں گذرا، سنہ 38ھ میں ثاغر بن دعور ا ایک بڑی فوج لے کر سیستان پہنچے اور سرحدی علاقوں کو فتح کرتے ہوئے قیقان تک پہنچے اور ایک زبردست لڑائی کے بعد قیقانیوں کو شکست دی، (قیقان سندھ کا وہ حصہ ہے جو خراسان سے متصل ہے اور آج کل اس کا نام قلات ہے یہ بلوچستان صوبہ کا ایک حصہ ہے اور پاکستان میں ہے)۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد زمام اقتدار حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھ میں مفتوحہ علاقوں پر جو ہاتھ سے نکل گئے تھے ان پر دوبارہ فوج کشی کی گئی، کوئی نیا علاقہ قبضہ میں نہیں آیا۔ سنہ 44ھ میں مہلب بن ابی صفرہ درہ خیبر کے راستے سے کابل اور پشاور کی پہاڑی گھاٹیوں کو عبور کر کے ہندوستان پہنچے اور جب واپس ہونے لگے تو ملتان اور پشاور کے درمیانی علاقوں پر حملہ کیا۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مہلب پہلا عرب سپہ سالار تھا جس نے سرزمین ہند پر فاتحانہ قدم رکھا، عبد الملک سنہ 65ھ میں سریر آرائے خلافت ہوا لیکن اس کا زیادہ وقت اندرونی امن اور استحکام میں گزرا۔

4.4.1 ولید بن عبد الملک کے دور میں سندھ پر حملہ کے اسباب

سندھ پر حملہ کی چار وجوہات تھیں:

1. پہلی تو یہ کہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں عبد اللہ بن عامر بن ربیع نے مکران پر حملہ کیا تو مکران والوں نے سندھ کے راجہ سے مدد مانگی اور اس نے مدد کی، کچھ عرصہ کے بعد حکم بن عمر تغلبی مکران کی طرف بڑھے مکران کے راجہ نے پھر سندھی راجہ سے مدد مانگی

اوراس نے پھر مدد کی۔

2. دوسری وجہ یہ تھی کہ محمد علافی نے خلافت امویہ کے خلاف بغاوت کی تھی اور ایک فوجی افسر کو قتل کر کے بھاگا تھا،اس کو سندھ کے راجہ نے پناہ دے کر خلافت امویہ کو مشتعل کرنے کا کام کیا تھا۔

3. سراندیپ سے لاوارث مسلمانوں اور سراندیپ کے راجہ کے تحائف پر مشتمل جہاز کو دیبل کے قریب جو راجہ داہر کے علاقہ میں تھا لوٹا گیا اوراس نے اس سلسلے میں کوئی بھی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا،اگر کسی ملک کے شہری پر کسی دوسرے ملک میں کوئی ظلم ہو اور وہ ملک اس ظلم کے سدباب کیلئے تیار نہ ہو تو پھر ایک خوددار حکومت وہی کرتی ہے جو حجاج نے ولید کے نائب ہونے کی حیثیت سے کیا۔

4. عبدالرحمن بن محمد بن اشعث کو بغاوت کے جرم میں ساتھیوں سمیت قتل کر دیا گیا لیکن ان کے گروپ کے ایک بارسوخ شخص عبدالرحمن بن عباس بن ربیعہ بھاگنے میں کامیاب رہا اور وہ سندھ میں آ کر پناہ گزیں ہو گیا۔

4.4.2 محمد بن قاسم کی آمد اور سندھ کی فتح

محمد بن قاسم سے قبل حجاج نے دو فوجی مہم روانہ کی لیکن دونوں مہم ناکام رہی،اب حجاج نے نہایت سوچ بچار کر کے سنہ 92ھ مطابق 711ء میں محمد بن قاسم نام کے سپہ سالار کی قیادت میں روانہ کی۔ "تاریخ سندھ" کے مولف مولانا سید ابو ظفر صاحب دسنوی اور "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" کے مولفین نے محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف ثقفی کا داماد بتایا ہے اور کہا ہے کہ جب اسے ہندوستان پر حملہ کرنے والی فوج کی قیادت سونپی گئی تھی تو وہ 17 سال کا نوجوان تھا لیکن "برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش" کے مصنف اسحاق بھٹی نے ان دونوں باتوں کو غلط بتایا ہے اور عربی کی تاریخی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ نہ حجاج کا داماد تھا اور نہ ہی سندھ پر حملہ کرنے کے وقت اس کی عمر 17 سال تھی بلکہ اس وقت اس کی عمر 27-30 سال کے درمیان تھی۔

سنہ 93ھ مطابق 712ء میں محمد بن قاسم مکران کے راستہ سے چل کر دیبل کے سامنے جا پہنچا اور تقریباً 6 ماہ تک دیبل کا محاصرہ کئے رہا اور بالآخر اسے فتح کیا،شہر میں چار ہزار عرب بسائے گئے اور حمید ن زارع نجدی کو حاکم مقرر کیا گیا۔ بعض مورخین کا یہ کہنا ہے کہ کراچی ہی کا گزشتہ نام دیبل ہے۔ اس دوران میں سندھ کے جنوبی حصے کا شہر نیرون فتح ہو چکا تھا۔ دریائے سندھ کے مغرب میں شمالی صوبہ سیوستان کی بستیوں پر بھی مختصر مدت میں قبضہ ہو گیا۔ مغربی سندھ کے بیشتر رئیس محمد بن قاسم کے عدل وانصاف اور مہربانی سے متاثر ہو کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ اس کے بعد عربوں نے جھم پیر کے مقام سے دریا پار کیا۔ راور کے قریب راجہ داہر سے مقابلہ ہوا،کئی دنوں کی چھوٹی موٹی جھڑپوں کے بعد 10 رمضان المبارک کو زبردست جنگ ہوئی،دونوں فریقوں نے پورے طور پر داد شجاعت دی،اس جنگ میں راجہ داہر مارا گیا اور یوں سندھ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ مورخین میں اختلاف ہے کہ آیا محمد بن قاسم نے سندھ میں راجہ داہر کی بیوی سے شادی کی تھی یا نہیں لیکن تاریخ سندھ کے مصنف مولانا ابو ظفر دسنوی کا رجحان شادی کرنے کی جانب ہے اور چچ نامہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ محمد بن قاسم نے یہ شادی سیاسی مصالح کے سبب کی تھی کیونکہ اس وقت محمد بن قاسم بھرپور جوان تھا اور رانی لاڈھی اس

کے مقابلہ میں عمر دراز تھی۔ راجہ داہر کی موت سے سندھ میں برہمن اور بودھ حکمرانوں کا سلسلہ ختم ہوا اور اسلامی دور شروع ہوا۔ محمد بن قاسم نے جگہ جگہ اپنے عمال متعین کئے اور مفتوحین سے اس نے اتنا بہتر سلوک کیا کہ لوگ دور دراز سے آکر اس کی اطاعت کا دم بھرنے لگے۔ ماہ ذوالحجہ میں سندھ کا ایک اہم علاقہ برہمن آباد بھی فتح ہو گیا۔ بعد میں جس کے کھنڈرات پر منصورہ نامی سلطنت کی تعمیر ہوئی۔ محمد بن قاسم نے سال ڈیڑھ سال کی مدت میں دارالحکومت الور یا ارور (موجودہ دور میں روہڑی کے قریب ایک علاقہ ہے) اسکندہ (موجودہ وقت میں اچ کے نام سے مشہور ہے) قلعہ بھاٹیہ (موجودہ بہاول پور کے قریب یہ مقام واقع ہے) اور ملتان کو فتح کرلیا۔ اس طرح اس نے مختصر مدت میں پوری سندھ کی حکومت پر قبضہ کرلیا۔ اب اس کا ارادہ آگے بڑھ کر قنوج کی حکومت سے جو فوجی اعتبار سے بہت زبردست تھی، دودو ہاتھ کرنے کا تھا، قنوج کے راجہ کے پاس اطاعت قبول کرنے کا خط سفیر کی معرفت بھیج دیا گیا تھا جس پر قنوج کا راجہ بہت برہم ہو گیا اور جنگ میں ہار جیت پر فیصلہ موقوف کیا، لیکن اسی دوران قضاوقدر کا فیصلہ غالب آیا اور خلافت اموی کے پایہ تخت دمشق میں ولید بن عبدالملک کے بعد سلیمان بن عبدالملک نیا خلیفہ بنا۔

سلیمان بن عبدالملک کو حجاج اور اس کے متعین کردہ عمال اور رشتہ داروں سے بہت عناد تھا۔ اس نے محمد بن قاسم کی معزولی اور گرفتاری کا پروانہ بھیج دیا، محمد بن قاسم کے پاس اتنی جمعیت تھی کہ اگر وہ چاہتا تو بغاوت کر سکتا تھا لیکن اس نے محض اپنی انا کے لیے ہزاروں کی جان خطرے میں ڈالنا گوارا نہ کیا بلکہ جان کو خطرہ ہوتے ہوئے بھی سلیمان بن عبدالملک کے ظالمانہ حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، اس کو ہتھکڑیاں لگائی گئیں، ٹاٹ کے کپڑے پہنائے گئے اور مجرموں کی طرح دمشق روانہ کیا گیا اور پھر اسے قید خانہ میں ڈال دیا گیا جہاں اس پر اتنی ظلم وزیادتی کی گئی کہ قید خانے میں ہی اس کی موت ہوگئی۔ محمد بن قاسم کی اچانک معزولی سے سندھ میں فتوحات کا سیلاب یکدم نہ صرف رک گیا بلکہ سمندر جس طرح چڑھاؤ کے بعد اترتا ہے اسی طرح اس کی فتوحات سمٹنے لگیں اور مفتوحہ علاقے خود مختار ہونے لگے۔

4.4.3 ہندوستان میں عربوں کی حکومت کے چار دور

ہندوستان بلکہ صحیح لفظوں میں کہیں تو سندھ اور اس کے ساحلی علاقوں میں عربوں کی حکومت کی چار دور رہے ہیں۔ (1) خلافت امویہ، (2) خلافت عباسیہ (3) خاندان ہباری (4) سومرہ خاندان۔ سومرہ خاندان کے بارے میں مورخین کی آراء میں اختلاف ہے کوئی ان کو غیر مسلم کہتا ہے تو کوئی ان کو ہندوستانی نو مسلم کہتا ہے اور کوئی ان کو نو مسلم یہودی قرار دیتا ہے۔ تاریخ سندھ کے مولف مولانا ابو ظفر ندوی نے بڑی تحقیق اور تفتیش سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ لوگ اصلاً شیعہ تھے اور فاطمی خلافت کے زیر اثر تھے اور عرب تھے لیکن پھر یہاں کر مخلوط النسل ہو گئے۔

4.5 سندھ خلافت اموی میں

سندھ میں اموی خلافت کا دور ولید بن عبدالملک سے شروع ہوتا ہے۔ خلافت امویہ میں سندھ میں رونما ہونے والے واقعات

اختصار کے ساتھ ذکر کئے جاتے ہیں۔ یزید بن ابی کبشہ سکسکی جس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کرکے دربار خلافت روانہ کیا تھا، محض اٹھارہ دن کے بعد اس کی موت ہوگئی۔ اس کے بعد حبیب بن مہلب کو سندھ کی ذمہ داری دی گئی۔ 20 صفر 99ھ میں سلیمان بن عبدالملک کی موت ہوئی اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ بنے، انہوں نے یزید بن مہلب کو عراق وخراسان سے اور اس کے بھائی حبیب بن مہلب کو سندھ کی گورنری سے معزول کیا اور خیانت کے جرم میں قید کردیا۔ وقت کی الٹ پھیر کا اس سے بہتر کیا نمونہ ہوگا کہ کل جو یزید بن مہلب محمد بن قاسم کو ہر قسم کی ایذا دے رہا تھا آج خود قید ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد سندھ اور اطراف کے تمام راجوں اور جاگیرداروں کو اسلام قبول کرنے کا دعوتی خط روانہ کیا، اکثر نے اسلام قبول کیا اور بعض نے جزیہ دینا منظور کیا، جن راجوں نے اسلام قبول کیا ان کو ان کے علاقے پر برقرار رکھا گیا۔ داہر کا بیٹا جے سنگھ بھی ان میں سے ایک تھا جس نے اسلام قبول کیا تھا اور اس کا علاقہ اس کی تحویل میں ہی دے دیا گیا۔ 101ھ میں آل مہلب نے بغاوت کی لیکن یہ بغاوت ناکام رہی، قندابیل کی جنگ میں آل مہلب کے خاندان کے تمام مرد مقتول ہوئے۔ مقتولین میں معاویہ بن یزید بن مہلب بھی تھا جس نے محمد بن قاسم کو قید خانہ میں ایذا پہنچائی تھی، وہ اسے زنجیروں سے جکڑ کر رکھتا تھا اور طرح طرح کی تکلیفیں دیتا تھا۔

ہشام بن عبدالملک 105ھ میں اموی خلیفہ بنا، اس نے خالد القیسری کو عراق کا گورنر بنایا۔ خالد القیسری نے عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کی ولایت سے ہٹایا اور جنید بن عبدالرحمن کو اس کی جگہ سندھ کا والی بنایا۔ جنید نے اپنی فتوحات سے محمد بن قاسم کی یاد دلادی۔ جنید کی سندھ آمد میں راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ جو برہمن آباد پر قابض تھا اپنی مملکت سے گزرنے سے روک دیا۔ جنید نے محتاط انداز میں تیاری شروع کردی بالآخر دونوں میں جنگ ہوئی اور جے سنگھ شکست کھا کر بھاگا لیکن گرفتار کرکے اسے قتل کردیا گیا۔ جنید نے کیرج کو فتح کیا اور جب سندھ میں امن واطمینان ہوگیا تو اس نے سرحدی علاقوں گجرات، کاٹھیاواڑ اور مارواڑ پر حملہ کیا اور سولنکی حکومت کو اپنے پرزور حملہ سے ختم کردیا، اس کے افسر حبیب نے اجین اور مالوہ کو فتح کرلیا، بھیلمان میں شکست خوردہ افراد کی بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی اور وہ فوجی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جنید یلغار کرتا ہوا ایک جانب سے اور دوسری جانب سے حبیب پہنچا اور بھیلمان میں بھی گوجروں کو شکست ہوئی۔ جنید کی فتوحات کی تائید اثری کتبوں کی تحقیقات سے بھی ہوتی ہے۔ اس حملہ میں جنید کو کثیر مال دولت ہاتھ لگا اندازہ کے اعتبار سے بیس کروڑ درہم، پانچواں حصہ دمشق بھیجا گیا، فوج اور احباب میں تقسیم کے بعد بھی تین کروڑ درہم بچ گیا، اس حملہ کی عرب میں بڑی دھوم مچ گئی حتی کہ مشہور عربی شاعر جریر تک نے جنید کی تعریف میں اشعار کہے۔

سنہ 111ھ میں جنید کے بعد تمیم بن زید سندھ کا والی بنا، اس میں حکمرانی کے اوصاف نہ تھے، اس کی وجہ سے سندھ کا شیرازہ منتشر ہوگیا اور سردار باغی ہوگئے اور بالآخر تمیم کو قتل کردیا گیا۔ تمیم کے بعد حکم بن عوانہ سندھ کا والی بنا، اس نے محفوظہ نامی شہر بسایا اور وہی تھا جو محمد بن قاسم کے بیٹے عمر بن محمد بن قاسم کو اپنے ساتھ لیتا آیا اور تمام اہم امور اس کے سپرد کردیئے۔ عمر بن محمد ثقفی نے تمام خودمختار علاقوں کو دوبارہ فتح کیا اور واپسی میں دریائے سندھ کے قریب ایک شہر آباد کیا جس کا نام منصورہ رکھا۔ حکم بن عوانہ کے ساتھ منذر بن زبیر ہباری بھی آیا تھا جس کے پوتے نے آگے چل کر ہباری سلطنت کی بنیاد رکھی جو چوتھی صدی تک قائم رہی۔

جنید کے بعد حکم بن ابی عوانہ کلبی کو سندھ کی ذمہ داری ملی، وہ اپنے ساتھ عمر بن محمد بن قاسم ثقفی اور منذر بن زبیر ہباری کو لیتا آیا۔ اس وقت سندھ میں مضبوط حکومت نہ ہونے سے ہر طرف بدامنی تھی، حکم نے محفوظہ نام کا ایک شہر بسایا۔ عمر بن محمد بن قاسم ثقفی نے ارد گرد کے علاقے فتح کئے، سندھ کے مقبوضات میں سے جو علاقے خود مختار ہو گئے تھے ان کو پھر سے اطاعت گزار بنایا، سندھ کے علاقوں کو فتح کر کے جب عمر بن محمد لوٹ رہا تھا تو اس نے دریائے سندھ کے دہانے پر ایک شہر آباد کیا جو آگے چل کر منصورہ کے نام سے ایک مستقل حکومت کا پایہ تخت بنا۔

حکم کی موت کے بعد سندھ کے والی بننے کے دعویدار دو تھے ایک عمر بن محمد بن قاسم ثقفی اور دوسرے یزید بن عرارہ، خلافت اموی نے محمد بن قاسم کی مظلومانہ موت پر نگاہ کرتے ہوئے عمر کے حق میں فیصلہ سنایا۔ عمر بن محمد بن قاسم نے سندھ حکومت کے مقبوضات کا دائرہ بڑھایا۔ پانچ سال کے بعد عمر بن محمد بن قاسم کو معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ یزید بن عرارہ سندھ کا والی بنا، یزید بن عرارہ ایک بہتر سپہ سالار تھا لیکن وہ معاملات کی گہرائی سے پرکھ کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا یہی وجہ ہے کہ ایک عباسی خلافت کے قیام کیلئے کوشاں منصور بن جمہور کلبی کے ہاتھوں اسے نہ صرف سندھ کی حکومت گنوانی پڑی بلکہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ منصور نے یزید بن عرارہ کو دیوار میں چنوادیا۔

4.6 خلافت عباسیہ کے دور میں سندھ میں عربوں کی حکمرانی

132ھ میں امویوں کا تختہ پلٹ گیا اور خلافت عباسیہ قائم ہو گئی۔ منصور بن جمہور کلبی نے خلافت عباسیہ سے بغاوت کا اعلان کر دیا، اس کی سرکوبی کیلئے کی گئی کوششیں ناکام رہیں تو ابو مسلم خراسانی نے موسیٰ بن کعب کو روانہ کیا۔ موسیٰ بن کعب کے ہاتھوں شکست کھا کر منصور بھاگا، غلطی سے ریگستان میں پھنس گیا، موسی بن کعب کی فوج اس کی تلاش میں تھی اس کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ موسی بن کعب کے بعد 140ھ میں عیینہ بن موسی کو سندھ کا والی بنایا گیا، اس کے دور میں اہل یمن اور اہل حجاز اس کی بدعنوانی پر معترض ہوئے اس نے سبھی کو قتل کرا دیا، پھر اس نے کچھ عرصہ بعد خلافت عباسیہ سے بغاوت اختیار کی، اس کی سرکوبی کیلئے ابو جعفر منصور نے عمر بن حفص کو روانہ کیا اور اس کے ساتھ عقبہ بن مسلم کو مشیر کے طور پر روانہ کیا۔ 142ھ میں یہ دونوں بڑی فوج کے ساتھ سندھ پہنچے، عیینہ نے پہلے مقابلہ کیا لیکن جب شہر اور باہر کے لوگ عمر بن حفص کے ساتھ شریک ہونے لگے تو اس نے صلح کر لی، عمر بن حفص نے اس کو بغداد روانہ کر دیا، وہ راستے میں ہی بھاگ نکلا اور سجستان کی راہ پکڑی لیکن یمنیوں نے اس کو باغی سمجھ کر گرفتار کر یا اور قتل کر دیا۔

اس دور کا ایک بڑا واقعہ یہ ہے کہ عباسیوں کو خلافت ملی تو ان میں آپس میں علویوں اور عباسیوں میں چپقلش شروع ہو گئی اور علویوں نے عباسیوں کے خلاف بغاوت شروع کر دی جس کے نتیجے میں علویوں کے خلاف خلافت عباسیہ نے سخت دارو گیر شروع کر دی۔ خلافت عباسیہ کے اہلکاروں سے چھپتے چھپاتے عبد اللہ الاشتر علوی اپنے چند جانثاروں کے ساتھ سندھ آئے اور خود کو گھوڑے کا تاجر مشہور کیا لیکن یہ بات کھل گی کہ وہ کون ہیں، عمر بن حفص سادات کا طرفدار تھا اس نے عبد اللہ الاشتر کو کسی قریبی راجہ کے یہاں مامون

کر دیا۔اس کی خبر جب پھیلی توان کے مزید خیر خواہ ان کے پاس آتے گئے یہاں تک کہ چار سو افراد جمع ہوگئے۔عبد اللہ الاشتر نو دس سال تک راجہ کے یہاں اطمینان سے رہے۔151ھ میں عبد اللہ الاشتر کے بارے میں منصور کو خبر ہوئی اس نے عمر بن حفص سے جواب طلب کیا۔ایک شخص نے کہا کہ ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال دیجئے ،ایسا ہی کیا گیا اور خلیفہ نے اس آدمی کو بغداد بلالیا۔لیکن عمر بن حفص کی اس کوتاہی کو دل سے معاف نہ کیا اور اس کو افریقہ کا گورنر بنا کر سندھ کا والی ہشام بن عمر تغلبی کو بنایا اور اس کو تاکید کی کہ دیکھو جیسے بھی ہو عبد اللہ الاشتر کو گرفتار کرو،لیکن یہ بھی دل سے سادات کا طرفدار تھا اس نے مشہور تو کیا کہ اس سلسلے میں راجہ سے خط وکتابت ہو رہی اور معاملہ حل ہونے والا ہے لیکن اندرون خانہ معاملہ کو ٹالتا رہا،قضاوقدر سے ایسا ہوا کہ ایک دن ہشام کا بھائی سفیح کسی بد امنی کو دور کرنے کیلئے جارہا تھا کہ عبد اللہ الاشتر سے مڈ بھیڑ ہوگئی۔سفیح کے ساتھیوں نے سادات کے خون سے دامن بچانا چاہا لیکن سفیح نے سخت کارروائی کی دھمکی دی اور پھر دونوں میں مڈ بھیڑ ہوئی اور عبد اللہ الاشتر مارے گئے۔منصور کی تاکید پر ہشام نے آخر 151ھ میں راجہ پر حملہ کر دیا ایک زبردست جنگ کے بعد راجہ مارا گیا اور اس کا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں آیا،عبد اللہ کے ساتھی مارے گئے اور جو بچے وہ ادھر ادھر منتشر ہوگئے اور عبد اللہ کے بیٹے محمد اور ان کی ماں جو لونڈی تھیں کو بغداد روانہ کر دیا۔منصور نے ماں اور بیٹے کو مدینہ روانہ کر دیا۔

تبلیغ اسلام:اس درمیان عباسی خلیفہ منصور کی موت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ اس کا بیٹا مہدی تخت نشیں ہوا تھا،اس نے عمر بن عبد العزیزؒ کے نقش قدم پر اکثر حکمرانوں کے نام جو اس کے ماتحت تھے قبول اسلام کی ترغیب دی،ان میں سے پندرہ راجہ مسلمان ہوگئے ان میں سے ایک سندھ کا راجہ تھا اس راجہ کو رائے کہا جاتا تھا اور ایک راجہ وہ تھا جو پورس کے خاندان سے تھا۔

بھروچ پر حملہ:159ھ میں مہدی نے عبد الملک بن شہاب مسمعی کی قیادت میں ایک بحری بیڑہ گجرات بھیجا،یہ بیڑا160ھ میں بھاڑ بھوت پہنچا عربوں نے زمین پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی حملہ کر دیا،گجراتی قلعہ بند ہوئے لیکن عربوں کے پرجوش حملوں کو قلعہ کی دیواریں سہار نہ سکیں،واپسی میں سمندر کی طغیانی کی وجہ سے انتظار کرنا پڑا اور اسی درمیان وبا پھوٹ پڑی جس کی وجہ سے ایک ہزار افراد شہید ہوئے۔ان شہیدوں میں سے ایک ابو بکر ربیع بن صبیح سعدی جلیل القدر تابعی بھی ہیں۔مہدی اور ہارون رشید کی خلافت تک سندھ میں کئی والی مقرر ہوئے جیسے لیث بن طریف،سالم یونسی طیفور بن عبد اللہ بن منصور،جابر بن اشعث طائی،سعید بن سلم بن قتیبہ۔لیکن ان سے سندھ میں امن وامان قائم نہیں ہوسکا۔حجازیوں اور یمنوں کی آویزیش بڑھتی چلی گی۔حجازی طاقتور ہوگئے اور انہوں نے سندھ کے والیوں کو اپنے اشارہ پر چلانا شروع کر دیا۔بالآخر ہارون رشید نے 184ھ میں داؤد مہلبی کو سندھ کا والی بنا کر روانہ کیا۔

داؤد مہلبی کا دور حکومت:داؤد مہلبی نے اپنا نائب اپنے بھائی مغیرہ کو بنا کر بھیج دیا۔حجازیوں نے مغیرہ کو منصورہ میں داخل نہیں ہونے دیا اور ایسے شرائط پیش کئے جو مانے نہیں جاسکتے تھے بالآخر لڑائی ہوئی اور مغیرہ کو شکست ہوئی،مغیرہ نے سارے واقعہ کی رپورٹ داؤد کو دی۔داؤد غصے سے بھر گیا اور ایک فوج لے کر نکل پڑا۔سندھ پہنچتے ہی اس نے نزاریوں(حجازیوں)کی بیخ کنی شروع کر دی اور نزاریوں کے خلاف سخت کارروائی شروع کی۔جب داؤد منصورہ پہنچا توان لوگوں نے قلعہ بند کر دیا اور جنگ شروع کر دی لیکن داؤد نے نزاریوں کی بڑی تعداد کو تہہ تیغ کر دیا۔کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد منصورہ فتح ہوا لیکن نزاری اپنی شرارت پر قائم رہے اور روز ایک نیا ہنگامہ برپا کرتے رہے۔داؤد نے

بالآخر منصورہ میں ان کے محلے اور مکانات کو مسمار کر دیا اور باغیوں کو قتل، قید اور جلاوطن کیا جس کی وجہ سے منصورہ میں امن ہو گیا۔ داؤد نے نزاریوں کے خلاف جو طرز عمل اختیار کیا اس سے سندھ میں امن تو قائم ہوا لیکن عربوں کی ایک بڑی آبادی فنا ہو گئی۔ اس نے اپنے حسن تدبیر سے چند ہی سالوں میں پورے سندھ کی کایا پلٹ دی اور بدامنی اور شورش کی جگہ امن وامان قائم ہو گیا۔ داؤد کا دور حکومت بیس برس رہا، اتنی طویل مدت تک سندھ میں کوئی والی اس سے قبل نہیں رہا اور اسی دور میں ہارون رشید کی موت ہوئی، امین ومامون کی خانہ جنگی ہوئی اور مامون عباسی حکمراں بنا، داؤد کی چونکہ کوئی شکایت نہیں تھی اس لئے مامون نے بھی اس کو برقرار رکھا۔

مامون الرشید کے دور میں داؤد مہلبی کا انتقال ہو گیا تو مامون نے بشر کو دس لاکھ درہم یعنی ڈھائی لاکھ روپے سالانہ خراج کے وعدہ پر اس کو سندھ کا حاکم بنا دیا، کچھ عرصہ یہ ٹھیک رہا لیکن پھر یہ لاپرواہ ہو گیا اور مامون کو خراج بھیجنا بند کر دیا۔ مامون نے غسان مہلبی کو اس کی سرکوبی کیلئے بھیجا، جب غسان منصورہ پہنچا تو بشر نے بغیر جنگ کے اس کی اطاعت کرلی، غسان نے اس کو نظر بند کر دیا اور مامون کے حکم کے مطابق سندھ کا والی موسیٰ برمکی کو بنا دیا۔ غسان کی بالا یابالا چندر نام کے ایک راجہ نے توہین کی تھی موسی برمکی نے اس پر حملہ کر دیا اور راجہ گرفتار ہوا، راجہ نے بڑی کوشش کی کہ کثیر زر فدیہ ادا کر کے خلاصی کرلے یہاں تک کہ پانچ لاکھ درہم تک ادا کرنے کی پیش کش کی لیکن موسیٰ نہیں مانا اور راجہ قتل کر دیا گیا۔ موسیٰ برمکی کی موت کے بعد 231ھ میں اس کے بیٹے عمران برمکی کو سندھ کا والی بنایا گیا، عمران برمکی نے پوری مستعدی کے ساتھ بدامنی اور جاٹوں اور میدوں کی بغاوت اور سرکشی کو ختم کیا۔ قیقان کے افراد ہمیشہ شورش برپا کرتے تھے اس کے سدباب کیلئے بوقان میں ایک فوجی چھاؤنی بنائی۔ میدوں کی بغاوت کا بالکلیہ استیصال کرنے کے لیے اس نے کمر باندھا اور میدوں پر حملے شروع کئے تھے کہ یمنیوں اور حجازیوں میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ عمران نے کمزور یمنیوں کی طرفداری کی جس پر حجازی عمران کے خلاف سازش کرنے لگے اور اپنے سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری کی قیادت میں عمران برمکی پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔

236ھ میں عمران کے قتل کے بعد عنبسہ بن اسحاق ضبی سندھ کا والی ہوا، عنبسہ نے بدامنی کا فائدہ اٹھا کر خود مختاری کا دعویٰ کرنے والوں امراء اور حکام کو سندھ حکومت کا پابند بنایا، قیدیوں کیلئے دیبل کے عالیشان مندر کا گنبد توڑ کر چھت دے کر ایک بڑی جیل بنائی۔ 235ھ میں خلیفہ متوکل نے عنبسہ کو معزول کر کے ہارون بن ابی خالد کو سندھ کا والی بنایا، اس نے یہاں آکر حجازیوں اور یمنیوں کے حالات دیکھے اور یہ بھی دیکھا کہ حجازی یمنیوں پر زبردستی کرتے ہیں تو اس نے یمنیوں کی طرفداری کرنی شروع کر دی جس کی وجہ سے حجازی گروہ اس سے ناراض ہو گیا اور بالآخر 240ھ میں حجازیوں نے اس کا قتل کر دیا۔

عمر بن عبدالعزیز ہباری نے سندھ کی حکومت سنبھالی اور خلیفہ متوکل کو اپنی اطاعت کا خط لکھا، متوکل پے درپے ہونے والی بغاوتوں سے پریشان تھا اس نے اس اطاعت گزاری کو بھی غنیمت جانا اور باوجود یہ کہ کی حجازی گروہ اس کے متعین کردہ والی کا قاتل تھا اس نے حجازیوں کو سندھ کی ولادت سپرد کر دی اور یہیں سے سلطنت خاندان ہباری کا آغاز ہوتا ہے۔

4.6.1 سندان پر عربوں کا قبضہ

مامون الرشید کے دور میں جب کہ سندھ کا والی موسی برمکی تھا بنی سامہ کے غلام فضل بن ہامان نے سندان پر قبضہ کر لیا(سندان

گجرات اور سندھ کی سرحد پر گجرات کا ساحلی علاقہ تھا) فضل نے مامون الرشید کو اپنی اطاعت گزاری کا خط لکھا، ایک ہاتھی نذر کیا اور سندان میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی۔ فضل کی موت کے بعد اس کا بیٹا محمد بن فضل سندان کا حاکم ہوا، اس کی طبیعت میں ملک گیری تھی، کشتیوں کا بیڑا لیکر مید قوم پر حملہ کیا اور مزید فتوحات کیلئے قدم آگے بڑھانا چاہتا تھا کہ خبر آئی کہ سندان میں اس کے بھائی نے بغاوت کر دی اور شہر پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ سن کر وہ سندان لوٹا، یہاں پہنچنے پر خبر کی تصدیق ہوئی، محمد بن فضل نے مامون سے مدد کی درخواست کی لیکن اس کے بھائی ہامان نے سندھیوں اور دیگر فوجی افسران کو ورغلا کر اپنے حق میں کر لیا اور مامون کی جانب سے مدد آنے سے پہلے محمد پر حملہ کر دیا، اس جنگ میں محمد کو شکست ہوئی، گرفتار کر کے محمد بن فضل کو سولی دے دی گئی۔

ہامان کے اندر چالبازی کی صفت ضرور تھی لیکن دوراندیشی اور پیش بینی نہیں تھی، وہ سندھ کی اسلامی مملکت اور خلافت عباسیہ دونوں سے بے پرواہو گیا اور کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھا چنانچہ کچھ ہی عرصہ بعد اس پر ہندوراجوں نے حملہ کر دیا اور کسی نے اس کی مدد نہیں کی اور اس طرح سندان کی اس چھوٹی سے عرب حکومت کا بہت قلیل مدت میں خاتمہ ہو گیا۔

سندھ میں ہباری خاندان کے سلسلے میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں لکھا ہے:

''اگرچہ ہارون رشید نے کے عہد میں داؤد مہلبی نے نزاریوں کی طاقت کا خاتمہ کر دیا تاہم متوکل کے دور میں حجازیوں کے سرگروہ عبدالعزیز ہباری نے عباسی عامل خالد کو قتل کر کے خود مختار حکومت قائم کر لی اور منصورہ کو اپنا صدر مقام قرار دیا''۔

ہباری خاندان قریش کی ایک شاخ بنواسد کے ہبار بن اسود سے چلا ہے۔ ہبار بن اسود 8 ہجری میں مسلمان ہو گئے تھے۔ اسی خاندان کا ایک فرد منذر بن زبیر حکم بن عوانہ کے ساتھ سندھ آگیا، منذر بن زبیر کا ہی پوتا عمر بن عبدالعزیز ہوا جو ہباری سلطنت کا موسس تھا۔ سنہ 240ھ میں سندھ کی ولایت ملنے کے بعد عمر بن عبدالعزیز نے زیریں سندھ کو فتح کیا، اس نے رفتہ رفتہ پورے سندھ کو فتح کیا لیکن اس نے منصورہ کو پایہ تخت نہیں بنایا بلکہ منصورہ سے تھوڑے فاصلہ بانیہ میں رہا۔ اس نے کبھی خلافت عباسی کی اطاعت کا جوا گردن سے نہیں اتارا، خطبہ میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جاتا رہا۔ اس کے دور میں خلیفہ عباسی بھی سندھ کو اپنے مقبوضات میں شمار کرتے تھے۔ چنانچہ یعقوب بن لیث صفاری کے نام خلیفہ معتمد نے ترکستان، سجستان اور کرمان کا والی بنایا تو اس میں سندھ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس عرصہ میں جب کہ عمر بن عبدالعزیز سندھ پر حکمرانی کر رہا تھا مشرق میں روزانہ نئے نئے ہنگامہ برپا ہوتے رہے لیکن وہ سندھ کی حکمرانی پر بدستور قائم رہا، یہ اس کی لیاقت اور حسن تدبر کی دلیل ہے۔ اس کی موت کب ہوئی تاریخ کتابیں اس سلسلے میں خاموش ہیں لیکن اندازہ ہے کہ 270ھ کے آس پاس اس کی موت ہوئی ہو گی۔ عمر بن عبدالعزیز ہباری کے زمانہ میں یعنی 264ھ میں مشہور مورخ اور سیاح ابوزید سیرافی ہندوستان آیا تھا۔

عمر بن عبدالعزیز ہباری کی موت کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ بن عمر ہباری 270ھ میں سندھ کا حاکم بنا۔ اس کی سیرت اور کارناموں کے بارے میں بھی تاریخ خاموش ہے لیکن اس کے دور کا ایک واقعہ یہ ہے کہ بنوکندہ کے آزاد کردہ غلام ابوالصمہ کے لڑکے صمہ نے بغاوت کر کے منصورہ پر قبضہ کر لیا، عبداللہ ہباری نے بعد میں فوجی طاقت جمع کر کے منصورہ واپس لے لیا اور اسی وقت سے منصورہ کو پایہ تخت بنالیا۔

270ھ میں ایک پڑوسی راجہ نے عبداللہ ہباری سے سندھی زبان میں اسلام کی تعلیمات لکھ کر بھیجنے کی درخواست کی، عبداللہ نے یہ کام ایک ایسے شخص کو سونپا جو اصل میں عراقی تھا لیکن اس کی پرورش منصورہ میں ہوئی تھی اور مقامی زبان سے وہ اچھی طرح واقف تھا، اس نے اسلامی تعلیمات کو نظم کی صورت میں لکھ کر راجہ بھیجا، راجہ بہت خوش ہوا اور درخواست کی کہ اس شاعر کو ہمارے پاس بھیج دیا جائے، عبداللہ ہباری نے شاعر کو راجہ کے پاس بھیج دیا وہ تین سال وہاں مقیم رہا اور راجہ کو اسلامی تعلیمات سے واقف کراتا رہا۔ 273ھ میں اس شاعر نے عبداللہ ہباری کو بتایا کہ راجہ نے سچے دل سے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن اس کے اظہار سے ڈرتا ہے اور یہ کہ اس نے ایک مکان تیار کیا ہے جہاں وہ تنہائی میں رہتا ہے اور عوام میں مشہور کر رکھا ہے کہ وہ امور سلطنت پر غور و فکر کیلئے وہاں جاتا ہے جب کہ دراصل وہ وہاں جا کر اسلامی طریقہ پر عبادت کرتا ہے، عبداللہ ہباری کے دور میں شوال 280ھ میں دیبل میں زبردست زلزلہ آیا جس میں پورا شہر تباہ ہو گیا اور ملبہ کے نیچے سے تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار کو مردہ نکالا گیا۔ اس بڑے حادثہ کی خبر پرچہ نویسوں نے خلیفہ معتضد باللہ کو روانہ کی۔ اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ عباسی خلفاء کا سندھ میں اثر ور سوخ باقی تھا۔

عبداللہ بن عمر ہباری کی حکومت 30، سال رہی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے بڑی لیاقت اور حسن تدبر کے ساتھ حکومت کی ہوگی اور عوام اس کے اقدامات سے خوش رہی ہوگی ورنہ عوامی اطمینان کے بغیر اتنے عرصے تک حکومت کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

4.6.2 سلطنت خاندان بنو سامہ

ملتان میں حکمراں خاندان بنو سامہ کا تھا۔ بنو سامہ کا سلسلہ قریش میں لوی بن غالب پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ لوی کی اولاد میں سامہ تھا اسی نسبت سے اس خاندان کو بنو سامہ کہا جانے لگا۔ اس خاندان کے افراد نے ملتان پر کب قبضہ کیا، کتب تاریخ سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ملتان کو محمد بن قاسم نے فتح کیا اور امیر داؤد بن نصر بن ولید کو ملتان کا حاکم بنایا۔ محمد بن قاسم کی اچانک معزولی اور گرفتاری سے سندھ میں ابتری پھیل گئی تھی، شاید اس کا فائدہ اٹھا کر امیر داؤد ملتان کا خود مختار حکمراں بن گیا۔ اس کے بعد ہمیں 151ھ میں جا کر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہشام بن عمر تغلبی نے ملتان فتح کیا، مورخین کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ملتان میں کسی مسلم خاندان کی ہی حکومت تھی اگر غیر مسلموں کی حکومت ہوتی تو پھر مورخین اس کا ذکر ضرور کرتے۔ پھر 184ھ میں ابن عدی والی سندھ نے ملتان کو فتح کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ تقریباً سو سال بعد ابن رستہ لکھتا ہے کہ اب (290ھ) میں ملتان پر بنو منبہ کی حکمرانی ہے (بنو منبہ بھی بنو سامہ کو ہی کہا جاتا ہے)۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ 375ھ تک ملتان میں بنو منبہ کے افراد خاندان ہی حکمراں تھے۔ ابن حوقل اور اصطخری نے بھی اپنی کتابوں میں ملتان کے احوال میں ذکر کیا ہے کہ یہاں کے حکمراں بنو منبہ ہیں مگر حاکموں کے نام نہیں لکھے، لیکن جب 375ھ میں بشاری مقدسی نے سندھ کی سیاحت کی تو اس سلسلے میں لکھا کہ ملتان کے حکمراں اسماعیلی ہیں۔

4.6.3 ملتان میں اسماعیلی حکومت

ملتان میں اسماعیلی دعاۃ کافی عرصہ سے انقلاب کی کوشش کرتے رہے۔ منصورہ میں ان لوگوں کو کامیابی نہ مل سکی لیکن ملتان میں ان کے ہم خیال افراد کی تعداد کافی ہو گئی پھر اسماعیلی امام العزیز قاہر باللہ متوفی 386 نے 372ھ میں جلم بن شیبان کو فوج کے ساتھ سندھ

بھیجا، سندھ کی آمد کا راستہ کیا تھا، مکران کا یا پھر خراسان، یہ واضح نہیں ہے اور ملتان پر حملہ کر کے قبضہ کیا گیا یا پھر ملتان میں اندر سے بغاوت ہوئی اور کامیاب ہوئی، اس بارے میں کچھ بھی واضح نہیں لیکن اتنی بات طے ہے کہ جلم بن شیبان ملتان پر قابض ہو گیا۔

جلم بن شیبان نے ملتان پر قبضہ کرنے کے ساتھ ہی فاطمی خلفاء کا سکہ اور خطبہ جاری کیا، اسی نے ملتان کے اس قدیم مندر کو تباہ کیا جس کو محمد بن قاسم نے شہر کی آمدنی کے خیال سے رکھ چھوڑا تھا۔ جلم بن شیبان کی حکومت کتنے عرصے رہی، کچھ پتہ نہیں چلتا، اس کے بعد تاریخی کی کتابوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ سبکتگین کا جب راجہ جے پال سے مقابلہ ہوا تو ہندوستان کے راجاؤں نے اس کی مالی اور فوجی مدد کی لیکن پھر بھی سبکتگین غالب رہا تو اس نے امیر ملتان شیخ حمید سے باز پرس کی کہ اس نے جے پال کی مدد کیوں کی۔ شیخ حمید نے اس شرط پر صلح کر لی کہ وہ سالانہ خراج دے گا۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ شیخ حمید نے اسلام کا واسطہ دیا کہ ہم دونوں مسلمان ہیں لیکن میری حکومت سے ہندو راجاؤں کی حکومت ملتی ہے ملتان کی حفاظت کیلئے کچھ دستے متعین کر دیں۔ امیر سبکتگین نے اس کو منظور کر لیا۔ پھر تقریباً 15-16 سال خاموشی رہی اور اس دوران شیخ حمید کا انتقال ہو گیا اور ملتان کا نیا امیر شیخ ابوالفتوح داؤد بن نصر بنا۔ غیر مسلم راجا بھاٹیہ سے لڑائی میں سلطان محمود کا ساتھ نہ دیا اور جب انند پال کی حمایت میں پورے ہندوستان کی فوجیں آ گئیں تو یہ سوچ کر کہ سلطان محمود انند پال کی متحدہ فوج سے نہیں جیت سکے گا، انند پال کا ساتھ دیا، اس جنگ میں شور وغل اور نفط اندازوں کی آگ سے انند پال کا ہاتھی بھاگنے لگا، اس امر کو انند پال کی فوج نے شکست پر محمول کیا اور بھاگنے لگی اور یہ دیکھ کر متحدہ فوج جو ہندوستان سے مدد کیلئے آئی تھی وہ بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔ سلطان محمود نے 401ھ میں اولاً تو غوریوں کو شکست دی پھر اچانک تیزی سے آگے بڑھ کر ملتان پر حملہ کر دیا اور ملتان سلطان محمود کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکا۔ سلطان محمود نے باغیوں کو سخت سزا دی اور شیخ داؤد بن نصر بن حمد کو گرفتار کر کے غزنہ لے گیا اور تاحیات نظر بند رکھا۔ اس طرح ملتان سے اسماعیلی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ فرشتہ نے بھی لکھا ہے کہ:

"شیخ حمید کے تعلقات سبکتگین کے ساتھ بڑے خوشگوار رہے لیکن اس کا پوتا ابوالفتح داؤد بن نصیر بن حمید جو ملاحدہ (اسماعیلیہ) میں سے تھا ابتداء میں اس کا طرز عمل اپنے باپ دادوں کے قدم بقدم رہا لیکن 395ھ میں اس نے غیر وفادارانہ حرکت کی"۔

منصورہ کے اسماعیلی: منصورہ میں 375ھ تک ہباری خاندان بر سر اقتدار تھا کیونکہ بشاری مقدسی انہی تاریخوں میں سندھ آیا ہے اور اس نے لکھا ہے کہ منصورہ کے قاضی اہل حدیث ہیں اور عوام زیادہ تر حنفی ہیں اور حکمراں خاندان ہباری کو بتایا ہے اسی کے ساتھ ابن اثیر نے 416ھ کے حالات میں لکھا ہے کہ منصورہ کے حکمراں قرامطہ (اسماعیلی) تھے۔

مولانا ابو ظفر ندوی مصنف تاریخ سندھ کی رائے یہ ہے کہ منصورہ میں اسماعیلی سلطنت کی دو صورت ہو سکتی ہے:

"پہلی صورت تو یہ کہ 376ھ سے لے کر 396ھ کے پر امن زمانہ میں اسماعیلیوں نے منصورہ میں بھی ملتان کی طرح انقلاب برپا کیا ہو لیکن منصورہ کی اسماعیلی حکومت اب بھی ملتان سے الگ رہی ہو، پس اسماعیلیوں کی گویا دو حکومتیں علیحدہ علیحدہ تھیں ایک ملتان میں اور دوسری منصورہ میں۔ اس لئے سلطان محمود غزنوی کے ملتان پر حملہ کا منصورہ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ 401ھ میں

جب سلطان محمود نے ملتان پر قبضہ کر لیا اور داؤد کو گرفتار کر کے غزنہ بھیجا تو اسماعیلیوں نے اپنی منتشر طاقت جمع کر کے اچانک منصورہ پر قبضہ کر لیا ہو کیونکہ ہباری خاندان اس وقت بہت کمزور ہو رہا تھا اور اس کے مقبوضات کے کچھ حصے پر دوسرے قابض تھے۔ ان دونوں نظریوں کے متعلق اس وقت تک کوئی علمی شہادت دستیاب نہیں ہوئی البتہ قیاس سے دوسری صورت کو ترجیح دی جا سکتی ہے"۔

منصورہ میں 416ھ تک اسماعیلیوں کی خود مختار حکومت تھی۔ منصورہ پر حملہ کی وجہ یہ ہوگی کہ جب سلطان محمود نے انند پال کا ساتھ دینے والے راجوں کی گوشمالی کرنی چاہی تو اس نے دریائے سندھ کے کنارے سفر کرنے کا سوچا لیکن منصورہ کے والی کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں محمود اس کی حکومت پر قبضہ نہ کر لے، ایسا قیاس ہے کہ منصورہ کے حکمرانوں نے جاٹوں اور میدوں کو سرکشی کی شہ دی ہوگی جس کی بناء پر جاٹوں نے سلطانی فوج کو بہت تنگ کیا جب سلطان محمود برہمن آباد پہنچا تو اس نے منصورہ کے حکمراں کی گوشمالی کرنی چاہی چنانچہ اس نے فوراً منصورہ والوں پر حملہ کر دیا، منصورہ کا حکمراں جھاڑیوں میں جا کر چھپ گیا لیکن سلطان محمود نے جھاڑیوں کو گھیر لیا اور پھر چھپنے والے اکثر مارے گئے یا دریا میں غرق ہوئے اور بہت کم اپنی جان بچا سکے۔ ابن اثیر نے الکامل فی التاریخ میں لکھا ہے۔

سلطان نے منصورہ کا قصد کیا، یہاں کا والی اسلام سے پھر گیا تھا۔ تو جب اس کو سلطان کی آمد کی خبر ہوئی تو شہر سے نکل گیا اور اپنے آدمیوں کو لے جا کر جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ سلطان محمود نے اس کا تعاقب کیا اور دو طرف سے اس پر حملہ آور ہوا، اس میں بہت سے آدمی مارے گئے اور بہت سے دریا میں ڈوب گئے، تھوڑے بچ گئے"۔

4.6.4 سومرہ حکمراں

جیسا کہ ماقبل میں لکھا جا چکا ہے کہ سومرہ کے تعلق سے اختلاف ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے سومرہ کو نو مسلم راجپوت بتایا ہے جب کہ مولانا عبدالحلیم شرر ان کو نو مسلم یہودی لکھتے ہیں اور تاریخ ہند کے مصنف ایلیٹ ان کو راجپوت ہندو بتاتے ہیں علامہ سید سلیمان ندوی نے "عرب وہند کے تعلقات" اور مولانا ابو ظفر ندوی نے "تاریخ سندھ" میں ان کو عرب مانا ہے ایسے عرب جنہوں نے یہاں شادی بیاہ کا سلسلہ قائم کر لیا ہے۔ مولانا ابو ظفر ندوی سومریوں کو راجپوت ہندو اور نو مسلم راجپوت قرار دینے والوں کی مدلل طور پر غلطی ثابت کرنے اور ایک تفصیلی بحث کے بعد خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں:

"پس ان حالات کی موجودگی میں یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سومرہ ہندو راجپوت نہ تھے بلکہ عرب تھے جو ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے اور پشت در پشت یہاں رہ کر ہندی نژاد بن گئے جس کی صحیح مثال ہندوستانی سادات ہیں"۔

علامہ سید سلیمان ندوی راجپوت اور عرب میں یوں تطبیق دیتے ہیں کہ جنہوں نے ان کو عرب کہا ہے انہوں نے ایک جانب کا لحاظ کیا اور جنہوں نے ان کو راجپوت کہا، انہوں نے دوسرے جانب کا لحاظ کیا۔

سومرہ حکمرانوں کو راجپوت قرار دینے یا راجپوت نو مسلم سمجھنے والوں کو شاید ان کے غیر مسلموں جیسے نام سے اشتباہ ہوا ہوگا حالانکہ دیکھا جائے تو عرب سے دور بسنے والی کچھ قوموں نے قبول اسلام کے بعد بھی عربی ناموں کو اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی زبان کے نام ہی استعمال کرتے رہے جیسے الپ تگین، سبکتگین، الپ ارسلان، ایلتتمش، بلبن وغیرہ حالانکہ یہ تمام لوگ پورے طور پر مسلمان تھے لہذا نام

کی مشابہت ان کے غیر مسلم یا غیر مسلم سے نو مسلم ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

سومرہ حکمران مذہب کے اعتبار سے اسماعیلی شیعہ تھے۔اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ دروزی شیعوں کا امام سلطان محمود کا ہم عصر تھا،اس نے سلطان محمود کے ملتان اور منصورہ پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کے ایک طاقتور زمیندار کو خط لکھا جس کے مندرجات یہ ہیں۔

''ملتان اور ہندوستان کے موحدوں کے نام عموماً اور شیخ ابن سومرہ راجہ پال کے نام خصوصاً اے معزز راجہ پال! اپنے خاندان کو اٹھا، موحدین اور داؤ داصغر کو سچے دین میں واپس لا کہ مسعود نے جو اسے حال ہی میں قید اور غلامی سے آزاد کیا ہے۔ وہ اس وجہ سے ہے کہ تو اس فرض کو انجام دے سکے جو تجھ کو اس کے بھانجے عبد اللہ اور ملتان کے تمام باشندوں کے خلاف انجام دینے کیلئے مقرر کیا گیا ہے تاکہ تقدیس اور توحید کے ماننے والے جہالت، ضد، سرکشی اور بغاوت والی جماعت سے ممتاز ہو جائیں۔''

اردو دائرۃ المعارف کا مقالہ نگار سندھ کے مقالہ میں لکھتا ہے۔

''ادھر سندھ میں بھی ان دونوں سومرہ خاندان زور پکڑ رہا تھا۔ یہ لوگ بھی عقیدتاً اسمٰعیلی تھے۔''

سومروں کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا اقتدار سندھ میں کافی عرصے تک رہا لیکن کسی ایک جگہ انہیں مستقل طور پر حکومت کرنے کا نصیب نہیں ہوا، ادھر ڈوبے ادھر نکلے کے مصداق جس علاقہ میں ان کی حکومت کا سورج غروب ہوتا، وہ کچھ دوری پر اپنا مرکز بنا کر پھر سے طاقت حاصل کر لیتے تھے۔

مصری ائمہ فاطمئین کا طریقہ تھا کہ دور دراز کے علاقے جو ان کے اقتدار کی دسترس سے باہر ہوتے وہاں ایک داعی بھیج دیتے جو ان کا مذہبی اعتبار سے ذمہ دار ہوتا تھا۔ سندھ کی دوری کا خیال کرتے ہوئے فاطمیوں نے ایک مقامی شخص کو مذہبی ذمہ داری سونپنا مناسب سمجھا جو سومرہ اپنی قوم میں ممتاز ہو گا اس لئے اس کو یہ ذمہ داری دی گئی۔ بیس سال تک سومرہ حکومت کے قیام کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر سلطان عبد الرشید (متوفی 444ھ) کے دور میں جب کہ غزنی حکومت خانہ جنگی سے کمزور ہو چکی تھی، کامیاب ہو گئے اور سومرہ نام کے ایک شخص کو سندھ کا والی مقرر کر دیا۔ اس وقت سے خاندان سومرہ کی حکومت مستقل طور سے تمام سندھ میں قائم ہو گئی۔ سلطان عبد الرشید کے دور سے لے کر سلطان شہاب الدین غوری تک جو وقفہ ہے اس دوران تمام سندھ اور ملتان پر سومرہ خاندان حکمراں رہا اور انہی سومرہ خاندان سے ملتان کا علاقہ سلطان شہاب الدین غوری نے چھینا تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بعد سومرہ خاندان کے اقتدار کی حالت یہ رہی کہ سندھ کے مختلف اضلاع پر مختلف اوقات میں حکومت کرتے رہے ان میں سے بعض خود مختار تھے اور بعد دہلی یا ملتان کی مرکزی حکومت کے زیر نگرانی تھے۔

سومرہ خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ: سمہ خاندان نے کیا اور اس کے بعد پھر ان کی سیاسی طاقت کا ظہور نہیں ہوا، اب یہ عام افراد کی طرح رہتے ہیں اور کاشتکاری کا شغل رکھتے ہیں لیکن مرکز کے ماتحت رہنا ان کی اب بھی خصوصیت ہے۔ اردو دائرۃ المعارف میں مذکور ہے۔

"مغلوں کے مسلسل حملوں سے سندھ میں جو طوائف الملوکی پھیلی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر سومرہ دوبارہ برسر اقتدار آ گئے۔ وہ بظاہر سلطنت دہلی کی اطاعت کا دم بھرتے تھے لیکن موقع پاتے ہی خود مختاری کا اعلان کر دیتے اور جب مرکزی فوج ان کی تادیب کیلئے روانہ ہوتی تو پھر اطاعت قبول کر لیتے، یہ صورت حال 1324ء تا 1351ء رہی، اور بعد ازاں جنوبی سندھ کے ایک راجپوت قبیلہ سمہ نے سومروں کو شکست دے کر ان کی جگہ لے لی"۔

4.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- سندھ کا علاقہ تاریخی طور پر بہت قدیم ہے۔ راجہ چچ کے بعد راجہ داہر نے حکومت سنبھالی لیکن اس نے مسلمان حکمرانوں سے ہمیشہ عداوت رکھی۔ یہاں تک کہ محمد بن قاسم نے سندھ کے علاقے کو فتح کر لیا۔
- محمد بن قاسم کی موت کے بعد فتوحات کا سلسلہ رک گیا اور اکثر و بیشتر سندھ کے والی سندھ سے آگے بڑھ کر ہندوستان پر کوئی کارگر حملہ کرنے میں ناکام رہے، زیادہ ہوا تو سندھ کو مکمل طور پر مطیع کر لیا اور اس سے زیادہ ہوا تو گجرات کے سرحدی علاقے کاٹھیاواڑ، ماڑواڑ، بھروچ وغیرہ پر حملہ کیا۔ اموی خلافت میں جنید۔ محمد بن عمر بن قاسم اور داؤد مہلبی نے سندھ میں بہتر انداز سے حکومت کی۔ مرکز میں خلافت امویہ کا تختہ پلٹ گیا اور عباسی حضرات کو اقتدار ملا لیکن سندھ کا حال جوں کا توں رہا۔
- جب خلافت عباسیہ کمزور ہو گئی تو ہباری خاندان کی حکومت سندھ میں قائم ہو گئی۔ ہباری خاندان نے برائے نام خلافت عباسی کی اطاعت گزاری کی در حقیقت وہ سندھ کے معاملے میں خود مختار تھے۔ خاندان ہباری کے بعد اسماعیلی شیعہ حضرات نے منصورہ اور ملتان کی حکومت کا باگ ڈور سنبھالا لیکن سلطان محمود غزنوی نے دونوں کا ہی خاتمہ کر دیا۔
- اسماعیلی شیعوں کے ہی دوسرے گروہ سومروں نے غزنوی سلطنت کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اقتدار حاصل کیا اور ان کی یہ حکومت کئی صدیوں تک قائم رہی۔

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

4.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. رانی بائی کس کی بہن تھی؟

(a) راجہ داہر (b) راجہ شری ہرش (c) راجہ رنمل (d) راجہ دھر سنگھ

2. پہلے عرب سپہ سالار کون تھے جنہوں نے سرزمین ہندوستان میں فاتحانہ قدم رکھا۔

(a) مہلب بن ابی صفرہ (b) حجاج بن یوسف (c) خالد القیسری (d) تمام غلط

3. سندھ میں اموی خلافت کا دور کب سے شروع ہوتا ہے؟

(a)ولید بن عبد الملک (b)یزید بن معاویہ (c)مروان دوم (d)سب صحیح

4. سومرہ خاندان کی حکومت کا خاتمہ کس نے کیا۔

(a)سمہ خاندان (b)راجہ داہر (c)راجہ شری ہرش (d)راجہ رنمل

5. حجاج بن یوسف نے کس کو ہندوستان کی سپہ سالاری دی تھی۔

(a)محمد بن قاسم (b)موسی بن کعب (c)داؤد مہلبی (d)لیث بن طریف

4.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. اسماعیلی شیعوں کی حکومت کا قیام اور زوال لکھیے۔
2. ہباری خاندان اور سومرہ خاندان کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کیجیے۔
3. سندان میں قائم عرب حکومت کا زوال کیسے ہوا۔
4. محمد بن قاسم کے بعد خلافت عباسیہ تک سندھ کے والیوں کا جائزہ لیجیے۔
5. سندھ کا جغرافیہ موسم، اور معدنیات کا جائزہ لیجیے؟

4.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6. سندھ کی قدیم تاریخ اور اسلامی دور سے قبل کے حالات بیان کیجیے۔
7. سندھ پر حملے کے اسباب اور محمد بن قاسم کی فتوحات اور وجوہات تحریر کیجیے۔
8. چچ کے راجہ بننے اور راجہ داہر کے اپنی بہن سے شادی کرنے کا پس منظر بیان کیجیے۔

4.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5. فتح نامہ سندھ معروف بہ چچ نامہ : بنی بخش خاں بلوچ، مترجم اختر رضوی، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، پاکستان
6. تاریخ سندھ جلد اول ودوم : از مولانا سید ابو ظفر ندوی، مطبوعہ دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اترپردیش
7. عرب وہند کے تعلقات : سید سلیمان ندوی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اترپردیش
8. آب کوثر : شیخ محمد اکرام علی، ادبی دنیا، دہلی
9. محمد بن قاسم سے اورنگ زیب تک : محمد سعید الحق، اریب پبلیکشنز، دہلی
10. برصغیر ہند میں اشاعت اسلام کی تاریخ : محمد مشتاق تجاروی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی

اکائی 5: دہلی سلطنت کا قیام اور مشہور سلاطین

اکائی کے اجزا:

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 سلطنت کا قیام

5.3 غلام خاندان

5.3.1 قطب الدین ایبک

5.3.2 شمس الدین التمش

5.3.3 رضیہ سلطان

5.3.4 غیاث الدین بلبن

5.3.5 خلجی خاندان (1320-1290)

5.3.6 سلطان علاء الدین خلجی

5.3.7 تغلق خاندان

5.3.8 غیاث الدین تغلق

5.3.9 محمد بن تغلق

5.3.10 فیروز شاہ تغلق (1388-1351)

5.3.11 سید خاندان (1451-1414)

5.3.12 لودھی خاندان (1526-1451)

5.3.13 سکندر لودھی

5.4 دہلی سلطنت کا کردار اور زوال

5.5 علاقائی حکومتوں کا قیام

5.6 اکتسابی نتائج

5.7 نمونہ امتحانی سوالات

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

افغانستان کے شہر غزنہ کے قریب علاقہ غور میں غوری حکومت قائم ہوئی جس نے بتدریج غزنوی حکومت کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ پھر اس نے مشرق کی جانب قدم بڑھائے۔ اس حکومت کا ایک فرمانروا غیاث الدین محمد ہوا ہے، اس کا چھوٹا بھائی اس کا شریک سلطنت تھا، جو محمد شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے ملتان اور لاہور سے آگے بڑھ کر اجمیر اور دہلی کے آس پاس تک کے علاقوں کو فتح کیا اور اپنے وفادار غلام جرنیلوں کو وہاں مقرر کیا، ان ہی غلام فوجی سپہ سالاروں میں ایک کا نام قطب الدین ایبک تھا جسے شہاب الدین غوری نے اندرپرست دہلی کا گورنر مقرر کیا تھا۔ جس نے 1206 میں غوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک نے دہلی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ زیر نظر اکائی میں دہلی سلطنت کے قیام کی تفصیل اور یہاں حکومت کرنے والے اہم حکمرانوں کی سیاسی و تمدنی کارکردگیوں کا تعارف کرایا جارہا ہے۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ ہندوستان میں قائم ہونے والی دہلی سلطنت کے اسباب واثرات سے واقف ہوسکیں۔ اسی طرح اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس سلطنت میں حکومت کرنے والے اہم خاندانوں واہم حکمرانوں کے کارناموں کا تجزیہ کرسکیں گے۔

5.2 سلطنت کا قیام

غزنوی خاندان کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر جب غوریوں نے طاقت حاصل کرلی تو وہ اپنی حکومت کا دائرہ وسیع کرنے لگے، غور کے علاء الدین حسین جہاں سوز کے بعد سیف الدین حکمراں ہوا، اس کے بعد اس کا چچازاد بھائی غیاث الدین اس کا جانشین ہوا، شہاب الدین محمد غوری جو اس کا چھوٹا بھائی تھا شریک سلطنت بنا۔ شہاب الدین غوری نے اپنی ترک تازیوں کا میدان مشرق کو بنایا، پہلے اس نے 1175 میں ملتان پر حملہ کیا، پھر اوچ کو فتح کیا۔ 1177 کے گجرات پر حملہ میں اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، 1186 میں اس نے لاہور کو فتح کیا اور 1189

میں بھٹنڈہ پر بھی قبضہ کر لیا، یہاں سے وہ غزنی واپس لوٹ رہا تھا تو دہلی کا راجہ پرتھوی راج چوہان مزاحم ہوا۔ ترائین کے میدان میں 1191 میں چوہان کے ساتھ غوری کا مقابلہ ہوا جس میں غوری نے شکست کھائی۔ اگلے سال 1192 میں وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا اور اسی ترائین کے میدان میں پرتھوی راج چوہان کو شکست دی۔ اس طرح دہلی اور اطراف کا علاقہ شہاب الدین غوری کے قبضہ میں آگیا۔ اس جنگ میں چوہان کی قوت بالکل ختم ہوگئی اور غوری نے اس کے بعد ہانسی، کہرام اور سرستی وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ غوری اس کے بعد غزنیں واپس چلا گیا، البتہ اس نے دہلی پر اپنے وفادار غلام قطب الدین ایبک کو مقرر کیا، جس نے 1194 میں علی گڑھ کو بھی فتح کر لیا۔ 1195 میں غوری دوبارہ ہندوستان آیا، اس بار قنوج کے راجہ جے چند سے اس کا مقابلہ ہوا، اٹاوہ کے پاس راجہ نے شکست کھائی، اور بنارس تک کا ملک غوری کے قبضہ میں آگیا۔ 1206 میں شہاب الدین غوری کھوکھروں کا فساد ختم کر کے غزنیں واپس جارہا تھا کہ راستہ میں کسی اسماعیلی کھوکھر نے اس پر حملہ کر کے شہید کرڈالا۔

شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد قطب الدین نے 1206 میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے پہلے دہلی کو اپنا مرکز بنایا، پھر جلد ہی لاہور منتقل ہو گیا، اور اسے اپنا پایہ تخت بنالیا۔ اور اس طرح دہلی سلطنت کی بنیاد پڑ گئی' اور قطب الدین ایبک دہلی سلطنت کا بانی قرار پایا۔ 1210 تک ایبک نے اپنے چار سالہ دور میں سلطنت کے استحکام اور وسعت پر توجہ دی۔ ساتھ ہی اپنے آقا شہاب الدین غوری کی طرح خود اس نے بھی اپنے وفادار اور قابل غلاموں کی عمدہ تربیت کی، جنہوں نے دہلی سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور اس کے دائرے کو وسیع کرنے میں بہترین کارنامے انجام دئے۔

دہلی سلطنت کا پہلا حکمراں خاندان قطب الدین ایبک کا خاندان تھا، اسکے بعد ایبک کے غلام شمس الدین التمش اور اس کے افراد خاندان نے حکومت کی، اس خاندان کے بعد التمش کے غلام غیاث الدین بلبن اور اس کے خاندان کے افراد نے حکومت کی۔ ان غلاموں کی وجہ سے دہلی سلطنت کے اس پہلے حکمراں خاندان کو خاندان غلاماں بھی کہتے ہیں۔ غلام خاندان کے بعد یکے بعد دیگرے خلجی، تغلق، سید اور لودھی خاندانوں نے تین سو برس تک اس حکومت کو برقرار رکھا۔ یہ سارے حکمراں سلطان کہلاتے تھے، اسی لئے یہ پوری حکومت سلطنت کے نام سے مشہور ہوئی، اور شہر دہلی جو اس سلطنت کا پایہ تخت رہا، اس کی نسبت سے دہلی سلطنت کہلاتی رہی۔

5.3 غلام خاندان

دہلی سلطنت کا پہلا حکمراں خاندان غلام خاندان کہلاتا ہے۔ شہاب الدین غوری کا وفادار اور قابل اعتماد جرنیل قطب الدین ایبک نہ صرف دہلی سلطنت کا بانی ہے، بلکہ غلام خاندان کی حکومت کی بنیاد بھی رکھنے والا وہی ہے۔ چونکہ یہ غلام سلطان شہاب الدین سے وابستہ تھے جو معزالدین نام رکھتا تھا، اس لئے یہ معزی بھی کہلاتے تھے۔ اس خاندان نے 1206 سے 1290 تک تقریبا ایک صدی ہندوستان پر حکومت کی، اور اس قابلیت کے ساتھ حکمرانی کی کہ آئندہ دو صدیوں تک دہلی سلطنت برقرار رہی۔ اس خاندان کے پہلے حکمراں قطب الدین ایبک نے اور اس کے جرنیلوں نے تقریبا پورے شمالی ہندوستان یعنی لاہور، سندھ، سروتی، کہرام، ہانسی، دہلی، اجمیر، قنوج اور بنارس

سے لے کر بہار و بنگال تک کے علاقوں پر مسلم سلطنت کا پرچم لہرایا۔ ان علاقوں میں حکومت کا مستحکم نظام اور امن و امان قائم کر دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غیر مسلم اکثریت کے دلوں کو فتح کر لیا۔ ایبک نے ہی علم و ادب کی شاندار محفلیں آراستہ کیں اور اس کا اس قدر اہتمام کیا کہ دنیا بھر کے باکمال اور اہل فن لاہور اور دہلی کی طرف کھنچ کر آنے لگے۔ اس خاندان میں کل دس سلاطین ہوئے، جن میں زیادہ شہرت و ناموری اور سلطنت کے استحکام میں حسن کارکردگی ایبک، التمش، رضیہ سلطانہ اور غیاث الدین بلبن کے حصہ میں آئی۔ ذیل کی سطروں میں ان کا مختصر تعارف دیا جارہا ہے۔

5.3.1 قطب الدین ایبک

قطب الدین ایبک ترکستان میں پیدا ہوا تھا، بچپن میں اسے غلام کے طور پر نیشاپور میں فروخت کر دیا گیا تھا۔ یہ قطب الدین کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بچپن میں ہی علم و فضل سے آراستہ گھرانہ ملا۔ نیشاپور کے قاضی فخر الدین کوفی نے قطب الدین کو خریدا، قاضی صاحب امام ابو حنیفہ کی اولاد میں سے تھے اور اپنے علاقہ کے حاکم بھی تھے، ان کا گھرانہ علم و فضل سے معمور تھا، انھوں نے ایبک کو بھی اچھی دینی تعلیم دی، اور اپنے بچوں کی طرح اس کی تربیت پر توجہ دی۔ ایبک نے کلام پاک کی ایسی تعلیم پائی کہ قرآن خواں کے نام سے مشہور ہو گیا، اس نے لکھنا پڑھنا سیکھا اور دوسرے آداب و کمالات میں اچھی مہارت حاصل کر لی، نیز سواری اور تیر اندازی کی بھی تعلیم پالی۔ قاضی فخر الدین کی وفات کے بعد ان کے لڑکوں نے قطب الدین کو کسی تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا، جس سے سلطان معزالدین غوری نے اسے بڑی قیمت دے کر خرید لیا۔ اس کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی، اس لئے وہ قطب الدین ایبک شل (ٹوٹی انگلی) کہلانے لگا، اور آگے چل کر صرف ایبک سے مشہور ہو گیا۔ قطب الدین ابتداء سے فیاض طبیعت کا مالک تھا، اپنے آقا سے ملنے والے انعامات کو بھی ادنی غلاموں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ اس کی بلند حوصلگی اور فیاضی سے خوش ہو کر سلطان شہاب الدین نے اسے اپنے امراء میں شامل کر لیا، پھر بتدریج ترقی کرتا ہوا وہ امیر آخور کے عہدہ پر فائز ہو گیا، اپنے آقا کے ساتھ فوج کشی میں بھی وہ اپنی شجاعت کی خوب داد دیا کرتا تھا۔

1192ء/587ھ میں جب شہاب الدین اجمیر اور دہلی کو فتح کرنے کے بعد 1193 میں غزنی واپس ہونے لگا تو اس نے قطب الدین کو کہرام اور سامانہ کا اقطاع دار اور ہندوستانی مقبوضات کا نائب مقرر کر دیا۔ اس نے دہلی کو اپنا مرکز بنایا اور نہ صرف مقبوضہ علاقوں کا اچھا انتظام کیا اور ان پر اپنا قبضہ برقرار رکھا، بلکہ آگے بڑھ کر میرٹھ اور علی گڑھ کو بھی فتح کر لیا۔ 1193 میں شہاب الدین نے اسے غزنیں بلا کر اس کے کارناموں کی داد دی، اور انعامات سے نوازا، غزنیں سے واپس آکر قطب الدین نے اپنی انتظامی اور فوجی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ 1194 میں سلطان شہاب الدین غوری قنوج اور بنارس کے راجہ جے چند سے مقابلہ کے لئے ہندوستان آیا تو قطب الدین نے اس موقع پر نہ صرف فوجی ساز و سامان بہم پہنچائے بلکہ غوری کی فوج کا پیشرو لشکر بن کر اس مقابلہ میں بہترین کارنامے انجام دئے۔ سلطان شہاب الدین نے اس جانبازی سے متاثر ہو کر اسے اپنا فرزند بنایا اور فرمان فرزندی عطا کیا۔ بنارس اور قنوج کی فتح سے شمالی ہند کا بڑا علاقہ غوری کے ماتحت آگیا۔ اس کے ساتھ ہی قطب الدین کے ایک فوجی سالار محمد بن بختیار خلجی نے بہار اور بنگال میں اپنی فتوحات کا پرچم لہرایا اور 1202 میں اس نے تبت کے پہاڑی علاقوں تک اپنی ترک تازیاں پہنچا دیں۔ گو کہ تبت کے دشوار گذار پہاڑی علاقوں میں اسے کافی فوجی اور جانی

نقصان اٹھانا پڑا لیکن بہار اور بنگال کے علاقے تک اس کی بلند ہمتی نے دہلی سلطنت کی وسعت قائم کر دی اور تقریباً تمام شمالی ہندوستان پر مسلم سلطنت کی عملداری قائم ہو گئی۔

شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد غزنیں میں سلطان محمود بن غیاث الدین تخت کا وارث بنا تو اس نے قطب الدین کو سلطان کا خطاب، امارت بادشاہی اور آزادی کا فرمان بھیجا۔ قطب الدین اپنے آقا کے خاندان سے ملنے والی اس خلعت اور فرمان آزادی کو حاصل کرنے کے لئے دہلی سے آگے بڑھ کر لاہور آیا اور اس اعزاز کا استقبال شایان شان انداز سے کیا۔ پھر لاہور میں ہی وہ آزاد سلطان کے طور پر ذی قعدہ602ھ مطابق جون1206ء میں تخت نشین ہوا۔ اور ہندوستان کی سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

قطب الدین ایبک نے لاہور کو مرکز بنا کر چار برس حکومت کی، اس مختصر مدت میں اس نے اپنی مقبوضات کے اندر بہترین نظم و نسق قائم کر دیا۔ ایبک جس طرح حوصلہ مند فوجی تھا، اسی طرح دور اندیش اور قابل منتظم بھی تھا۔ اپنی سلطنت میں اس نے امن وامان قائم کر دیا، ڈاکہ اور لوٹ مار کا خاتمہ کر دیا، وہ بڑا منصف مزاج اور عطا پرور تھا۔ مظلوموں کی دادرسی اور انصاف کا قیام اس نے اپنا فرض منصبی سمجھا اور عدل نوازی کی بہترین روایت قائم کر دی۔ داد و دہش اور انعامات دینے میں وہ بڑا فراخدل واقع ہوا تھا۔ اپنی فیاضی اور سخاوت کی وجہ سے وہ لکھ بخش سے مشہور ہو گیا تھا، علمی اور ادبی سرپرستی اس نے دل کھول کر کی۔ چنانچہ اس کے دربار سے کئی بڑے شعراء وابستہ رہے اور اہل فضل و کمال کی قدر دانی ہوتی رہی۔ قطب الدین ایبک اوصاف حمیدہ کا حامل تھا۔ مذہب کا احترام اور شریعت نوازی اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ تخت نشیں ہونے کے بعد غیر شرعی وصولی بند کرادی، مسلمانوں کی زندگی کی تشکیل شرعی نہج پر کرنے کی کوشش کی، سنت کی پیروی کرنے کا ماحول بنایا اور تمام نامشروع بدعتیں دور کر دیں۔ اس نے اجمیر اور دہلی میں مسجدیں بنوائیں۔ دہلی کا قطب مینار اسی کی یادگار ہے، جو دراصل مسجد قوت الاسلام کے مینارہ کے طور پر بنوایا گیا تھا۔ قطب الدین ایبک چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر پڑا اور 1210 میں وفات پائی۔

5.3.2 شمس الدین التمش

صرف چار سال کی حکومت کے بعد اچانک قطب الدین ایبک کی وفات ہو گئی تھی، اس کے انتقال پر امراء نے اس کے لڑکے آرام شاہ کو تخت نشیں کیا۔ یہ وقت حکومت کے لئے بڑا مشکل اور چیلنجز سے بھرا تھا، ہندوستان میں ابھی نئی حکومت کے قیام پر مختصر عرصہ ہی گذرا تھا۔ آرام شاہ نئی صورت حال کو پوری طرح قابو میں نہیں رکھ سکا، اور جگہ جگہ علاقائی امیروں نے خود مختاری کے خواب دیکھنے شروع کر دئے۔ داخلی اور بیرونی دونوں سطحوں پر کئی چیلنجز پیدا ہو گئے تھے۔ قطب الدین ایبک کا ایک قابل اور بااعتماد غلام شمس الدین التمش تھا، اپنی فوجی صلاحیت، اعلی انتظامی قابلیت اور جرأت و حوصلہ مندی کی وجہ سے قطب الدین ایبک نے اسے اپنا داماد بنایا تھا، اور اس کے کارناموں سے خوش ہو کر اسے پروانہ آزادی بھی عطا کر چکا تھا۔ وہ گوالیار کا امیر، پھر برن پھر بدایوں کا مقطع رہ چکا تھا۔ ملک کی نئی صورت حال میں وہ امیروں کے مشورہ پر جلد دہلی آیا اور اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ لاہور کی شاہی فوج کے ساتھ مقابلہ میں اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک برس سے کم مدت میں ہی آرام شاہ معزول کر دیا گیا۔

التمش بہت سی خوبیوں کا مالک تھا، تاریخوں اور تذکروں میں اسے بہادر سپاہی، بیدار مغز حکمراں، برگزیدہ ولی اللہ اور جلیل القدر اہل علم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ سیاسی ہوشمندی اور سپہ گری کے ساتھ عشق الہی اور علم نوازی میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ خواجہ بزرگ اجمیری، خواجہ بختیار کاکی، شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ بہاؤالدین ملتانی، قاضی حمید الدین ناگوری جیسے مشائخ کبار کے ساتھ اس نے گہرے عقیدت مندانہ مراسم رکھے۔ عالم اسلام کے دگرگوں حالات کی وجہ سے وقت کے بڑے بڑے علماء اور اصحاب فضل ہندوستان کا رخ کررہے تھے، التمش نے ان کی قدر دانی کی، شیخ نور الدین مبارک غزنوی، قاضی منہاج الدین سراج اور دیگر علماء اس کے دربار کی زینت تھے۔ اس کے دستر خوان پر اور سفر میں سینکڑوں علماء اس کے ساتھ ہوتے، جن سے وہ ملکی نظم ونسق، حکمرانی کے نظریہ نیز علمی مسائل پر گفتگو کرتا، اور ان کی نصیحتوں اور رایوں کو قبول کرتا۔ اس کا وزیر نظام الملک جنیدی بھی بڑا عالم وفاضل اور علم وفضل کا قدر داں تھا۔ التمش نے دہلی میں دو مدرسے معزیہ اور ناصریہ قائم کئے تھے جہاں سے بڑے علماء وابستہ رہے۔ برن میں بھی اس نے مدرسہ قائم کیا تھا۔ ملکی نظام میں اس نے ملکی مصالح اور شریعت کے احکام کے درمیان توازن رکھنے کی کوشش کی۔ ایک موقع پر علماء کی ایک جماعت نے غیر مسلموں کے تئیں التمش کی بعض پالیسیوں پر شرعی نقطہ سے اعتراض کیا تو التمش نے اپنے وزیر جنیدی کے ذریعہ انہیں ملکی مصالح اور ہندوستان کے مخصوص حالات کے بارے میں بات کرکے مطمئن کرایا۔ التمش نے خواجہ قطب الدین کاکی کے مشورہ سے جگہ متعین کرکے عوامی سہولت کے لئے حوض شمسی بنوایا۔ اس نے قطب الدین ایبک کے شروع کردہ قطب مینار کی تعمیر مکمل کرائی۔ اپنے ان سب کارناموں کی وجہ سے وہ نہ صرف دہلی سلطنت کی تاریخ میں بلکہ عمومی تاریخ میں اپنا نام روشن کرگیا ہے۔

5.3.3 رضیہ سلطان

سلطان شمس الدین کی وفات کے بعد اس کی اولاد میں خانہ جنگی شروع ہوگئی، اور دس سال کے عرصہ تک سیاسی حالات غیر مستحکم رہے۔ التمش نے اپنی مدد اور مشاورت کے لئے چالیس امیروں پر مشتمل مجلس چہلگانی بنائی تھی جو امور سلطنت میں بادشاہ کے لئے دست و بازو تھی، لیکن یہ مجلس اب اتنی طاقت ور ہوگئی تھی کہ یہی بادشاہ بناتی اور بادشاہت ختم کرتی تھی۔ دس سال کے عرصہ میں تخت سلطنت پر چار بادشاہ آئے اور گئے۔ جب 1246 میں التمش کا سب چھوٹا لڑکا صوفی صفت اور خداترس بادشاہ ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا اور اس نے اپنے وزیر باتدبیر بلبن کو سلطنت کے سیاہ وسپید کا مالک بناکر خود گوشہ نشین ہوگیا تب بلبن کے آہنی ہاتھوں اور پر ہیبت نظریات نے سلطنت کو استحکام بخشا۔

التمش کے بعد خانہ جنگی میں اس کا منجھلا لڑکا رکن الدین فیروز شاہ حریفوں پر غالب آیا اور تخت نشیں ہوا، لیکن صرف سات ماہ کی مدت کے بعد اسے قتل کردیا گیا اور التمش کی بیٹی رضیہ سلطان تخت نشین کی گئی۔

رضیہ سلطان ہندوستان کی پہلی حکمراں خاتون ہے۔ یہ 1246ء، 634ھ میں تخت دہلی پر بیٹھی۔ اس کے اندر حکمرانی کے تمام اوصاف موجود تھے، وہ التمش کی اولاد میں سب سے زیادہ قابل ولائق تھی۔ عقلمند، بہادر، بلند ہمت اور معاملہ فہم خاتون تھی، اس نے اعلی تعلیم وتربیت بھی پائی تھی، اسی لئے التمش نے اسی کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے زمانہ میں ملکی معاملات میں دخل دیا کرتی تھی اور

فرمانروائی کیا کرتی تھی، رضیہ نے تخت نشین ہونے کے بعد حبشی غلام یاقوت کو اہم عہدہ پر فائز کیا، لیکن امراء چہلگانی میں سے بعض جو رضیہ کی حکومت کو اس کے عورت ہونے کی بنا پر پسند نہیں کرتے تھے، اس کے مخالف ہوگئے۔ التمش کا وزیر نظام الملک جنیدی بھی مخالف تھا۔ رضیہ کے خلاف بغاوت کردی گئی، اور مقابلہ میں رضیہ گرفتار ہوکر تبرہندہ میں قید کردی گئی۔ رضیہ نے اپنی دانشمندی سے کام لیتے ہوئے جیل کے محافظ التونیہ کو اپنے ساتھ ملالیا اور اس سے شادی کرلی، اور مقابلہ کے لئے نکلی لیکن میدان جنگ میں شکست کھائی اور راستہ میں کسی نے اسے قتل کردیا۔ رضیہ کے بعد اس کا بھائی معزالدین بہرام شاہ دو برس حکمراں رہا، پھر التمش کا پوتا اور رکن الدین فیروز شاہ کا بیٹا علاء الدین مسعود شاہ تخت نشین کیا گیا، جس نے چار برس حکومت کی۔ پھر 1246 میں التمش کا سب سے چھوٹا بیٹا ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا۔

رضیہ سلطان نے چار برس حکومت کی، اس کے عہد میں گو سیاسی طور پر انتشار رہا، لیکن اس نے بیدار مغزی اور جرأت کے ساتھ حکومت کی۔ وہ مردانہ لباس پہن کر دربار لگاتی، جنگوں میں فوج کی قیادت کرتی، اس نے ملک کے اندر بغاوتوں پر قابو پایا اور امن و امان کو برقرار رکھا۔ رضیہ کے دور میں علمی کام بھی انجام پائے، طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج نے اسے عالم نواز لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے علم و ادب کی سرپرستی اور قدردانی جاری رہی۔ خود قاضی منہاج سراج رضیہ کے عہد میں ہی گوالیار سے دہلی آئے تو رضیہ نے انہیں مدرسہ ناصریہ کا مہتمم بنایا۔

5.3.4 غیاث الدین بلبن

بلبن ہندوستان کے نامور بادشاہوں میں سے ایک ہے۔ اس نے دہلی سلطنت کو وقار و اعتبار عطا کیا اور اپنے مخصوص طرز حکومت اور مضبوط انتظامی و عدالتی نظام کے ذریعہ ملک میں بغاوت کے تصور کو بھی ختم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی، اور مفسدوں و رہزنوں کی بدامنی سے عوام کو راحت دلادی، نیز منگولوں کی ناقابل شکست فوجوں کو سرحدی علاقوں میں ہی کراری شکست دے کر ہندوستان کی طرف رخ کرنے کی ان کی ہمت توڑ کر رکھ دی۔

بلبن بھی التمش کی طرح ترکستان کے البری قبیلہ کا ایک ترک امیر زادہ تھا، اس کا باپ البری ترک کے دس ہزار خاندانوں کا سردار تھا۔ چنگیز خانی حملہ میں وہ مغل سپاہی کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور بغداد میں لاکر بیچ دیا گیا۔ یہاں خواجہ جمال الدین بصری نے اسے خریدا اور اپنے فرزند کی طرح اس کو تعلیم و تربیت دی۔ اسی گھرانہ میں بلبن کی مذہبی تربیت ہوئی، خواجہ جمال نے اسے دہلی لاکر سلطان شمس الدین التمش کے ہاتھوں فروخت کردیا۔ التمش نے بلبن کی تربیت پر خصوصی توجہ دی اور اس کے اندر عظمت کے آثار دیکھ کر اسی کو اپنا خاصہ دار یعنی ذاتی محافظ مقرر کردیا۔ بلبن کا بھائی کشلی خان پہلے سے التمش کے دربار میں تھا، اور ترقی کرکے امیر حاجب کے عہدہ پر مامور تھا۔ یہاں بلبن کی عزت و وقعت میں اضافہ ہوتا گیا۔ شروع میں اس نے ایک معمولی سپاہی، اور بہشتی کا کام کیا، پھر رفتہ رفتہ میر شکار بنا اور چہل گانی امراء میں داخل ہوگیا، بلبن کے اندر پیدا ہونے والے مذہبی رنگ میں التمش کی ان مجلسوں کا اہم رول ہے جو وہ اپنے دربار میں علماء اور مشائخ کے ساتھ منعقد کرتا تھا' اور بلبن ان سے استفادہ کرتا تھا۔ التمش کے بعد پیدا ہونے والی سیاسی رسہ کشی میں بلبن نہ تو رکن الدین فیروز شاہ کی

حمایت کرنے والے گروہ میں تھا، نہ رضیہ سلطان کی اس نے حمایت کی، جس کی وجہ سے وہ قید و بند کا شکار بھی ہوا، لیکن جلد ہی اسے قید سے نجات ملی، اور میر شکار کا عہدہ عطا ہوا۔ پھر معزالدین بہرام شاہ کے عہد میں اس کا رتبہ اور بڑھ گیا، اور وہ امیر آخور یعنی داروغہ شاہی اصطبل مقرر ہوا، پھر اسے ریواڑی کی جاگیر عطا ہوئی۔ یہاں اس نے نہ صرف میواتیوں کی سرکشی کو فرو کیا بلکہ اپنی جاگیر کا اچھا انتظام کیا۔ علاء الدین مسعود کے زمانہ میں بلبن امیر حاجب کے عہدہ پر مقرر ہوا اور اسی زمانہ میں دوآبہ کی فوجی مہم میں مغلوں کے حملہ کو روکنے میں زبردست خدمات انجام دیں جس سے اس کی سپہ گری اور فوجی قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ ناصر الدین محمود کے زمانہ میں بلبن کو الغ خاں کا خطاب اور وزارت عطا کی گئی اور وہ نائب الملک بن کر پوری سلطنت پر حکومت کرنے لگا۔ ناصر الدین محمود درویش صفت بادشاہ تھا، اس نے بادشاہی کے تمام اختیارات اپنے وزیر اور خسر الغ خاں کے سپرد کر دئے اور خود گوشہ نشیں ہو گیا، اس نے بلبن سے کہا:

"اپنے تمام اختیارات کا باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں، لیکن کبھی تم کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ کل خدا کے حضور میں اس کا جواب نہ بن پڑے اور اپنے ساتھ مجھ کو بھی شرمندہ کرو"۔

بلبن نے بیس برس تک نائب الملک بن کر حکومت کی۔ اس دوران اس نے پنجاب میں کھوکھروں کی بغاوت فرو کی، دوآبہ کو سلطنت کے تابع کیا، اور رنتھمبور کی تسخیر کی، اور گوالیار، چنڈیری اور مارواڑ کی فتوحات حاصل کیں۔ اس نے اندرونی نظم کو بھی مستحکم بنایا۔ 1259 اور 1260 میں دو مغل حملوں کا کامیاب مقابلہ کیا، راجپوت راجاؤں کو بھی اس عرصہ میں قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔

1260 میں ناصر الدین محمود لاولد مرا تو بلبن کی سیاسی بصیرت اور سپہ گری کا سکہ اتنا جم گیا تھا کہ امراء نے بالاتفاق اسے تخت شاہی پر بٹھایا۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے سلطان کے دبدبہ اور سطوت کو ایسے اونچے مقام تک پہنچا دیا کہ اس سے زیادہ تصور مشکل ہے۔ چہل گانی امراء کی طاقت توڑ دی تاکہ کسی اندرونی خطرہ کا امکان باقی نہ رہے۔ دربار کی شان و شوکت اور آداب شاہی کا اعلی معیار قائم کر دیا، اس کے دربار میں تقریباً پندرہ شاہزادے ایسے تھے جو منگول حملوں اور بربادی کی وجہ سے عالم اسلام کے مختلف علاقوں سے آکر پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ ان میں سے صرف دو عباسی شاہزادوں کو دربار میں بیٹھنے کی اجازت تھی۔ باقی شاہزادے کھڑے رہا کرتے تھے۔ امراء میں سے کسی کو دربار میں مذاق اور ہنسی کی مجال نہ تھی۔

بلبن نے منگول حملوں کو روکنے کے لئے مغربی سرحدوں پر مضبوط قلعے تعمیر کرائے، اپنے بیٹوں محمد اور بغرا خاں کو وہاں مقرر کیا، شاہراہوں اور راستوں کی تعمیر کرائی، دہلی اور اس کے اطراف میں میواتیوں کی ڈاکہ زنی کو روکنے کے لئے اس نے ان جنگلات کو صاف کرایا جہاں وہ چھپ جایا کرتے تھے۔ راستوں کو درست کرایا اور جگہ جگہ مضبوط تھانے قائم کر دئے، اور ڈاکوؤں کو سخت ترین سزائیں دیں۔

بلبن کے عہد میں طغری خاں نے بنگال میں بغاوت کی اور شاہی فوج کو شکست دیدی تو بلبن خود ایک بڑے لشکر کے ساتھ نکل کھڑا ہوا، طغری خاں کو قرار واقعی سزا دی اور اپنے بیٹے بغرا خاں کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا جس کے بعد داخلی امان اور مستحکم ہو گیا۔

بلبن بڑا مذہبی اور علم و فضل کا قدر دان تھا، مشائخ کے ساتھ اس کی عقیدت بہت بڑھی ہوئی تھی، وہ اپنے تمام شاہی کر و فر اور آداب کے باوجود ہر جمعہ کو بزرگان دین کی خدمت میں حاضری دیتا، ان کے وعظ سننے جاتا، راستے میں اگر کہیں وعظ کی محفل ہوتی تو وہیں

سواری سے اتر کر عام آدمی کی طرح بیٹھ جاتا۔ اس عہد کے بڑے مشائخ اور علماء نے بھی بلبن کی بڑی تعریف کی ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء اس کا نام دعائیہ کلمات کے ساتھ لیتے ہیں اور اس کی عبادت وراسخ العقیدگی کی تعریف کرتے ہیں۔ اس عہد میں بابا گنج شکر، خواجہ علی چشتی، شیخ بہاؤالدین زکریا، شیخ بدر الدین غزنوی، شیخ ابو المؤید نظام الدین، شیخ جمال الدین ہانسوی، خواجہ علاء الدین علی بن احمد صابر، سیدی مولہ، شیخ حسام الدین ملتانی، شیخ نجیب الدین فردوسی، اور شیخ ابو بکر طوسی جیسے مشائخ موجود تھے۔ علماء وفقہاء میں مولانا برہان الدین بزاز، مولانا کمال الدین زاہد، مولانا برہان الدین محمود بلخی، علامہ نجم الدین عبد العزیز دمشقی، شیخ سراج الدین ابو بکر، مولانا شرف الدین ولوالجی، مولانا شمس الدین خوارزمی، مولانا فخر الدین ناقلہ، قاضی جلال الدین کاشانی، قاضی رفیع الدین گازرونی، مولانا سراج الدین سجزی اور مولانا منہاج الدین جوزجانی وغیرہ علم وفن کے آفتاب وماہتاب تھے۔ ان میں بیش تر کے ساتھ بلبن کا گہرا لگاؤ تھا اور بلبن نے ان کی بڑی قدردانی کی۔

بلبن نے حتی الامکان اپنی سلطنت کو شرعی احکام کے مطابق رکھنے کی سعی کی، لیکن سیاسی امور اور سزاؤں میں وہ شریعت کی مکمل پابندی نہیں کرپاتا تھا۔ جس کا اسے احساس بھی رہا اور وہ کہا کرتا تھا کہ عوام کی بھلائی کا کام کرکے اس کی تلافی کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ البتہ اس نے حمیت اسلام اور شعائر اسلام کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ بادشاہت سے پہلے بلبن کے اندر جو غیر شرعی عادتیں تھیں ان کو اس نے چھوڑ دیا، اور اپنی سلطنت میں شراب وممنوعات شرعیہ پر روک لگادی۔ اس کے عہد میں غیر مسلموں کو بھی پورا عدل وانصاف ملا اور خوشحالی وترقی حاصل ہوئی۔ بلبن نے توسیع حکومت کی کوشش نہیں کی، البتہ اندرونی امن وامان اور خارجی حملہ آوروں سے حفاظت میں پوری کامیابی حاصل کرلی۔ اس نے عدل وانصاف کی ترویج میں مذہب اور قرابت داری کو حائل نہیں ہونے دیا۔ بلبن نے اپنے دونوں بیٹوں محمد اور بغرا خاں کی تربیت اعلی پیمانہ پر کی تھی۔ خاں محمد کا دربار تو اہل علم وفضل کا مرکز تھا، امیر خسرو اسی دربار سے وابستہ تھے، مغلوں سے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد نماز پڑھتا ہوا خان محمد شہید ہوا تو بلبن اس صدمہ سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور ایک برس بعد اسی غم میں 1286 میں وہ چل بسا۔

5.3.5 خلجی خاندان (1290-1320)

غلام خاندان کا آخری فرمانروا معز الدین کیقباد اپنی بداطواری کی وجہ سے اپنے انجام کو پہنچا اور اس کے خاندان میں کوئی قابل نہیں رہ گیا تو ستر سالہ بوڑھے جلال الدین فیروز خلجی نے تاج شاہی اپنے سرپر رکھا۔ جلال الدین خلجی افغانستان سے آیا ہوا ترک تھا، فوجی قابلیت میں دھنی، لیکن حکومت کی باگ سنبھالنے کے بعد انتہائی نرم دل ورحم کرنے والا بن گیا۔ اس کے دور میں سرحد پر مغلوں نے حملہ کیا تو جلال الدین نے ان کا مقابلہ کرکے مصالحت کرلی جس کے نتیجہ میں چنگیز خاں کا نواسہ الغو خاں اور چار ہزار مغلوں نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اسلام قبول کرلیا اور دہلی میں آباد ہوگئے۔ بادشاہ کی نرمی سے فائدہ اٹھاکر رہزنوں اور ڈاکوئں نے فساد شروع کردیا اور جگہ جگہ سازشیں ہونے لگیں، ملک چھجو کی بغاوت کو بھی جلال الدین نے معاف کردیا، لیکن یہ معافی مہنگی ثابت ہوئی، جلال الدین کے داماد اور بھتیجہ علاء الدین خلجی نے سازش کرکے اپنے چچا کو قتل کردیا اور خود تخت حکومت پر قابض ہوگیا۔ علاء الدین خلجی کا دور حکومت بڑا طویل، زریں اور نئے تجربات سے آراستہ ہے۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ آخر میں علاء الدین کی پیرانہ سالی میں اس کے محبوب سپہ سالار ملک کافور نے اس کے

مزاج میں دخل حاصل کر لیا اور حکومت کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں کر کے خاندان خلجی کو تقریباً نابود کر دیا، اس خاندان کے آخری بادشاہ قطب الدین مبارک شاہ نے قسمت سے حکومت حاصل کر لی لیکن وہ بھی اپنے محبوب خسرو خاں کے فریب میں گرفتار رہا جس سے حکومت کا نظم و نسق ڈھیلا ہوتا گیا، بلکہ خسرو خاں ہی کے ہاتھوں وہ مارا گیا۔ نو مسلم خسرو خاں کی اسلام دشمن حرکتوں سے تنگ آکر دیپال پور کے گورنر غازی ملک نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ خاندان خلجی کا کوئی فرد موجود نہ بچا تھا، نتیجہ حکومت غازی ملک کے خاندان یعنی تغلق خاندان میں منتقل ہو گئی۔ خلجی خاندان میں کل چار بادشاہ ہوئے، اور انھوں نے 1290-1320 تک کل تیس برس حکومت کی۔ جس میں اصل حکومت علاء الدین خلجی کی تقریباً بیس برس رہی۔ اس خاندان میں یہی ایک نامور سلطان گذرا ہے، بلکہ یہ اپنی ناموری میں نہ صرف دہلی سلطنت بلکہ ہندوستان کے چند بادشاہوں میں سے ایک ہے۔ ذیل کی سطروں میں اس نامور سلطان کے بارے میں پڑھئے۔

5.3.6 سلطان علاء الدین خلجی

علاء الدین خلجی خاندان خلجی کے اولین فرمانروا جلال الدین خلجی کا بھتیجہ اور داماد تھا، اپنے چچا کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا، اور پورے کر و فر کے ساتھ طویل عرصہ تک حکومت کی، اس نے حکومت کا مستحکم نظام بنایا، نئے نئے معاشی تجربے کئے، سلطنت کے دائرے کو وسیع کیا اور نئے نئے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کئے، دکن کے علاقہ میں پہلی مرتبہ علاء الدین نے ہی فتوحات کا پرچم لہرایا، فوجی محکمہ کو ترقی یافتہ اور مضبوط بنایا، سامان خورد نوش کی ارزانی کا زبردست انتظام کیا، گو وہ ان پڑھ تھا لیکن اپنی دور اندیشی اور ذہانت کے بل بوتے پر وہ کامیاب حکمراں ثابت ہوا۔

علاء الدین، جلال الدین کے ایک بھائی شہاب الدین مسعود خلجی کا بیٹا تھا، اس کی تاریخ پیدائش متعین طور پر معلوم نہیں ہے، بچپن اور جوانی کے ابتدائی حالات پر بھی اخفاء کا پردہ پڑا ہے۔ بچپن میں اسے لکھنے پڑھنے کی تعلیم نہیں مل سکی، البتہ شہسواری، اسلحہ کے استعمال اور کھیلوں کی باقاعدہ تربیت حاصل ہوئی تھی۔ اس کا چچا جلال الدین غیر متوقع طور پر بادشاہ ہو گیا تھا، جب کڑہ میں ملک چھجو نے بغاوت کی تو علاء الدین ہی نے اس بغاوت کو فرو کیا، اور اپنے چچا کو راضی کر کے کڑہ کا گورنر مقرر ہو گیا۔ علاء الدین آٹھ ہزار سواروں کا دستہ لے کر دکن کے دیوگیر پر حملہ آور ہوا، شمالی ہند کی جانب سے دکن کے علاقہ پر یہ پہلا حملہ تھا، علاء الدین نے اس کے لئے زبردست تیاریاں کی تھیں اور پورے عزم و ہمت کے ساتھ دشوار گذار راہوں کو طے کرتا ہوا یہاں پہنچا اور اسے فتح کرنے کے بعد بے انتہا مال و دولت کے ساتھ واپس ہوا۔ دولت کی کثرت اور فوجی قابلیت نے اس کے دماغ پر حکمرانی کا نشہ چڑھا دیا، اس نے تدبیر سے اپنے چچا کو کڑہ بلا کر طے شدہ منصوبہ کے تحت اس کا کام تمام کر دیا، اور دولت کا منہ کھول کر امراء کو رام کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے سامنے کئی اہم چیلنجز ہیں۔ مغل حملہ آوروں سے ملک کی حفاظت، طاقتور امراء پر غلبہ، ہندو سرداروں کی طرف سے مقابلہ کا خطرہ اور مرکزی اقتدار کی شوکت کی بقاء، چنانچہ اس نے ان چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لئے مستحکم نظم و نسق، طاقتور فوج، مضبوط معیشت، اور اپنے ماتحت قابل اعتماد امراء کی جماعت تیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دیوگیری پر 1296 میں حملہ اور فتح سے اسے بے اندازہ دولت و مال مل گیا، اور جلال الدین کی حکومت سے غیر مطمئن امراء کا تعاون بھی اسے حاصل ہو گیا، علاء الدین نے اپنے چچا کی نرمی کے نتائج دیکھے تھے کہ نرمی کی وجہ سے کس

طرح نظام حکومت درہم برہم ہو گیا' علاء الدین نے اس کے برعکس طریقہ اپنایا۔ 1297 سے 1306 تک اس نے پانچ مرتبہ مغلوں سے مقابلہ کیا اور ان کی یورش و بربادی سے ملک کی کامیاب حفاظت کی اور منگولوں نے علاء الدین کے خوف سے ہندوستان کی طرف رخ کرنے کی جرأت بند کر دی۔

علاء الدین نے سلطنت کے استحکام و توسیع کی طرف توجہ کی، چنانچہ 1299 میں اس نے گجرات پر قبضہ کیا، 1301 میں رنتھمبور کی تسخیر کی، پھر راجستھان کی طرف متوجہ ہوا، 1303 میں چتوڑ کو فتح کیا، 1305 میں مانڈو کو زیر بنایا، 1308 میں سیوان اور 1312 میں جالور کو دہلی سلطنت میں شامل کیا۔ اس طرح راجستھان میں اسے وسیع کامیابی حاصل ہوئی۔

علاء الدین کے سپہ سالار ملک کافور نے 1309 میں دوبارہ دیوگیری پر حملہ آور ہو کر بقیہ خراج کی ادائیگی پر اسے مجبور کیا۔ پھر دو برس کے بعد اس نے تلنگانہ کی کاکتیہ حکومت کو دہلی کے تابع کیا۔ 1310-1311 میں وہ جنوب کے دور دراز مقام رامیشورم تک اپنا پرچم لہراتا چلا گیا۔ اس طرح علاء الدین نے بڑی کامیابی کے ساتھ وسطی اور جنوبی ہندوستان کی چھوٹی ریاستوں کو دہلی سلطنت کے زیر تسلط بنالیا۔

علاء الدین مذہبی انسان نہیں تھا، اس نے اصول حکومت اپنے خود بنائے۔ اس کے دربار میں علماء کو وہ مقام حاصل نہیں تھا جو سابق حکمرانوں کے یہاں انھیں ملتا رہا تھا، لیکن وہ علماء کا احترام کرتا اور ان سے مسائل بھی پوچھتا اور ان کے مشورہ کو قبول بھی کرتا تھا۔ قاضی مغیث سے اس نے غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ، بیت المال کی حیثیت اور اپنی سزاؤں کے بارے میں شرعی احکام پوچھے۔ وہ شیخ محبوب الٰہی کا معتقد تھا اور خواجہ نظام الدین اولیاء سے ملنے کا خواہش مند رہا۔ اس نے اپنی حکومت میں غیر مسلموں کو بھی شامل کیا۔ علاء الدین نے یہ محسوس کر کے کہ امراء اپنی نجی محفلوں میں شراب پیتے ہیں اور بے عقلی میں حکومت کے خلاف سازشیں کرسکتے ہیں، اس نے خود بھی شراب چھوڑ دی اور اپنی سلطنت میں شراب و نشہ آور اشیاء کی صنعت اور فروخت پر پابندی لگادی اور لوگوں کو شراب پینے سے منع کر دیا۔

علاء الدین نے معاشی اصلاحات میں بھی دلچسپی لی، اس نے زمینوں کی پیمائش کرائی، پیداوار کے تخمینے لگوائے اور اسی حساب سے زمینوں پر ٹیکس مقرر کئے، اس نے مدد معاش دینے کا سلسلہ بند کر دیا، اور ایسی زمینیں سرکاری تحویل میں لے لیں جس سے سرکاری زمینیں جو خالصہ کہلاتی تھیں بڑی تعداد میں حاصل ہو گئیں۔ پیداوار کا ٹیکس غلہ اور اناج کی شکل میں اصول کرایا اور اسے سرکاری گودام میں رکھوا کر قحط کے موقعوں پر اور دوسرے مواقع پر کم قیمت میں فراہم کرایا۔ اس نے بازار کے نرخ کی تعیین کرائی اور نہایت سختی سے اس کی پابندی کرائی، جس کی وجہ سے غلے اور اناج بے انتہا سستے ہو گئے۔ نرخوں کی نگرانی کے لئے اس نے ایک مارکٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا جو اپنی ٹیم کے ساتھ نرخ پر نظر رکھتا، اور خلاف ورزی کرنے والوں کو نہایت ظالمانہ سزائیں دلواتا۔

علاء الدین ایک کامیاب فوجی تھا، اس نے یہ محسوس کر لیا کہ ایک مستحکم حکومت کی برقراری کے لئے مضبوط اور طاقتور فوج کا ہونا ضروری ہے، چنانچہ اس نے سرکاری فوج تیار کی، جس کی تقرری براہ راست مرکزی حکومت کرتی اور اسے نقد تنخواہ ادا کی جاتی۔ نقد تنخواہ کا یہ طریقہ بھی علاء الدین کا اختراع تھا، اس نے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ بھی جاری کیا تا کہ ان کی شناخت رہے، کہا گیا ہے کہ سرکاری رجسٹر میں درج سرکاری فوج کی تعداد چار لاکھ پچھتر ہزار تھی، جن کو تنخواہیں اور غلہ جات کی ادائیگی حکومت کرتی تھی۔

علاء الدین ایک کامیاب بادشاہ اور مدبر منتظم تھا، اس نے ملک کو وسیع اور مستحکم بنایا، سری شہر بسایا، قطبی مسجد میں توسیع کرائی، اور اس میں ایک دروازہ کی تعمیر کرائی جو علائی دروازہ کہلاتا ہے، قطب مینار کے مقابل ایک اور مینار کی تعمیر شروع کرائی جو نامکمل رہ گئی۔ وہ اگرچہ ان پڑھ تھا لیکن اس کے دربار سے اہل کمال و شعراء وابستہ رہے، امیر خسرو بھی اس دور میں تھے۔

5.3.7 تغلق خاندان

ملک کی ابتر صورت حال اور بالخصوص خسرو خاں کے اقدامات نے دہلی سلطنت کے امراء کو بے چین کر دیا تھا۔ دیپال پور کے گورنر غازی ملک نے اس صورت حال میں اقدام کا فیصلہ کیا، کئی ہم خیال امراء کو ساتھ لے کر اس نے دہلی پر حملہ کیا اور خسرو خاں کو شکست دی، ملک کافور، قطب الدین خلجی اور پھر خسرو خاں نے خلجی خاندان کا کوئی فرزند باقی نہ رکھا تھا۔ ناچار غازی ملک نے غیاث الدین تغلق کے لقب سے عصائے سلطنت اپنے ہاتھ میں لی، اور ملک کے انتظامات درست کئے، ایک سال میں امن وامان قائم ہو گیا، اس نے مالگذاری کم کر کے رعایا کو خوشحال بنادیا، اپنے بیٹے محمد جونا کے ذریعہ دکن کی بغاوت ختم کرائی، اور جونا کو ہی دہلی میں نائب بنا کر بنگال کی بغاوت ختم کرنے گیا، واپسی میں دہلی کے باہر استقبال کے لئے بنائے گئے عارضی خیمہ میں اترا تھا کہ خیمہ گرنے سے دب کر مر گیا۔ اس کی صرف چار برس کی حکومت کے بعد محمد جونا بادشاہ ہوا جس نے طویل حکومت کی، اس کا دور بھی نت نئے تجربات اور سرد و گرم حالات سے پر رہا ہے۔ 25 برس کی حکومت کے بعد جب وہ مرا تو اس کا بھتیجہ فیروز شاہ تغلق سریر آرائے سلطنت ہوا اور اڑتیس برس تک امن و سکون کے ساتھ حکومت کر کے رعایا کی خوشحالی اور زیر کنٹرول ملک کے لئے ترقی کے بڑے بڑے اقدامات کئے۔ 1388 میں فیروز تغلق کے انتقال کے بعد 25 برس کے عرصہ میں تخت سلطنت پر اس خاندان تغلق کے چار بادشاہ آئے۔ آخری سلطان محمود شاہ نے ہی کسی قدر طویل دس برس حکومت کی۔ اسی سلطان کے عہد میں تیمور نے دہلی پر حملہ کیا اور شہر کو تباہ کر کے بڑی تعداد میں دولت و غلام لوٹ کر لے گیا۔ 1413 میں خضر خان نے حکومت چھین کر سید خاندان کی حکومت قائم کر دی۔

تغلق خاندان کے سات بادشاہوں نے 93 برس ملک پر حکومت کی۔ اس خاندان کی حکومت اس اعتبار سے یادگار ہے کہ اس دور میں پایہ تخت کو دہلی سے دولت آباد منتقل کیا گیا، لیکن تجربہ کی ناکامی کے بعد پھر دہلی پایہ تخت بنایا گیا، اسی دور میں وسیع و عریض دہلی سلطنت سے کئی علاقے اس طرح نکلے کہ وہاں خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں، جو ہندوستان کی تاریخ میں اہم رول اور اپنی شاندار روایات رکھتی ہیں۔ ان میں گجرات کی حکومت، دکن کی بہمنی سلطنت، بنگال کی حکومت، جونپور کی شرقی حکومت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تغلق خاندان کے تین بادشاہ غیاث الدین تغلق، محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق کے بارے میں ذیل کی سطروں میں پڑھیئے۔

5.3.8 غیاث الدین تغلق

غیاث الدین تغلق اسلامی ہندوستان کی مایہ ناز ہستیوں میں شمار ہونے کے لائق ہے، اس نے ایسی حالت میں اقتدار سنبھالا جب ملک کے حالات انتہائی نازک ہو گئے تھے، نو مسلم خسرو خاں اپنے آقا قطب الدین مبارک شاہ خلجی کو قتل کر کے بادشاہ بن بیٹھا تھا، اس نے اپنی قوم کے غیر مسلموں کو بڑی تعداد میں دہلی بلا لیا تھا جنھوں نے اسلامی شریعت اور شعائر کی بے حرمتی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ شیخ محمد

اکرام نے آب کوثر میں کیمبرج ہسٹری کا یہ اقتباس اس صورت حال کیبارے میں نقل کیاہے:"خسرو کی ساری جماعت میں ایک بھی ایسانہ تھا جس کا اسلام برائے نام نہ ہو اور بعض نے تو اسلام اختیار ہی نہ کیا تھا، دربار میں علانیہ بت پرستی ہوتی اور مذہب اسلام کی توہین کی جاتی، مسلمان مؤرخین ان واقعات کا بڑے رنج اور افسوس کے ساتھ اظہار کرتے ہیں، مسجدوں کی بے حرمتی ہوتی"۔ معاصر مؤرخ ضیاء الدین برنی نے خسرو کا مقصد شمالی ہند میں نئے سرے سے ہندو اقتدار قائم کرنا لکھاہے۔ ان حالات میں غازی ملک فخر الدین جونا نے خسرو خاں کی اسلام کش پالیسی اور اپنے آقا کے خاندان پر زبردست مظالم کی روک تھام کرنی چاہی۔ تھانیسر کے قریب مقابلہ میں غازی ملک نے خسرو کی فوج کو شکست دی، دہلی کے باہر دوسری لڑائی میں بھی خسرو کو شکست فاش ہوئی، حالانکہ اس نے شاہی خزانے کا منہ کھول دیا تھا، اور سپاہیوں کو کئی برسوں کی پیشگی تنخواہ کے علاوہ مشائخ کو بھی رقمیں تقسیم کی تھیں۔ چونکہ خاندان خلجی کا کوئی بچہ باقی نہ رہا تھا، غازی ملک علماء کے اصرار پر تخت نشین ہوا۔

غازی ملک غریب خاندان کا فرد تھا، اپنی ذاتی قابلیت پر ترقی کرتا ہوا علاء الدین کے بھائی الغ خاں کے پاس پیادوں میں بھرتی ہوا، پھر ترقی پاکر امیر آخور (سوار فوج کا افسر اعلی) مقرر ہوا، پھر منگولوں کی مہم کی روک تھام کی عظیم مہم اس کے سپرد ہوئی، اور تاتاریوں کے ساتھ انتیس دفعہ لڑا جس کی وجہ سے غازی ملک کے لقب سے مشہور ہوا۔

تخت نشین ہونے کے بعد اس نے بیت المال کو درست کیا، خسرو خاں کی بے جا تقسیم کردہ دولت کی بازیابی کا فرض اسے انجام دینا پڑا، انتظام سلطنت پر توجہ دے کر ایک سال میں اسے درست کر دیا، پولیس اور عدلیہ کے نظام کو از سر نو درست کیا، فوج کو منظم اور مرتب کیا، اس کا انتظام سلطنت میانہ روی پر مبنی تھا، مالگذاری کے نئے اصول وضع کئے جس سے ملک کی مالی حالت درست ہوگئی، کاشتکاروں سے اچھا سلوک کیا، اور بدعنوان افسروں پر سختی کی جس سے ملک کے دور دراز حصوں میں بھی بہترین امن وامان قائم ہوگیا۔ غیاث الدین نے ڈاک کا انتظام بھی عمدہ بنایا، پیدل اور سوار دونوں قسم کی ڈاک کا انتظام کیا۔ اندرونی انتظامات کے بعد وہ بیرونی محاذ کی طرف متوجہ ہوا، دکن میں ورنگل کے حاکم نے خراج کی ادائیگی بند کر دی تھی، تغلق نے ورنگل کے راجا کو شکست دے کر ورنگل کو دہلی سلطنت میں شامل کرلیا، پھر بنگال پر فوج کشی کی اور وہاں بغاوت کو ختم کیا۔

غیاث الدین تغلق ایک قابل منتظم اور انصاف پسند ہونے کے ساتھ دیندار بادشاہ تھا، خود شریعت کا پابند اور دین کی حمایت میں پیش پیش رہا۔ دکن اور بنگال کی بغاوتوں پر قابو پاکر سلطنت کا استحکام اسی طرح برقرار رکھا جو علاء الدین خلجی کے زمانہ میں تھا۔ بنگال سے دہلی واپسی کے بعد حادثاتی طور پر دہلی کے قریب عارضی خیمہ میں دب کر وہ انتقال کرگیا، اس کی موت ہندوستان کے لئے ایک عظیم نقصان تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی حکومت کی انتہائی وسعت کا زمانہ ختم ہوگیا۔ علاء الدین کی وسیع مفتوحات اب تک دہلی کے تابع تھیں، مشرق میں بنگالہ، مغرب میں سندھ اور جنوب میں معبر تک علاقے سلطنت دہلی کے تحت تھے۔ لیکن غیاث الدین کی وفات کے بعد وہ منتشر ہوگئے، اور سلطنت دہلی کمزور ہونی شروع ہوگئی، البتہ مرکز کی اس کمزوری کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے مرکز اب صرف دہلی نہ رہ کر گجرات، بنگال، احمد نگر، اور گلبرگہ وغیرہ بھی بن گئے، اور ان صوبوں میں خود مختار حکومتوں کے قیام سے یہاں بڑے پیمانہ پر تہذیبی ترقی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ہوئی۔

5.3.9 محمد بن تغلق

باپ کی وفات کے بعد محمد جونا محمد بن تغلق کے نام سے تخت نشیں ہوا، وہ بے شمار خوبیوں اور متضاد صفات کا مالک شخص تھا، اس کی ذہانت اور جدت طبع اس کے زمانہ سے بہت آگے کی تھی، اس لئے اس نے نظم و نسق، معاشی اصلاحات اور فوجی تدابیر میں جو جو تجربات کئے وہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکے اور نتیجہ میں جانی اور مالی نقصان بڑھتا گیا۔ عوام بد دل ہو گئی اور بڑھتی بغاوتوں پر قابو پانا اس کے لئے ممکن نہیں رہ گیا، محمد بن تغلق انتہائی تعلیم یافتہ اور ذہین و طباع انسان تھا، قرآن کا حافظ، نماز و شعائر اسلام کا پابند، عربی، فارسی اور سنسکرت کا ماہر، فلسفہ اور ریاضی پر دسترس رکھنے والا، شعر و شاعری اور خطاب کا ماہر، بحث و مباحثہ کا دھنی اور اچھا صاحب قلم تھا۔ بڑے بڑے اہل علم و ذہانت اس سے مباحثہ کرنے کی ہمت نہیں کرپاتے تھے۔ محمد بن تغلق کے زمانہ آغاز میں دہلی سلطنت اپنے عروج کی انتہاء پر تھا، لیکن اسی دور میں زوال شروع ہوا تو کئی علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں، جن میں سے کچھ ہندو ریاستیں بھی قائم ہوئیں۔ اور دہلی کی حکومت کو ایسی وسعت پھر تب ہی نصیب ہو سکی جب مغلیہ دور میں اورنگ زیب تخت نشین سلطنت ہوا۔

محمد بن تغلق نے تخت نشین ہونے کے بعد معاشی اصلاحات پر توجہ دی، اس کے لئے اس نے ایک مستقل دیوان امیر کوہی قائم کیا جس کے افسران نے دوآبہ کے زرخیز علاقہ میں اچھی فصل تیار کرنے کے لیے کسانوں کو قرض فراہم کئے، اور اس وجہ سے ٹیکس کی رقم کافی زیادہ مقرر کر دی، لیکن شدید قحط کی وجہ سے اچھی فصل تیار نہ ہو سکی اور سرکاری مطالبات سے مجبور ہو کر کاشتکار مخالف ہو گئے۔ سلطنت کی وسعت اور منگولوں کے حملوں سے تحفظ کے پیش نظر محمد بن تغلق نے پایہ تخت کو دہلی سے دیوگیری منتقل کرنے کا حکم دیا جس کا نام دولت آباد رکھا گیا، اس کے پیچھے اس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں سے پورے جنوب پر نظر رکھنا ممکن ہو گا، نیز ساحلی علاقوں کی تجارت پر بھی اس کا کنٹرول رہے گا، وہ اشاعت اسلام کا جذبہ بھی رکھتا تھا، اور دولت آباد کے مرکزی مقام میں رہ کر وہ جنوب کے خطہ میں اسلام کی تبلیغ کے مواقع فراہم کرنا چاہتا تھا۔ محمد بن تغلق نے اپنا یہ منصوبہ اتنی سختی سے نافذ کیا کہ دہلی کی پوری آبادی کو دولت آباد منتقل ہو جانے پر مجبور کر دیا، اس منتقلی میں بے شمار جانی و مالی نقصان ہوا، ادھر شمال کے علاقوں پر اس کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی، اور اسے اپنے منصوبہ کی ناکامی کا احساس ہوا تو پھر پایہ تخت اور لوگوں کو دہلی واپس آنے کا حکم دیا، اس میں مزید جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا اور عوام بد دل ہو گئی۔ محمد بن تغلق کو اپنے نئے نئے منصوبوں کے لئے وسائل کی ضرورت تھی، اور قحط کی شدت کی وجہ سے سرکاری آمدنی گھٹ گئی تھی، اس صورت حال میں اس نے سونے اور چاندی کے سکوں کو اپنی تحویل میں لے کر تانبہ کے علامتی سکے جاری کئے۔ اس کی یہ سوچ اس زمانہ کے لحاظ سے ناقابل عمل تھی۔ بنیوں نے تانبہ سکے ڈھالنے کے کارخانے گھروں میں بنالئے اور بازار نقلی سکوں سے بھر گیا، لوگوں کے پاس سونے اور چاندی کے سکے نہ رہے، نتیجہ میں پوری معیشت بیٹھنے لگی، یہ دیکھ کر محمد بن تغلق نے تانبہ کے سکے واپس لئے اور پرانے درہم و دینار جاری کر دئے، تب تک حکومت کو بے انتہا مالی خسارہ ہو چکا تھا۔

محمد بن تغلق اپنی سلطنت کو مزید وسیع کرنا چاہتا تھا، اس نے نہایت دور دراز کے دو علاقوں میں اپنی فوجیں بھیجیں، خسرو ملک کی

ماتحتی میں ایک لاکھ کی فوج تبت اور چین کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا، لیکن پہاڑی راستوں کی دشواری اور برسات کی شدت میں فوج تباہ ہو کر رہ گئی۔ اسی طرح اس نے تین لاکھ کی فوج خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ فتح کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ فوج بھی لٹی پٹی واپس آئی، جس سے حکومت کو شدید مالی خسارہ اور فوجی نقصان ہوا۔

اس صورت حال میں ملک کے اندر بے چینی بڑھتی گئی اور جگہ جگہ بغاوتیں شروع ہو گئیں، محمد بن تغلق اپنے ارادوں میں پختہ ہونے کے ساتھ اپنی سزاؤں میں بھی بے انتہا سخت تھا، ان بغاوتوں پر قابو پانے کے لئے اس نے آئینی ہاتھ استعمال کئے اور بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، لیکن وہ ایک بغاوت کو فرو کرتا تو دوسری جگہ بغاوت ہو جاتی، چنانچہ معبر کے مسلم گورنر نے بغاوت کر کے 1335 میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی، ہندو سرداروں نے بھی بغاوت کی، اور وجے نگر کی مضبوط سلطنت دکن میں قائم ہو گئی، گلبرگہ، ورنگل اور دولت آباد میں بغاوتوں نے ان علاقوں کو دہلی سلطنت سے علاحدہ کر دیا، اور 1347 میں بہمنی سلطنت قائم ہو گئی۔ پھر گجرات میں بغاوت ہو گئی، ان کی سرکوبی کے لئے محمد بن تغلق روانہ ہوا، سندھ پہنچ کر ٹھٹھ کا محاصرہ کئے ہوا تھا کہ آب وہوا کی وجہ سے اس کی طبیعت بگڑ گئی اور اسی علالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔

محمد بن تغلق بڑا مدبر و منتظم اور انصاف پرور تھا، نظام عدل کی مضبوطی پر اس نے بہت توجہ دی، سماجی برائیوں کے خاتمہ کی بھی اس نے کوشش کی، چنانچہ ستی کی رسم پر پابندی لگائی، البتہ وہ سزائیں دینے میں بڑا سخت واقع ہوا تھا، اپنے نظریات اور فیصلوں کو بھی پوری سختی سے نافذ کرتا تھا، جس کی وجہ سے بسا اوقات لوگوں پر زیادتی ہو جاتی تھی۔ 1351 میں محمد بن تغلق نے وفات پائی۔

5.3.10 فیروز شاہ تغلق (1351-1388)

محمد بن تغلق لاولد مرا تو امراء نے اس کے چچازاد بھائی فیروز شاہ تغلق کو تخت نشین کیا گیا۔ فیروز تغلق کی تربیت اس کے چچا غیاث الدین تغلق نے کی تھی۔ محمد بن تغلق کے دور میں بھی وہ انتظام حکومت میں شریک رہا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کا دور رعایا کی بہبود اور امن وامان کا تھا، اس کی رعیت پروری اور فلاحی کام بڑے مشہور ہیں۔ غریبوں کی اعانت، بے روزگار لوگوں کی ملازمت، علم و ادب کی اشاعت، کاشتکاروں پر نرمی، سزاؤں میں ظالمانہ سزاؤں کی برخاستگی، پانی کی فراوانی، علاج معالجہ کی فراہمی اور ظلم وزیادتی کے خاتمہ کے لئے فیروز کا دور یادگار ہے۔ خان جہاں مقبول تلنگی فیروز کا وزیر اعظم تھا۔

فیروز تغلق نے بادشاہ بننے کے بعد سب سے پہلے ان قیدیوں کو رہا کیا جنھیں محمد بن تغلق کے زمانے میں جیل میں ڈال دیا گیا تھا، قتل ہونے والوں کے پسماندگان کو خون بہا دئے، اور جن لوگوں کی زمینیں چھین کر سرکاری تحویل میں دے دی گئی تھی وہ ساری زمین مالکوں کو واپس کر دیں۔ فیروز نے عام اعلان کر دیا کہ جو بھی شرعی عدالت کے سامنے اپنے حقوق ثابت کر سکے اسے اس کی جائداد واپس مل جائے گی۔ کاشتکاروں پر سرکاری لگان کی سخت شرحیں عائد تھی، ان کو فیروز نے ختم کر دیا اور لگان وصول کرنے والے افسران کے ظلم پر روک لگا دی، بہت سارے ٹیکس بالکل ختم کر دئے گئے۔ کاشتکاری کی بہتری کے لئے کثرت سے نہریں جاری کیں اور کنویں کھدوائیں، ان سب کی وجہ سے قابل زراعت اراضی میں اضافہ ہوا، فصلیں بڑھ گئیں اور کسان خوشحال ہو گئے۔ فیروز تغلق نے کمزور لوگوں کے لئے چھوٹے سکے

یعنی نصف اور چوتھائی جیتل بھی جاری کئے جس سے غریبوں کو بہت سہولت ہوگئی۔

فیروز تغلق نے بغاوتوں پر قابو پانے کی خاص کوشش نہیں کی، بنگال پہلے ہی آزاد ہو گیا تھا، گو کہ فیروز نے دو مرتبہ اسے تابع بنانے کی کوشش کی، اسی طرح اس نے جاج نگر اور نگر کوٹ نیز ٹھٹھ پر حملے کئے، لیکن اسے اندازہ ہو گیا کہ ان حملوں سے عوام کی بہبودی نہیں ہو گی، چنانچہ اس نے سلطنت کے بچے ہوئے حصوں کے نظم ونسق اور رفاہ عام کے کاموں پر توجہ دینی شروع کردی، فیروز نے کثرت سے باغات لگوائے، صرف شہر دہلی اور اس کے اطراف میں 1200 باغات تھے جن سے نہ صرف ماحولیاتی مناظر میں حسن پیدا ہوتا تھا بلکہ آمدنی بھی حاصل ہوتی تھی۔ بے شمار کنویں کھدوائے اور نہریں نکلوائیں تاکہ لوگوں تک آسانی سے پانی پہنچ سکے۔ اس نے کئی اسپتال قائم کئے جہاں ناداروں کے مفت علاج معالجہ کا انتظام کیا۔ فیروز کو غریبوں کا بڑا خیال رہتا تھا۔ غریب بچیوں کی شادی کے لئے علاحدہ سے مدد کا انتظام کیا، نوجوانوں کو ملازمت کی فراہمی کے لئے محکمہ قائم کیا، بیرونی سیاحوں کی مدد اور تعاون کے لئے الگ سے فنڈ مخصوص کیا، فیروز تغلق گو کہ خود زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا، لیکن اس نے تعلیم کے فروغ سے بہت دلچسپی لی، کثرت سے اسکول اور کالج کھولے، دہلی میں مدرسہ فیروز شاہی بہت مشہور تھا، تعلیم گاہوں اور اساتذہ وطلبہ کی مدد کے لئے وظائف اور اوقاف مقرر کئے، صرف دہلی میں ایک ہزار ایسے مدرسے تھے، اس نے علماء وفضلا، اور شعراء ومشائخ کی سرپرستی کی۔ اس کے دور میں فقہ وشریعت کا عروج زیادہ ہوا، اسلامی قانون اور علوم اسلامیہ پر متعدد اہم کتابیں اس دور میں تصنیف ہوئیں، جن میں فتاوی فیروز شاہی اور فتاوی تاتارخانیہ وغیرہ مشہور ہیں۔ فیروز کے عہد میں سلطان المشائخ کے خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی تھے جن کی بڑی قدر دانی فیروز کرتا تھا، اس زمانے کے مشہور علماء میں مولانا احمد تھانیسری، مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر دہلوی تھے۔ مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ اسی علم پرور بادشاہ کے نام منسوب کرکے تاریخ فیروز شاہی رکھا، شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ فیروز نے سنسکرت کے فروغ سے بھی دلچسپی لی اور سنسکرت کی کئی کتابوں کے ترجمے فارسی میں کروائے، ان میں قابل ذکر باراہ سنگتا ہے، جسے فیروز کے حکم سے عبد العزیز شمس تھانیسری نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

فیروز شاہ کا دور دہلی سلطنت میں عوامی فلاح وبہبود کے لئے بہت عمدہ تھا، لیکن اس کی نرمی کی پالیسی کے نتیجہ میں حکومت اور امراء پر گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ اور 1388 میں فیروز شاہ کی وفات کے بعد کوئی ایسا قابل جانشیں نہیں رہا جو حکومت کو اس کی ڈگر پر جاری رکھتا، چنانچہ آپسی رسہ کشی ہونے لگی، یکے بعد دیگرے تین بادشاہ آئے اور گئے۔ 1394 میں محمود شاہ تخت پر بیٹھا، اس کے دور میں 1398 میں دہلی پر تیمور کا مشہور حملہ ہوا جس نے قتل وغارت گری اور بربادی کی مثال قائم کردی۔ تیمور کا حملہ تباہی کی ایک آندھی تھی جو بربادی پھیلاتی گذر گئی۔ دہلی جو عظمت، تقدس اور تمدن کی نشانی تھا مٹ گیا، ملتان، پنجاب، جون پور، دکن، گجرات اور بنگال کے علاقے خود مختار ہوگئے۔ دہلی کی دگرگوں حالت میں ایک افغان سردار اقبال خاں حکومت کی باگ سنبھالے رہا، پھر دولت خاں لودھی کاروبار سلطنت پر قابض ہو گیا، اور 1413 میں محمود شاہ تغلق نے کسمپرسی کے عالم میں وفات پائی اور تخت سلطنت پر تغلق خاندان کی حکمرانی ختم ہوگئی۔

5.3.11 سید خاندان (1414-1451)

لٹی پٹی اور سمٹی دہلی سلطنت کے تخت پر ملتان کا حاکم خضر خاں 1414 میں دولت خاں کو ہٹا کر قابض ہو گیا، یہ سید تھا، ہر طرف

بغاوت تھی، پوری زندگی باغیوں سے لڑنے میں گذر گئی، 1421ء میں اس کا لڑکا مبارک شاہ حاکم ہوا، اس نے اپنی ہمت سے پنجاب اور ملتان پر بھی قبضہ برقرار رکھا، لیکن درباریوں نے سازش کر کے 1435 میں اسے قتل کر دیا، اور خضر خاں کا پوتا محمد شاہ بادشاہ بنا دیا گیا، جونپور کے حکمراں سے اس کی جھڑپ چلتی رہی، پنجاب کے حاکم بہلول خاں لودھی کی مدد سے یہ دہلی کے تخت پر قابض رہا۔ 1445 میں اس نے وفات پائی تو اس کا لڑکا علاء الدین حاکم ہوا، اب صرف دہلی باقی بچی تھی، اطراف کے علاقے بھی دہلی کی تابعداری سے نکل گئے تھے، جب علاء الدین سے دہلی بھی نہ سنبھل سکی تو وہ بدایوں جا کر گوشہ نشیں ہو گیا، اور 1451 میں بہلول لودھی نے حکومت دہلی پر قبضہ کر لیا۔

5.3.12 لودھی خاندان (1451-1526)

بہلول لودھی کے تخت سلطنت پر قبضہ سے دہلی سلطنت میں لودھی خاندان کی حکومت شروع ہوتی ہے۔ دہلی سلطنت کا یہ آخری خاندان ہے۔ تغلق خاندان کے آخری دور سے دہلی سلطنت کی وسعت سمٹتی چلی گئی تھی۔ بیشتر علاقے خود مختار و آزاد ہو گئے تھے۔ سید خاندان کی حکومت کے زمانہ میں دہلی سلطنت کا رقبہ صرف دہلی اور اس کے اطراف تک محدود رہ گیا تھا، اور اس چھوٹے دائرہ میں بھی حکومت پر امن نہ رہی تھی، جب لودھی خاندان میں حکومت منتقل ہوئی تو گو کہ اس خاندان کے تین بادشاہوں نے تقریباً 75 برس حکومت کی، اور متعدد علمی و تمدنی کارنامے بھی انجام پائے، اسلام کی اشاعت سے بھی دلچسپی لی گئی، لیکن حکومت کو پہلی سی وسعت نصیب نہ ہو سکی، اندرونی انتشار اتنا بڑھا ہوا تھا کہ کابل کے بادشاہ بابر نے اپنی چھوٹی لیکن منظم فوج سے دہلی کی شاہی فوج کی بھیڑ کو شکست دے کر دہلی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور مغلیہ حکومت کی بنیاد رکھ دی۔

5.3.13 سکندر لودھی

لودھی خاندان کا پہلا فرمانروا بہلول لودھی ہے۔ یہ افغانستان کے پٹھان خاندان کا فرد تھا، محمود شاہ نے اسے پنجاب کی صوبیداری پر مقرر کیا تھا، طاقتور حکمراں تھا، علاء الدین کی مدد کر کے دہلی سلطنت کو بچائے رکھا، اور اسکے بعد تخت دہلی پر قابض ہو گیا، اس نے پنجاب تک اپنی سلطنت کو وسعت دینے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس نے جونپور کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ 38 برس حکومت کی، اس دوران مختلف بغاوتوں کو فرو کرنے میں مصروف رہا۔ 1488 میں وفات پائی۔ 1479 میں اس کے بعد اس کا لڑکا سکندر لودھی باشاہ ہوا، اس نے دوسرے صوبوں کو دہلی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجہ میں دہلی سلطنت کی سرحد ایک طرف مالوہ اور دوسری طرف بنگال تک پہنچ گئی۔ اس علاقہ میں عام طور پر امان بھی قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ غلے ارزاں ہو گئے اور تجارت کو فروغ ملنے لگا۔ سکندر نے 1506 میں آگرہ شہر کی بنیاد رکھی، اس کے دربار سے اہل علم بھی وابستہ رہے، اور اس نے علمی قدردانی کی، 29 برس کی حکومت کر کے 1517 میں اس نے وفات پائی۔ ابراہیم لودھی اس کا لڑکا تھا، باپ کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا، جونپور پر قبضہ کے لئے اپنے بھائی سے لڑتا رہا، اس نے گوالیار کا قلعہ بھی وہاں کے راجہ سے چھین لیا، وہ بہادر اور مضبوط ارادوں کا مالک تھا، دربار کی سازشوں پر کنٹرول کرنے کے لئے سختی کی روش اختیار کی، سازش کرنے والے بعض امیروں کو سخت سزائیں دیں، دوسرے ڈر کر بھاگ گئے، وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتا اور دہلی سلطنت میں آیا استحکام مزید آگے بڑھتا، لیکن لاہور کے حاکم دولت خاں لودھی نے کابل کے مغل بادشاہ بابر کو دہلی فتح کرنے کی دعوت

دے دی، جب بابر کابل سے ہندوستان روانہ ہوا تو دولت خاں کو اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا، اور اس نے بابر کو روکنا چاہا، لیکن بابر نے پہلے لاہور پر قبضہ کر لیا، پھر دہلی کی جانب بڑھا، پانی پت کے میدان میں 1526 میں دہلی کی شاہی فوج سے مقابلہ ہوا، بابر کی فوج مختصر تھی، لیکن وہ منظم اور تجربہ کار تھی، ابراہیم لودھی کی منتشر سی بڑی فوج نے شکست کھائی اور ابراہیم مارا گیا اور دہلی سلطنت کا چراغ گل ہو گیا۔

5.4 دہلی سلطنت کا کردار اور زوال

1206 میں قائم ہونے والی دہلی سلطنت اپنی عظمت کے نقوش ہمیشہ کے لئے نقش کرتے ہوئے 1526 میں مغلیہ سلطنت میں تبدیل ہو گئی۔ ہندوستان میں یہ پہلی وسیع و عریض اور مستحکم مسلم حکومت تھی جس نے زندگی کے ہر میدان کو متاثر کیا، ملک کو مضبوط اور متحدہ حکومت دی۔ عوام کو امن و امان حاصل ہوا۔ بیرونی دنیا کے ساتھ تجارتی روابط مضبوط ہوئے، معاشی اصلاحات اور زراعت کے فروغ نے عوام کو خوشحال بنایا، نئے نئے شہر بسے، یادگار عمارتیں اور قلعے تعمیر ہوئے، فن تعمیر میں نت نئے تجربات کئے گئے۔ شاہراہوں اور سڑکوں کی تعمیر اور ان پر سرایوں اور مسافر خانوں کی فراہمی نے آمد و رفت کی سہولت بہم پہنچائی، ڈاک کے سواری اور پیدل نظام نے روابط بحال کئے۔ دہلی اور متعدد شہروں میں علم کے مراکز قائم ہو گئے، بادشاہوں نے دل کھول کر علم و ادب اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کی، جس کے نتیجہ میں پوری دنیا سے اہل فن و اہل کمال یہاں جمع ہونے لگے، شعر و شاعری، زبان و ادب، حکمت و تاریخ اور اسلامی علوم پر وقیع کتابیں تصنیف ہوئیں، سنسکرت سے فارسی اور فارسی سے سنسکرت میں کتابوں کے ترجمے ہوئے، مدارس و اسکول اور کالج قائم ہوئے، عوام کی اخلاقی اصلاح اور مذہبی رواداری کے لئے صوفیا اور مشائخ نے خانقاہیں قائم کیں جو بلا تفریق مذہب عوام کے لئے امن و اخلاق کی آماجگاہیں تھیں، وقت کے اکابر مشائخ نے اس سرزمین کو اپنی برکتوں سے فیضیاب کیا، عدل و انصاف کا پختہ نظام قائم کیا گیا، پولیس اور خفیہ محکمہ کے ذریعہ سخت نگرانی رکھ کر ظلم پر بندشیں لگائی گئیں۔ فوجی محکمہ کو مضبوط تر بنایا گیا، کہ منگولوں کی غارت گری ہندوستان جنت نشان کو نقصان پہنچانے کی ہمت نہ کر سکی، اور نہ اسے کامیابی ملی۔ مذہبی آزادی نے ملک میں امن و امان اور بھائی چارہ کی فضا کو مضبوط بنایا اور اتنی وسیع مملکت میں مذہبی بنیادوں پر فرقہ وارانہ فسادات واقع نہ ہو سکے۔ سوا تین سو برس کی اس دہلی سلطنت نے ہندوستان کو دنیا کے نقشہ پر انتہائی ترقی یافتہ، مضبوط و مستحکم، خوشحال اور مہذب ملک بنا کر پیش کیا۔

تغلق خاندان کا آخری دور ہندوستان کی دہلی سلطنت کی قوت و عظمت اور وسعت کا نقطہ عروج تھا۔ بنگال (بشمول موجودہ بنگلہ دیش) سے لے کر سندھ تک اور کشمیر سے لے کر جنوب کی انتہاؤں تک دہلی سلطنت کا پرچم لہرا رہا تھا، تغلق خاندان کے بعد پھر تخت دہلی پر ایسے قابل حکمراں نہ آسکے، تخت حکومت کے لئے رسہ کشی ہوتی رہی، اتنی وسیع سلطنت پر نظر رکھنے اور اس کو متحد بنائے رکھنے میں آمد و رفت اور ربط و اتصال کی دشواری تھی۔ تغلق حکومت کے آخر میں فوجیوں اور امیروں کو تنخواہ میں نقد کی جگہ اراضی دئے جانے کا سلسلہ شروع ہوا جس سے علاقائی امراء مضبوط ہونے لگے، اس دور میں غلاموں کی بڑی تعداد میں خریداری ہوئی، اور وہ اسلام قبول کر کے فوج میں بھرتی ہوئے، ان کی اندر حکومت کے ساتھ جذباتی وابستگی نہ تھی۔ ان سب اسباب نے مل کر دہلی کی مرکزی سلطنت کو کمزور کر دیا اور علاقائی حکومتوں کے قیام کی راہ ہموار ہونے لگی۔ سید خاندان کی حکومت آتے آتے دہلی سلطنت صرف دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں تک

محدود رہ گئی ، گجرات ، ملتان ، مالوہ ، جونپور ، دکن اور بنگال وغیرہ میں آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں۔ راجستھان اور جنوب بعید میں چند ہندو ریاستیں بھی آزادانہ طور پر وجود میں آگئیں۔ لودھی خاندان کے حکمرانوں نے سلطنت دہلی کو طاقت پہنچانے کی کوشش کی اور کسی حد تک اسے وسعت دینے میں کامیابی حاصل کی، لیکن ٹوٹتی بکھرتی دہلی سلطنت کو عظمت رفتہ کی طرف وہ بھی واپس نہ لا سکے، اور 1526 میں یہ ختم ہو کر رہی۔

5.5 علاقائی حکومتوں کا قیام

دہلی سلطنت کی کمزوری اور بکھراؤ اور بالآخر اس کے زوال نے جہاں مرکزی حکومت کی عظمت کو ختم کر دیا، اور مغلیہ سلطنت کے لئے تاریخ شروع کرنے کی راہ ہموار کر دی، وہیں اس سے ملک اور یہاں کی تہذیب و معیشت کو بے شمار فوائد بھی حاصل ہوئے، جو مرکز کی متحدہ حکومت کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طور پر وجود میں آئے۔ علاقائی حکومتوں کے قیام سے ان علاقوں میں نظم ونسق زیادہ بہتر ہو گیا۔ علاقائی خصوصیات اور تہذیب کی زیادہ بہتر سرپرستی ہوئی، ان علاقوں میں چھوٹی حکومتوں نے اسلامی تہذیب کے فروغ میں بھی بڑا کردار ادا کیا۔ علم وادب کی سرپرستی صرف ایک شہر دہلی کے بجائے جونپور، مالوہ، اڑیسہ، دکن، بنگال، ملتان، سندھ اور کشمیر وغیرہ کئی جگہوں پر ہونے لگی۔ ان علاقوں میں صنعت و حرفت اور زراعت کو فروغ ملا۔ گجرات میں کئی صنعتوں کی بنیاد رکھی گئی جس سے علاقہ میں خوشحالی آگئی۔ گجرات اور بنگال میں بحری تجارت میں کافی ترقی ہوئی۔ دور دراز سے اشیاء تجارت کی برآمد درآمد ہونے لگی، اور یہ تجارت کی مشہور منڈیاں بن گئیں، بہت سے نئے نئے شہر تعمیر ہوئے اور ہند اسلامی فن تعمیر میں علاقائی خصوصیات آمیز ہوئیں۔ بنگال میں الیاس شاہی حکومت نے 1348 سے 1489 تک تہذیب و تمدن اور علم وادب کو فروغ دیا۔

5.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- دہلی سلطنت ہندوستان میں قائم ہونے والی پہلی مسلم حکومت تھی جس نے سوا تین سو برس تک ایک وسیع و عریض علاقہ پر حکومت کی اور ہندوستان کو ایک مضبوط اور متحدہ حکومت فراہم کیں۔ اس حکومت کا بانی قطب الدین ایبک ہے جو شہاب الدین غوری کا غلام تھا' 1206 سے 1290ء تک دہلی پر غلام خاندان نے حکومت کی۔ ایبک کے بعد التمش اور بلبن غلاموں میں بڑے بادشاہ ہوئے۔
- 1290ء سے 1320 تک خلجی خاندان نے دہلی پر حکومت کی۔ اس خاندان کا بانی جلال الدین فیروز ماہر فن' سیاسی اور بہادر انسان تھا۔ دہلی سلطنت کمزور ہوئی تو تخت شاہی پر بیٹھا۔ لیکن جلد ہی اس کے بھتیجے علاء الدین نے حکومت پر قبضہ کر لیا' جس نے بڑی شان اور دبدبہ کے ساتھ بیس برس حکومت کی' علاء الدین نے ہی پہلی مرتبہ دکن کے علاقہ کو سلطنت میں شامل کیا۔ اس کے دور میں دہلی سلطنت کی وسعت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔
- خلجی خاندان کے بعد تغلق خاندان نے 1320ء سے 1413 تک حکومت کی' غیاث الدین تغلق اس خاندان کا پہلا فرمانروا تھا جس نے

انتہائی نازک صورت حال میں حکومت سنبھالی تھی اور اسلامی شعائر پر ہونے والے حملوں کو روکا تھا‘لیکن بہت جلد ہی وہ ایک حادثہ میں انتقال کر گیا۔اس کے بیٹے محمد بن تغلق نے طویل حکومت کی۔یہ بڑا عالم وفاضل اور مختلف اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک تھا۔اس نے دہلی سے دیوگیری کو پایۂ تخت منتقل کیا جس کا نام دولت آباد رکھا‘لیکن شمال پر گرفت ڈھیلی ہونے لگی تو پھر دہلی کو پایہ تخت بنایا تاکہ وہاں سے دکن پر نظر رکھی جائے اور پورے ملک میں اسلام کی اشاعت ہوسکے۔

- ایک طرف اس نے تبت وچین اور دوسری طرف ماوراء النہر کے علاقوں کو فتح کرنے کے لیے فوجیں بھیجیں لیکن ناکامی اور نقصان ہاتھ آیا‘قحط کی وجہ سے مالی تنگی ہوئی تو اس نے تانبہ کے سکے چلائے‘لیکن بنیوں کے نقلی سکے چلانے کی وجہ سے اسے تانبے کے سکے واپس لینے پڑے۔ان سب منصوبوں کی وجہ سے ملک میں بغاوتیں شروع ہوگئیں اور دہلی کی مرکزی حکومت سے علاحدہ ہوکر دکن‘بنگال‘ گجرات اور جونپور وغیرہ میں علاقائی حکومتیں قائم ہوگئیں۔
- فیروز شاہ تغلق کا دور دہلی سلطنت کے بچے ہوئے حصوں کے لیے خوشحالی اور امن وامان کا دور تھا‘اس نے نہریں اور کنواں بنوائے۔ ٹیکس کا بار ختم کیا۔غریبوں کی مدد پہنچائی‘بچیوں کی شادی کا انتظام کیا اور مفت علاج کے اسپتال کھولے‘اس نے بہت سے مدرسہ بھی بنوائے‘ان سب سے عوام بے حد خوش حال ہوگئی۔تغلق دور میں ہی تیمور نے دہلی پر حملے کرکے اسے تباہ وبرباد کردیا۔
- تغلق کے بعد مختصر مدت کے لیے سید خاندان نے حکومت کی۔اب دہلی سلطنت کا رقبہ بہت گھٹ گیا اور حکومت ان سے نہ سنبھلی تو بہلول لودھی نے تخت سلطنت پر قبضہ کیا۔اس سے لودھی خاندان کی حکومت شروع ہوتی ہے۔اس کا بیٹا سکندر لودھی بڑی خوبیوں کا بادشاہ ہوا ہے۔اس نے عدل وانصاف کی روشن مثال قائم کردی‘سامان بے انتہا سستے ہوگئے‘علم وادب کی ترقی ہوئی اور امن وامان قائم ہوا۔

5.7 نمونہ امتحانی سوالات

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. دہلی سلطنت کا بانی کون ہیں؟

(a)قطب الدین ایبک (b)فیروز شاہ تغلق (c)علاء الدین خلجی (d)سکندر لودھی

2. ہندوستان کی پہلی حکمراں خاتون کون ہے؟

(a)رضیہ سلطانہ (b)سلطان جہاں (c)شاہجہاں بیگم (d)سب غلط

3. دہلی سلطنت کا آخری حکمراں خاندان کون ہے؟

(a)غلام خاندان (b)خلجی خاندان (c)تغلق خاندان (d)لودھی خاندان

4. بلبن نے کتنے برس تک نائب الملک بن کر حکومت کی۔

(a) بیس برس (b) پندرہ برس (c) دس برس (d) پانچ برس

5. دہلی سے دولت آباد کو پایہ تخت کس نے بنایا؟

(a) محمد بن تغلق (b) فیروز شاہ تغلق (c) غیاث الدین تغلق (d) علاء الدین خلجی

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. اشیاء کی نرخ بندی کے لئے علاء الدین خلجی نے کیا اقدامات کیے۔
2. محمد بن تغلق کے ذریعہ پایہ تخت کی تبدیلی کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔
3. لودھی خاندان کی حکومت کا تعارف کرائیے۔
4. دہلی سلطنت کے قیام پر روشنی ڈالیے۔
5. رضیہ سلطانہ کے عہد کا جائزہ لیجیے۔

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. شمس الدین التمش کی فتوحات پر روشنی ڈالیے۔
2. غیاث الدین بلبن کے طرز حکومت پر ایک مضمون لکھیے۔
3. عوام کی فلاح وبہبود کے لئے فیروز شاہ تغلق کے اقدامات کا تذکرہ کیجیے۔

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. آب کوثر : شیخ محمد اکرام، فرید بک ڈپو، دہلی
2. عہد وسطیٰ کا ہندوستان، حصہ اول پروفیسر ستیش چندر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 2003ء اردو ترجمہ: عزیز الدین حسین
3. ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک : سید صباح الدین عبد الرحمن، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2012
4. بزم مملوکیہ : سید صباح الدین عبد الرحمن، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 1999ء
5. خلجی خاندان : کے ایس لال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 1998، اردو ترجمہ، یسین مظہر صدیقی
6. مختصر تاریخ ہند : سید ابو ظفر ندوی، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2006
7. "A Comprehensive History of Medieval India: Salma Ahmed Farooqui, Pearson:2011"

اکائی 6: دہلی سلطنت کا نظم ونسق

اکائی کے اجزا:

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 پس منظر

6.2.1 انتظام سلطنت

6.2.2 سلطان یا بادشاہ

6.3 مرکزی حکومت

6.3.1 وزراء

6.3.2 جاسوس اور پولیس

6.3.3 حرم شاہی کے عہدیداران

6.4 صوبائی حکومتیں

6.4.1 پرگنے اور گاؤں

6.5 فوج

6.6 ڈاک

6.7 مالیاتی نظام

6.8 اکتسابی نتائج

6.9 نمونہ امتحانی سوالات

6.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

6.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

6.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

6.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

دہلی سلطنت جن حالات میں ہندوستان کے اندر قائم ہوئی وہ افغانستان کے غوری حکومت کی مشرقی فتوحات کا نتیجہ تھی۔ شہاب الدین غوری نے ہندوستان میں اپنی شاندار فتوحات کا پرچم تولہرایا اور ترائن کی دوسری جنگ میں پرتھوی راج چوہان کو زبردست شکست دے کر اس کی طاقت ختم کر دی اور دہلی کو اپنے قبضہ میں کر لیا، لیکن خود اس نے یہاں حکومت نہ کی اور اپنے وفادار فوجی سپہ سالار قطب الدین ایبک کو دہلی کا گورنر بنا گیا۔ 1206ء میں شہاب الدین کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک نے اپنی سلطنت کا اعلان کیا تو اس وقت ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت ماحول میں مسلمانوں کی انتہائی محدود تعداد تھی۔ غور سے آنے والے ان فوجیوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا، لیکن یہاں انتظام حکومت اور نظم ونسق چلانے کے لئے وہ یہاں پہلے سے موجود نظام حکومت کو اختیار کیا لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے اس میں اصلاحات کیں اور نئے اصول وضوابط قاعدے اور قوانین بنائے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ یہ جان سکیں کہ دہلی سلطنت ہندوستان میں قائم ہونے والی پہلی مسلم حکومت تھی۔ یہاں پر انہوں نے حکومت کی داغ بیل ڈالی اور نظم ونسق کے میدان میں نئی روش اختیار کی۔ تین سو سالہ دور میں سلاطین دہلی نے کئی تجربات کیے۔ نظم ونسق مرکزی سطح سے لے کر صوبائی اور ضلعی سطح پر محیط تھا جس میں سلطان کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ واقف ہوں گے کہ دہلی سلطنت کا نظم ونسق کن بنیادوں پر قائم تھا، اس کی انتظامیہ میں کتنے عہدے دار تھے،، ذمہ داریوں اور عہدوں کی تقسیم کیسے ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ بادشاہ اور دوسرے اراکین حکومت کے پاس کیا اختیار ہوتے تھے اور وہ کیسے حاصل ہوتے تھے۔

6.2 پس منظر

یہ ضرور تھا کہ وہ اپنے ساتھ مسلم حکومتوں کی سینکڑوں برس کی شاندار روایات رکھتے تھے، وسط ایشیا میں انہیں حکومت کا تجربہ بھی تھا، لیکن ہندوستان کی نئی سرزمین پر انہیں یہ افرادی وسائل اور تجربہ کار مشنری مہیا نہ تھی۔ پھر قیام حکومت کے ابتدائی عرصہ میں انہیں فوجی مقابلے اور فتوحات درپیش تھیں، اور مفتوحہ علاقوں پر اپنے قبضہ کو مستحکم کرنا تھا۔ انہوں نے اس موقع پر نظم ونسق میں کسی نئے تجربہ کے بجائے پرانے نظام پر ہی اپنی انتظامیہ کی عمارت اٹھائی، ملک میں امن وامان کے قیام، عوام کی خوشحالی اور عدل وانصاف کی فراہمی پر انہوں نے توجہ دی، اور حتی الامکان دین وشریعت اور علم وادب کے فروغ نیز تمدنی ترقیات اور تعمیرات سے دلچسپی لی۔ شمس الدین التمش کے 26 سالہ طویل دور حکومت میں ایک مضبوط اور متحدہ ہندوستان وجود میں آیا، جس کا دائرہ شمالی ہند کے بڑے حصہ پر محیط تھا، چنانچہ نظم

ونسق کے میدان میں نئے طور طریقے وضع کئے گئے، بلبن کا چالیس سالہ دور دہلی سلطنت کے استحکام اور شان وشوکت کا دور ہے۔ بلبن حکومت کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ رکھتا تھا اور اس کے عکس نظام حکومت پر مرتب ہو رہے تھے۔ غلام خاندان کے بعد خلجی دور میں نظم ونسق بالخصوص فوج اور اقتصادیات کے میدانوں میں بڑے پیمانہ پر نت نئے تجربات کیے گیے۔ نئی نئی پالیسیاں بنائی اور جاری کی گئیں، جن کے مخصوص نتائج سامنے آئے، تغلق دور میں بھی نئے تجربات کا سلسلہ جاری رہا، خلجی دور کی پالیسیوں میں کئی جگہوں پر تبدیلیاں کی گئیں، محمد بن تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق کا زمانہ آتے آتے پالیسیوں میں کافی فرق دیکھنے کو ملتا ہے، اب فتوحات کی وسعت اور بغاوتوں پر کنٹرول کے بجائے دہلی سلطنت کے بچے کچھے حصوں پر بہتر نظم ونسق اور عوام کی خوشحالی کے اقدامات پر توجہ مرکوز کر دی گئی، چنانچہ اس زمانہ میں زراعت میں بڑی ترقی ہوئی، اشیاء ارزاں اور عوام خوشحال ہوگئی، تعلیم وتمدن کو بڑا فروغ ملا۔ تغلق دور کا آخری زمانہ دہلی سلطنت کے بکھراؤ اور نئی نئی علاقائی حکومتوں کے قیام کا دور ہے۔ اب علاقائی حکومتوں میں نظم ونسق کے اپنے مخصوص طور طریقے اختیار کیے جانے لگے۔ سید خاندان اور لودھی خاندان کی حکومتوں کے زمانوں میں مرکزی حکومت میں مشکل سے استحکام آتا اور جلد ہی وہ سازشوں اور رسہ کشیوں کا شکار ہو جاتی۔ اس سیاسی صورت حال کا اثر نظم ونسق پر بھی مرتب ہو رہا تھا، حکمراں اور وزراء کے اختیارات میں اب پہلے کی بہ نسبت بہت فرق آچکا تھا۔ سکندر لودھی کے دور حکومت میں ایک بار پھر امن وامان قائم ہوا۔ ابراہیم لودھی کے زمانہ میں اشیاء کے دام گھٹے اور خوشحالی آگئی، جس کی وجہ سے علم وادب کو بھی فروغ ہوا، لیکن یہ دہلی سلطنت کے بڑھتے زوال کا آغاز تھا جلد ہی مغلیہ حکومت نے اس کی جگہ لے لی، اور دہلی سلطنت کے ہی نظم ونسق کی بنیاد پر مغلیہ حکومت نے اپنی عمارت استوار کرلی۔

6.2.1 انتظام سلطنت

دہلی سلطنت اپنے ابتدائی دور میں فوجی نوعیت کی تھی، چونکہ حکمرانوں کو استحکام حکومت پر توجہ دینی تھی، اور بغاوتوں کے خطرات پر بندش لگانی تھی، ان کی بیشتر توجہ فوج کی تیاری اور عمدگی پر رہتی تھی۔ اور فوجی قوت پر ہی حکومت کی بقاء منحصر تھی۔ حکمراں کے انتخاب کا بھی کوئی طریقہ متعین نہیں تھا، پہلے فرمانروا قطب الدین ایبک کو تو شہاب الدین غوری نے گورنر مقرر کیا تھا، جس نے غوری کی وفات کے بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا، بادشاہ کی حمایت کے لیے اس کے ماتحت امراء تھے۔ امراء کے مختلف مرتبے اور درجات تھے، کچھ خان کہلاتے، کچھ ملک اور کچھ امیر۔ چونکہ حکومت کی بنیاد رکھنے والے ترک نسل کے تھے، غلام خاندان کی حکومت میں یہ امراء اور معاونین بھی ترک ہی ہوتے تھے۔ بادشاہ ان ہی میں سے اپنے وزراء کو مقرر کرتا تھا، بیشتر حالات میں حکومت پر بادشاہ کا مطلق العنان اختیار ہوتا، اور وہی پورے نظام سلطنت کا مرکزی محور ہوتا۔ زیر حکومت علاقوں کو صوبوں اور پرگنوں میں تقسیم کیا گیا تھا، اور پرگنہ گاؤں پر مشتمل تھے۔ بادشاہوں نے حکومت کی انتظامی مشنری کی بحالی کے ساتھ عوام کی خوشحالی، امن وامان کے قیام اور عدل وانصاف کی فراہمی پر توجہ دی تھی۔ چونکہ حکومت کا پورا نظم ونسق بادشاہ کی ذات سے جڑا تھا، اور اس کی بہتری یا ابتری بنیادی طور پر بادشاہ سے ہی وابستہ تھی، اس لئے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ بادشاہ کے اختیارات کیا تھے، اور وہ کس طرح نظام حکومت پر نظر رکھتا تھا۔

6.2.2 سلطان یا بادشاہ

عہد وسطی کی دہلی سلطنت بنیادی طور پر بادشاہ مرکوز تھی۔ بادشاہ پوری طرح با اختیار اور بڑی حد تک مطلق العنان ہوتا تھا۔ تمام انتظامی قوتوں کا مرکز اعلی اسی کی ذات تھی، فوج کا سربراہ اعلی بھی وہی ہوتا تھا اور عدلیہ کی آخری اتھاریٹی بھی بادشاہ ہی کی شخصیت تھی۔

بادشاہ کی تقرری کا کوئی باضابطہ نظام اور اصول طے نہیں تھا، بنیادی طور پر اعلی فوجی قابلیت اور حکومت پر کنٹرول کی صلاحیت تخت سلطنت کو حاصل کرنے کی راہ تھی۔ کچھ خاص حالات میں ایک بادشاہ اپنے بعد کے لئے کسی کو بادشاہ مقرر کر دیتا تھا، لیکن اس کی تخت نشینی اور بقاء بھی اس کی فوجی صلاحیت اور امراء کے ساتھ تال میل پر منحصر رہتی تھی۔ امراء بادشاہ کے دست وبازو ہوتے تھے، ان کے تحت بڑی بڑی فوجیں ہوتی تھیں، بادشاہ ان کا تعاون حاصل کرنے پر مجبور ہوتے تھے، التمش نے ایسے چالیس امراء کی جماعت بنائی تھی جو امراء چہلگانی کہلاتے تھے۔ حکومت کو چلانے میں ان کا بڑا رول تھا، التمش کے بعد کے سیاسی اتھل پتھل میں ان امرائے چہلگانی کی علاحدہ وابستگیوں اور اختلاف رائے کو کافی دخل تھا۔ التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود کے زمانہ میں بلبن جو وزیر اعظم یا نائب الملک مقرر ہوا، وہ بھی امرائے چہلگانی میں سے تھا۔ لیکن بلبن نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے امراء کا زور توڑ دیا اور چہلگانی جماعت ختم کر دی۔ علاء الدین اور محمد تغلق نے بھی اپنے امراء کو وہ اہمیت نہیں دی اور مطلق العنانی بر قرار رکھی۔ لودھیوں کے زمانہ میں افغان امیروں نے پھر قوت حاصل کر لی تھی، اور ان ہی کے انتشار کے نتیجہ میں حکومت دہلی ان کے ہاتھوں سے چلی گئی۔

بادشاہ کا اقتدار اگرچہ خود مختارانہ تھا، اور اس کے اوپر کوئی طاقت نہ تھی، لیکن حکمرانوں کو بہت سارے مواقع پر اپنے امیروں کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔ علاء الدین خلجی نے بغاوتوں پر قابو پانے کے لئے اپنے خاص امراء کے ساتھ تین دنوں تک مشورہ کیا اور کافی غور وخوض کے بعد جو تجاویز مرتب ہوئی تھیں ان کو سختی کے ساتھ اس نے نافذ کیا۔ دہلی سلطنت مسلم حکومت تھی، اس لئے بادشاہ سے اس بات کی توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ دین وشریعت کا محافظ اور پناہ گاہ ہوگا۔ قطب الدین، التمش اور بلبن خود بھی بڑے دیندار اور پابند شریعت تھے، ان کے درباروں میں علماء اور فقہاء کو بڑا اعزاز حاصل تھا، بادشاہ کئی موقعوں پر ان سے مشورے کرتا تھا، وہ بھی موقع بہ موقع بادشاہ کو نصیحت کرتے اور شرعی احکام کی یاد دہانی کراتے۔ التمش کی مجلس میں شیخ نور الدین مبارک غزنوی نے مشہور نصیحت کی تھی جس میں بادشاہ کے شرعی فرائض اسے یاد دلائے تھے۔ التمش اور بلبن کے دسترخوان پر سینکڑوں علماء ہوتے جن سے مذہبی گفتگو اور حکومت کے کام کاج کی بابت مشورے ہوتے تھے، لیکن یہ بادشاہ بھی ملکی مصالح میں شریعت کے پابند نہیں ہوتے تھے۔ علاء الدین خلجی اور محمد تغلق نے ان کا اثر کم کرنے کی کوشش کی، قاضی مغیث الدین بیانوی کے ساتھ علاء الدین کی گفتگو اس ضمن میں مشہور ہے جس میں بادشاہ نے اگرچہ قاضی سے بیت المال کی آمدنی کے ذاتی استعمال، سزاؤں میں اس کے طریقے اور دوسرے پیچیدہ امور کے بارے میں شریعت کی رائے جاننی چاہی، لیکن وہ قاضی کے شرعی جواب پر عمل کے لئے آمادہ نہ ہوا۔

سلاطین دہلی میں سے کئی حکمرانوں نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ وہ خود کو خلیفۃ المسلمین کا نائب بنا کر پیش کریں، عباسی خلافت اگرچہ دم توڑ رہی تھی، لیکن دہلی کے مضبوط ترین سلطان التمش نے اپنے لئے عباسی خلیفہ مستنصر باللہ سے سند توثیق منگوائی، اور خلیفہ کے

منشور کا اس نے بڑے احترام و اہتمام کے ساتھ استقبال کیا۔ اپنے خطبہ میں خلیفہ کا نام شامل کیا، سکوں پر اس کے نام کندہ کروائے اور خود اپنے لئے خلیفہ کے نائب کا لقب اختیار کیا۔ محمد بن تغلق نے بھی مصر کے عباسی خلیفہ سے اپنے لئے سند توثیق منگوائی تھی۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں گو کہ بغداد کی عباسی حکومت ختم ہو چکی تھی، لیکن اس نے دو مرتبہ خلیفہ سے ایسی سندیں حاصل کیں اور اپنی سلطنت کو شرعی استناد فراہم کیا۔ البتہ بلبن نے خود کو ہی خلیفہ کہلوایا، اس کا نظریہ تھا کہ بادشاہ زمین پر اللہ کا نائب ہے، اور اس کا مقام بہت بلند ہے، اپنے اس نظریہ کے تحت بلبن نے اپنے دربار کی شان و شوکت اور دبدبہ شاہی کو انتہائی بلندی پر برقرار رکھا۔ صرف قطب الدین مبارک خلجی نے سکوں پر سے خلیفہ کا نام ہٹوادیا تھا۔

بادشاہ کی ذمہ داری سلطنت کی حفاظت، امن و قانون کی برقراری، محاصل کی وصولیابی، عوام و رعایا کی خوشحالی اور عدل کا قیام تصور کیا جاتا تھا، سلطان ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے مختلف ذیلی محکموں اور افراد کی مدد لیتا تھا، اور مختلف کاموں کے لئے علاحدہ علاحدہ شعبے قائم کر دئے تھے، ان تمام شعبوں کا آخری سربراہ خود بادشاہ تھا، ان محکموں کے قیام اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے بادشاہ اپنے مخصوص امیروں اور عقلمند عہدیداروں سے مشورے لیا کرتا تھا، یہ مشاورتی کونسل بھی بادشاہ کی صوابدید پر ہوتی تھی اور اس کے افراد کی تعداد اور ان کی تعیین بدلتی رہتی تھی، جو بسا اوقات درپیش مسئلہ کی نوعیت اور سنگینی کے لحاظ سے ہوتی تھی۔

6.3 مرکزی حکومت

سلطنت کے نظام کو بہتر طریقہ پر چلانے کے لئے تمام مفتوحہ علاقوں کو مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، صوبوں کی تعداد مختلف زمانوں میں بدلتی رہی تھی۔ دہلی سلطنت کا ابتدائی دور استحکام اور وسعت کا تھا، ایبک اور اس کے بعد التمش اور بلبن کے عہد میں نئ فتوحات جاری تھیں، اور نئے علاقے داخل سلطنت ہو رہے تھے۔ علاء الدین خلجی کے زمانہ میں جب سلطنت دہلی کی سرحدیں شمال اور مشرق و مغرب کی وسعتوں کے ساتھ پہلی مرتبہ جنوب میں دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی تھیں تو اس وقت دہلی سلطنت اپنی وسعت کی بلندی پر تھی، ایسے وسیع علاقے کے انتظام کے لئے اسے بڑے بڑے صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان میں بعض صوبے ملتان، گجرات، دیوپال پور، چتوڑ، بدایوں، اودھ اور بنگالہ وغیرہ تھے۔ صوبوں کو پرگنہ میں تقسیم کیا گیا تھا، اور ہر پرگنہ میں کئی کئی گاؤں ہوتے تھے۔

مرکزی حکومت کے نظام کے لئے مرکز میں وزراء مقرر کئے جاتے تھے، جو اپنے محکموں سے متعلق کاموں کو پوری مملکت کے اندر دیکھتے تھے، صوبے بھی ان کے اندر آتے تھے، البتہ صوبائی سطح پر داخلی انتظامات کیلئے اسی طرح کے محکمے صوبوں میں بھی قائم کئے جاتے تھے، جن کے سربراہان مرکزی وزراء اور عہدیداروں کی ماتحتی میں کام کرتے تھے، کئی محکمہ پرگنہ کی سطح پر بھی قائم کئے گئے تھے جن کی نگرانی صوبائی عہدیداروں کے ذریعہ ہوتی تھی۔

مرکز میں قائم ہونے والے بڑے بڑے محکموں میں فوج، محاصل، قضاء و مذہبی امور، فرامین و مراسلات، شاہی محل، پولیس و جاسوس، ڈاک اور صوبائی نظم وغیرہ تھے۔ ان کے عہدیداران وزراء اور دوسرے مختلف ناموں سے جانے جاتے تھے۔ محکموں اور وزراء کی

تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، اور ان کے اختیارات اور فرائض میں بھی مختلف حکومتوں میں فرق ہوا کرتا تھا۔

6.3.1 وزراء

مرکز کے وزراء میں سب سے اہم عہدہ وزیر کا تھا، اس کی حیثیت وزیر اعظم کی تھی، جو بادشاہ کے بعد دوسرے نمبر کا شخص ہوتا تھا، بادشاہ کا قابل اعتماد اور اس کا نائب۔ شروع میں یہ عہدہ صرف وزیر کے نام سے تھا، التمش کے بعد اس کی اہمیت اور اختیارات میں کمی آگئی تھی، نائب الممالک کو بادشاہ کے بعد والے شخص کے اختیارات حاصل ہو گئے تھے، چنانچہ بلبن ترقی کرتا ہوا ناصر الدین محمود کے زمانہ میں نائب الممالک کے عہدہ پر فائز ہو گیا تھا، اور ایک طرح سے وہی پوی مملکت کے سیاہ و سپید کا مالک تھا۔ علاء الدین کے زمانہ میں ملک کافور نائب الممالک کے عہدہ تک پہنچا تھا۔ وزیر کا عہدہ عملی لحاظ سے دیوان وزارت کے سربراہ کا رہ گیا تھا، اور دیوان وزارت کے ذمہ مالیات اور محاصل کی نگرانی کا کام آ گیا تھا۔ دیوان وزارت کے تحت مالیات ذمہ داری کے آجانے سے پوری مملکت کی آمد و خرچ اور ان کا حساب کتاب اس وزارت سے متعلق ہو گیا تھا، وہ اپنے ماتحت عملوں کے ساتھ خالصہ یعنی شاہی زمینوں کا لگان اور باجگذار حکمرانوں سے خراج وصول کرتا تھا، صوبائی حکومتوں کے حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا، اور وہاں کے فاضل محصول وصول کرتا تھا۔ محاصل کے کاموں کے لیے اس وزیر کے تحت دو اور افسران ہوتے تھے، ایک کا عہدہ مشرف ممالک کہلاتا تھا جس کے ذمہ مملکت کی آمدنیوں کی دیکھ بھال تھی، یہ آج کی اصطلاح میں اکاؤنٹنٹ جنرل کے برابر کا عہدہ تھا، دوسرے کا عہدہ مستوفی ممالک کہلاتا تھا جو اخراجات کی جانچ پڑتال کیا کرتا تھا۔ اسے موجودہ اصطلاح میں آڈیٹر جنرل کہا جا سکتا ہے۔ مستوفی کے ماتحت ایک اور افسر ہوتا تھا جسے وقوف کہتے تھے۔ یہ عہدہ جلال الدین خلجی نے جاری کیا تھا، اس کا کام مصارف کی مدوں کا جائزہ لینا تھا۔ اسی دور میں ایک عہدہ ناظر منصب کا نکالا گیا جو عاملوں کی طرف سے مشرف ممالک کو بھیجے جانے والے حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا، نچلی سطح کے عہدوں میں عامل، کارکن اور متصرف ہوا کرتے تھے۔ دیوان وزارت کا کام کافی وسیع اور پیچیدہ ہوا کرتا تھا۔ التمش کا وزیر فخر الدین عصامی تھا جس نے بغداد کے محکموں میں تیس برس کام کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ پھر اس کی جگہ نظام الملک جنیدی مقرر ہوا، جو بڑا قابل شخص تھا۔ بلبن خود وزیر اور نائب الممالک رہا تھا لیکن بادشاہ بننے کے بعد اس عہدہ کو اس نے ختم کر دیا تھا، خواجہ حسن کو اس نے وزیر بنایا تھا جو بہت کم مشہور ہے۔

علاء الدین کے زمانے میں اس عہدہ پر خواجہ خطیر مقرر تھا، پھر نصرت خاں کو اس منصب پر فائز کیا گیا اور آخر میں ملک کافور نائب مملکت کے ساتھ وزیر خاص بھی تھا اور مالیات کا قلمدان اس کے پاس رہا۔ سید خاندان کے عہد میں اسے وکیل السلطنت کا نام دیا گیا تھا۔ محمد بن تغلق نے احمد ایاز کو خان جہاں کے خطاب کے ساتھ وزیر مقرر کیا تھا' جو معمر اور تجربہ کار آدمی تھا۔ فیروز تغلق کا وزیر خاں جہاں مقبول تھا جو تلنگی سے مشہور تھا اور نو مسلم برہمن تھا، یہ نہایت لائق شخص تھا اور فیروز شاہ نے تمام معاملات اس کے سپرد کر دئے تھے۔

دوسرا وزیر سربراہ فوج تھا، اس کا عہدہ دیوان عرض کہلاتا تھا، اسے عارض ممالک بھی کہتے تھے۔ یہ اہم عہدہ تھا اور اہمیت میں وزیر خاص کے بعد دوسرے نمبر پر تھا، اس کے ذمہ سپاہیوں کی بھرتی، فوجیوں کے ساز و سامان کی نگرانی، ان میں تنخواہوں کی تقسیم اور وقفہ وقفہ سے عرض یعنی فوج کا معائنہ کرانا داخل تھا۔ اس کے تحت کئی نائب ہوا کرتے تھے جو بخشی بھی کہلاتے تھے۔ عارض ممالک فوج کا سربراہ یا سپہ

سالار اعظم نہیں ہوتا تھا، بلکہ ہر فوج کے کمانڈر کی تقرری بادشاہ خود کرتا تھا، البتہ عارض ممالک یا اس کے نائب اور بخشی کا کام یہ تھا کہ میدان جنگ میں صوبائی گورنروں کے بھیجے ہوئے فوجی دستوں کا خیر مقدم کرے۔ سپاہیوں میں تنخواہوں کی تقسیم، سامان رسد اور ذرائع حمل و نقل کا انتظام اور اموال غنیمت کا انتظام و انصرام اس کے ذمہ تھے، وزیر جنگ کے اختیارات بڑے وسیع تھے۔

تیسری وزارت دیوان انشاء کہلاتی تھی، اس وزارت کا کام شاہی فرامین اور اعلانات کا مسودہ تیار کرنا، صوبائی گورنروں اور دیگر افسروں کے ساتھ رسل و رسائل کا رابطہ رکھنا اور سرکاری دستاویزات کی حفاظت کرنا تھا۔ اس کے تحت سکریٹریوں کا ایک بڑا عملہ ہوا کرتا تھا، یہ لوگ دبیر کہلاتے تھے، ان دبیروں کا سربراہ دبیر مملکت کہلاتا تھا، یا صاحب دیوان انشا بھی کہلاتا تھا، بادشاہ کا پرائیوٹ سکریٹری دبیر خاص کہلاتا جو بادشاہ کے خط و کتابت کا نگراں ہوتا تھا۔

مملکت کا چوتھا وزیر دیوان رسالت تھا، اسے موجودہ زمانے کی اصطلاح میں وزیر خارجہ کہا جاسکتا ہے اس کے ذمہ دوسری حکومتوں کے درباروں میں خط و کتابت بھیجنا تھا، غیر ممالک سے آنے والے سفراء اور نمائندوں سے بھی قریبی رابطہ رکھتا تھا، اسی کی نگرانی میں دوسرے ممالک میں سفراء بھیجے جاتے تھے۔

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

6.3.2 جاسوس اور پولیس

ایک اہم عہدہ برید ممالک کا تھا، اس کے تحت پورے ملک میں واقعہ نویس اور جاسوس مقرر ہوتے تھے، جو مملکت کی ہر چھوٹی بڑی بات سے بادشاہ کو باخبر رکھتے تھے، یہاں تک کہ مملکت کی سرحد میں داخل ہونے والے شخص کے ذاتی کوائف اور حلیہ و لباس تک کی تفصیلات سے فوری طور پر بادشاہ کو باخبر کر دیا جاتا تھا۔ برید ممالک کے تحت بریدوں کی ایک پوری جماعت ہوتی تھی جو شہروں، بازاروں اور ہر آباد محلہ میں تعینات ہوتی تھی، ان کا کام سلطنت میں واقع ہونے والے ہر کام کی خبر بادشاہ کو دینا تھا۔ برید سلطنت کے کان اور آنکھ ہوا کرتے تھے، بریدوں کے علاوہ بھی مخبر مقرر کئے جاتے تھے، جو منہی کہلاتے تھے، وہ مختلف درجوں میں منقسم ہوتے تھے اور وہ بادشاہ کو عوام و خواص کے معمولی معاملات سے بھی باخبر رکھتے تھے، یہ منہی لوگوں کے گھروں میں داخل ہوسکتے تھے، علاء الدین اسی محکمہ کی سخت نگہداشت کے ذریعہ بازار کا کنٹرول قائم رکھنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس محکمہ میں جاسوسوں کے ساتھ پولیس بھی مقرر تھے، پولیس کا افسر اعلی کوتوال کہلاتا تھا، وہ امن و قانون کا محافظ ہوتا تھا اور اہم معاملات میں سلطان کو مشورہ دیا کرتا تھا، پایہ تخت سے سلطان کی عدم موجودگی میں وہ شاہی حرم کا بھی نگہباں ہوتا تھا، بلبن کے زمانہ میں کوتوال کا بادشاہ پر بہت اثر تھا۔ دہلی کا کوتوال اس زمانہ میں ملک فخر الدین تھا، جو اہم معاملات میں بلبن کو مشورہ دیا کرتا تھا، اس کا داماد ملک نظام الدین' کیقباد کے زمانہ میں نائب کوتوال بن کر بادشاہ پر کافی اثر و رسوخ رکھنے لگا تھا، اور بغرا خاں کے مشورہ پر کیقباد نے اسے راستہ سے الگ کیا۔ علاء الدین کے زمانہ میں ملک علاء الملک مشہور کوتوال تھا جو ضیاء الدین برنی کا چچا تھا' اس نے بادشاہ کو بڑی صفائی اور جرأت کے ساتھ معتدل مشورے دئے تھے، جس کی وجہ سے علاء الدین خلجی اپنے دو منصوبوں سے یعنی کسی نئے طریقہ و مذہب کو جاری کرنے اور یونان کے سکندر اعظم کی طرح عالمگیر فتوحات پر نکلنے سے باز رہا۔

اسی محکمہ کے تحت ایک افسر محتسب کے نام سے تھا جو عوام کے اخلاق کا نگراں اور لوگوں کے کردار پر نظر رکھنے والا ہوتا تھا، اس

کے علاوہ وہ بازار کی اشیاء اور ناپ و تول کے پیمانوں کی بھی جانچ پڑتال کیا کرتا تھا، تاجروں پر سخت نگہداشت رکھنے کے لئے شحنہ کے نام سے بھی ایک عہدہ تھا۔

6.3.3 حرم شاہی کے عہدیداران

بادشاہ کا محل، دربار، مطبخ، حرم شاہی اور سیکوریٹی وغیرہ خود اپنے آپ میں وسیع انتظامات کے متقاضی ہوا کرتے تھے، ان کاموں کے لیے علاحدہ علاحدہ عہدیدار مقرر تھے، اور ان کی ذمہ داریاں بڑی اہمیت کی حامل اور نزاکت بھری ہوتی تھیں۔ بادشاہ کی حفاظت سے لے کر دربار کے آداب و رسوم اور دربار کی مجلسوں تک نیز حرم شاہی کے لئے خورد و نوش و پوشاک اور شان و شوکت نیز سفر کے دوران عارضی محل کے تمام انتظامات انہی عہدیداروں سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ انہیں بادشاہ کے پاس رسائی سے زیادہ مواقع ہوا کرتے تھے اور ان پر بادشاہ کی نظر بھی گہری رہا کرتی تھی۔ اسی طرح بادشاہ کے حرم کا اپنا انتظامیہ بڑا وسیع ہو جایا کرتا تھا۔

حرم شاہی کے عہدیداروں میں ایک عہدہ وکیل در کا ہوتا تھا، یہ محل کے دروازوں کا کلید بردار ہوتا تھا، اور اس کے ذمہ پورے محل اور دربار کے انتظام و انصرام کو دیکھنا تھا، یہ محل کا اہم ترین افسر ہوا کرتا تھا، محل کے عملہ کی تنخواہیں تقسیم کرنا، شاہی اولاد کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا، محل کا مطبخ، شاہی ملبوسات اور شاہی اصطبل اس کے ذمہ میں ہوتے تھے۔ اس عہدہ کی نزاکت بہت زیادہ ہوا کرتی تھی، بادشاہ کی معمولی ناراضگی، ذرا سا بھی شک و شبہ اس کی جان کے لئے خطرہ بن سکتا تھا۔ وکیل در کے ساتھ اس کا نائب بھی ہوتا تھا اور بہت بڑے عملہ کے ذریعہ وہ اپنے فرائض کو انتہائی ذہانت و صلاحیت اور قابلیت کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ شاہی محل کے عملہ اور کارکنوں و خادموں کی تعداد سینکڑوں میں ہوا کرتی تھی۔

ایک اہم عہدہ امیر حاجب کا تھا، یہ سلطان سے تنہائی میں ربط رکھنے والا افسر ہوتا تھا، یہی دربار کے آداب کا نفاذ کرتا تھا، اور جلسوں اور تقریبات کے انتظامات دیکھتا تھا، دربار میں باریابی کے آداب اور امراء و افسران کی نشست گاہوں کی تعیین اس سے متعلق ہوتی، یہ بڑی اہم ذمہ داری تھی اور دربار میں ملاقات کے طریقے اور اس کی شان و شوکت اس سے وابستہ ہوتی تھی، بلبن کے زمانہ میں دربار کی شان و شوکت اور اس کے دبدبہ کا اہتمام بہت زیادہ کیا جاتا تھا، کہا گیا ہے کہ جب بلبن کا دربار آراستہ ہوتا تو ملوک و امراء نقیب و چاؤش اور دیو پیکر جوان ننگی تلواریں لیے اس کے دیگر دو پیش کھڑے رہتے، باہر کا کوئی سفیر یا مقامی کوئی راجہ دربار میں باریاب ہوتا تو سلام کے وقت خوف سے گر جاتا یا بے ہوش ہو جاتا۔ چنگیزی فتنوں سے پریشان ہو کر بلبن کے دربار میں پندرہ شہزادے پناہ لئے ہوئے تھے، ان میں سے سوائے دو عباسی شہزادوں کے سبھی شہزادے تخت شاہی کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے۔ دربار کے بڑے بڑے امراء پر ایسی ہیبت رہتی کہ بلبن کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کرتے تھے، جب اس کی سواری نکلتی تو تماشائی اور سامعین پر لرزہ طاری ہو جاتا، برنی کے مطابق بلبن نے اپنی حکومت کے بیس سالہ دور میں شاہی وقار، شاہی آداب اور شاہی دبدبہ کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ بلند نہ ہو سکا۔ دربار کی اس شان و شوکت کے انتظام کی ذمہ داری امیر حاجب کے ذمہ ہوا کرتی تھی۔ امیر حاجب کو باربک کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔

ایک افسر سر جاندار کے نام سے تھا، یہ بادشاہ کے ذاتی محافظوں کا سربراہ ہوتا تھا، بادشاہ کی حفاظت میں بڑے توانا اور مضبوط نسل

کے نوجوان اسلحوں کے ساتھ ارد گرد کھڑے رہتے تھے، انہیں جاندار کہا جاتا تھا، اور ان کا یہ سربراہ سر جاندار کہلاتا تھا، بلبن کے دربار میں سینکڑوں دیو پیکر نوجوان ننگی تلواریں لئے کھڑے رہتے تھے جو اچانک کسی حملہ کے وقت تحفظ کے لئے تیار رہتے تھے اور ان سے دربار کی شان و شوکت میں بھی اضافہ ہوتا تھا، اسکی سواری کے جلو میں پانچ سو سیستانی، عربی، سمرقندی اور غوری سوار ننگی تلواروں کے ساتھ نعرے بلند کرتے ہوئے چلتے تھے۔

بادشاہ کے معمولات میں سیر و شکار اور اس غرض سے سفر بھی ہوا کرتا تھا، شکار گاہ کی نگرانی امیر شکار کے ذمہ ہوا کرتی تھی، شاہی فوج کے ہاتھیوں کا ذمہ دار شحنہ پیلان کہلاتا تھا، اور سرکاری اسلحوں کا سربراہ سر سلاحدار ہوتا تھا، شاہی مہر بردار مہر دار کہلاتا اور گھوڑوں کا افسر امیر آخور کہلاتا، یہ شاہی سوار فوج کا سربراہ ہوتا تھا۔

شاہی محل کا ایک اہم کام مطبخ سے متعلق ہوا کرتا تھا، اسکے پاس نہ صرف شاہی افراد خاندان کے خورد و نوش کا انتظام تھا بلکہ بڑی شاہی ضیافتوں کا اہتمام بھی ہوا کرتا تھا۔ شاہی مطبخ کا نگراں سرچاشنی گیر اور مشروبات کا ذمہ دار شرابدار کہلاتا تھا۔ اس طرح کے بہت سے عہدے شاہی حرم سے متعلق ہوا کرتے تھے۔

شاہی حرم کے یہ وزراء، افسران اور سکریٹریز بڑی اہمیت کے حامل ہوتے تھے، وہ بادشاہ سے بہت قریب ہوتے تھے اور اپنے مقام و حیثیت کے لحاظ سے خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔

6.4 صوبائی حکومتیں

دہلی سلطنت کا رقبہ اپنی ابتداء سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا، علاء الدین خلجی کے عہد تک تقریباً پورے شمالی اور جنوبی ہندوستان پر دہلی حکومت قائم ہو چکی تھی، مملکت کے انتظام کے لئے ان مفتوحہ علاقوں کو بڑے بڑے صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، بعض صوبے پہلے ہی سے بڑے اور معروف تھے، جہاں دہلی سلطنت سے قبل چھوٹی حکومتیں تھیں اور دہلی سلطنت نے انہیں فتح کر لیا تھا، جیسے گجرات اور ملتان کی حکومتیں وغیرہ۔ بعض علاقوں کو صوبے کی حیثیت دی گئی، ان صوبوں کے علاوہ کچھ ایسے بھی علاقے تھے جن کو دہلی سلطنت کے تابع بنا کر حکومت پر سابق حکمرانوں کو باقی رکھا گیا کہ وہ مرکز کو خراج ادا کرتے رہیں، یہ باجگذار کہلاتے، جیسے شروع میں تلنگانہ کی حکومت اور راجستھان کی بعض راجپوت حکومتیں تھیں۔

علاء الدین کے زمانہ میں صوبوں کی تعداد گیارہ تھی جن کے علاحدہ علاحدہ گورنر مقرر تھے۔ گجرات پر الپ خاں مقرر تھا، ملتان کافور کے تحت تھا، دیوپال پور میں غازی ملک متعین تھا، اجین میں عین الملک ملتانی گورنر تھا، بدایوں کا گورنر ملک دینار تھا، سامانہ کی گورنری آخور بیگ کے تحت تھی، چتوڑ پر ملک ابو محمد گورنر بنایا گیا تھا، چندیری ملک تمر کے تحت، اودھ ملک بکتن کے تحت اور کڑہ ملک نصیر الدین سوتیلہ کے تحت تھے اور جھائن پر فخر الملک میرٹی گورنر تھا۔

صوبے اپنی جگہ مکمل یونٹ تھے اور وہاں گویا بادشاہ دہلی کے ماتحت خود مختارانہ حکومت تھی۔ صوبہ کے گورنر کی تقرری بادشاہ خود

کرتا تھا، اسے صوبہ دار کہا جاتا تھا، وہ اپنے صوبہ میں آزادانہ حکومت کرتا تھا اور صوبائی سطح پر وہاں بھی مرکز کی طرح محکمے ہوتے تھے۔ صوبہ داروں کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا تھا، اور گورنری ختم بھی کر دی جاتی تھی، یہ سب کچھ صوبہ دار کے انتظام و انصرام اور بادشاہ کے ساتھ اس کے مراسم پر موقوف تھا۔ بعض صوبے بہت بڑے بڑے تھے، جیسے بنگالہ کا صوبہ جو لکھنوتی کہلاتا تھا، یا دکن کا صوبہ جس میں کئی چھوٹی حکومتوں کو شامل کر دیا گیا تھا۔ اپنی فوجی قابلیت اور صلاحیتوں کی بنیاد پر صوبہ دار کی تقرری ہوتی، بادشاہ اپنے شاہزادوں کو بھی صوبوں کی گورنری پر مقرر کرتا تھا، یہ صوبے مقطع بھی کہلاتے تھے، اور یہاں کے سربراہ مقطع دار۔ ایبک نے التمش کو بدایوں کا مقطع دار بنایا تھا۔ خود ایبک شہاب الدین غوری کے ذریعہ دہلی کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ بلبن نے اپنے بڑے بیٹے خان محمد کو ملتان کی گورنری پر مقرر کر کے منگولوں کی روک تھام اس کے سپرد کی تھی، ملتان میں خان محمد کا دربار اہل علم و فضل کا مرکز تھا جس سے امیر خسرو جیسے فاضل بھی وابستہ تھے، اس نے اپنے دربار میں شیراز سے شیخ سعدی کو بھی بلانے کی کوشش کی تھی۔ بلبن کا دوسرا بیٹا بغرا خاں لکھنوتی (بنگال) کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ علاء الدین خلجی بادشاہ ہونے سے قبل کڑہ کا گورنر تھا اور اس کا سپہ سالار ملک کافور ملتان کا گورنر بنایا گیا تھا۔ غیاث الدین تغلق بادشاہ ہونے سے قبل دیوپال پور کا گورنر تھا۔ محمد بن تغلق کے زمانہ میں اس کی پالیسیوں سے ناراض ہو کر اور مسلسل ہو رہے مالی و فوجی نقصان کے پیش نظر ان صوبائی گورنروں نے ہی بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا، محمد بن تغلق نے کچھ بغاوتوں پر قابو پایا اور انہیں دہلی سلطنت کے تابع بنالیا، لیکن کچھ صوبے تو ایسے آزاد ہوئے کہ پھر وہ دہلی سلطنت کا حصہ نہ بن سکے، جیسے دکن، گجرات، بنگالہ اور ملتان وغیرہ۔ بلکہ اسی زمانہ میں کئی ہندو ریاستیں قائم ہو گئیں، جیسے راجستھان کی حکومتیں اور جنوب میں وجے نگر کی حکومت وغیرہ۔

باجگذار ریاستیں جو وہاں کے حکمرانوں کے تحت رہنے دی جاتی تھیں، ان کا داخلی انتظام مرکز سے متعلق نہیں ہوتا تھا۔ صرف انہیں سالانہ خراج کی ادائیگی کرنی ہوتی اور ضرورت پڑنے پر فوجی امداد فراہم کرنی ہوتی تھی، اور سکوں پر بادشاہ دہلی کا نام رہتا تھا۔ دیوگیری کے رام دیو اور دوسرے جنوبی ہند کے حکمراں ایسے ہی باجگذار تھے۔

صوبوں کی حکومتوں میں تمام اہم محکمے موجود ہوتے تھے، صوبائی گورنر ایک طرح سے چھوٹا بادشاہ ہوتا تھا، دہلی کے بادشاہ کی طرح وہ بھی اپنے صوبہ میں انتظامیہ اور عدلیہ کا سربراہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے دربار منعقد کرتا تھا، عدل و انصاف کے محکمہ کی نگرانی اور عدالت اپیل کا کام کرتا، صوبے کا لگان وصول کرتا اور امن و قانون کو یقینی بنائے رکھتا تھا، یہ صوبے دار عام طور پر اپنے صوبے یا مقطع میں مقیم رہتے تھے، لیکن بعض حالات میں انہیں دہلی کے شاہی دربار میں بھی رہنا پڑتا تھا، اور نائبوں کے ذریعہ صوبہ کے نظم و نسق کو چلانا پڑتا تھا۔

صوبائی گورنروں کی تنخواہ اس کے اقطاع کے کل محاصل کے تناسب سے مقرر کی جاتی تھی، وہ صوبے کے محصولہ لگان میں سے اپنی مقررہ رقم منہا کر کے فاضل رقم شاہی خزانے میں جمع کرا دیتا تھا، وہ اپنے صوبہ کے حسابات کے لئے مرکز کے دیوان وزارت (وزارت مالیات) کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا، جہاں اس کے آمد و خرچ کی پابندی سے جانچ پڑتال ہوتی تھی، مرکزی حکومت ہی صوبائی گورنر کی فوج کی تعداد متعین کرتی تھی، اور مقطع اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ گویا مرکز کی جانب سے صوبہ کی فوجی حیثیت کی تعیین ہوا کرتی تھی، سلطان کے برید اور جاسوس مقطعوں اور صوبوں کے اندر بھی ہر جگہ مقرر ہوتے تھے جو صوبے کے حالات اور چھوٹی بڑی سرگرمی کی خبریں

بادشاہ تک پہنچاتے تھے۔اس کی وجہ سے گورنر بھی وفادار رہنے کی کوشش کرتے تھے، اور بغاوت کی ہلکی سے بھنک بھی کم وقت میں بادشاہ تک پہنچ جاتی تھی، خسرو خاں کی بغاوت کی خبر دکن کے دور دراز علاقہ سے دہلی پہنچ گئی تھی۔ ان پابندیوں کے علاوہ صوبہ دار کو کافی آزادی حاصل تھی، اور وہ اپنی قابلیت وصلاحیت اور وفاداری کی بنیاد پر طویل عرصہ تک گورنری پر برقرار رہ سکتے تھے۔ دیوپال پور میں غازی ملک اور گجرات پر الپ خاں نے طویل مدت تک گورنری کی۔

ان صوبوں کے علاوہ کچھ علاقے براہ راست مرکز کے زیر انتظام ہوتے تھے، یہ علاقے خالصہ کہلاتے تھے، اس کے اندر مختلف اضلاع اور شہر تھے، ان پر مقطع کے بجائے امیر شحنہ حکومت کرتے تھے، یہاں کے افسران دیوان وزارت سے تنخواہ پاتے تھے، اور اسی کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔

6.4.1 پرگنے اور گاؤں

دہلی سلطنت کے علاقوں کو بڑے بڑے صوبوں میں تقسیم کیا گیا گھا، جہاں صوبہ دار چند شرائط کے ساتھ پوری آزادی سے حکومت کرتے تھے، یہ صوبے بھی پرگنوں میں تقسیم تھے، پرگنہ ایک طرح سے ضلع کی حیثیت رکھتے تھے، کیونکہ ایک پرگنہ کئی گاؤں پر مشتمل ہوا کرتا تھا، ضلع کو سرکار بھی کہتے تھے، صوبہ کے تحت شق بھی ہوتے تھے، جن کے سربراہ کو شق دار کہا جاتا تھا، پرگنہ کے اندر موجود ہر گاؤں کا ایک ذمہ دار ہوا کرتا تھا جسے عامل کہا جاتا تھا، گاؤں کے سربراہ کے لئے مقدم کا نام استعمال ہوتا تھا، اور زمین کے مالکان خوط کہلاتے تھے۔ پرگنہ اور گاؤں کی سطح پر نظم وانتظام، مذہبی معاملات اور رسوم ورواج میں مرکز کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہوتی تھی، یہاں پہلے سے چلا آرہا سابق نظام باقی رکھا گیا تھا، گاؤں میں مالیات کا ذمہ دار پٹواری کہلاتا تھا، اور اس کے ذریعہ گاؤں کی محصولی پرگنہ اور صوبہ سے ہو کر مرکزی حکومت تک پہنچتی تھی۔

6.5 فوج

دہلی سلطنت کے نظم ونسق کا ایک حصہ فوج کا انتظام تھا، حکومت چونکہ بنیادی طور پر فوجی نوعیت کی تھی، اس لئے حکومت کی بقاء فوج کی اعلی قابلیت پر ہی منحصر تھی۔ پھر اس دور میں مرکزی حکومت کے اندر بادشاہ کو نہ صرف اپنی بادشاہت کو باقی رکھنے کے لئے فوجی قوت پر اعلی دسترس کی ضرورت ہمیشہ رہتی تھی، بلکہ ملک کے اندر وقتاً فوقتاً اٹھنے والی بغاوتوں پر قابو پا کر صوبوں کو مرکزی اقتدار سے وابستہ رکھنے کے لئے، مختلف علاقائی ہندو حکومتوں پر قابو رکھنے کے لئے اور خاص طور پر شمال مغربی سرحدوں کی طرف سے بار بار امنڈ کر اٹھنے والے خطرناک منگولی سیلاب سے تحفظ کے لئے بادشاہ کو پوی طرح فوجی قوت پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے دہلی سلطنت کے جن بادشاہوں نے اپنی فوج مضبوط رکھی ان کی حکومتیں مستحکم رہیں، اور جہاں فوجی قوت میں کمزوری آئی علاقے ہاتھوں سے نکل گئے۔

دہلی سلطنت کے تمام ہی حکمراں بنیادی طور پر اعلی قابلیت رکھنے والے فوجی تھے، اور انہوں نے میدان جنگ میں اپنی اعلی صلاحیتوں اور بہادری کا مظاہرہ کر کے ہی تخت سلطنت تک رسائی حاصل کی تھی۔ قطب الدین ایبک اعلی درجہ کا قابل فوجی سربراہ تھا، التمش کی فوجی

قابلیت نے ہی اسے تخت نشین کیا۔ التمش کے بعد تخت نشینی کی جنگ چلی اور واحد خاتون بادشاہ رضیہ سلطان کو اس کی قابلیت کی وجہ سے ہی تخت سلطنت نصیب ہو سکا، بلبن کا طویل دور حکومت اس کی فوجی عظمت اور شاہانہ شوکت و شان کی مرہون منت ہے۔ بلکہ اس نے منگولوں کو بھی اپنی فوجی سطوت و قوت کا خوف دلانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ کیقباد کمزور اور ناز و نعمت کا پروردہ تھا، حکومت کا عصا مضبوطی سے نہ تھام سکا اور فیروز خلجی کی فوجی صلاحیت کام آئی اور حکومت خاندان خلجی میں منتقل ہو گئی، علاء الدین خلجی کو سکندر ثانی اس کی فوجی صلاحیتوں کی وجہ سے کہا جاتا ہے، اس کی فوجی مضبوطی کی وجہ سے دہلی سلطنت جنوب تک پہنچ سکی، خسرو خاں نے اگرچہ حکومت خاندان خلجی سے غصب کرلی لیکن اس موقع پر بھی غازی ملک کی غازیانہ صلاحیت نے ہی دہلی سلطنت پر اس کے قدم جمادئے۔ محمد تغلق کے بعد جب فوجی قوت میں کمزوری آئی تو دہلی سلطنت کے ٹکڑے ہوتے گئے اور چھوٹی چھوٹی علاقائی حکومتیں وجود میں آگئیں۔

دہلی سلطنت میں فوج کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہر بادشاہ نے فوجی تیاری پر خاطر خواہ توجہ دی، کیونکہ اس زمانہ میں یہی تصور تھا کہ "بادشاہت فوج ہے اور فوج بادشاہت"۔ ترکی نسل سے تعلق رکھنے والے ان بادشاہوں کی فوج اعلی معیار کی تھی، اس کے سپاہی نہ صرف اپنی فوجی تربیت میں بہتر تھے بلکہ سامان جنگ اور اسلحوں کا معیار بھی اونچا تھا، پھر وہ حکمت و تدبیر کے ساتھ لڑتے تھے۔ شہاب الدین غوری کے مقابلوں میں ترائن کی دونوں جنگوں میں ہندوستانی فوج کے مقابلہ ترکی فوج کی برتری عیاں تھی۔

فوج کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی کہ فوج کی ایک قسم بادشاہ کے ذاتی محافظوں پر مشتمل ہوتی تھی، یہ فوج جاندار کہلاتی تھی، وہ سلطان کی نگرانی اور ملازمت میں رہتے تھے۔

دوسرے گھوڑ سوار اور پیادہ فوج تھی، یہ سلطنت کی مستقل اور متعینہ فوج کا حصہ تھے، تیسرے مخصوص سپاہی ہوتے جو جنگ کے زمانے میں بھرتی کئے جاتے تھے، اور اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے تھے، بلبن کے زمانہ کی فوج کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان میں لڑاکے پہلوان، دوڑنے والے شطار اور ہر قسم کے لوگ پائے جاتے تھے، ان کے پاس بہترین گھوڑے، شان دار اسلحے اور خوبصورت ملبوسات تھے۔ ترکی بادشاہوں نے اچھی نسل کے عمدہ گھوڑوں کی مسلسل فراہمی پر خصوصی توجہ دی تھی، یہ گھوڑے وسط ایشیا اور عرب و ایران سے آتے تھے، یہ اپنی قوت و تربیت میں علاقائی گھوڑوں سے بدرجہا بہتر ہوتے، ان گھوڑوں اور ان کے سواروں کو لوہے کے زرہوں کا لباس دیا جاتا اور دیگر اسلحوں سے لیس ہو کر وہ میدان جنگ میں مقابلہ کرتے۔

بادشاہ فوج کا کمانڈر ان چیف ہوتا تھا، اگر بادشاہ کہیں کسی فوج کو بھیجتا تو اس کے لیے سالار مقرر کر دیتا تھا، سلطنت کی فوج وزیر جنگ یا عارض ممالک کی نگرانی میں ہوتی تھی، جس کی ذمہ داری فوجیوں کی فراہمی، ان کی تنخواہوں کی تقسیم، ان کے اسلحوں اور پوشاکوں کا انتظام اور گھوڑوں کا معائنہ وغیرہ تھی، وہ فوجیوں کا ریکارڈ بھی رکھتا تھا۔

بلبن نے فوج کے لئے باضابطہ ایک محکمہ قائم کیا تھا، علاء الدین خلجی نے فوج میں نئی نئی اصلاحات کیں اور کئی تبدیلیاں لائیں۔ اس نے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ جاری کیا تاکہ معائنے کے وقت ایک گھوڑا دوبارہ نہ پیش کیا جائے یا اسے بدل نہ دیا جائے۔ فوجیوں کے ریکارڈ

کے لئے رجسٹر بنوائے جس میں ہر فوجی کی تفصیل درج ہوتی، علاء الدین نے ہی فوج کو نقد تنخواہ دینے کا طریقہ شروع کیا، تاکہ سلطنت کے پاس با قاعدہ تنخواہ والی مستقل فوج رہے۔

سلطنت کی حفاظت کے لئے فوج کے ساتھ قلعوں کی تعمیر اور مرمت نیز ان میں تمام جنگی ساز و سامان کی فراہمی پر بھی توجہ دی گئی تھی، بلبن نے قلعوں کی تعمیر پر خاص توجہ دیتے ہوئے شمال مغربی سرحدوں پر متعدد قلعے تعمیر کرائے، تاکہ منگولوں کے حملوں کا موئثر دفاع کیا جاسکے۔ علاء الدین کے زمانہ میں منگولوں کی فوج کے دہلی تک آجانے کے بعد اس نے بھی قلعہ بندی کی ضرورت محسوس کی اور فوجی اہمیت کے مقامات پر پرانے قلعوں کو تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ ان قلعوں میں ہر قسم کے ہتھیار اور غلہ ورسد کے گوداموں کا انتظام کیا گیا، بڑے اسلحے جیسے منجنیق اور عرادے لگائے گئے، نیز ان کے بنانے والے ماہرین فن وہاں مقرر کئے گئے، اور ان قلعوں پر آزمودہ کار کمانڈر مقرر کئے گئے جو کوتوال کہلاتے تھے۔ علاء الدین اپنی فوج کے ساتھ بڑی شفقت کا معاملے رکھتا تھا اور ان کی آسانی کا خیال رکھتا تھا، اشیاء کی ارزانی اور قیمتوں پر کنٹرول کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ فوجیوں کو کم داموں پر ضروریات کے سامان مہیا ہو جائیں۔ فوج میں گھوڑوں کے علاوہ ہاتھی بھی رکھے جاتے تھے۔

6.6 ڈاک

سلطنت کے دور دراز علاقوں سے رابطہ رکھنے کے لئے ڈاک کا انتظام بہتر بنایا گیا تھا، جس کی وجہ سے سلطنت کے مختلف حصے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، اور نظم ونسق میں سہولت پیدا ہوگئی تھی، ڈاک کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شہر سے دوسرے دور دراز شہر تک راستے میں ہر تھوڑے فاصلہ پر چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں، یہ چوکیاں بہت کم فاصلہ پر ہوتی تھیں، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ دہلی سے دولت آباد کی شاہراہ پر ہر میل پر تین چوکیاں قائم تھیں، ہر چوکی پر سوار افسر اور محرر مقرر ہوتے تھے، چوکیاں سواروں اور پیادوں دونوں کی ہوتی تھیں، چوکی پر وہ تمام چیزیں مہیا رکھی جاتی تھیں جن کی ضرورت کسی ایک مسافر کو پیش آسکتی ہے، محمد بن تغلق کے عہد میں ہر چوکی پر دس تیز رفتار دوڑنے والے تعینات رہتے تھے۔ ان چوکیوں کے ذریعہ سلطنت کے ہر علاقہ کی خبر برابر دہلی میں بادشاہ کو پہنچتی رہتی تھی، جب مرکز سے کوئی فوج کسی علاقہ میں روانہ ہوتی تو فوج کی خبریں ہر روز یا تیسرے دن سلطان کے پاس بھیجی جاتی رہتی تھی۔ علاء الدین اور محمد بن تغلق نے ڈاک کے نظام کو اور بہتر بنایا تھا،، محمد بن تغلق نے دہلی سے دولت آباد کی طویل شاہراہ بنوائی تھی جس پر دونوں کنارے درخت لگوائے تھے۔ علاء الدین کو اسی ڈاک کے بہتر نظام کی وجہ سے حاجی مولہ کی بغاوت کی خبر تیسرے دن ہی مل گئی تھی۔ اور قطب الدین مبارک کے زمانہ میں خسرو خاں کو قید کرکے دیوگیری کے دور دراز مقام سے صرف ایک ہفتہ میں دہلی پہنچا دیا گیا تھا۔ محمد بن تغلق کو اس ڈاک کے ذریعہ دولت آباد میں گنگا کا صاف پانی پہنچتا تھا، اور خراسان کے تازہ میوے بھی پہنچائے جاتے تھے۔

ڈاک کا یہ نظام پھیلی ہوئی دہلی سلطنت پر بیدار مغزی سے نظر رکھنے میں سلطان کے لئے کافی مددگار ثابت ہوتا تھا۔

6.7 مالیاتی نظام

سلطنت کے نظم و نسق کا ایک اہم حصہ مالی نظام تھا، دہلی سلطنت کے سلاطین کے پیش نظر یہ بات رہی کہ ملک کے اندر ایک انتظامیہ رکھنے کے لیے آزاد سلطنتوں کو فتح کر کے دہلی کے تابع بنایا جائے، ملک میں امن و امان قائم رکھا جائے، بیرونی حملوں سے ملک کی حفاظت کی جائے اور ملک کے مختلف حصوں سے محاصل وصول کئے جائیں۔ ان کاموں کے لئے دہلی سلطنت کو ایک مضبوط فوج کی ضرورت تھی، اور فوجی اخراجات کی تکمیل کے لئے نیز عوام کی فلاح و بہبود سے متعلق رفاہی اقدامات کے لئے مستحکم مالی نظام کی ضرورت تھی۔

قطب الدین ایبک سے لے کر جلال الدین خلجی تک حکمرانوں نے ہندوستان میں پہلے سے رائج مالی نظام، محصول کے طریقوں اور زرعی معاملات کو باقی رکھا اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی، نیز ظلم و تشدد کی روک تھام کو یقینی بنایا۔ ہندوستان بنیادی طور پر زرعی ملک تھا، جہاں کاشتکار اپنی یا مالکان اراضی کی زمینوں پر کاشت کرتے تھے اور پیداوار کا ایک مقررہ حصہ جنس کی شکل میں یا نقد کے طور پر حکومت کو دیا کرتے تھے، صوبوں کے اندر اقطاع کا نظام رائج تھا، یعنی امیروں یا صوبہ داروں کو اپنے زیر انتظام علاقوں سے وصول ہونے والے لگان اور محصول میں سے ہی صوبائی اخراجات کے انتظام، صوبائی فوج کے اخراجات اور اپنے ذاتی اخراجات کو پورا کرنا ہوتا تھا، اور ایک مقررہ مقدار میں محصول مرکزی حکومت کو ادا کرنا ہوتا تھا۔

علاء الدین خلجی نے لگان کی تعیین اور اس کی وصولیابی کے انتظام میں بڑے پیمانہ پر تبدیلیاں کیں، اس سے پہلے تک جو نظام رائج تھا وہ کچھ یوں تھا کہ کچھ زمینیں براہ راست مرکز کے تحت تھیں جو خالصہ کہلاتی تھیں، یہ زمینیں دیوان وزارت کی براہ راست نگرانی میں ہوتی تھیں، یا گورنر اپنے ماتحت علاقوں کی اراضی کے محصولات وصول کراتے، ان سے اپنی تنخواہ کا حصہ اور صوبائی نظم و نسق کے اخراجات نکال کر باقی محصول مرکزی خزانہ میں جمع کر دیتے تھے، محصول کی تعیین کا طریقہ یہ تھا کہ کاشتکار اپنی پیداوار کا کچھ حصہ مقطع یا بادشاہ کو ادا کرنے پر راضی ہو جاتا تھا، یہ مقدار عموماً پیداوار کی ایک تہائی ہوتی تھی۔ گاؤں کے مقدم یا خوط لگان کو وصول کرتے تھے، اور مرکزی حکومت کے حصہ کو نقد یا جنس جس شکل میں طے ہو ادا کر دیا کرتے تھے۔ یہ وصول کنندگان اپنے عمل کا معاوضہ پاتے تھے۔ جلال الدین خلجی کے عہد تک محصول کی وصولیابی یا مالی نظام کا یہی طریقہ رائج تھا۔

علاء الدین خلجی نے جب دہلی سلطنت کی سرحدیں انتہائی وسیع کر دیں اور مملکت کا دائرہ تقریباً پورے ہندوستان پر پھیل گیا تو اس نے اپنی بڑھتی فوجی ضروریات کی تکمیل کے لئے نیز رعایا کی بہبودی کے پیش نظر دوسری اصلاحات کے ساتھ معاشی اصلاحات پر بھی خاطر خواہ توجہ دی، اور پہلی مرتبہ میں محاصل کی تعیین، ان کی وصولیابی، بازار کے نرخ، اشیاء کی درآمد و برآمد اور دیگر معاشی ضوابط میں بڑے پیمانہ پر تبدیلیاں کیں، اور ان معاشی ضوابط اور مالی اصلاحات کو پوری قوت کے ساتھ نافذ بھی کیا۔ اپنی ان اصلاحات اور ان کے نفاذ کی وجہ سے علاء الدین اپنی وسیع مملکت میں امن و امان کے ساتھ طویل عرصہ حکومت کر سکا۔

علاء الدین نے پہلی مرتبہ زرعی زمینوں کی پیمائش کروائی، زمین کی حقیقی پیمائش کی بنیاد پر محصول کو مقرر کیا، اس کی وجہ سے

درمیانی لوگوں اور سرداروں کی من مانی وصولیابی پر روک لگ گئی۔ اب کاشتکاروں کی زمینیں جتنی ہوتیں ان پر محصول کی مقدار طے ہو جاتی، خوط اور مقدم اور چودھری پوری امانت داری کے ساتھ لگان کی مقررہ مقدار سرکاری خزانہ میں جمع کراتے، عاملوں اور پٹواریوں کی رشوت خوری بھی اس سے بند ہوگئی۔ علاء الدین نے لگان کی مقدار بھی بڑھادی تھی، پہلے لگان وصول کرنے والے افسران اور دوسرے عامل کاشتکاروں سے زیادہ وصول کرتے اور سرکار کو اس کی مقررہ مقدار دے کر فاضل آمدنی اپنے پاس رکھ لیتے تھے، اب زمینوں کی پیمائش کردی گئی تھی اور اسی حساب سے پیداوار کا نصف سرکاری خزانہ میں جمع کرنا ضروری قرار پایا تھا، اس سے سرکار کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور علاء الدین نے شراب بندی اور قمار بندی کردی تھی جس سے سرکاری خزانہ کو نقصان ہوا تھا، اس کی تلافی لگان کی شرح بڑھا کر کرلی گئی۔

علاء الدین نے اس کے علاوہ انعامی اور عطیات کی زمینوں کی منسوخی کا بھی فرمان جاری کیا، حکمرانوں کے ذریعہ اہل علم وفضل کو اور خوشی کے مواقع پر امراء کو بڑی بڑی زمین انعام کے طور پر ملتی تھیں، جن کے محاصل ان کی ذاتی آمدنی ہوتی تھی، علاء الدین نے ایسی تمام زمینیں بحق سرار واپس لے لیں اور وہ خالصہ زمین قرار پا گئیں جن کے محصول براہ راست سرکاری خزانہ میں پہنچنے لگے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ بڑے بڑے امراء جو اپنی زبردست آمدنیوں کی وجہ سے شان وآرام کی زندگی بسر کرتے تھے اور عیش وعشرت میں پڑ کر مغرور ہو جاتے اور بسا اوقات بغاوت کے منصوبے باندھتے، ان کی زمینیں جب ضبط ہوگئیں تو ان کی آمدنی بہت زیادہ گھٹ گئی، اور ان کے دماغ سے بغاوت کا سودا نکل گیا۔ اسی لئے علاء الدین کے زمانہ میں بغاوت کی بہت کم خبریں ملتی ہیں۔ اسی طرح گاؤں کے مقدموں، خوطوں اور کاشتکاروں پر بھی گہری نظر رکھنے کے لئے زمینداروں کو دی جانے والی مراعات واپس لے لی گئیں، اور ان کی طرف سے سرکشی کے خطرات پر بھی بندش لگادی گئی، اب وہ کاشتکاروں سے وصول ہونے والی مقررہ لگان جوں کی توں شاہی خزانہ کو بھیجتے اور اپنے معاوضہ پر گذارہ کرتے تھے۔

علاء الدین کا ایک اہم اقدام بازار کے نرخ کی تعیین سے متعلق تھا، اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اشیاء ضرورت کو اتنا ارزاں بنادیا جائے کہ ملک کی عوام کم ترین قیمت پر اپنی ضروریات پوری کر سکیں، اس پالیسی سے اس کی فوج کو بھی کم آمدنی میں ضروریات زندگی کو پوری کرنے کے مواقع فراہم ہوتے تھے۔ اپنی اس پالیسی کے تحت علاء الدین نے اشیاء کی نرخ بندی کی۔ دہلی اور اطراف میں سامانوں کے بازار لگتے تھے، علاحدہ علاحدہ سامانوں کے لئے الگ الگ بازار تھے، ہر بازار اور وہاں کے سامانوں کی قیمتیں علاء الدین نے مقرر کردیں اور نرخ کی یہ فہرست بازار میں لگوادی اور سخت حکم جاری کیا کہ اس سے زیادہ قیمت پر چیزیں فروخت نہ ہوں، غلہ اور اجناس کے بازار میں انتہائی کم قیمت پر چاول، دال، گھی، شکر وغیرہ دستیاب ہوگئے تھے، کپڑا بازار میں ہر نوع کے کپڑے کی قیمت طے تھی، مٹھائی کے بازار میں وہاں کی اشیاء کی نرخ بندی تھی، جانوروں حتی کہ غلاموں کی بھی قیمتیں طے کردی گئی تھیں، یہی حال مسالہ جات، پھلوں، ہتھیاروں اور جوتوں وغیرہ کے بازار کا تھا۔ مارکٹ کے نرخ کی پابندی کے لئے ہر بازار پر ایک شحنہ مقرر تھا اور اس کے ماتحت افسران کی پوری ٹیم ہوتی، یہ بازار میں موجود رہتے اور حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت ترین سزائیں دیتے۔ یہ ہر دن کی رپورٹ بادشاہ کو بھیجتے، ان کے علاوہ خفیہ پولیس کی رپورٹ علاحدہ سے

روزانہ بادشاہ کے پاس آتی اور برید منڈی کے لوگ سامانوں کے معیار کی رپورٹ بھیجتے تھے، اس طرح تین مختلف ذرائع سے آنے والی روزانہ کی رپورٹ کی بنیاد پر مارکٹ پر سخت ترین نظر رکھی جاتی، اور کسی بھی کوتاہی پر خود افسران کو سخت ترین سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا، اور علاء الدین کی سنگین سزاؤں کے خوف سے یہ افسران بازار کے بیوپاریوں کو انتہائی سختی کے ساتھ معاشی ضوابط کا پابند رکھتے تھے۔ بازار کے تاجروں کے علاوہ باہر سے اشیاء درآمد برآمد کرنے والے کاروانیوں کو بھی نرخوں کا پابند کردیا گیا تھا، جب ان کاروانیوں کو باہر سے مہنگے دام خرید کر دہلی میں علاء الدین کے مقررہ کم نرخ پر فروخت کرنے میں دشواری ہوتی اور منڈی میں اشیاء کی فراہمی دشوار ہوئی تو علاء الدین نے ان کاروانیوں کو بڑی بڑی رقم فراہم کرکے پابند کیا کہ وہ ان رقومات سے اشیاء خرید کر لائیں اور مقررہ قیمت پر ہی منڈی میں تاجروں کو فروخت کریں، تاکہ عوام سستی نرخوں پر چیزیں پاتے رہیں۔

قحط اور خشک سالی کے زمانہ میں قیمتیں گراں ہونے کا اندیشہ تھا، علاء الدین نے اس سے نمٹنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ ہر ہر محلہ میں سرکاری گودام بنوائے جہاں محصول میں آنے والی اجناس حفاظت سے رکھی جاتیں، یہ شاہی گودام غلوں سے بھرے رہتے اور قحط کے زمانہ میں ان گوداموں سے سستی قیمت پر سامان مارکٹ میں فراہم کردئے جاتے۔ کالابازاری روکنے کے لئے قحط کے زمانوں میں راشن کا طریقہ اختیار کیا جاتا، جس کے تحت ہر گھر کو اس کی ضرورت کے مطابق سامان خریدنے کی اجازت ہوتی، اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اذیت ناک سزائیں دی جاتیں۔

علاء الدین کی ان اصلاحات کو نافذ کرنے میں اس کے وزیر شرف الدین قاینی نے بڑی خدمات انجام دیں۔ اسی طرح مارکٹ پر کنٹرول قائم رکھنے کے لئے بادشاہ نے ملک قبول کو بازار کا شحنہ مقرر کیا تھا اور ملک یعقوب کو دیوان ریاست مقرر کیا گیا تھا، اس کا دائرہ اختیار بہت وسیع تھا، وہ مارکٹ کا ناظر اور محتسب یعنی عوام کے اخلاق کا نگراں بھی تھا۔ علاء الدین اپنے افسران کے علاوہ بذات خود بھی بازار کا حال اور قیمتوں کی صورت حال سے آگاہی حاصل کرتا رہتا تھا، اس کے لئے وہ چھوٹے بچوں اور غلاموں کو خفیہ طریقہ پر سامان خریدنے کے لئے الگ الگ بازاروں میں بھیج دیتا، اور آنے والے سامانوں کا وزن، معیار اور قیمت کی براہ راست واقفیت حاصل کرلیتا، اور اگر ذرا سا بھی قیمت یا وزن میں فرق معلوم ہوتا تو اسی وقت مجرم کو سنگین سزائیں دیتا، اس سختی کی وجہ سے بیوپاری ایماندار ہوگئے تھے، اور ناپ تول میں کمی ختم ہوگئی تھی۔ علاء الدین کی ان اصلاحات کی وجہ سے ملک سے رشوت خوری ختم ہوگئی، بغاوتیں بند ہوگئیں، اشیاء ارزاں ہوگئیں، اور سامانوں کے معیار اور وزن میں راست بازی آگئی۔ البتہ اس کا یہ بھی اثر ہوا کہ امراء کی عیش وعشرت جاتی رہی، خوطوں اور مقدموں کی من مانی اور مالی آسائش گھٹ گئی، لگان کی شرح بڑھنے سے کاشتکاروں پر بھی بوجھ بڑھ گیا، لیکن یہ بوجھ کاشتکاروں پر پہلے بھی تھا، اس کا فائدہ درمیانی لوگ اٹھاتے تھے، اب یہ فائدہ شاہی خزانے کو پہنچنے لگا، اور کاشتکاروں اور عوام کو اشیاء ارزاں دستیاب ہونے لگیں۔

علاء الدین کی سختی اس کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہوگئی، اور بہت سے معاشی ضوابط بھی دم توڑ گئے۔ محمد تغلق نے بھی لگان کی شرح بہت اونچی رکھی، لیکن فیروز تغلق نے کاشتکاروں کو بے انتہاء راحت دے دی، ٹیکس کا بار بالکل ہلکا کردیا، کسانوں کے پرانے قرض کی بہت بڑی رقم معاف کردی، بلکہ غریبوں کی خورد و نوش وعلاج و معالجہ، بے روزگاروں کی ملازمت اور غریب بچیوں کی شادی وغیرہ کے انتظامات

سرکاری آمدنی سے کرائے، ان اقدامات کی وجہ سے رعایا ایک بار پھر خوشحال ہوگئی۔ ابراہیم لودھی کے زمانہ میں اشیاء دوبارہ بہت زیادہ ارزاں ہوگئی تھیں، اور لوگ عہد علائی کو بھول گئے تھے، حالانکہ لودھی دور میں اشیاء کو سستا رکھنے کے لئے سخت سزاؤں کا سہارا نہیں لیا گیا تھا۔

6.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- دہلی سلطنت کا نظم ونسق بنیادی طور پر فوجی استحکام پر مبنی تھا، اور پورے نظام حکومت میں بادشاہ کو محوری حیثیت حاصل تھی، وہ پوری طرح بااختیار اور بڑی حدتک مطلق العنان ہوتا تھا، بادشاہ کی تقرری کے لئے کوئی اصول وضابطہ طے نہیں تھا، اسی لئے تخت نشینی کے لئے بسااوقات فوجی مقابلہ آرائی کی نوبت آجاتی تھی۔
- سلطنت کا نظام اس طرح چلایا جاتا تھا کہ مرکز میں بادشاہ چند وزیروں کو مقرر کردیتا تھا، جو مختلف محکموں کے سربراہ ہوتے، یہ تقرری پوری طرح بادشاہ کی مرضی پر منحصر ہوتی اور اس میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔
- مرکز کے اس انتظام کے علاوہ پوری سلطنت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کردیا گیا تھا، ہر صوبہ کا سربراہ صوبہ دار کہلاتا تھا، اور وہ صوبہ کی حدتک بادشاہ کی طرح تمام محکموں کا سربراہ اعلیٰ ہوتا تھا، صوبہ کے اندر مرکز کی طرح محکمہ ہوتے تھے، صوبہ دار اپنے علاقہ سے لگان وصول کرتے اور امن وقانون کو برقرار رکھتے اور ضرورت پر فوج مہیا کرتے تھے۔
- صوبہ کو پرگنوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر پرگنہ کے اندر کئی گاؤں ہوتے تھے، گاؤں میں محصول کا ذمہ دار پٹواری کہلاتا تھا، اور گاؤں کا سربراہ مقدم اور زمیندار کو خوط کہتے تھے۔
- سلطنت کے نظم ونسق کا اہم ترین حصہ فوج تھی، فوج سوار اور پیدل دونوں ہوتی تھی، بادشاہ ہی فوج کا سربراہ اعلیٰ تھا، لیکن کسی فوج کو بھیجتے وقت وہ کمانڈر مقرر بھی کرتا تھا، عارض ممالک فوج کے انتظامات دیکھتا تھا، فوج میں اعلی نسل کے گھوڑوں کی بڑی اہمیت تھی، فوج کی ایک قسم بادشاہ کی محافظ فوج کی تھی، دوسرے سلطنت کی مستقل فوج تھی جس میں پیدل اور سوار دونوں ہوتے، تیسرے مخصوص سپاہی ہوتے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے۔
- محمد بن تغلق نے دہلی سے دولت آباد تک سات سو میل کی لمبی سڑک بنوائی، جس پر دونوں جانب درخت لگوائے، ان راستوں پر ہر میل کی مسافت پر تین ڈاک چوکیاں بنائی گئیں، ہر ڈاک چوکی میں دس تیز رفتار دوڑنے والے افراد متعین ہوتے، ڈاک پیدل بھی ہوتی اور سوار بھی، ڈاک چوکی پر مسافر کی ضروریات کے سارے انتظامات مہیا کئے گئے تھے۔

6.9 نمونہ امتحانی سوالات

6.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. قطب الدین ایبک نے کس کی وفات کے بعد اپنی سلطنت کا اعلان کیا؟

(a) شہاب الدین غوری (b) بابر (c) اکبر (d) سکندر لودھی

2. دہلی سلطنت کی بنیاد رکھنے والے کس نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

(a) ترک (b) عرب (c) ایرانی (d) سب غلط

3. شیخ نور الدین مبارک غزنوی نے کس بادشاہ کو شرعی فرائض یاد دلائے تھے؟

(a) التمش (b) قطب الدین ایبک (c) سکندر لودھی (d) اکبر

4. مرکز کے عہدوں میں سب سے اہم عہدہ کون سا ہوتا تھا۔

(a) وزیر (b) سربراہ فوج (c) دیوان انشاء (d) دیوان رسالت

5. التمش کا وزیر کون تھا۔

(a) فخر الدین عصامی (b) نصرت خاں (c) مغیث الدین (d) احمد ایاز

6. شاہی فرامین اور اعلانات کا مسودہ تیار کرنا کس کے ذمہ ہوتا تھا۔

(a) وزیر (b) سربراہ فوج (c) دیوان انشاء (d) دیوان رسالت

7. دوسری حکومتوں کے درباروں میں خط و کتابت بھیجنا کس مملکت کے تحت ہوتا تھا۔

(a) وزیر (b) سربراہ فوج (c) دیوان انشاء (d) دیوان رسالت

8. سلطان سے تنہائی میں ربط رکھنے والے افسر کو کیا کہا جاتا تھا؟

(a) امیر حاجب (b) سربراہ فوج (c) امیر دیوان انشاء (d) امیر دیوان رسالت

9. گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ کس سلطان نے جاری کیا۔

(a) علاء الدین خلجی (b) قطب الدین ایبک (c) محمد بن تغلق (d) رضیہ سلطانہ

10. دہلی سے دولت آباد کی طویل شاہراہ کس سلطان نے بنوائی۔

(a) علاء الدین خلجی (b) قطب الدین ایبک (c) محمد بن تغلق (d) رضیہ سلطانہ

6.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. دہلی سلطنت میں بادشاہ کے اختیارات پر روشنی ڈالیے۔
2. حرم شاہی کے انتظامات اوران کے عہدیداران کے بارے میں بتائیے۔
3. دہلی سلطنت میں ڈاک کے نظام کی وضاحت کیجیے۔
4. دہلی سلطنت میں فوج پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے؟
5. صوبائی حکومتوں کا جائزہ لیجیے؟

6.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مرکزی حکومت میں وزراء کی تقسیم اوران کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالیے۔
2. دہلی سلطنت میں پولیس اور جاسوسی کے نظام کی تفصیل بیان کیجیے۔
3. علاءالدین خلجی کی معاشی اصلاحات کا تفصیلی تذکرہ کیجیے۔

6.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. آب کوثر : شیخ محمد اکرام، فرید بک ڈپو، دہلی
2. عہد وسطیٰ کا ہندوستان، حصہ اول : پروفیسر ستیش چندر، قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان، دہلی 2003ء اردو ترجمہ: عزیزالدین حسین
3. ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک : سید صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2012
4. بزم مملوکیہ : سید صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 1999ء
5. خلجی خاندان : کے ایس لال، قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان، دہلی 1998، اردو ترجمہ، یسین مظہر صدیقی
6. مختصر تاریخ ہند : سید ابوظفر ندوی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2006
7. "A Comprehensive History of Medieval India: Salma Ahmed Farooqui, Pearson:2011

اکائی 7: دہلی سلطنت میں نظام عدل، سماجی اور مذہبی حالات

اکائی کے اجزا:

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 دہلی سلطنت میں نظام عدل

7.2.1 سلطان کی ذات

7.2.2 قاضی القضاۃ اور صدر الصدور

7.2.3 صوبوں اور شہروں میں قضا

7.2.4 قضاء کے دوسرے عہدیداران

7.2.5 شریعت کا نفاذ

7.3 سماجی حالات

7.3.1 امراء کا طبقہ

7.3.2 تاجروں کا طبقہ

7.3.3 صنعت پیشہ طبقہ

7.3.4 دیہی زندگی

7.3.5 اہل علم وفضل کا طبقہ

7.3.6 غلاموں کا طبقہ

7.4 مذہبی حالات

7.4.1 سماج پر اسلامی تہذیب کے اثرات

7.5 اکتسابی نتائج

7.6 نمونہ امتحانی سوالات

7.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

7.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

7.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

دہلی سلطنت قائم کرنے والے حکمراں افغانستان کے علاقوں سے آئے تھے، بغداد کی عباسی حکومت اس وقت دم توڑ رہی تھی اور علم و فن کے نئے مراکز بغداد کے بعد دنیا کے کئی شہروں میں قائم ہوگئے تھے۔ عرب کے مشرق میں ایسے کئی مراکز وجود میں آگئے تھے جہاں اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی علوم و شریعت کی شاندار بزمیں آراستہ ہورہی تھیں۔ ایران و افغانستان کے علاقوں میں یہ رونق برپا ہوچکی تھیں اور جب ان کوہ و دمن کے جیالوں نے ہندستان کی سرزمین کو اپنا وطن بنایا تو وہ اپنے ساتھ اپنے مذہب اور قانون و شریعت کی شاندار روایات بھی لیتے آئے۔ یہاں انہوں نے حکومت دہلی کی بنیاد رکھی اور نظم و نسق کو استوار کیا تو اس کے ساتھ حکمرانی کے اہم ترین فریضہ کو پورا کرتے ہوئے قضاء کا نظام قائم کیا، تاکہ سلطنت کے ہر فرد کو انصاف مل سکے۔ دہلی کے سلاطین عدل و انصاف کی فراہمی کے معاملہ میں بڑے فکر مند اور سرگرم رہے، انہوں نے عدل کے محکمے قائم کئے اور مرکزی شہروں سے لے کر صوبائی شہروں، پرگنوں اور گاؤں تک نظام عدل و قضاء کا جال بچھادیا، قضاء کے نظام کو پختہ اور آسان بنانے کے لئے کئی طرح کے تجربات کئے، اور نظام عدل پر گہری نظر رکھی، انصاف کے کٹہرے میں انھوں نے ایک عام کسان اور غریب انسان کو وقت کے شہزادوں اور امیروں بلکہ بسا اوقات خود اپنے برابر کھڑا کیا اور بے لاگ انصاف فراہم کیا اور اس کو یقینی بنانے کے لئے قضاء کا پورا نظام قائم کیا۔ سلاطین دہلی کی نظر اس بات پر بھی رہی کہ ایک غریب انسان آسانی سے انصاف پاسکے اور امیروں یا طاقت وروں کا خوف اسے انصاف سے محروم نہ کرسکے۔ اس کے لئے انہوں نے نہ صرف اپیل کی عدالتیں قائم کیں، بلکہ اپنے درباروں میں مظلومین کی رسائی کو بالکل سہل و آسان بنادیا، جس کے نتیجہ میں ظلم کا سدباب ہوا اور انصاف کا دور دورہ ہوا۔ قضاء کا محکمہ دہلی سلطنت کے چار اہم وزارتوں میں سے ایک تھا اور بادشاہ براہ راست اس پر نگرانی رکھتا تھا اور قاضی کی معاونت کے لئے مفتیوں اور دیگر معاونین کا پورا عملہ ہوتا تھا۔

دہلی سلطنت کا سماج اس دور کے رائج سماجی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ عہد وسطی میں سماجی نظام فرق مراتب پر مبنی تھا، جیسا کہ آج بھی ہندوستان کے اندر ہے، مسلم حکمراں اپنا اسلامی تصور ضرور رکھتے تھے جس میں سماجی فرق مراتب کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے اور محمود و ایاز کو نہ صرف خانہ خدا میں بلکہ سماج کے عام احوال میں بھی ایک درجہ دیا گیا ہے، لیکن ہندوستان کے رائج حالات کا اثر مسلم حکمرانوں پر بھی رہا، چنانچہ بادشاہ اور امراء کا طبقہ اپنی علاحدہ شناخت رکھتا تھا، درمیانی درجہ کا ملازمت پیشہ طبقہ اس سے کمتر درجہ کا حامل تھا، علماء اور ارباب فضل

کے طبقہ کو مخصوص سہولیات اور حیثیت حاصل تھیں، غلاموں کا طبقہ عہد وسطی کے سماج کا لازمی عنصر تھا اور ان کے اپنے مخصوص احوال تھے، گاؤں میں آباد زمینداروں کا طبقہ علاحدہ تھا اور ان کے بعد کاشتکاروں اور کسانوں کا طبقہ تھا، اہل ہنر اور تجارت پیشہ افراد کا اپنا مخصوص طبقہ تھا، اس طرح دہلی سلطنت کے اندر سماجی سطح پر ہمیں متعدد سماجی طبقات اور ان کے مخصوص احوال نظر آتے ہیں۔

مذہبی احوال کی نوعیت کچھ یوں تھی کہ دہلی سلطنت مسلم سلطنت کہلاتی تھی، اور کئی حکمراں ذاتی زندگی میں بے حد دیندار رہے جیسے التمش، بلبن اور ناصر الدین محمود وغیرہ۔ کئی حکمرانوں نے سرکاری سطح پر مذہب وشریعت کے ساتھ دلچسپی لی، جیسا کہ ہم محمد بن تغلق، فیروز تغلق اور سکندر لودھی کے زمانوں میں دیکھتے ہیں، لیکن اتنی بات صاف ہے کہ سیاست اور حکومت کو مکمل طور پر شریعت کے تابع رکھنے کی کوشش اس عہد میں نظر نہیں آتی ہے۔ التمش اور بلبن نے اس کا اظہار بھی کیا کہ معاملات حکومت ملکی مصالح کے مطابق چلائے جائیں گے، بلکہ علماء نے اس ضمن میں اپنے شکوہ آمیز احساسات رکھے تو انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔ جلال الدین خلجی نے اپنی حکومت میں دین وشریعت سے وابستگی کی لاچارگی کھلے لفظوں میں بیان کی ہے اور علاء الدین خلجی اور کیقباد کا عہد تو بڑی حد تک موجودہ عہد کے سیکولر نظام کے مطابق رہا۔ ذیل کی سطور میں آپ تفصیل کے ساتھ دیکھیں گے کہ دہلی سلطنت کے حکمرانوں نے قضاء کے نظام کو کس طرح نافذ کیا ، اور اس عہد کے سماجی اور مذہبی احوال کیسے رہے؟

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ یہ جان سکیں گے کہ نظام عدل وانصاف کسی بھی مستحکم حکومت کی بنیادوں میں شامل ہوتا ہے۔ سلاطین نے نہ صرف عدل کے نظام از سر نو قائم کیا اور مرکز سے لے کر گاؤں کی سطح تک اس کو یقینی بنایا۔ سلاطین نے عوام کی سماجی زندگی سے بھی دلچسپی لی۔ ان کے اخلاق وکردار پر بھی نظر رکھی گئی تاکہ سماج میں امن وہم آہنگی برقرار رہے۔ سلاطین دہلی نے اسلامی شریعت کے نفاذ پر بھی توجہ دی۔ اسلامی علوم کی تدریس واشاعت اور علماء وفقہا کی قدردانی سے دلچسپی لی گئی۔ دہلی اور دوسرے شہروں میں خانقاہیں قائم تھیں جس سے لوگ استفادہ اٹھاتے۔ اس اکائی کو پڑھ کر آپ عدل وانصاف کا نظام کن بنیادوں پر قائم تھا اور دہلی سلطنت کا سماج کیسا تھا، کون کون سے طبقات اس کے اندر رہتے تھے، ان کی حالت کیا تھی؟ ان سب سے آگاہی حاصل ہوگی۔

7.2 دہلی سلطنت میں نظام عدل

سلاطین دہلی نے خصوصیت کے ساتھ عدل وانصاف کی فراہمی پر توجہ دی، اور اسے آسان بنانے کی کوشش کی، اس شعبہ کی اہمیت ہی کی وجہ سے حکمرانوں نے باضابطہ اس کے لئے وزارت قائم کی اور مرکزی سطح سے لے کر صوبوں، پرگنوں اور قصبوں کی سطح تک عدل کا محکمہ قائم کیا اور اس کے لئے افراد مقرر کئے۔ نظام عدل کی نوعیت درج ذیل طریقہ پر تھی:

7.2.1 سلطان کی ذات

دہلی سلطنت میں نظام عدل کچھ اس طرح قائم تھا کہ سلطان کی ذات ہی عدل وانصاف کا سرچشمہ تھی، اور وہ خود انصاف فراہم

کرنے میں دلچسپی لیتا تھا۔ ہفتہ میں مخصوص دنوں کے اندر سلطان کا دربار لگتا، کبھی کبھی ہفتہ میں دو یا تین بار دربار لگتے۔ ان درباروں میں بادشاہ براہ راست لوگوں کے مقدمے سنتا اور مجلس کے اندر ہی فیصلہ صادر کر دیتا، بادشاہ کے دربار کی یہ عدالت کبھی ابتدائی مقدمے بھی طے کرتی، یعنی بادشاہ کے سامنے ہی مقدمہ پیش ہوتا اور کارروائی کے بعد فیصلہ کر دیا جاتا اور کبھی بادشاہ کا دربار عدالت اپیل کا کام کرتا، یعنی کسی فریق کے خلاف جو فیصلہ کسی قاضی کی عدالت میں ہو چکا ہوتا، وہ فریق مقدمہ کے خلاف اپیل پیش کرتا، سلطان محمد بن تغلق ہفتہ میں ہر شنبہ کو دربار لگاتا تھا، اور وہاں اذن عام ہوتا تھا کہ مظلومین اپنی فریاد سنائیں، اور وہ بلا تکلف بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے حالات بیان کرتے اور اثنائے بیان کسی کو روکنے کی مجال نہیں تھی، حالات سن کر سلطان خود فرمان صادر کر دیتا۔ ابن بطوطہ جو دہلی کا قاضی رہ چکا ہے، بیان کرتا ہے کہ محمد بن تغلق ہفتہ میں دو دفعہ پیر اور جمعرات کو انصاف رسانی کی غرض سے دیوان خانہ کے سامنے ایک میدان میں بیٹھتا تھا اور شکایت پیش کرنے والوں کو عام اجازت ہوتی تھی۔ سلطان کی عدل گستری کا یہ عالم تھا کہ اس نے اجازت دے رکھی تھی کہ خود اس کے خلاف بھی استغاثہ داخل کیا جا سکتا ہے۔ ابن بطوطہ نے ایسے تین چشم دید واقعات لکھے ہیں جن میں سلطان محمد بن تغلق خود ماخوذ ہو کر قاضی کے سامنے حاضر ہوا۔

سلطان کے دربار میں اس کی مدد کے لئے مفتی بھی مقرر ہوا کرتے تھے، جو مذہبی معاملات میں اس کی مدد کرتے تھے، سلطان محمد بن تغلق نے شاہی محل کے اندر چار مفتی مقرر کر رکھے تھے، کوئی فریادی آتا تو سلطان ان مفتیوں کو بلا کر مشورے کرتا اور ان کی روشنی میں فیصلے کرتا۔

عدل وانصاف کے معاملہ میں دہلی سلطنت کے بادشاہ ابتداء سے ہی سرگرم رہے، سلطان قطب الدین ایبک جو اس سلطنت کا بانی ہے، عدل وانصاف کا بے حد خیال رکھتا تھا، اس کے لشکر میں مختلف نسلوں اور مذہبوں کے لوگ تھے، لیکن کسی کو مجال نہ تھی کہ کسی پر ظلم کرے یا آبادی میں سے کسی کے گھر یا جنگل سے کسی کا کوئی سامان اٹھالے۔ عدل پروری کی اسی روش کو التمش نے جاری رکھا اور اسے اور مضبوط بنایا، اس نے اپنے محل کے ساتھ زنجیر لٹکا رکھی تھی اور اعلان کر دیا تھا کہ جو مظلوم ہو وہ رنگین کپڑا پہن کر آئے تاکہ دور سے پہچان لیا جائے۔ رضیہ سلطان اور ناصر الدین محمود کے زمانوں میں عدل وانصاف کے اسی معیار کو برقرار رکھا گیا۔ بلبن دہلی سلطنت کا نامور اور طاقتور بادشاہ گذرا ہے، اس نے عدل پروری کے نظام کو اور بھی مستحکم اور مضبوط بنایا۔ بلبن کے نزدیک بادشاہ کا بڑا فرض عدل وانصاف کی ترویج تھا، اس کا وہ سختی سے اہتمام کرتا تھا۔ اس کے زمانہ میں جن امراء نے غریبوں پر ظلم کئے بلبن نے انہیں سخت سزائیں دیں۔ انصاف کے معاملہ میں وہ اس قدر سخت تھا کہ اپنے بھائیوں، اپنے بچوں، اپنے ساتھیوں اور اپنے ملازموں کے ساتھ بھی کوئی مروت نہیں کرتا تھا۔ انصاف کو یقینی بنائے رکھنے کے لئے پورے ملک میں اس نے جاسوس مقرر کر دئے تھے تاکہ کسی پر زیادتی ہو تو اس کی خبر بادشاہ کو مل جائے۔ ایک مرتبہ بدایوں کے گورنر نے جو بلبن کا انتہائی قابل اعتماد تھا، نشہ کی حالت میں اپنے ایک ملازم کو کوڑے مار کر ہلاک کر دیا، ملازم کی بیوہ نے انصاف کی درخواست کی، بلبن نے حکم دیا کہ اس گورنر کو بھی کوڑے مار مار کر ہلاک کیا جائے۔ اور اس جاسوس کو بھی عوام کے سامنے پھانسی دے دی گئی جس نے اس واقعہ کی اطلاع بلبن کو نہیں دی تھی۔ انصاف کے ایسے متعدد واقعات بلبن کے زمانہ میں پیش آئے جن کی

وجہ سے بلبن اپنے عوام میں نہایت مقبول اور گرویدہ ہو گیا تھا۔ علاء الدین خلجی بھی بلبن ہی کی طرح عدل وانصاف میں بڑا سخت تھا، وہ اس کا بھی خیال رکھتا تھا کہ قاضی سے کوئی نازیبا بات نہ ہونے پائے۔ ایک مرتبہ اس نے ایک قاضی کو شراب پینے کے جرم میں موت کی سزا دی تھی اس کے دور میں سزائیں بہت سخت تھیں اور پولیس اور جاسوس کا نظام پوری مملکت میں مضبوطی سے جاری تھا، فیروز شاہ کا دور جہاں خوشحالی و بہبودی کے لئے مشہور تھا، اس کی عدل پروری کی وجہ سے امن و امان بھی اسی طرح عام تھا، اس کے عہد میں عدل و انصاف کی حکومت تھی، کسی شخص کو بھی کسی دوسرے پر ظلم و تعدی کرنے کا حق نہ تھا، وہ ان معاملات میں اسلام کے شرعی قوانین کو اہمیت دیتا تھا، سزائیں بھی وحشیانہ نہ تھیں، بلکہ شریعت کے مطابق تھیں، دہلی سلطنت کے آخری حکمراں خاندان کا بادشاہ سلطان سکندر لودھی بے انتہا عدل پرور تھا، وہ اپنی رعایا کے احوال سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا اور کسی طرح کے ظلم وچیرہ دستی کو پسند نہیں کرتا تھا، مظلوموں کی داد رسی کے لئے پورا اہتمام کرتا تھا اور اس میں بڑی ہوشمندی کا ثبوت دیتا، اس نے خود اپنا معمول بنا رکھا تھا کہ روزانہ مغرب کے بعد حرم میں ایک گھنٹہ گذار کر خلوت خاص میں آجاتا اور وہاں لوگوں کے استغاثے سنا کرتا۔ اس نے ایک قاضی کے علاوہ بارہ علماء بھی صرف مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کر رکھے تھے، اس نے وکیل کو حکم دے رکھا تھا کہ عدالت کے اندر پہر رات گئے بیٹھا رہے کہ شاید اس وقت تک کوئی فریادی آجائے۔ سکندر لودھی کے انصاف پسندی کے بہت سے قصے مشہور ہیں، سکندر لودھی مذہبی انسان تھا، اس نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ کوئی کام خلاف شریعت نہ ہونے پائے، وہ عدل و انصاف اور فیصلوں میں علماء سے مشورے کیا کرتا تھا اور اسلامی معیار کے مطابق سب کے ساتھ مساویانہ طور پر عدل وانصاف کرتا، اسی لئے وہ امن وامان قائم رکھنے میں کامیاب رہا اور اس کے عہد میں خوشحالی رہی۔

7.2.2 قاضی القضاۃ اور صدر الصدور

نظام عدل کا سربراہ بادشاہ کے بعد قاضی القضاۃ ہوتا تھا اس کی تقرری خود بادشاہ کرتا تھا اور بادشاہ اس کو تبدیل بھی کر دیا کرتا تھا۔ قاضی القضاۃ کی حیثیت چیف جسٹس کی ہوتی جو پوری سلطنت کے عدلیہ کا سربراہ ہوتا، اس منصب پر ایسے شخص کو مقرر کیا جاتا تھا جو اپنے علم اور تقوی میں ممتاز ہو، قاضی القضاۃ کی اپنی بھی مجلس عدالت ہوتی جہاں وہ مقدمات سنتا اور نچلی عدالتوں سے آنے والی اپیلوں کی سماعت کرتا تھا۔ صوبوں کے لئے قاضیوں کی تقرری اسی قاضی القضاۃ کے ذریعہ ہوتی تھی اور وہ ان پر نظر رکھتا تھا، قاضی القضاۃ کا عہدہ دہلی سلطنت میں انتہائی اہمیت کا حامل تھا، بادشاہ کے بعد پہلا وزیر تو وزیر خاص ہوتا تھا، دوسرے نمبر پر قاضی القضاۃ ہی کا عہدہ اہمیت رکھتا تھا، اسے قاضی ممالک بھی کہا جاتا تھا۔

قاضی القضاۃ ہی کی طرح ایک عہدہ صدر الصدور کا تھا، یہ گویا وزارت مذہبی امور تھی، اس کے ذمہ مذہبی معاملات، جمعہ وعیدین کا قیام، علماء و فضلا کے لئے مدد معاش کی فراہمی، محتسبین اور دوسرے عہدیداروں کی تقرری وغیرہ تھی۔ کبھی کبھی یہ دونوں عہدے ایک ہی شخص کے سپرد ہوتے تھے اور بسا اوقات دونوں کے لئے علاحدہ تقرری ہوتی تھی۔ صدر الصدور اپنے نائبین صوبوں میں مقرر کرتا جو صدر صوبہ کہلاتے تھے، یہ صوبائی سطح پر مذہبی امور کے سربراہ قرار پاتے تھے۔ عہد سلطنت کا مشہور مؤرخ و عالم قاضی منہاج سراج جرجانی دونوں عہدوں پر فائز رہا۔ بہرام شاہ نے اسے دہلی کی قضائت کے ساتھ صدر الصدور مقرر کیا تھا، سلطان ناصر الدین نے صدر جہاں کے نام

سے عہدہ قائم کیا اور اس پر قاضی منہاج کو مقرر کیا، اس نے اس عہدہ کو قاضی القضاۃ سے اونچا بنا دیا تھا، کیونکہ صدر جہاں دیوان مظالم اور مذہبی امور دونوں کا نگراں تھا۔ علاء الدین خلجی نے دونوں عہدے ایک ہی شخص کے سپرد کر دئے تھے، اس نے تخت نشیں ہونے کے بعد قاضی صدر الدین عارف کو قضائے مملکت کی مسند سپرد کی تھی جو قاضی منہاج الدین سراج کے نواسے تھے اور مضبوط کیرکٹر کے حامل اور شہر والوں کے مزاج سے اچھی طرح آشنا تھے۔ فیروز تغلق کے دور میں یہ دونوں عہدے پھر سے علاحدہ کر دئے گئے تھے۔ دہلی سلطنت کے عہد میں جن لوگوں کو قضائے ممالک کا منصب عطا کیا گیا تھا۔ ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

قاضی وجیہ الدین کاشانی، قاضی ناصر الدین، قاضی اختیار الدین، قاضی ملک ضیاء الدین، محمد جنیدی، قاضی جلال الدین کاشانی، قاضی شمس الدین، قاضی منہاج السراج، قاضی عماد الدین اشفور قانی، قاضی شمس الدین بہرائچی، قاضی ملک نظام الدین، قاضی مغیث الدین، قاضی حمید الدین ملتانی، قاضی ضیاء الدین قاضی خاں، قاضی کمال الدین، قاضی جلال الدین، قاضی ضیاء الدین، قاضی سماء الدین، قاضی میاں بھوا۔

7.2.3 صوبوں اور شہروں میں قضا

قاضی القضاۃ کے ذریعہ پوری مملکت کے اندر ہر صوبے میں قاضی کی تقرری کی جاتی تھی، یہ قاضی صوبہ کہلاتے تھے، اگر صوبہ کے لئے صدر مقرر ہوتے تو صدر صوبہ کہلاتے تھے۔ قاضی صوبہ کے تحت صوبہ کے تمام پرگنوں میں قاضی مقرر ہوتے تھے، جو پرگنہ کی سطح پر مقدمات کی سماعت کرتے اور فیصلے کرتے تھے، اسی طرح صدر صوبہ کے ذریعہ پورے صوبے کے مذہبی معاملات دیکھے جاتے تھے۔ پرگنہ کئی شہروں اور گاؤں پر مشتمل ہوتا تھا، گاؤں کے معاملات کو اسی طرح باقی رکھا گیا تھا جیسا وہ پہلے سے چلا آرہا تھا۔ یہ عہد سلطنت کے بادشاہوں کی پالیسی تھی کہ گاؤں کے نظام کو نہ چھیڑا جائے، چنانچہ وہاں پنچایت کے ذریعہ معاملے حل ہو جایا کرتے تھے۔

صوبوں اور پرگنوں کے اندر قاضیوں کے ساتھ ان کی معاونت کے لئے پوری ٹیم ہوا کرتی تھی، صوبوں کے اندر قاضی کے ساتھ مفتی بھی مقرر ہوتے تھے جو شرعی معاملات میں قاضی کو مشورہ دیا کرتے تھے، اگر قاضی خود ہی شرعی احکام کا ماہر ہوتا تو اسے مفتی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، اگر مقدمہ غیر مسلموں سے متعلق ہوتا تو پنڈٹ قاضی کی مدد کیا کرتے تھے، گاؤں کی سطح پر غیر مسلموں کے فیصلے خود ان کے مذہب کے مطابق اور ان ہی کے ذریعہ طے ہو جایا کرتے تھے۔

7.2.4 قضاء کے دوسرے عہدیداران

قاضیوں کے ساتھ ایک عہدیدار میر داد کے نام سے ہوتا تھا، یہ عہدہ بڑے دبدبہ والے شخص کو سپرد کیا جاتا تھا اور اس کا کام ایسے امراء اور بڑے افراد کو عدالت میں حاضر کرنا ہوتا تھا جن کے بارے میں خدشہ ہوتا کہ وہ اپنے مقام و مرتبہ کی وجہ سے حاضر عدالت نہیں ہوں گے۔ اسی طرح ایک عہدہ داد بک کا تھا جس کی حیثیت آج کل کے مجسٹریٹ کی ہوتی تھی۔ سکندر لودھی نے ایک عہدہ میر عدل کے نام سے قائم کیا تھا، جو صرف دیوانی کے معاملات کی سماعت کرتا تھا۔ فوج چونکہ لوگوں کی بڑی تعداد پر مشتمل ہوا کرتی تھی اور اکثر یہ متحرک رہتی اور مہینوں اور برسوں سفر کرتی، ایسی فوج کے اندر بھی مقدمات پیش آتے تھے اور وہاں بھی عدالت کا انتظام رکھا گیا تھا، چنانچہ فوج کے

لئے قاضی کی تقرری ہوتی تھی' یہ قاضی عسکر کہلاتے تھے، اور ان کا کام لشکر کے اندر کے مقدمات کو سننا اور فیصلہ کرنا ہوتا تھا۔ دہلی شہر جہاں مرکزی حکومت تھی اور بادشاہ خود رہتا تھا، وہاں کے لئے بھی مخصوص طور پر قاضی مقرر کیا جاتا تھا، چنانچہ مشہور سیاح ابن بطوطہ جو محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی آیا تھا، اسے سلطان نے شہر دہلی کا قاضی مقرر کیا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مسلک کے علماء بھی قاضی مقرر ہوسکتے تھے، کیونکہ دہلی سلطنت میں فقہ حنفی کا رواج تھا اور ابن بطوطہ فقہ مالکی سے وابستہ تھا۔ قاضی کا بڑا احترام کیا جاتا اور وہ بڑے بڑے امراء کو سزا دے سکتا تھا۔ شہزادے، وزراء، فوج کے سردار اور دوسرے اہم عہدیدار بھی ایسے مقدمات فیصل کر دیتے جن میں بہت زیادہ قانون دانی کی ضرورت نہ ہوتی، مال کے مقدمات کی سماعت مقطع یا دیوان کر دیا کرتا تھا، ان میں قاضی کے پاس جانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ فیصلے بہت جلد ہو جایا کرتے تھے اور مظلومین کے لئے انصاف پانا بہت آسان تھا۔ عام طور پر عدالتی کارروائی جلد مکمل کر کے مجلس ہی میں فیصلہ سنا دیا جاتا، اور حق دار کو حق ملتا اور مجرم کو سزا۔ محکمہ عدل کے اس سستے، جلد اور مساویانہ انصاف کے نظام کی وجہ سے دہلی سلطنت میں عدل کی فرمانروائی تھی۔

7.2.5 شریعت کا نفاذ

عدل وانصاف کا یہ نظام پوری طرح اسلامی شریعت کے مطابق جاری کیا گیا تھا۔ دہلی سلطنت کے عہد میں دیگر وزارتوں کے مقابلہ میں محکمہ عدل کی وزارت ہی بڑی حد تک شریعت کے مطابق چلائی گئی تھی۔ قاضیوں کی تقرری ان کی شرعی قابلیت اور فقہی صلاحیت کی بنیاد پر ہوتی تھی اور مرکز سے لے کر صوبوں اور پرگنوں تک مقرر ہونے والے قاضی احکام شریعت کی روشنی میں فیصلے کیا کرتے تھے۔ شرعی احکام کی تابعداری کی غرض سے ہی قاضیوں کے ساتھ مفتیوں کی تقرری کی جاتی تھی، خود بادشاہ اپنی معاونت کے لئے قاضیوں کو رکھتا تھا' البتہ بادشاہ کی ذات محکمہ عدل کی آخری منزل تھی۔ لوگوں کے مقدمات میں اس کے فیصلے شریعت کے مطابق ہوا کرتے تھے اور فیصلوں سے پہلے عدالتی کارروائی یعنی ثبوت اور گواہیاں دیکھی جاتی تھیں اور ان کے بعد ہی فیصلہ ہوتا تھا۔ البتہ سزاؤں کے نفاذ میں بادشاہ ہمیشہ شریعت کا پابند نہیں رہتا تھا، بالخصوص ایسے معاملات جو سیاسی بغاوت یا سیاسی اختلاف کی نوعیت کے ہوتے یا ایسے جرائم جن سے بادشاہ کے احکام کی خلاف ورزی کی جاتی، ان میں متعدد بادشاہوں کی سزائیں بے انتہا سخت تھیں اور وہ شریعت کے مطابق نہیں کہی جاسکتی ہیں۔ علاءالدین خلجی اور محمد بن تغلق نے سزاؤں میں سختی کی روش اختیار کی تھی، لیکن وہیں قطب الدین ایبک، التمش، ناصر الدین محمود، بلبن، فیروز تغلق، بہلول اور سکندر لودھی وغیرہ سلاطین نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ عدل کا اعلی معیار برقرار رہے اور ان کا کوئی کام خلاف شریعت نہ ہو۔ ان بادشاہوں کی انصاف پروری اور عدل گستری کے شاندار قصے تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

7.3 سماجی حالات

دہلی سلطنت کا سماجی نظام عہد وسطی میں جاری سماجی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ حکمراں اگرچہ مسلمان تھے اور اسلام میں سماج کے اندر ذات وبرادری یا مالی حیثیت کی بنیاد پر فرق مراتب نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے عہد وسطی میں سماج کے اندر یہ فرق مراتب موجود تھا۔

دراصل عہد وسطی کا سماج کئی طبقوں پر مشتمل تھا، حکمراں اور امراء کا طبقہ بیشتر مسلمانوں کا تھا۔ ملک کی اکثریت ہندوؤں کی تھی، ان میں بھی امراء اور حکمرانی کرنے والے خاندانوں کے افراد تھے، ہندو سماج کے اندر اونچ نیچ اور برادری کے طبقات پہلے سے موجود تھے۔ گاؤں کے اندر دو طرح کے لوگ تھے، ایک طبقہ کاشتکاروں اور کسانوں کا تھا جن کی محنت پر ملک کی معیشت کا انحصار تھا۔ دوسرا طبقہ زمینداروں اور گاؤں کے سرداروں کا تھا، ان ہی میں سے محصلین ہوتے جو گاؤں سے لگان وصول کرتے تھے۔ سماج کے اندر تاجروں کا ایک طبقہ تھا جو مختلف اشیاء کی تجارت انجام دیتا تھا، یہ لوگ اشیاء تجارت کی درآمد برآمد سے بھی جڑے ہوئے تھے۔ عہد سلطنت کے سماج کا ایک اہم عنصر غلاموں کا تھا، اس دور میں دنیا کے بیشتر حصوں میں غلاموں اور باندیوں کی تجارت جاری تھی، اس کے لئے غلاموں کو پکڑنے اور انہیں اچھی تعلیم وتربیت سے آراستہ کرکے اونچی قیمتوں پر فروخت کرنے کا رواج تھا۔ ایسے غلام اپنی قابلیت کی وجہ سے غلامی سے نکل کر امراء کی صف تک ہی نہیں پہنچتے بلکہ تخت حکومت پر بھی بیٹھتے تھے، دہلی سلطنت کا آغاز کرنے والے سلاطین بھی غلام ہی تھے، جو اپنی قابلیت اور صلاحیت کے بل بوتے پر ہندوستان کے بادشاہ بنے تھے۔

7.3.1 امراء کا طبقہ

سماجی زندگی میں سب سے اہم اور باحیثیت طبقہ امراء کا تھا، حکمراں طبقہ بھی ان ہی میں سے ہوتا تھا۔ شروع میں ترکوں نے حکومت قائم کی تو امراء بھی اسی نسل کے لوگ تھے، پھر جب حکومت ترک نسل سے نکل کر خلجی خاندان میں آئی تو لوگوں کے اس احساس کو تقویت ملی کہ وہ بھی امراء کے طبقہ میں شامل ہوسکتے ہیں۔ حقیقت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی، چنانچہ عہد وسطی کے اس سماج میں ایسے نمونے ملتے ہیں کہ معمولی سطح سے اٹھ کر لوگ امراء کی صف میں شامل ہوگئے۔ فوجی قابلیت اور اعلی صلاحیت کے بل بوتے پر ایسی ترقی ممکن تھی۔

امراء اور حکمراں خاندان کا طبقہ حکومت کے اعلی عہدوں پر فائز ہوتا تھا، سماج میں ان کو اونچی حیثیت حاصل تھی، ان کے پاس مالی وسائل بھی بہت زیادہ تھے، اور وہ بڑے عیش و آرام کی زندگی گذارتے تھے۔ عام طور پر امراء تین درجوں میں تقسیم تھے: کچھ خان تھے جو سب سے اعلی رتبہ تھا، اس کے بعد ملک، پھر امیر ہوتے تھے۔ یہ تقسیم بہت زیادہ نمایاں نہیں ہوتی تھی، حکومت اور فوج کے بڑے عہدے ان ہی لوگوں کے پاس ہوتے تھے۔ التمش نے ایسے چالیس امراء کی جماعت بنائی تھی جو حکومت کے کاروبار کو سنبھالنے میں اس کے مددگار ہوتے تھے، یہ جماعت چہلگانی کہلاتی تھی۔ التمش کے بعد سربراہ حکومت کی تعیین میں ان امراء کا بڑا دخل تھا۔ بلبن بھی انہی چالیس امراء میں سے ایک تھا اور اس جماعت کی طاقت و اہمیت سے وہ واقف تھا، چنانچہ جب وہ بادشاہ بنا تو اپنی حکومت کی مضبوطی کے لئے اس نے امراء کی یہ جماعت توڑدی، لیکن سماج کے اندر امراء باقی رہے، اور قابل لوگوں کو ان کے کارناموں پر خان وغیرہ کے خطابات ملتے رہے۔ مختلف مناسبتوں میں اور فتوحات وغیرہ کے موقعوں پر ان امراء کو بیش قیمت تحائف ملتے تھے۔ یہ امراء بھی بادشاہ کے دربار میں قیمتی تحائف ونذر پیش کرتے تھے، امراء کے محلات، سامان عیش و راحت اور ٹھاٹھ باٹھ بادشاہ کے نقش قدم پر ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض کو امتیازی حیثیت کے اظہار کے لئے کچھ علامتیں اور نشان وغیرہ بھی عطا ہوتی تھیں۔ جیسا کہ کہا گیا، امراء کی اس حیثیت تک پہنچنے کے لئے کسی نسل کی قید نہ تھی، لوگ اپنی صلاحیت و قابلیت کے ذریعہ اس مقام کو حاصل کرلیتے تھے۔

امراء کی صف میں غیر مسلم اور ہندو بھی تھے اور انہیں بھی اعلی سماجی حیثیت اور حکومت میں عہدے حاصل تھے۔ دہلی حکومت کے آغاز کے وقت راجپوت ہندوستان کے کئی علاقوں میں حکومت کر رہے تھے، آہستہ آہستہ ایسے بیشتر علاقے دہلی سلطنت میں شامل ہوگئے۔ لیکن راجستھان اور آس پاس کے علاقوں میں کئی جگہ ان کی حکومتیں باقی تھیں، کچھ جگہوں پر وہ دہلی سلطنت کے باجگذار کے طور پر تھے، اور مرکز کو متعینہ خراج دے کر اپنی حکومت میں آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے، ان کے پاس فوجیں ہوتیں اور نہایت شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گذارتے تھے۔ اونچی ذات کے یہ ہندو اور برہمن وغیرہ خود دارالسلطنت دہلی میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ رہتے تھے، حکومت ان کو اعلی عہدے دیا کرتی تھی، قطب الدین ایبک کی فوج میں ہندو افسر اور سپاہی تھے۔ بلبن اور علاء الدین کے عہد میں ہندو سرداروں کا اقتدار کافی بڑھ گیا تھا' حتی کہ علاء الدین نے ان کی بغاوت کے اندیشہ سے ان کی طاقت توڑنے کی کوشش کی اور مسلم امراء کے ساتھ ہندو سرداروں پر بھی سختی اور پابندی نافذ کی، لیکن محمد بن تغلق کے عہد میں ہندو سردار اور بھی طاقتور ہوگئے تھے، وہ صوبوں کے گورنری اور محکمہ مال کے اعلی عہد ایدار مقرر ہونے لگے۔ ان کے اثرات اتنے زیادہ ہوگئے تھے کہ لوگ ان پر رشک وحسد کرتے تھے۔ فیروز شاہ کے محبوب ہم جلیسوں میں ہندو سردار بھی شامل تھے، مؤرخین نے ہندو سرداروں اور امیروں کی شاندار زندگی، عیش و عشرت اور مقام وعظمت کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے، جن کے یہاں مسلمان بھی نوکر ہوتے تھے اور جن کے دروازوں پر مسلمان غرباء بھیک مانگتے تھے۔ برنی نے فتاوی جہانداری میں لکھا ہے کہ ہندو دار السلطنت میں بھی بڑے بڑے مکانات محلوں ہی کی طرح بناتے ہیں، وہ کمخواب کے لباس پہنتے ہیں، عربی گھوڑوں کی سواری کرتے ہیں، جن پر چاندی اور سونے کا ساز ہوتا ہے اور ان کی عظمت طرح طرح سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ عیش وتنعم کی زندگی گذارتے ہیں۔

7.3.2 تاجروں کا طبقہ

ہندوستان بنیادی طور پر زراعتی ملک تھا، لیکن یہاں قدیم زمانہ سے تجارت کا رواج رہا، دہلی سلطنت کے قیام کے بعد وسط ایشیا اور عرب ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی تعلقات میں مزید مضبوطی اور وسعت آگئی اور اشیاء تجارت کی درآمد برآمد بڑھ گئی، سلاطین دہلی نے بھی اس جانب پوری توجہ دی اور سہولیات بہم پہنچائیں، محمد بن تغلق نے دہلی سے دیوگیری تک سات سو میل کی لمبی شاہراہ تیار کرائی جس پر دونوں جانب درخت لگوائے اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر سرائے بنوائے جہاں مسافروں کے ٹھہرنے اور خورد ونوش کا انتظام کرایا۔ اس سے تجارت کو بہت فروغ ملا، ان تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے سماج کے اندر تاجروں کا طبقہ وجود میں آگیا تھا ان میں کچھ ایسے تھے جو ملک کے اندر تجارت کرتے تھے دہلی میں تجارت کی منڈیاں لگتی تھیں، اور ہر سامان کیلئے علاحدہ بازار تھے، جہاں کپڑے، اجناس، جانور، غلام وباندی، مٹھائیاں، جوتے، اسلحے اور دیگر سامان ملتے تھے۔ ان تاجروں کے علاوہ کچھ بیرونی تجار بھی تھے جو دوسرے ممالک سے سامان تجارت لاتے اور ہندوستان میں فروخت کرتے، کیونکہ اس دور میں ملتان بیرونی تجارت کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا، خراسانی، عراقی اور ایرانی بیرونی تجارت میں نمایاں تھے۔

تجارت پیشہ طبقہ میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے، ان کی سماجی زندگی بھی آرام وراحت اور باحیثیت تھی، بسا اوقات ان

تاجروں کے پاس اتنی دولت ہوتی کہ امراء اور دوسرے لوگ ان سے قرض لیا کرتے۔ تجارت بحری اور بری دونوں قسم کی تھی، بحری تجارت کی وجہ سے ساحلی علاقوں کے شہروں میں تجارت کو فروغ مل رہا تھا۔ سلاطین دہلی نے تجارت کے فروغ اور اشیاء کی قیمتوں کو ارزاں بنانے میں کافی دلچسپی لی۔ علاء الدین کے زمانہ میں اشیاء کی نرخ بندی کر دی گئی تھی اور قیمتیں سستی ہوگئی تھیں، فیروز شاہ تغلق اور بہلول لودھی اور سکندر لودھی کے زمانوں میں قیمتیں اور بھی کم ہوگئی تھیں، جس سے لوگوں کو بہت آسانیاں حاصل ہوگئی تھیں۔

7.3.3 صنعت پیشہ طبقہ

تاجروں کے ساتھ سماج میں ایک بڑا طبقہ صنعت و حرفت سے جڑا ہوا بھی تھا، دیہاتوں میں تو چھوٹی موٹی ایسی صنعتیں تھیں جو زراعت سے وابستہ ہوتی تھیں، شہری صنعتوں میں پارچہ بافی یعنی کپڑے کی تیاری اور اس سے متعلق متعدد صنعتیں بڑی ترقی پر تھیں۔ اس کے علاوہ دھات سازی، شکر سازی، کاغذ سازی اور سنگ تراشی کی صنعتیں رائج تھیں، کپڑے کی صنعت عروج پر تھی اور اس سے جڑی زردوزی، رنگ سازی اور کشیدہ سازی کی صنعتیں بڑے شہروں میں رائج تھیں۔ طرح طرح کے عمدہ اور نفیس کپڑوں کی تیاری میں سماج کا ایک بڑا طبقہ مشغول تھا، ہندو اور مسلمان دونوں ان صنعتوں سے جڑے ہوئے تھے۔ شہروں کے اندر ان پیشہ وروں اور صنعتوں سے وابستہ لوگوں کی علاحدہ آبادیاں ہوتی تھیں، ان صنعتوں کے لئے شاہی کارخانے قائم تھے، جہاں بڑی تعداد میں ملازم ہوتے تھے، ان کی زندگی متوسط طرز کی ہوتی تھی، بہت سارے غلاموں کو صنعتوں کی تربیت دے کر ان کاموں میں لگایا جاتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے ایسی صنعتوں کو بہت فروغ دیا تھا، اس نے تقریباً دو لاکھ غلام جمع کر لئے تھے جن میں سے ایک بڑی تعداد کو صنعتوں کی تربیت دی گئی تھی اور انہیں مختلف پرگنوں میں پھیلا دیا گیا تھا، اس سے صنعت کو بھی ترقی ہوئی اور سماجی زندگی میں لوگوں کو ہنر مند بن کر کمانے کا راستہ حاصل ہوا۔

7.3.4 دیہی زندگی

دہلی سلطنت کے دور میں گاؤں کی آبادی بڑی اہمیت رکھتی تھی، چونکہ گاؤں سے ہی زراعت وابستہ تھی جس پر ملک کی معیشت کا دارومدار تھا، سلاطین دہلی نے گاؤں کی زندگی میں دخل اندازی کی پالیسی نہیں اپنائی تھی، اس لئے گاؤں کا نظام زیادہ تر اسی حال پر رہا جو پہلے سے مروج تھا۔ گاؤں میں بنیادی طور پر دو طبقے تھے، ایک کاشتکاروں اور زراعت پیشہ لوگوں کا تھا اور دوسرا زمین کے مالکان اور گاؤں کے سربراہوں کا تھا۔ کسان اور کاشتکار زیادہ تر زمین کے مالک نہ ہوتے تھے۔ بلکہ وہ بٹائی پر یا شرکت کے دوسرے طریقوں پر کاشتکاری کرتے تھے اور اپنی بٹائی کے حصہ پر یا مزدوری پر گذارہ کرتے تھے، سماج کا یہ طبقہ مالی اعتبار سے کمزور تھا اور قدرتی آفات یا زراعت کی نابہتری کی صورت میں انہیں مشکلات کا سامنے کرنا پڑتا تھا، ورنہ عام حالات میں ان کی زندگی میں خوشحالی رہتی، حکومت بھی انہیں امداد فراہم کرتی تھی۔ فیروز شاہ تغلق نے زراعت کی ترقی اور عوام کی خوشحالی کے لئے بے شمار نہریں بنوائیں، کنویں کھدوائے اور ٹیکس کا بار بالکل ہلکا کر دیا، جس کے نتیجہ میں زراعت میں بے انتہا ترقی ہوئی اور کاشتکار خوشحال و آسودہ ہوگئے تھے۔

گاؤں میں دوسرا طبقہ زمینداروں اور سرداروں کا تھا یہ لوگ خوط اور مقدم کہلاتے تھے، یہی کسانوں سے لگان وصول کرتے اور حکومت کو مقررہ حصہ ادا کر کے بقیہ آمدنی خود استعمال کرتے تھے ان لوگوں کی معاشی حالت بڑی اچھی تھی، یہ کاشتکاروں سے زیادہ وصول

کرتے تھے اور حکومت کو کم ادائیگی کرتے، درمیانی منافع کا بڑا حصہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ خوط اور مقدموں کی ان بے ایمانیوں کو روکنے کے لئے ہی علاء الدین نے مقررہ لگان کے بجائے زمین کی حقیقی پیائش کروائی اور پیائش کی شرح پر لگان کی مقدار طے کی، جس سے اصل وصول شدہ لگان حکومت کو پہنچنے لگی اور پٹواریوں کو اپنا معاوضہ ملتا تھا، لیکن علاء الدین کے بعد پھر ان کی حالت پہلے جیسی ہو گئی۔ مؤرخین جیسے وصاف اور ابن بطوطہ نے بالترتیب گجرت اور بنگال کی دیہی آبادیوں کے بارے میں لکھاہے کہ یہاں بہت زیادہ خوشحالی ہے، گاؤں اور قصبے کے لوگ دولت سے کھیلتے ہیں اور تھوڑی سے آمدنی میں لوگ آرام و آسائش سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

7.3.5 اہل علم و فضل کا طبقہ

سماج کا ایک اہم ترین طبقہ اہل علم و فضل کا تھا، دہلی سلطنت اس معاملہ میں زریں ہے کہ یہاں کے بڑے شہر بالخصوص دہلی، لاہور' ملتان اور لکھنوتی وغیرہ علم و تہذیب کے روشن مراکز بن گئے تھے، جہاں اہل کمال کا مجمع رہتا، عالم اسلام میں چنگیزی تباہی کے نتیجہ میں بڑے بڑے باکمال دہلی میں سمٹ آئے تھے، ان میں فقہاء و علماء کے علاوہ بڑے بڑے شعراء و ادباء اور ماہرین فن تھے۔ سماج میں اس طبقہ کو بڑی عزت وو قار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، سلاطین دہلی بھی ان کی بڑی قدر کرتے، ان کو شریعت سے وابستہ علم و تدریس اور قضاء وغیرہ کے لیے مناصب پر فائز کرتے اور ان کے لئے معیاری معاوضہ مقرر کرتے تھے۔ قطب الدین ایبک، التمش اور بلبن کے زمانوں میں دہلی میں وقت کے نامور فاضلان کا مجمع اکٹھا تھا اور ان سلاطین نے انہیں حسب حیثیت اعزاز بخشا۔ التمش اور بلبن کے درباروں میں اور ان کے دستر خوانوں پر نیز ان کے سفر میں علماء و اہل فضل ساتھ ہوا کرتے تھے، علاء الدین نے گو کہ بذات خود انہیں وہ اہمیت نہ دی جو اس سے پہلے حاصل تھی، لیکن اس کے عہد میں سب سے زیادہ ارباب کمال اور علماء دہلی میں موجود تھے۔ محمد بن تغلق، فیروز شاہ تغلق، سکندر لودھی ان کے بڑے قدر داں رہے۔ عہد سلطنت کے مشہور فقہاء میں قاضی منہاج سراج، قاضی قطب الدین کاشانی، شرف الدین ولوالجی، مولانا برہان الدین بزاز، نور الدین مبارک، فخر الدین ناقلہ اور شمس الدین وغیرہ فقہاء کی ایک طویل فہرست رہی ہے۔ ان فقہاء کے علاوہ یہ دور مشائخ کبار کا بھی ہے، دہلی سلطنت کے سماج کا یہ اہم عنصر تھے۔ یہ دور مشائخ عظام کے وجود اور ان کی برکتوں سے فیضیاب ہو رہا تھا، شیخ معین الدین چشتی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ساتھ ایبک، التمش اور بلبن کی عقیدت جگ ظاہر تھی، بابا فرید الدین گنج شکر اور شیخ نظام الدین اولیاء جیسی عظیم ہستیاں اسی دور میں تھیں جن کے آستانوں پر ہزاروں لوگ روحانی سکون اور اخلاقی تربیت حاصل کیا کرتے تھے۔ سماج میں ان کی عظمت اور دبدبہ کے سامنے بسا اوقات شاہانہ عظمت ماند پڑ جاتی تھی۔ قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، شیخ نصیر الدین چراغ، علی احمد صابر کلیری، جمال الدین ہانسوی، مخدوم جہانیان جہاں گشت، شرف الدین احمد یحیٰ منیری، شیخ جلال الدین تبریزی، سید اشرف جہانگیر سمنانی، شیخ سراج الدین اخی سراج، نور قطب عالم وغیرہ مشائخ سے دہلی سلطنت کا یہ زمانہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ان مشائخ کی خدمات اور روحانی سرگرمیوں نے سماج پر بڑے گہرے اثرات ڈالے، ہندو اور مسلم دونوں ان بزرگوں کی خانقاہوں میں آتے، مسلم امراء کے ساتھ ہندو امراء بھی یہاں جبین عقیدت خم کرتے، اور سماج کے اندر روحانی ماحول میں تقویت پیدا ہوتی۔

7.3.6 غلاموں کا طبقہ

غلامی کا رواج زمانہ قدیم سے جاری تھا، دہلی سلطنت میں یہ رواج باقی رہا، عام طور جنگوں میں گرفتار ہونے والے مرد وعورت غلام وباندی بنالئے جاتے، اس میں مذہب کا کوئی فرق نہ تھا، غیر مسلم جنگوں میں بھی اسی طرح قیدی غلام ہوتے جس طرح مسلم حکمرانوں کی جنگوں میں قیدی بنائے جاتے۔ یہ غلام گھروں میں کام کرتے اور اپنے مالکوں کی خدمت نیزان کے مطابق تجارت وصنعت انجام دیتے تھے۔ غلاموں کی خرید وفروخت کے لئے باضابطہ منڈی ہوتی تھی، ہندوستان میں زیادہ تر غلام گھریلو کاموں کے لئے رکھے جاتے تھے، لیکن وسط ایشیاء میں غلاموں کو خرید کر انھیں بہترین مذہبی اور ادبی تعلیم دی جاتی، آداب سکھائے جاتے اور فوجی تربیت دے کر اونچی قیمتوں میں انہیں فروخت کیا جاتا تھا، ایسے غلاموں کو بڑے امراء، اصحاب ثروت اور اہل علم خریدتے، انہیں علمی کاموں میں لگایا جاتا یا فوج میں بھرتی کیا جاتا، ایسے غلام اپنی فوجی قابلیت اور اعلی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد ترقی پاتے اور سماج کے اندر اونچا مقام حاصل کرلیتے تھے۔ ایبک، التمش اور بلبن جیسے عظیم سلاطین دہلی پہلے غلام تھے اور انہیں بازاروں سے خرید کر تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا گیا اور وہ ترقی کرتے ہوئے عظیم سلطنتوں کے بادشاہ بنے۔

7.4 مذہبی حالات

مذہبی اعتبار سے دہلی سلطنت پر اگر نظر ڈالی جائے تو وہ بڑی حد تک ایسی حکومت محسوس ہوتی ہے جس میں مذہب کو اعلی حیثیت حاصل تھی اور اس کا اثر براہ راست سماج پر بھی مرتب ہورہا تھا۔ اس لئے یہ سماج بھی بڑی حد تک مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، حکومت اور سماج دونوں سطحوں پر اس عہد میں مذہب اور بالخصوص اسلام کا رنگ صاف نمایاں نظر آتا ہے، عہد سلطنت کے ابتدائی سلاطین بذات خود گہرے مذہبی رنگ کے حامل تھے، وہ نہ صرف علم اور دینداری سے آراستہ تھے بلکہ شریعت کی تابعداری اپنا فریضہ سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے مذہب اور اسلامی شریعت کو اہمیت دی اور اہل علم کی قدردانی کی جس کی وجہ سے سماج میں اہل علم کا مقام اونچا ہوا بلکہ لوگ مذہب اور دین کی طرف راغب ہونے لگے۔

مذہبی رنگ کو گہرا کرنے میں علماء وفقہاء کے علاوہ مشائخ اور صوفیوں کی عظیم خدمات کا بڑا دخل رہا ہے۔ یہ دور بڑے مشائخ اور بزرگان دین سے مالامال تھا جو اسلامی تعلیمات اور اخلاقی خوبیوں کے عملی نمونے تھے۔ اور ان کی مجلسوں میں ہر کس وناکس کی رسائی تھی، جہاں عوام کو روحانی سکون ملتا اور اپنے درد کا درماں پاتے۔ خواجہ اجمیری، خواجہ بختیار کاکی، بابا فرید، محبوب الہی، چراغ دہلی اور خواجہ گیسودراز کی نفس گرم سے سماج کے اندر دینداری اور تعلق مع اللہ کی کیفیت میں اضافہ ہی ہوتا گیا تھا، دوسری طرف علماء اور فقہاء نے وعظ وارشاد کی محفلیں اور درس کے حلقے قائم کررکھے تھے۔ قاضی منہاج کا وعظ مشہور تھا جس میں شیخ نظام الدین بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ وعظ بادشاہوں کے درباروں، خانقاہوں، مسجدوں اور محفلوں میں ہوتے جہاں ہزاروں عوام ان سے مستفید ہوتی تھی اور ان کی زندگی میں مذہبی رنگ آجاتا تھا۔ یہ وعظ لشکروں کے اندر بھی ہوتے اور خصوصیت کے ساتھ بیرونی حملوں کے موقعوں پر سلاطین کی خواہش پر وعظ

کے ذریعہ لوگوں میں جذبہ بیدار کیا جاتا تھا۔

مذہبی تعلق کے پیدا کرنے میں مشائخ کی خانقاہوں اور فقہاء کی محفلوں کے علاوہ تعلیم کے حلقوں کا بھی رول تھا۔ سلاطین نے اس بات سے بھی دلچسپی لی تھی کہ مدارس قائم ہوں اور اساتذہ تعلیم دیں، چنانچہ دہلی اور دوسرے شہروں میں مدارس بھی قائم ہوئے اور زیادہ تر اساتذہ نے اپنے یہاں تعلیم کے حلقے لگائے، جن سے علم دین کی اشاعت ہوئی اور لوگ مذہب سے گہری وابستگی قائم رکھتے رہے۔

دہلی سلطنت میں سماج کے اندر جہاں دینداری اور مذہب سے تعلق کا غالب ماحول رہا، وہیں اس کے برعکس صورت حال بھی رہی، جس میں بسا اوقات زیادہ شدت بھی پیدا ہوئی، چنانچہ علاء الدین کے دربار میں وہ دینی اور مذہبی رنگ نہ تھا جو اس کے پیشرو سلاطین اور بعد کے سلاطین میں نظر آتا ہے۔ علاء الدین مذہبی آدمی نہیں تھا، لیکن وہ مذہب کی بے حرمتی نہیں کرتا تھا، اس کے دور کو تو علماء وفقہاء کی موجودگی کے اعتبار سے سب سے زیادہ زرخیز دور کہا جاتا ہے۔ علاء الدین کے دور میں ہی قاضی شمس الدین محدث حدیث کی کتابوں کے ایک بڑے ذخیرہ کے ساتھ ہندوستان آئے کہ یہاں حدیث کی اشاعت ہو، لیکن جب اسے علاء الدین کے مذہبی احوال معلوم ہوئے تو وہ واپس چلے گئے۔ اسی طرح قطب الدین مبارک کا دربار مذہبی رنگ سے خالی تھا اور اس کا براہ راست اثر سماج کی مذہبی حالت پر مرتب ہوتا تھا، خسرو خاں کے زمانہ میں تو مذہب اسلام کی بے حرمتی کے واقعات پیش آنے لگے تھے، لیکن مجموعی طور پر دہلی سلاطین کے دربار میں مذہبی رنگ ہی زیادہ غالب رہا، البتہ دربار کی آرائش وزیبائش، بادشاہوں کی نجی محفلوں اور بادشاہوں کی سزاؤں کو مذہبی رنگ سے مستثنیٰ کرکے دیکھنا ضروری ہوگا۔

گو کہ سلاطین دہلی کا مذہب اسلام تھا اور وہ اسلام اور شریعت اسلامی کے نگہبان تصور کئے جاتے تھے، لیکن انہوں نے دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ بھی عزت ومساوات کا برتاؤ کیا، مذہب کی بنیاد پر کسی کو اس کے حق سے محروم نہیں کیا۔ محمد بن تغلق کی بنائی ہوئی دہلی سے دولت آباد کی طویل شاہراہ اور اس پر موجود مسافروں کی بیش قیمت سہولتیں ہندو و مسلمان سب کے لئے تھیں۔ فیروز تغلق کے عہد میں کسانوں سے قرضوں کی معافی، ٹیکس میں بے انتہا کمی اور نہر و کنوؤں کی تیاری نیز باغات کے لگوانے، بیماروں کے لئے اسپتال کھولنے، غریبوں ومحتاجوں کی مالی امداد، بے روزگاروں کے لئے روزگار، اور غریب بچیوں کی شادی کے انتظامات جیسے فلاحی اقدامات یکساں طور پر ہندو اور مسلمان سب کے لئے تھے۔ ہندو مذہب کی طرح جین مذہب اور دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ بھی یکساں برتاؤ ہوتا تھا اور سلاطین دہلی ان کی بھی قدر افزائی کرتے تھے۔

7.4.1 سماج پر اسلامی تہذیب کے اثرات

یہ بہت دلچسپ ہے کہ دہلی سلطنت کے دور میں ہندوستان کے سماج پر اسلام کے افکار و نظریات اور عقائد کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور ہندو سماج کے اندر ایسی تحریکیں اٹھیں جن میں اسلامی عقائد اور تعلیمات سے استفادہ کا عکس نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں مشہور مؤرخ ڈاکٹر تاراچند کے درج ذیل چند ٹکڑے قابل مطالعہ ہیں: ”ہندو مسلمان دونوں نے ایک ایسا طرز زندگی اختیار کرنے کی کوشش کی جس سے دونوں اچھے ہمسایہ کی طرح زندگی بسر کرسکیں‘ اس نئے طرز زندگی سے ایک ایسا تمدن پیدا ہوا جو نہ تو بالکل ہندوؤں ہی کا تھا‘ نہ

خالصاً مسلمانوں کا' بلکہ ایک مخلوط ہندو مسلم تمدن تھا' اس طرح ہندو مذہب' ہندو آرٹ' ہندو ادب اور ہندو سائنس نے اسلامی اثرات قبول کرنے شروع کیے اور ہندو کلچر اور ہندو ذہنیت میں بھی تبدیلی پیدا ہونے لگی' مہاراشٹر' گجرات' پنجاب' ہندوستان اور بنگال کے مذہبی پیشواؤں نے پرانے اعتقادات کی بہت سی باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔" جناب کے ایم پنیکر صاحب نے لکھا ہے کہ ہندو معاشرت پر اسلام کے اثرات کی وجہ سے ہندوؤں کے معاشرتی نظام میں برابر نئے عقائد اور فرقے پیدا ہوتے جارہے تھے اس عہد میں ہندو مذہب کی تجدید کی تحریکیں برابر جاری رہیں۔ ویشنو تحریک اسی زمانے میں شروع ہوئی جس کی وجہ سے شمال میں جے دیو، میرابائی، رامانند، کبیر، پھر مہاراشٹر ا اور گجرات میں گیانیشور وغیرہ جیسے پیشوا پیدا ہوئے۔ کرناٹک میں لنگایت کا عروج بھی اسی دور میں ہو۔ گیت گووند پوری میں لکھی گئی اور یہ اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی شرح راجپوتانہ کے مہارانا کمبھ نے لکھی، رامانند کی تحریک کا مرکز بنارس میں تھا۔ اور یہ بات تو واضح ہے کہ اسی عہد میں ہندو مذہب پر اسلام کا گہرا اثر پڑا، ہندوستان میں خدا پرستی کا تصور اسلام ہی کی بدولت پیدا ہوا۔ بھکتی عقائد میں بھی خالص توحید پرستی ہے"۔

7.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- دہلی سلطنت میں نظام عدل مرکز سے لے کر صوبوں، پرگنوں اور قصبوں تک میں نافذ کیا گیا تھا۔ سلاطین دہلی نے عدل و انصاف کی فراہمی پر بہت زیادہ توجہ دی تھی اور اس معاملہ میں وہ بسا اوقات اپنے عزیزوں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا، جب کہ غیر مسلموں کے فیصلے ان کے مذہب کی روشنی میں کئے جاتے تھے، گاؤں میں پنچایت کے قدیم نظام کو باقی رکھا گیا تھا۔
- نظام عدل کا سربراہ قاضی القضاۃ ہوتا تھا جس کی تقرری بادشاہ کرتا تھا، پھر ہر صوبے کے لئے ایک قاضی مقرر ہوتا تھا، صوبہ کے اندر ہر پرگنہ میں ایک قاضی ہوتا تھا، قاضی صوبہ کی عدالت میں فیصلہ اور اپیل دونوں کے لئے تھی۔ عدالت کی آخری منزل بادشاہ کی ذات تھی۔
- دہلی سلطنت کے سماج میں مختلف طبقے تھے، امراء اور حکمراں کا طبقہ اعلی سمجھا جاتا تھا، حالانکہ اسلام میں ایسا کوئی تصور نہیں ہے، لیکن دہلی سماج میں انھیں یہ حیثیت حاصل تھی، اعلی عہدے اسی طبقہ کے پاس ہوتے تھے، البتہ یہ بات ممکن تھی کہ کوئی بھی شخص حتی کہ ادنی غلام بھی اپنی صلاحیت اور فوجی قابلیت کے ذریعہ ترقی کرتا ہوا امراء کے طبقہ میں شامل ہو جائے، ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ امراء کے طبقہ میں ہندو سردار بھی تھے اور انہیں بھی اعلی سماجی رتبہ حاصل تھا، دارالسلطنت دہلی کے اندر ہندو امراء اپنی پوری شان و شوکت کے اظہار کے ساتھ رہتے تھے اور مذہب کی وجہ سے سماجی حیثیت میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا، اس سماج میں اور بھی طبقات تھے۔ جیسے تاجروں کا طبقہ، علماء و اہل کمال کا طبقہ، صنعت پیشہ لوگوں کا طبقہ اور کاشتکاروں کا طبقہ، ان سب کی حیثیتیں مختلف تھیں، کسانوں کا طبقہ بہت نچلی سطح پر تھا، لیکن سلاطین دہلی کی پالیسیوں کی وجہ سے ان میں بھی خوشحالی آگئی تھی۔

غلاموں کا بھی طبقہ تھا جن کی خرید و فروخت ہوتی تھی، انھیں گھریلو کام کے لئے رکھا جاتا تھا۔ فیروز تغلق نے بہت سے غلاموں کو تعلیم و تدریس اور ہنر سکھا کر صنعت کے کاموں میں لگایا تھا۔ یہ غلام فوج میں بھرتی کئے جاتے تھے، جہاں اپنی قابلیت کی بنیاد پر وہ ترقی کر کے اونچے عہدوں تک پہنچ جاتے تھے۔

- دہلی سلطنت کے سماج پر بنیادی طور پر مذہبی رنگ غالب تھا، نہ صرف سلاطین مسلمان تھے بلکہ وہ اسلام کے محافظ تصور کئے جاتے تھے، انہوں نے مذہبی علماء اور مشائخ کی بڑی قدر دانی کی۔ اس عہد میں بڑی تعداد میں علماء و فضلاء اور مشائخ و صوفیاء تھے، جن کی خدمات کی وجہ سے عوام کی اصلاح و تربیت اور تعلیم و اخلاق کی اشاعت ہوتی تھی۔

7.6 نمونہ امتحانی سوالات

7.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. دہلی سلطنت قائم کرنے والے حکمراں کس علاقے سے آئے تھے؟

(a) افغانستان (b) ایران (c) عرب (d) انگلینڈ

2. کس سلطان نے اپنے محل کے ساتھ زنجیر لٹکا رکھی تھی اور اعلان کیا تھا کہ مظلوم رنگین کپڑا پہن کر آئے تاکہ دور سے پہچان لیا جائے؟

(a) التمش (b) قطب الدین ایبک (c) بابر (d) محمد بن تغلق

3. میر عدل کے نام سے کس نے عہدہ قائم کیا؟

(a) سکندر لودھی (b) التمش (c) قطب الدین ایبک (d) محمد بن تغلق

4. مشہور سیاح ابن بطوطہ کو کس نے قاضی مقرر کیا؟

(a) محمد بن تغلق (b) فیروز شاہ تغلق (c) التمش (d) رضیہ سلطانہ

5. دہلی سلطنت میں کس فقہ کا رواج تھا۔

(a) فقہ حنفی (b) فقہ شافعی (c) فقہ حنبلی (d) فقہ جعفری

6. کس سلطان نے چالیس امراء کی جماعت بنائی جو حکومت کے کاروبار سنبھالنے میں اس کے مددگار ہوتے تھے۔ جو چہلگانی کہلاتی تھی۔

(a) التمش (b) محمد بن تغلق (c) رضیہ سلطانہ (d) سکندر لودھی

7. ابن بطوطہ کہاں کا قاضی تھا۔

(a) دہلی (b) لکھنو (c) بنارس (d) سب غلط

8. قاضی شمس الدین محدث حدیث کی کتابوں کے ذخیرے کے ساتھ کس کے عہد میں ہندوستان میں آئے۔

(a) علاء الدین (b) التمش (c) محمد بن تغلق (d) ابراہیم لودھی

9. سلطان محمد بن تغلق نے محل کے اندر کتنے قاضی مقرر کر رکھے تھے۔

(a)چار　(b)ایک　(c)دو　(d)پانچ

10. ابن بطوطہ کس فقہ سے وابستہ تھے۔

(a)فقہ حنفی　(b)فقہ مالکی　(c)فقہ شافعی　(d)فعہ حنبلی

7.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. نظام عدل میں بادشاہ کی حیثیت بیان کیجیے۔
2. شریعت کے نفاذ کی صورت حال پر تبصرہ کیجیے
3. سماجی نظام میں غلاموں کی حیثیت پر گفتگو کیجیے۔
4. خان، امیر اور ملک کے درمیان دہلی کے سماج میں کیا فرق تھا؟
5. قاضی القضاۃ اور صدر الصدور میں کیا فرق تھا؟

7.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. دہلی سلطنت کے نظام عدل پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. دہلی سلطنت کا سماجی نظام کیسا تھا، روشنی ڈالیے۔
3. دہلی سلطنت کے مذہبی حالات بیان کیجیے۔

7.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. آب کوثر : شیخ محمد اکرام، فرید بک ڈپو، دہلی
2. عہد وسطیٰ کا ہندوستان، حصہ اول : پروفیسر ستیش چندر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 2003ء ترجمہ: عزیز الدین حسین
3. ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک : سید صباح الدین عبد الرحمن، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2012
4. بزم مملوکیہ : سید صباح الدین عبد الرحمن، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 1999ء
5. خلجی خاندان : کے ایس لال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 1998، ترجمہ، یسین مظہر صدیقی
6. مختصر تاریخ ہند : سید ابو ظفر ندوی، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2006
7. "A Comprehensive History of Medieval India: Salma Ahmed Farooqui, Pearson:2011

اکائی 8: دہلی سلطنت میں علمی خدمات اور فن تعمیر

اکائی کے اجزا:

8.0 تمہید
8.1 مقاصد
8.2 عہد سلطنت میں علمی خدمات
8.2.1 علمی خدمات۔ غلام سلاطین کے عہد میں
8.2.2 خلجی عہد میں علمی خدمات
8.2.3 تغلق دور میں علمی خدمات
8.2.4 لودھی عہد میں علمی خدمات
8.2.5 علاقائی حکومتوں میں علمی فروغ
8.3 دہلی سلطنت میں فن تعمیر
8.3.1 عہد غلاماں میں فن تعمیر
8.3.2 خلجی دور میں فن تعمیر
8.3.3 تغلق دور میں فن تعمیر
8.3.4 سادات اور لودھی عہد میں فن تعمیر
8.3.5 ہند اسلامی فن تعمیر
8.4 اکتسابی نتائج
8.5 نمونہ امتحانی سوالات
8.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
8.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
8.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

دہلی سلطنت کا تین سو سالہ دور علمی خدمات اور تعمیری نمونوں کے اعتبار سے زرخیز اور شاہکار دور ہے۔ اس سلطنت کے آغاز کے موقع پر عالم اسلام کے مختلف شہروں میں بڑی تباہی اور قتل وغارت گری مچی ہوئی تھی، علم کے مرکز تباہ ہورہے تھے اور ماہرین واہل کمال بے یارومددگار ہورہے تھے۔ اس موقع پر ہندوستان کے اندر دہلی سلطنت کا قیام اور وہاں علم واہل علم کی قدر دانی ان باکمالوں کے لیے بہت بڑی نعمت تھی، چنانچہ دہلی سلطنت قائم ہوتے ہی جہاں سلاطین نے اپنے درباروں میں اہل علم کی قدر دانی کی اور علم وتعلیم کے فروغ کے لیے سہولیات بہم پہنچائیں وہیں بغداد وشام، ماوراء النہر اور وسط ایشیا کے علاقوں سے فضلاء وعلماء اور شعراء جوق در جوق دہلی اور دوسرے ہندوستانی شہروں کا رخ کرنے لگے۔

فن تعمیر کے میدان میں بھی ان سلاطین کی شاندار خدمات ہیں جن کا آپ مطالعہ کریں گے۔ ان تعمیرات میں سلاطین نے ہندوستانی کاریگروں سے مدد لیتے ہوئے عربی طرز اور اسلامی ذوق کا استعمال کیا اور ایک نئے فن تعمیر کو وجود بخشا جو ہندوستانی فن تعمیر کہلایا۔ علمی خدمات، فن تعمیر کے نمونے اور ان کی خصوصیات اس اکائی کا موضوع ہیں۔ سطور ذیل میں ان پر تفصیلی روشنی ڈالی جارہی ہے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ یہ جان سکیں کہ سلاطین دہلی نے حکومت کے استحکام اور عدل وامن کے قیام کے ساتھ علم کے فروغ اور فن تعمیر پر خاصی توجہ دی۔ اس کے علاوہ تعلیم کے میدان میں ان کے اقدامات کے بارے میں آپ آگاہی حاصل ہوگی۔ اسی طرح اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ دہلی سلطنت کے تعمیری ذوق پر تبصرہ کرسکیں گے۔

8.2 عہد سلطنت میں علمی خدمات

8.2.1 علمی خدمات۔ غلام سلاطین کے عہد میں

دہلی سلطنت کے پورے دور میں علمی خدمات کی ہمہ ہمی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ خدمات کئی طرح کی رہی ہیں۔ عموماً سلاطین نے شعراء اور علماء کی سرپرستی کی اور انہیں دربار کی زینت بنایا، یہ شعراء اپنے فن کے کمال دکھاتے، علماء اور فضلاء نے بادشاہوں سے علمی گفتگو اور مشورے جاری رکھے، نیز تعلیم کی اشاعت کی، سلاطین کی خواہش پر اور اپنے طور پر بھی کئی اہل علم نے تاریخ کی کتابیں لکھیں جس سے اس عہد کی معاصر تاریخ قلم بند ہوگئی۔ بعض امراء نے اپنی سرپرستی میں کتابیں لکھوائیں۔ اس دور میں بڑے فقہاء اور علماء موجود تھے جنہوں نے تفسیر اور فقہ کے موضوعات پر قیمتی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ سلاطین نے مدارس اور اسکول بھی قائم کیے جہاں طلبہ اور اساتذہ

دونوں کے لیے تعلیم اور رہائش کے بہترین انتظامات کے گئے۔ ان کے اخراجات کے لیے بڑے بڑے او قاف خاص کیے گئے۔ سنسکرت اور فارسی زبانوں میں ان کتابوں کے ترجمے کرائے گئے جس سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہوا۔ علاقائی زبانوں کو بھی فروغ دیا گیا اور ان میں غیر مسلم اہل فضل نے تصنیفات تیار کیں' اس طرح یہ عہد علمی اعتبار سے مالامال نظر آتا ہے۔

قطب الدین ایبک کا دور

دہلی سلطنت کا پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک ہے' جب وہ غلام تھا' قسمت نے یاوری کی اور اس نے امام ابو حنیفہ کی اولاد میں سے ایک بڑے عالم قاضی فخر الدین عبد العزیز کوفی کے گھر میں تربیت پائی جنھوں نے اسے دینی تعلیم دی اور اپنے بچوں کی طرح تربیت سے آراستہ کیا۔ قطب الدین جب تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے مسلمانوں کی زندگی اسلامی اور شرعی نہج پر تشکیل دینے کی کوشش کی' اس نے غزنین اور غور کی علمی محفلیں دیکھیں تھی' دہلی میں اس نے علماء و فضلاء اور شعراء کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دی اور ان کی سرپرستی شروع کی۔ مولانا بہاؤ الدین اوش اپنے زمانہ کے مشہور شاعر اور ادیب تھے' اوش ہندوستان آکر ایبک کے دامن دولت سے وابستہ ہوئے۔ جمال الدین محمد ایبک کے دربار سے وابستہ دوسرے بڑے شاعر تھے جن کے علم کی قدر دانی کی گئی۔ ایسے ہی قاضی حمید الدین ایک باکمال شاعر اور عالم و فاضل تھے جو عنایت شاہانہ سے مستفید ہوتے رہے۔ ایبک کے دور کی ایک اہم علمی شخصیت حسن نظامی نیشاپوری کی ہے۔ جنھوں نے ایبک کی خواہش پر مشہور و معروف تاریخ "تاج المآثر" لکھی ہے' جس میں 587ھ سے 612ھ تک کے واقعات درج ہیں۔ شہاب الدین غوری کے ہندوستان پر آخری پانچ حملوں کے ذکر سے لے کر قطب الدین ایبک کے پورے عہد اور التمش کے عہد کے ابتدائی سات برسوں کے سیاسی و جنگی واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ایبک اور التمش کے حالات پر یہ پہلی تاریخ ہے اور اس کا مؤلف ہندوستان کا پہلا مؤرخ ہے جس کی اصل کتاب محفوظ رہی ہے۔ ایبک کے دور کا ایک اور مشہور مورخ مبارک شاہ ہے جو عرف عام میں فخر مدبر کہلاتا ہے۔ اس نے 'بحر الانساب' کے نام سے کتاب لکھ کر قطب الدین ایبک کی خدمت میں پیش کی' اس میں رسول اکرم ﷺ کے عہد سے لے کر مؤلف کے زمانہ تک کے شجرے قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس میں قطب الدین کے اوائل زندگی اور حکمرانی کے واقعات درج ہیں۔

اسی سے ملتا جلتا ایک نام فخر الدین مبارک شاہ مروزی کا ہے جس کی کتاب 'تاریخ فخر الدین مبارک شاہ' کہلاتی ہے' یہ بھی اس دور کی معاصر کتاب ہے اور ایبک کے بارے میں مختصر معلومات درج ہیں۔ یہ دراصل غیاث الدین غوری کے دربار کا ایک ممتاز شاعر تھا اور 602ھ میں وفات پائی۔

عہد قطبی کے نامور فاضل اور فخر ہند شخصیت مولانا رضی الدین حسن صغانی کی ہے' جن کی کتاب 'مشارق الانور' حدیث کی مشہور کتابوں میں سے ایک ہے اور عرصہ تک نصاب میں پڑھائی جاتی رہی' امام صغانی محدث ہونے کے ساتھ بڑے ادیب' لغوی اور مفسر و فقیہ بھی ہیں۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ سیاحت اور عالم عرب میں گذرا' عباسی خلیفہ بغداد کا فرمان وہاں سے التمش کے پاس لائے تھے۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ قطب الدین ایبک نے انہیں لاہور کی قضائت پیش کی تھی۔ مختلف فنون پر انہوں نے بیسیوں کتابیں تصنیف کیں جن میں فن لغت کے اندر ایک کتاب العباب الزاخر بیس جلدوں میں اور ایک 'مجمع البحرین' بارہ جلدوں میں ہے۔

قطب الدین ایبک کا مشہور سپہ سالار محمد بختیار خلجی تھا جس نے بہار و بنگال کے علاقے فتح کئے۔ خلجی اور اس کے ساتھی امراء نے بھی اپنے مفتوحہ علاقوں میں مساجد اور مدارس قائم کیے جہاں تعلیم کی اشاعت پر توجہ دی گئی۔ قطب الدین نے علم کی اشاعت کے لیے مساجد بھی قائم کیے جہاں نماز کے ساتھ تعلیم و تدریس کے حلقے بھی لگتے تھے، مشہور قطب مینار بھی دراصل مسجد قوۃ الاسلام کا حصہ تھا۔

شمس الدین التمش

شمس الدین التمش عہد غلاماں کا نامور بادشاہ ہے، جس نے صحیح معنوں میں ہندوستان کے ایک وسیع حصہ پر امن و امان کے ساتھ حکومت کی۔ اس کا چھبیس 26 سالہ طویل دور ہندوستان میں مسلم حکومت کے استحکام اور علم و ادب کے روشن کارناموں کا زمانہ ہے۔ التمش ایک ثروت مند گھرانہ کا فرد تھا، لیکن بھائیوں کے حسد کا شکار ہو کر غلام بنا، اس نے بخارا اور بغداد میں غلامی کی زندگی گزاری، جہاں اسے نہ صرف اپنے آقاؤں کے علمی گھرانوں میں عمدہ تربیت ملی بلکہ بغداد کے کبار مشائخ کی خدمت اور استفادہ کے مواقع سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ اوحد الدین کرمانی، خواجہ معین الدین چشتی اور قاضی حمید الدین ناگوری جیسے بزرگان دین کی عنایتوں اور دعاؤں سے اس زمانہ میں وہ بغداد میں شادکام ہو چکا تھا۔ دہلی کی بادشاہت ملنے کے بعد مشائخ دین اور علماء و فضلاء سے اس کی عقیدت اور بڑھ گئی، ان صحبتوں کا اثر تھا کہ التمش خود بھی انتہائی دیندار اور پابند شریعت بلکہ ولی مرشد تھا، خواجہ عثمان ہرونی، خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ بختیار کاکی سے اس کے گہرے مراسم عقیدت اور سرگرم تعلقات رہے، حوض شمسی کے لیے جگہ کا انتخاب خواجہ قطب الدین کے ہی مشورہ سے کیا جس کا پانی انتہائی شیریں نکلا تھا۔

التمش کا عہد چونکہ دہلی میں مسلم حکومت کے استحکام اور امن و امان کا دور تھا، جب کہ عالم اسلام کے دوسرے شہروں میں چنگیزی فتنہ کی قہر سامانیاں برپا تھیں، اس لیے دہلی کی طرف ہر جانب سے علماء و فضلاء آرہے تھے، التمش نے آنے والے علماء و اہل کمال کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے لیے وظائف مقرر کیے۔ ان کے علمی کاموں کی قدر اور ہمت افزائی اور علم و دین کی خدمت کے لیے ان کو سہولیات بہم پہنچائیں۔ التمش کے عہد میں مشہور بزرگ حضرت جلال الدین تبریزی دہلی آئے تو التمش نے علماء و مشائخ کی ایک جماعت کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کو اس نے شیخ الاسلام بنایا، قاضی قطب الدین کاشانی، نور الدین مبارک غزنوی اور قاضی فخر الائمہ اس کے دربار کی زینت تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوری سے اس کو بے پناہ عقیدت تھی۔ ان مشائخ کے علاوہ علماء اور فقہاء سے بھی اسے گہری عقیدت رہی اور انہیں اپنی صحبت میں رکھتا تھا۔ سفر اور حضر دونوں میں علماء التمش کے جلو میں ہوتے تھے، محل کے اندر ہفتہ میں تین روز علماء کی مجلسیں ہوتیں، رمضان المبارک میں روزانہ یہ مجلس ہوتی، جمعہ کے روز نماز کے بعد علماء اور مشائخ خاص طور پر دربار میں بلائے جاتے، یہ علماء بادشاہ کو سلطان کے فرائض سے آگاہ کرتے اور علمی مشورے دیا کرتے تھے۔ التمش ہی کے دربار سے مشہور مورخ، قاضی اور فقیہ مولانا منہاج الدین سراج وابستہ ہوئے، وہ شاہی خیمہ میں وعظ کہتے تھے، التمش نے انہیں گوالیار کا قاضی و خطیب اور تمام امور شرعی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ التمش کے دربار میں ارباب فضل و کمال اس قدر جمع ہو گئے تھے کہ کہیں اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ ان علماء میں بعض درس و تدریس کے لیے مشہور تھے۔ التمش نے ان کے لیے دہلی میں متعدد مدرسے قائم کیے، دہلی کا مشہور مدرسہ

معزی اسی بادشاہ کا قائم کردہ ہے جسے اس نے معزالدین (شہاب الدین غوری) کی یاد کے لیے قائم کیا تھا۔ بدایوں میں اپنی اقطاع کے زمانے میں بھی التمش نے اس نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ دہلی میں ایک دوسرا مدرسہ ناصریہ کے نام سے قائم ہوا تھا جسے التمش نے اپنے مرحوم بیٹے ناصرالدین کے نام پر بنایا تھا۔ التمش کے اپنے نام پر بھی ایک مدرسہ تھا جس کی بوسیدہ عمارت کی تعمیر و مرمت فیروز شاہ نے اپنے زمانہ میں کرائی۔

التمش کے دربار سے وابستہ شعراء میں خواجہ ابونصر ناصری' بخارا کے مشہور شاعر و فلسفی امیر روحانی تاج الدین ریزہ اور شہاب الدین مہمرہ نامور اہل کمال تھے۔ التمش کا وزیر فخر الدین عصامی خود بڑا فاضل شخص تھا' وہ بغداد کے دربار خلیفہ میں تیس برس کام کر چکا تھا۔ پھر اس کی جگہ نظام الملک محمد جنیدی وزیر مقرر ہوا جو اپنے تدبر اور علم و فضل کے علاوہ علم دوستی اور علم پروری کے لیے بھی اس عہد میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا' خود اس کا دربار بھی علماء و فضلاء اور شعراء سے مزین رہا کرتا تھا۔ التمش کے ایک امیر بہاء الدین علی کا شمار بھی اہل علم واہل ذوق میں ہوتا تھا اور اس کا دربار بھی شعراء کی سرپرستی کے لیے مشہور تھا۔

فخر الدین مبارک شاہ جو فخر مدبر کے نام سے معروف ہے' التمش کے دربار سے وابستہ رہا' اس نے بحر الانساب یا سلسلہ الانساب لکھ کر قطب الدین ایبک کو پیش کی تھی' اس کی دوسری کتاب آداب الحرب والشجاع ہے' جسے اس نے التمش کے نام پر معنون کیا تھا۔ یہ فارسی زبان میں فنون جنگ پر بہترین کتاب ہے۔ اسی عہد کے ایک نامور اہل علم مؤید جرجامی ہیں' جنہوں نے امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء علوم الدین کا فارسی میں ترجمہ کرکے التمش کے نام منسوب کیا' قاضی منہاج سراج نے اپنی کتاب طبقات ناصری میں ذکر کیا ہے کہ التمش کے دور میں علم وادب کی جو ترقی شروع ہوئی وہ آئندہ برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔

شمس الدین التمش نے اس بات کی بھی کوشش کی بیرون ہندوستان سے اچھی کتابیں منگوائی جائیں اور ملک کے علمی خزانہ کو مالامال کیا جائے۔ بلبن کے بیٹے بغرا خان نے اپنے بیٹے کیقباد کو نصیحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ میرے والدین نے اتالیق کو حکم دیا تھا کہ آداب السلاطین اور مآثر السلاطین جیسی کتابیں جو سلطان شمس الدین التمش کے بیٹوں کے لیے بغداد سے لائی گئی تھیں' ہم لوگوں کو پڑھائی جائیں۔ دراصل التمش نے اپنے بیٹے محمود کی خاطر خواہ تعلیم کے لیے علاحدہ انتظام کر رکھا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی رضیہ سلطان کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی بڑا اہتمام کیا تھا جس کی وجہ سے وہ انتہائی تعلیم یافتہ اور قابل حکمراں ثابت ہوئی تھی۔

عہد شمسی میں صوفیہ کرام نے بھی تصنیفی کاموں سے دلچسپی لی' چنانچہ خواجہ اجمیری کے خلیفہ سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوری کے مکتوبات فن انشاء میں مشہور ہیں' ان ہی کی اصول الطریقہ اور سرور الصدور نامی کتابیں ہیں' اسی نام کے ایک اور بزرگ قاضی حمید الدین ناگوری تھے جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے اور دہلی آکر خواجہ بختیار کاکی کے عقیدت مندوں میں شامل ہوئے اور سماع کے بڑے دلدادہ تھے' ان کی کتاب طوالع الشموس مشہور ہے' ان کی ایک کتاب رسالہ عشقیہ ہے جس میں عشق الہیٰ کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔

خاندان التمش کے دوسرے بادشاہ

1236ء میں التمش کی وفات کے بعد دس برسوں تک ملک میں سیاسی بدانتظامی رہی، التمش کے بعد کچھ عرصہ کے لیے اس کا بیٹا رکن الدین فیروز سلطان بنا، اس کا دور اگرچہ ناکام تھا، لیکن اس نے بھی علم وادب سے دلچسپی لی، مشہور شاعر تاج الدین سنگریزہ اس کے عہد میں دبیر الملک کے منصب پر فائز تھا، مولانا شہاب الدین مہمرہ جیسے نامور شاعر بھی جن کو امیر خسرو نے اپنا استاد بنایا تھا۔ فیروز کے دربار سے منسلک رہے، سلطان فیروز کے حکم سے امام رازی کی عربی کتاب مکتوم کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ فیروز کا زمانہ حکومت صرف سات ماہ رہا۔

پھر التمش کی بیٹی رضیہ سلطان تخت سلطنت پر بیٹھی، فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ خود بھی قرآن اور دوسرے علوم میں دستگاہ رکھتی تھی اور علماء وفضلاء کی سرپرست رہی۔ دہلی کے مدرسہ ناصریہ کا اہتمام اسی نے قاضی منہاج الدین سراج کو سپرد کیا تھا۔ انہوں نے طبقات ناصری میں رضیہ کو عالم نواز کے لقب سے یاد کیا ہے۔

رضیہ کے بعد اس کا بھائی بہرام شاہ تخت نشین ہوا جس نے دوسال سے کچھ زائد حکومت کی، وہ مولانا قاضی منہاج سراج کا معتقد رہا اور ان کو دہلی اور تمام مملکت کا قاضی مقرر کیا۔ اس عہد کے ایک ممتاز عالم قاضی جلال الدین کاشانی تھے، جنہیں بہرام نے دہلی کی قضاءت سے معزول کر دیا تھا۔ بہرام کے بعد علاء الدین مسعود شاہ بادشاہ بنا جس نے چار برس حکومت کی۔ اس نے قاضی جلال الدین کاشانی کی قدر دانی کی، مولانا منہاج عہدۂ قضاء سے علاحدہ ہوگئے۔ ناصر الدین محمود کے زمانہ میں بلبن نے ان کی قدر دانی کی اور پرانے عہدہ پر مامور کرتے ہوئے مدرسہ ناصریہ کے اوقاف کا متولی اور گوالیار کا قاضی مقرر کیا۔

ناصر الدین محمود التمش کا چھوٹا بیٹا تھا۔ بڑا نیک نفس وصالح اور سلیم الطبع تھا، اس میں اولیاء اللہ کے اوصاف تھے، علاء الدین مسعود کے بعد وہ تخت سلطنت پر بیٹھا اور بلبن کو تمام کاروبار سلطنت حوالہ کرکے خود گوشہ نشین ہوگیا۔ وہ صرف دربار میں آتا اور پھر محل میں جاکر عبادت اور قرآن کی کتابت میں مصروف ہو جاتا۔ بائیس برس کی حکومت میں وہ درویشانہ زندگی گزارتا رہا، سلطان کو بابا فرید الدین گنج شکر سے بڑی عقیدت تھی۔ علماء وفضلاء سے وہ تعلق خاطر رکھتا تھا۔ مولانا منہاج الدین سراج حضر وسفر میں اس کے ساتھ رہتے تھے۔ سلطان نے ان کو صدر جہاں اور پھر قاضی دہلی اور تمام مملکت کا قاضی القضاۃ بنایا۔ مولانا منہاج الدین نے اپنی مشہور تاریخ طبقات ناصری ختم کرکے اسی بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور اسی کے نام پر اس کا نام طبقات ناصری رکھا، بادشاہ نے بھی نہایت قدر دانی میں اپنی چادر اتار کر ان کو دیدی اور بڑے انعامات سے نوازا۔ طبقات ناصری کارآمد تاریخ ہے۔ اس میں 23 طبقات ہیں جن میں ابتدائے عالم سے لے کر 1261 تک کے تاریخی واقعات ہیں، دہلی سلطنت کے قطب الدین ایبک سے ناصر الدین محمود تک سلاطین دہلی اور ان کے امراء کے حالات اخیر کے ابواب میں بیان ہوئے ہیں۔ دہلی کے غلام سلاطین پر تاج المآثر اور طبقات ناصری دو معاصر کتابیں ہیں۔ مؤلف بلبن کی تخت نشینی کے وقت زندہ تھے، لیکن تاریخ 658 مطابق 1260 پر ختم کر دی ہے۔ مولانا ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ عہد بلبن سے شروع کی ہے۔

ناصر الدین محمود کے زمانے میں ہی قاضی عماد الدین محمد بن اسماعیل اشفور قانی ایک بڑے فقیہ اور جید عالم تھے۔ انہیں سلطان مسعود کے زمانے میں قاضی ممالک کے منصب پر فائز کیا گیا تھا، ناصر الدین محمود کے عہد میں 646 تک وہ اس عہدہ پر مامور رہے تھے۔ ان کی

ایک قیمتی کتاب صنوان القضاء وعنوان الافتاء ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں قضاء کے آداب اور مسائل کے موضوع پر ہے اور اس موضوع پر ہندوستان میں لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی قاضی شریعت امارت شرعیہ پٹنہ نے اس کی تحقیق کر کے چار جلدوں میں طبع کرایا ہے۔ قاضی جلال الدین کاشانی بھی اس عہد کے ممتاز عالم تھے جنہیں قاضی اشفور قانی کے بعد 647 میں سلطان ناصر الدین محمود نے قاضی ممالک کے عہدہ پر فائز کیا تھا۔ قاضی شمس الدین بہرائچی بڑے صاحب فضل و کمال تھے' سلطان محمود نے انہیں دہلی کا قاضی بنایا تھا' وہ بادشاہ کے کاموں میں بھی مشیر بنے رہے۔ مولانا جمال الدین بسطامی کو سلطان نے شیخ الاسلام بنایا تھا اس عہدہ پر وہ چار سال رہ کر وفات پا گئے۔ مولانا قطب الدین بھی اس عہد کے نامور عالم تھے' وہ بہرام شاہ کے زمانے میں شیخ الاسلام رہ چکے تھے۔ سلطان کے دربار کے شعراء میں مولانا منہاج الدین اور عمید الدین سنامی خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

غیاث الدین بلبن

سلطان غیاث الدین بلبن سلاطین دہلی میں اپنی شان و شوکت اور عظمت و دبدبہ کے لیے سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے' بلبن کو التمش نے خرید کر تربیت دی تھی اور اپنے چالیس امراء میں شامل کیا تھا۔ ناصر الدین محمود کے زمانے میں یہ قاضی ممالک بنا اور بیس برس تک اس عہد پر رہ کر ناصر الدین کے نام سے تحت حکومت کرتا رہا۔ محمود کی وفات کے بعد بلبن ہی تخت نشین ہوا اور مزید بیس برس پوری شوکت و شان کے ساتھ حکومت کی۔ اس کا نظریہ تھا کہ نبوت کے بعد خلق کی خدمت کا سب سے بڑا ذریعہ بادشاہت ہے۔ بادشاہ کے مقام کو اس نے بہت اونچا کر دیا۔ وہ خود بھی اس مقام کے آداب کی بے انتہا رعایت کرتا تھا۔ بلبن کے طویل دور میں دہلی سلطنت امن و امان کی آماجگاہ رہی' چنگیزی فتنہ کو اس کے عہد میں دہلی پر حملہ کی جرأت نہ ہو سکی۔ اسی وجہ سے دوسرے علاقوں سے بڑی تعداد میں شہزادے اور علماء و فضلاء اس کے دربار میں اور ہندوستان میں آ گئے تھے۔ بلبن کے دربار میں پندرہ شہزادے پناہ گزیں تھے۔ اور ان شہزادوں کے ساتھ بھی کافی تعداد میں علماء و فضلاء اور ارباب کمال آ گئے تھے۔ بلبن نے ان ارباب کمال اور علماء و فضلاء کی بڑی قدر دانی کی۔ وہ خود بھی عالم و فاضل تھا اور اس کی طبیعت پر مذہبی رنگ غالب تھا۔ التمش کے شاہی دربار میں وہ صلحاء کی صحبت اور فقہاء و علماء کی مجلسوں سے مستفید ہوتا تھا۔ خواجہ نظام الدین اولیاء نے اس کی راسخ العقیدگی اور عبادت کی تعریف کی ہے۔

بلبن کو مشائخ میں بابا فرید گنج شکرؒ سے عقیدت تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی ایک بیٹی بابا صاحب کی عقد میں تھی۔ وہ مشائخ اور علماء کی بے حد تعظیم کرتا تھا اور حصول برکت کے لیے ان کے گھر جایا کرتا تھا' وہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد مشائخ کے مزاروں کی زیارت کے لیے جاتا۔ اس کے دور میں اتنے مشائخ جمع ہو گئے تھے کہ مورخین نے اس عہد کو خیر الاعصار کہا ہے۔ بابا فرید گنج شکر' خواجہ علی چشتی' شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی' ان کے صاحبزادے شیخ صدر الدین' شیخ بدر الدین غزنوی' شیخ ابو المؤید' شیخ نظام الدین اولیاء' شیخ جمال الدین ہانسوی' خواجہ علاء الدین علی بن احمد صابر' شیخ حسام الدین ملتانی' شیخ نجیب الدین فردوسی اور شیخ ابو بکر طوسی وغیرہ سے پورا ملک منور ہو گیا تھا۔

ان مشائخ کے علاوہ فضلاء و علماء بھی بڑی تعداد میں اس دور میں جمع ہو گئے تھے۔ بلبن نے ان علماء اور ارباب کمال کو علاحدہ علاحدہ محلوں میں آباد کیا تھا اور ان کی بھرپور سرپرستی کی تھی جس سے اس عہد میں علم و فن کی بڑی رونق ہو گئی تھی۔

بلبن ہمیشہ علماء اور مشائخ کے جلو میں رہتا تھا' وہ علماء کے بغیر کھانا نہیں کھاتا تھا' اس کا دستر خوان مذہبی مذاکرے کی مجلس میں منتقل ہو جاتا تھا' وہ شاہی جلال کے باوجود علماء کے گھروں پر بے تکلف جاتا' کسی عالم کا انتقال ہو جائے تو جنازہ میں شریک ہوتا اور تعزیت کے لیے گھر جاتا۔ ان کے عزیزوں کے وظیفے مقرر کرتا۔ کہیں وعظ کی مجلس ہوتی رہتی تو سواری سے اتر کر عام لوگوں کے ساتھ وعظ سننے بیٹھ جاتا۔ بلبن کے دور میں مشہور علماء میں ایک مولانا برہان الدین محمود بلخی تھے جو صاحب ہدایہ شیخ برہان الدین مرغینانی کے شاگرد تھے۔ ان سے ہی ہندوستان میں ہدایہ کو رواج ملا' علامہ نجم الدین دمشقی فلسفہ کے عالم اور امام فخر الدین رازی کے شاگرد تھے۔ شیخ سراج الدین ابو بکر فقہ و اصول فقہ اور عربی ادب کے بڑے عالم تھے۔ مولانا شرف الدین والوالجی درس فقہ کے لیے مشہور تھے۔ مولانا برہان الدین بزار اور قاضی رکن الدین سامانوی بھی اس دور کے مشہور فقیہ تھے۔ مولانا کمال الدین زاہد بڑے زاہد و متقی عالم تھے۔ ان سے ہی شیخ نظام الدین اولیاء نے مشارق الانوار پڑھی تھی۔ مولانا شمس الدین خوارزمی یگانہ عصر تھے' دہلی کے تمام اساتذہ ان کے شاگرد تھے' ان کے تین چہیتے شاگردوں میں مولانا قطب الدین ناقلہ مولانا برہان الدین عبد الباقی اور شیخ نظام الدین اولیاء تھے۔ بلبن نے ان کو شمس الملک کا خطاب دے کر سلطنت کا مستوفی الملک (آڈیٹر جنرل) مقرر کیا تھا۔ مولانا فخر الدین ناقلہ فقہ و اصول اور عربی ادب کے بڑے ماہر تھے۔ بلبن نے ان کو صدر جہاں بنایا تھا۔ اسی طرح قاضی رفیع الدین قارزونی، قاضی شمس الدین' قاضی جلال الدین کاشانی' قاضی سدید الدین اور قاضی ظہیر الدین وغیرہ بھی اس عہد کے بلند پایہ عالم اور منصب قضاء پر فائز اصحاب تھے۔

بلبن نے تعلیم کی ترویج سے بے حد دلچسپی لی' درس کے لیے مشہور فقہاء کے لیے تعلیم و تدریس کا انتظام کیا۔ دہلی کے دو مدارس مدرسہ معزیہ اور مدرسہ ناصریہ کے اخراجات شاہی خزانے سے پورے کیے جاتے تھے۔

اس عہد میں امراء کے دربار بھی علم و فضل کے مراکز بن گئے تھے' بالخصوص بلبن کے بیٹے خان محمد کا ملتان میں دربار بے مثال تھا۔ جہاں فضلاء و شعراء کا مجمع رہتا تھا اور شعر و ادب کے علمی نکات پر گفتگو ہوتی تھی۔ خان محمد کے دربار سے امیر خسرو جیسی عظیم شخصیت اور امیر حسن جیسے ماہر فن شاعر وابستہ تھے' شہزادہ خود بھی شعر و ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتا تھا' اس نے ایک بیاض شعری تیار کی تھی جس میں اپنے ذوق کے مطابق بیس ہزار اشعار منتخب کیے تھے۔ اس انتخاب پر امیر خسرو اور امیر حسن سجزی بھی داد دیتے تھے۔ شہزادہ محمد کی علمی سرپرستی کی شہرت بیرون ملک پہنچی ہوئی تھی۔ دہلی کے شاہی دربار سے بھی کئی فضلاء سلطان محمد کے دربار ملتان سے وابستہ ہو گئے تھے۔ شہزادہ نے ان کو جاگیریں دے کر اپنی قدردانی کا ثبوت دیا۔ سلطان محمد اس بات کی کوشش کرتا کہ بیرون ملک کے ارباب کمال اس کے دربار میں آئیں' وہ لاہور میں خود شیخ عثمان ترمذی کی خدمت میں حاضر ہوا جو توران کے بڑے جید عالم تھے اور انہیں اپنے یہاں قیام کرنے کی بہت منت سماجت کی۔ اس نے دو مرتبہ شیخ سعدی کی خدمت میں شیراز قاصد بھجوا کر ان کو ملتان آنے کی دعوت دی اور تحائف کے ساتھ سفر خرچ بھیجا۔ بلبن کے دوسرے بیٹے شہزادہ بغرا خان کے یہاں بھی ادب کی مجلسیں قائم ہوتی تھیں جہاں ماہرین موسیقی' ارباب نشاط اور مغنیوں کا اجتماع رہتا تھا۔ اس کے درباری شعراء میں شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر کے علاوہ ایک زمانے میں امیر خسرو اور حسن سجزی بھی رہتے تھے۔ ان امراء کی تقلید میں ایسے علمی جلسے ہر محلہ اور آبادی میں منعقد ہونے لگے تھے۔

علاء الدین کشلی خان جو بلبن کا بھتیجہ تھا' وہ بھی اہل علم کا قدر داں اور فیاض تھا۔ اس کے دربار کی شہرت سن کر مصر و شام' روم و بغداد' خراسان و ترکستان اور ماوراء النہر سے شعراء آتے اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر یہاں سے واپس جاتے۔ امیر خسرو سب سے پہلے اسی امیر کشلی خان کے دربار سے وابستہ ہوئے تھے۔ اسی طرح امیر علی سرجاندار بھی علمی قدردانی کے لیے مشہور امیر تھا اور کثرت سے سخاوت و فیاضی کرتا تھا۔ بلبن کے دربار کا ایک اور امیر ملک الامراء فخر الدین جو دہلی کا کوتوال تھا اہل علم کی سرپرستی اور علمی سخاوت و فیاضی کے لیے مشہور تھا۔ اس کے یہاں ہزاروں افراد قرآن کی تلاوت کے لیے متعین رہتے تھے۔ امیر خسرو کی شہرت و عظمت کا آغاز اسی دور سے ہوتا ہے۔ شہزادہ محمد کی شہادت کے بعد خسرو گوشہ نشین ہوگئے' کیقباد کی تخت نشینی کے بعد جب بغرا خان اور کیقباد کی ملاقات ہوئی تو اس موقع پر خسرو موجود تھے اور کیقباد کی خواہش پر اس تاریخی ملاقات کو انہوں نے منظوم کیا اور قران السعدین کے نام سے تین ہزار نو سو چوالیس اشعار کی ایک مثنوی لکھی۔ بادشاہ نے ان کو اپنا ندیم خاص بنالیا تھا اور ان کے لیے روزینہ مقرر کر دیا تھا۔ ان کی شعری تصانیف غزلوں اور مثنویوں پر مشتمل ہے' تحفتہ الصغر' غرۃ الکمال' وسط الحیوۃ' بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال' اسی طرح خمسہ اہم دیوان ہیں۔

8.2.2 خلجی عہد میں علمی خدمات

جلال الدین خلجی

خلجی عہد کا آغاز جلال الدین فیروز خلجی سے ہوتا ہے' جلال الدین خلجی خود عمدہ علمی ذوق رکھتا تھا۔ وہ خود شاعر تھا اور شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتا تھا' وہ علم و ہنر کا بڑا قدر داں رہا۔ جلال الدین خلجی کے ہم نشینوں میں ممتاز ارباب علم ہوئے جو اکثر اس کی نجی مجلسوں میں شریک رہتے۔ امیر خسرو اس کی مجلس میں ہر روز نئی نئی غزلیں لاتے اور بادشاہ ان غزلوں کو خوب پسند کرتا اور انعامات سے نوازتا۔ جلال الدین نے امیر خسرو کو اپنے شاہی کتب خانہ کا کتاب دار مقرر کیا تھا۔ وہ بادشاہ ہونے سے پہلے بھی امیر خسرو کا قدر داں رہا تھا۔ اس نے خسرو کو اپنا مصحف دار بھی بنایا تھا اور امیر کا خطاب دے کر سفید کمر بند لگانے کی اجازت دی تھی جو صرف شاہی خاندان کے لیے مخصوص تھا۔ جلال الدین کے ہم نشینوں میں امیر خسرو کے علاوہ تاج الدین عراقی' خواجہ حسن' معید دیوانہ' امیر ارسلان قلی' اختیار الدین یاغی اور باقی خطیر وغیرہ رہے۔ جن میں سے بعض نے شاعری اور تاریخ پر کتابیں تصنیف کی۔ جلال الدین خلجی کے عہد میں سدی مولہ کے قتل کا واقعہ پیش آیا' یہ بابا فرید گنج شکر سے وابستہ اور نیک بزرگ تھے' اس عہد میں سعد الدین علم منطق کے بڑے جید عالم تھے۔

علاء الدین خلجی

جلال الدین کے بعد علاء الدین تخت نشین ہوا۔ یہ ان پڑھ تھا لیکن جلد ہی اس نے اپنی کمی کا احساس کرکے ضروری حد تک پڑھنا سیکھ لیا۔ اور اس کے سامنے علمی مذاکرے ہونے لگے۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور علماء خصوصا قاضی مولانا کہرامی اور قاضی مغیث الدین کے ساتھ لطف و کرم سے پیش آتا۔ علاء الدین کا دور اہل علم اور ارباب کمال کی کثرت کے لیے ممتاز ہے' مولانا عبد الحق حقی نے لکھا ہے کہ: سلطان علاء الدین کے عہد میں دہلی علماء و فضلاء کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔ مسجدیں' مدرسے' حمام' مقبرے' قلعے اور ہر قسم کی عمارتیں اس

طرح تعمیر ہوئیں کہ جیسے کسی نے جادو کیا ہے اور فضلاء کا مجمع ایسا ہوا جو کہ کسی زمانے میں نہیں ہوا۔ علوم وفنون کے 45 ماہرین درس و تدریس میں مشغول تھے۔ دربار علائی سے وابستہ شعراء میں امیر خسرو، امیر حسن، صدر الدین علی، فخر الدین خواص، حمید الدین راجہ، مولانا عارف، عبدالحکیم اور شہاب الدین صدر نشین وغیرہ تھے۔ ان سب کو دربار سے وظائف ملتے تھے۔ اس دور کے مؤرخین میں امیر ارسلان کلاہی اور کبیر الدین فرزند تاج الدین عراقی ہیں جس نے فتوحات علائی پر کتاب لکھی تھی، جس کا نام فتح نامہ ہے۔ ان کے علاوہ امیر خسرو اور ضیاء الدین برنی بھی اس دور کے بڑے مورخین میں ہیں، نثر نگاروں میں عین الملک ملتانی کا تعلق دربار علائی سے ہے جس کی انشائے ماہر وشستہ نثر میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔

مقامی زبانوں میں علمی خدمات

خلجی خاندان کی حکومت چالیس برس رہی۔ اس زمانے میں علم و ادب کو بھی سب سے زیادہ رونق حاصل ہوئی۔ اوپر ذکر کی گئی کتابوں کے علاوہ اس دور میں ملفوظاتی ادب بھی سامنے آیا، چنانچہ شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کو امیر خسرو نے افضل الفوائد کے نام سے حسن سنجری نے فوائد الفواد کے عنوان سے اور شیخ نصیر الدین چشتی نے مفتاح العاشقین کے نام سے جمع کیا، خواجہ محبوب الٰہی کے ایک شاگرد امیر خورد نے ان کی حیات سیر الاولیاء کے نام سے لکھی۔

دور علائی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں سنسکرت اور دوسری مقامی زبانوں میں بھی تصنیفی کام انجام پائے۔ سارنگ دھرنے کاویہ اور ہمیہ راسد تصنیف کیا، جن میں رنتھمبور پر علاء الدین کے حملہ کے وقت ہمیہ دیو کے مدافعانہ اور جان نثارانہ انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ اس نے سنسکرت نغموں کی ایک بیاض دھرپدھتی کے نام سے مرتب کی تھی۔ اس دور کا ایک مشہور شاعر بھوپتی تھا۔ نلا سنکھ اور ملا داؤد بھی اس دور کے شعراء ہیں۔ امیر خسرو نے بھی ہندی میں شاعری کی تھی۔ اس دور میں گجراتی ادب، بنگال میں بنگالی ادب اور جنوبی ہند کے علاقوں میں علاقائی ادب پر بھی کام ہوئے۔

8.2.3 تغلق دور میں علمی خدمات

تغلق دور حکومت دہلی سلطنت میں عروج اور زوال دونوں کی داستان لیے ہوئے ہے۔ غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کے دور میں حکومت حسب سابق مضبوط و متحد اور وسیع رہی۔ چنانچہ اس زمانے تک دیگر میدانوں کی طرح علم و ادب کے میدان میں ترقیاں ہوتی رہیں، لیکن فیروز تغلق کا دور آتے آتے دہلی کی وسیع سلطنت میں بکھراؤ شروع ہو گیا تھا اور ایک مضبوط مرکزی سلطنت کے کئی بازو علاحدہ ہو گئے۔ دہلی سلطنت کی مرکزی حکومت باقی رہی، لیکن متعدد علاقائی حکومتیں وجود میں آگئیں، ان میں ملتان، گجرات، بنگال اور جنوب میں دکن کی حکومتیں زیادہ مشہور تھیں۔ نئی قائم ہونے والی حکومتیں کچھ مسلم تھیں اور کچھ ہندو۔ اس تبدیلی سے جہاں مرکزی حکومت کا دائرہ سکڑ گیا وہیں نئے علاقائی مراکز قائم ہو گئے اور ایک دہلی کے بجائے کئی شہروں میں علم و فن اور ادب و شاعری کی آبیاری ہونے لگی اور اس سے علاقائی زبانوں کو بھی فروغ ملا، لیکن اس کے باوجود دہلی میں علم و ادب کی محفل سونی نہیں ہوئی، بلکہ اس کی شان و شوکت اور بڑھتی گئی، بالخصوص فیروز تغلق کے زمانے میں شرعی علوم میں تصنیف اور مدارس کے قیام کے بڑے اہم کام انجام پائے۔

غیاث الدین تغلق

علاء الدین کا دور جیسا کہ گذشتہ سطور میں لکھا گیا علم و ادب کی بہار کا دور تھا' دہلی اور دوسرے شہروں میں علماء و فقہاء اور مشائخ اس کثرت سے جمع ہو گئے اور تعلیم و تصنیف کے کام اس طرح انجام پا رہے تھے کہ دہلی بغداد و بخارا کے لئے قابل رشک بن گیا تھا۔ لیکن علاء الدین کی وفات کے بعد ملک کافور قطب الدین مبارک خلجی' اور غاصب خسرو خان کا دور علم و تہذیب کے لیے ایک مصیبت ثابت ہوا۔ اہل علم بکھر گئے اور اہل اسلام کے لیے مصائب شروع ہو گئے اور غیاث الدین تغلق بڑی نازک صورت حال میں بر سر اقتدار ہوا اور اس لحاظ سے وہ اسلامی ہندوستان کی مایہ ناز ہستیوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ وہ ملتان کا گورنر تھا جہاں منگولوں کی روک تھام اس کے ذمہ تھی اور اس نے 29 دفعہ تاتاریوں سے مقابلہ کر کے ان کو شکست دی تھی جس کی وجہ سے غازی ملک کے لقب سے مشہور ہوا تھا۔ غیاث الدین تغلق ایک متدین اور احکام شریعت کا پابند شخص تھا' تخت نشین ہونے کے بعد مذہبی بد عنوانیوں کی اصلاح کی اور بیت المال کو استوار کیا۔ اس ضمن میں اس نے حضرت سلطان المشائخ سے بھی وہ رقم دریافت کی جو غاصب خسرو نے اپنی حمایت حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے علاوہ انہیں بھی بھجوائی تھی' لیکن سلطان المشائخ نے وہ رقم اس وقت خیرات کر دی تھی۔

غیاث الدین تغلق کے عہد میں تعلیمی ترقی کی راہیں وسیع ہوئیں۔ سلطان ارباب علم و فضل کا گرویدہ تھا' انہیں اپنے دربار میں مدعو کرتا اور ان کے لیے وظائف جاری کرتا۔ اس کا عہد بہت مختصر رہا۔ بنگال کے سفر سے واپسی میں دہلی کے قریب ایک حادثہ میں وہ جاں بحق ہو گیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق اگرچہ علم و فضل کا قدر داں تھا لیکن اس کے دور میں لائق ارباب علم اتنے نہ تھے جتنے عہد علائی میں تھے۔ مشائخ بھی اس قدر نہ تھے' دہلی کی آخری عظیم بزرگ شخصیت سلطان المشائخ محبوب الٰہی نے بھی سلطان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد انتقال کیا۔ سلطان غیاث الدین کی وفات سے اسلامی حکومت کی انتہائی وسعت کا زمانہ ختم ہو گیا۔

محمد بن تغلق

محمد بن تغلق اعلیٰ درجہ کا عالم و فاضل اور متعدد خوبیوں کا حامل شخص تھا۔ قرآن مجید کا حافظ' نماز و روزہ کا پابند' بہترین خطاط' ساحر البیان خطیب' عربی و فارسی میں اعلیٰ خطوط لکھنے والا' اور جدت پسند تھا۔ اس کا حافظہ بھی بڑا عجیب و غریب تھا جو کچھ پڑھتا اس کو تاریخ کے ساتھ یاد رکھتا' کئی کتابیں اس کو زبانی یاد تھیں' طب' منطق' ہیئت اور ریاضی میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ یونانی فلسفہ کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا' علماء و فضلاء سے مذاکرے کیا کرتا تھا' ارباب علم و دانش کو دلائل سے قائل کرتا۔ اشعار میں گہرے معانی اور نئی نئی تشبیہات و استعارات پیدا کرتا کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ اپنی ان خوبیوں کے ساتھ وہ فیاضی اور غربا پروری کے لیے بھی مشہور تھا۔ اس کی فیاضی کی شہرت سن کر ارباب فضل دہلی آتے اور انعامات سے سرفراز ہو کر واپس جاتے' لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ تند خو اور وہمی مزاج رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے علمی ماحول پر برا اثر پڑا۔ اس نے دہلی کی جگہ دولت آباد کو دارالخلافہ بنانا چاہا اور اس کے لیے انتہائی شدت سے کام لیا' جس کے نتیجہ میں دہلی کی علمی محفلیں اجڑ گئیں اور تعلیمی ادارے و مدارس خالی ہو گئے' گو کہ بعض مؤرخین کے مطابق محمد تغلق اس تبدیلی کے ذریعہ دیوگیر کو اسلام کا مرکز بنانا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے اسلام کی شعاعیں دکن کے گوشہ گوشہ میں پہنچ سکیں اور اس کا یہ فیصلہ تبلیغ اسلام کی

شعوری کوشش تھی۔ محمد بن تغلق نے اپنے منصوبہ کو کامیاب نہ پاکر دوبارہ دہلی کو دارالخلافہ بنایا۔ اس بار بار تبدیلی کا بے حد نقصان ہوا' لیکن سلطان کا ذوق علمی تھا' اس کے دربار میں شروع سے آخر تک علمی معیار اونچا رہا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کے دربار میں عربی فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے ایک ہزار لائق شعراء تھے۔ اس کے دستر خوان پر دو دو سو علماء ہوتے اور وہ ان سے علمی مذاکرے کرتا۔

محمد بن تغلق کے دربار میں آنے والے نامور اہل علم میں القاموس کے مصنف علامہ مجد الدین' مولانا شمس الدین یحیی، شیخ عبدالعزیز الاردویلی جو علامہ ابن تیمیہ کے شاگرد رہ چکے تھے' موجود تھے۔ مشائخ میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی مشائخ چشتیہ کی یادگار تھے۔ اسی بادشاہ کے زمانے میں مشہور سیاح ابن بطوطہ دہلی آیا۔ محمد بن تغلق نے اسے دہلی کا قاضی مقرر کیا تھا اور کچھ عرصہ بعد اسے سفیر بنا کر چین بھیجا۔ مشہور مورخ ضیاء الدین برنی بھی اس دور میں موجود تھا۔ وہ سلطان کا ندیم خاص مقرر ہوا تھا۔ شعراء میں ملک الشعراء بدر چاچ تھا جس کی سلطان نے بڑی قدر کی اور فخر الزماں کا خطاب دیا' مولانا معین الدین عمرانی بڑے فقیہ تھے' جنہوں نے فقہ واصول کی کئی کتابوں جیسے کنز' منار' حسامی وغیرہ پر حواشی لکھے تھے۔ ضیاء نخشبی بھی اس عہد کے نامور فاضل ہیں' جنہوں نے سلک السلوک اور طوطی نامہ لکھی۔ یہ طوطی نامہ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہے۔ اس عہد کا ایک اور مشہور مؤرخ عصامی ہے جس نے 12 ہزار اشعار کی ایک مثنوی فتوح السلاطین لکھی جس میں غزنویوں' غوریوں' خاندان غلاماں' خاندان خلجی اور خاندان تغلق کے پہلے دو بادشاہوں کی فتوحات اور واقعات زندگی نظم کیے ہیں۔

فیروز تغلق

فیروز تغلق اپنے رفاہی کاموں' عوامی فلاح و بہبود اور علم و دین کی خدمت کے شاندار کارناموں کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی صف اول میں رکھے جانے کے لائق ہے۔ جس طرح اس نے سلطنت کی مادی خوشحالی پر توجہ دی۔ تعلیم وثقافت کے فروغ پر بھی خاطر خواہ توجہ دی۔ خود اس کی تعلیم بھی اعلیٰ درجہ پر ہوئی تھی' چنانچہ اس نے خود ایک کتاب فتوحات فیروز شاہی تصنیف کی۔ اس کے دربار میں ضیاء الدین برنی اور شمس سراج عفیف جیسے بڑے مؤرخ تھے۔ ان دونوں کی کتابیں تاریخ فیروز شاہی کے نام سے موجود ہیں۔ فیروز شاہ نے علماء وفضلاء کی پذیرائی کے لیے خاص اہتمام کر رکھا تھا' چنانچہ ایک خاص محل صرف علماء سے ملاقات کے لیے بنوایا تھا۔ فیروز تغلق نے ہزاروں غلاموں کو جمع کر لیا تھا جن میں ایک بڑی تعداد کو تعلیم اور درس سے لگا رکھا تھا' کچھ غلام قرآن کی تلاوت کرتے اور حفظ کرنے میں مشغول رہتے۔ کچھ مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور کچھ کتابوں کی نقلیں تیار کرتے۔ اس نے علم کے فروغ کے لیے باضابطہ قانون بنایا تھا اور سلطنت کے مختلف حصوں میں علماء وفضلاء کو آباد کیا تاکہ وہ لوگوں میں تعلیم کی اشاعت کریں۔ اس نے پرانے فرمانرواؤں کی عمارتوں کی مرمت کرائی جن میں مسجدیں اور مدارس کی بھی از سر نو مرمت کرائی اور ان کے اوقاف مقرر کیے چنانچہ' خود اس نے 40 مسجدوں اور 30 مدرسوں کا ذکر کیا ہے۔

فیروز شاہ نے ایک مدرسہ فتح خاں کے مقبرہ کے پاس بنوایا تھا۔ دوسرا مدرسہ فیروز آباد میں بنوایا تھا جو مدرسہ فیروز شاہی کہلاتا تھا' وہ اپنی علمی شہرت اور تعمیری دلآویزی میں تمام مدارس میں ممتاز تھا' مولانا جلال الدین رومی اسی مدرسے میں درس دیتے تھے۔ اس مدرسہ کو

دیکھنے کے لیے دور دراز کے علاقوں سے سیاح آتے تھے' مدرسہ کے اساتذہ اور تمام طلبہ کے لیے روزینے مقرر تھے۔ اچھے طلبہ کو وظیفہ دیا جاتا تھا۔

فیروز شاہ تغلق کے دور کے تین بڑے عالم مولانا احمد تھانیسری' مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر دہلوی تھے۔ مشائخ میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی فیروز شاہ نے بڑی قدر کی' بلکہ اس کی تخت نشینی میں شیخ چراغ دہلی کی کوششوں کا دخل رہا' شیخ صدر الدین ملتانی اسی دور میں شیخ الاسلام تھے۔ اس عہد کے شعراء میں قاضی عابد' مسعود بک' ظہیر دہلوی' حمید قلندر' امیر احمد اور سب سے معروف و مشہور رہے تھے۔

فیروز تغلق کے عہد میں فقہ کو خاص طور سے فروغ حاصل ہوا اور فقہ کے موضوع پر کتابیں لکھی گئیں' ان میں فقہ فیروز شاہی مشہور ہے' جو یعقوب مظفر کرانی نے تصنیف کی تھی۔ ایسے ہی ایک کتاب فوائد فیروز شاہی ہے' جسے شرف محمد عطائی نے تصنیف کیا تھا' فیروز شاہ کا ایک صاحب علم امیر تاتار خاں تھا' اس نے فقہ کی ایک اہم مبسوط کتاب فتاوی تاتار خانیہ تیار کرائی' جسے مولانا عالم بن علاء حنفی نے تیار کر کے امیر کے نام سے منسوب کیا۔ اس امیر نے علماء کی ایک جماعت کے ذریعہ تفسیر میں بھی ایسی ہی ضخیم کتاب تیار کرائی۔ حضرت چراغ دہلی کے ایک مرید مولانا رکن الدین نے 30 ہزار اشعار پر مشتمل ایک فقہی کتاب طرفۃ الفقہاء لکھی تھی۔

فیروز شاہ کے عہد میں سنسکرت کی کئی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ جن میں دلائل فیروز شاہی قابل ذکر ہے۔ اس دور کے مشائخ میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بھی ہیں۔ جن کے مکتوبات کا مجموعہ مکتوبات صدی اور مکتوبات دو صدی کے نام سے موجود ہے' عہد تغلق کا ایک مشہور ادیب عین الملک ملتانی ہے جس کی انشاء ماہر و مشہور ہے۔

8.2.4 لودھی عہد میں علمی خدمات

لودھی خاندان کی حکومت افغان حکمراں بہلول لودھی نے قائم کی تھی اور اپنی ہمت و محنت کے ذریعہ ختم ہوتی دہلی سلطنت میں ایک بار پھر روح پھونک دی۔ سید خاندان کی حکومت کے زمانہ میں دہلی سلطنت میں صرف آس پاس کے کچھ گاؤں رہ گئے اور سبھی جگہوں کے حاکم آزاد ہو گئے تھے۔ بہلول نے اپنی 38 برس کی مضبوط حکمرانی میں مقامی سرداروں کو قابو میں کیا اور دہلی کی عظمت اور اسلام کی شوکت پھر سے قائم کر دی' اس کا زیادہ وقت جنگوں میں گذرا۔ اس لیے وہ دوسرے میدانوں میں زیادہ کام نہ کر سکا' وہ اچھے کردار کا انسان' غریبوں کے لیے رحم دل اور سختی سے عدل گستری کرنے والا تھا۔ بہلول لودھی فضلاء کی محبت کا شوق رکھتا تھا اور ان کو انعامات دے کر علم کی قدر دانی کرتا تھا۔ اس نے کچھ مدارس بھی قائم کئے۔ اور ایسا امن و مان قائم کیا جس سے علم و ادب کی ترقی ہوئی۔ بہلول کے بعد اس کا بیٹا نظام خاں تخت سلطنت پر بیٹھا جس نے سکندر لودھی کا لقب اختیار کیا۔ لودھی حکومت میں یہ فرمانروا بڑی خوبیوں کا مالک' متدین بے حد انصاف پرور اور بڑا عالم و فاضل ہوا ہے۔ اس کا دور عوام کی خوشحالی کے لیے بڑا زریں دور ہے۔ اس عہد میں غلہ کی فراوانی ہو گئی تھی اور اشیاء کی قیمتیں بے حد ارزاں ہو گئی تھیں۔ اس نے غلہ پر سے سارے محصولات ختم کر دیئے۔ زراعت کو بڑی ترقی دی۔ غرباء کی فہرست تیار کر کے ان کے لیے چھ مہینے کا سامان فراہم کراتا' اس نے کوشش کی کہ کوئی کام خلاف شریعت نہ ہو' اس کی عدل نوازی کے قصے بہت مشہور ہیں۔

سکندر لودھی خود بھی بڑا فاضل اور عالم تھا' علماء کے ساتھ صحبت رکھتا تھا' ان سے مذہبی مناظرے کیا کرتا تھا' اس نے علوم وفنون کی فیاضیانہ سرپرستی کی۔ اس کے دستر خوان پر جید قسم کے علماء وفضلاء ساتھ ہوتے۔ سلطان خود بھی ایک اچھا شاعر تھا اور گلرخ تخلص استعمال کرتا تھا۔ اس کے دیوان میں آٹھ ہزار اشعار ہیں۔ سکندر لودھی نے اپنا دارالسلطنت آگرہ منتقل کر دیا تھا۔ وہاں عرب' ایران' بخارا اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کے علماء وفضلاء اس کی قدر دانی کی وجہ سے جمع ہو گئے تھے۔ سکندر کے علمی ذوق اور علم کی اشاعت کے شوق کا یہ عالم تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ تمام فوجی عہدیدار بھی تعلیم یافتہ ہوں' اس طرح اس کے دور میں فوجی فنون سپہ گری کے ساتھ علمی قابلیت بھی رکھتے تھے۔

سکندر لودھی کے عہد کا ایک اہم علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس دور میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی۔ پہلے ہندو فارسی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ سکندر لودھی نے انہیں ترغیب دی اور اس کی ترغیب پر کائستھوں نے فارسی سیکھی اور سرکاری عہدے حاصل کرتے گئے۔ اس سے دونوں قوموں کے باہمی روابط کو فروغ ملا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے علوم کا خود ان کی زبان میں مطالعہ شروع کیا۔ اس عہد میں سنسکرت کی کتابوں کا کثرت سے فارسی میں ترجمہ ہوا۔ سلطان نے ترجمہ کی ترغیب دی اور اس کی ہمت افزائی کی۔ سلطان کی فرمائش پر بہت سی کتابیں فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ طب پر سنسکرت کی ایک اہم کتاب ارگا مہا بیدک ہے اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا گیا اور طب سکندری نام رکھا گیا' موسیقی کی کتابوں کا بھی فارسی میں ترجمہ ہوا۔

علم وفن کی سرپرستی میں سلطان سکندر لودھی کے ذوق وشوق کا اثر اس کے امراء پر بھی تھا' چنانچہ اس کے متعدد امراء بھی علمی فیاضی میں بہت پیش پیش رہتے تھے۔ اس کے عہد میں ملتان سے دو بڑے عالم شیخ عبد اللہ اور شیخ عزیز اللہ دہلی آئے جنہوں نے درس و تدریس کے معیار کو بہت بلند کیا۔ مولانا رفیع الدین شیرازی محدث شیراز سے آئے' ملک العلماء مولانا عبد اللہ اس کے دربار سے وابستہ تھے' جنہوں نے فتوی دیا تھا کہ ہندوؤں کی ایک قدیمی عبادت گاہ کو گرانا خلاف شرع ہے اور ہندوؤں کے اشنان کی قدیم رسم بند کرنا جائز نہیں ہے۔ عہد سکندری کی ایک اہم علمی شخصیت شیخ جمال کی ہے جن کی تصنیف سیر العارفین مشائخ کے تذکرہ میں ہے' ان ہی کے صاحبزادہ شیخ گدائی ہیں جو عہد اکبری کے شیخ الاسلام ہوئے۔

8.2.5 علاقائی حکومتوں میں علمی فروغ

دہلی سلطنت میں عہد تغلق کے اندر جب مرکزی حکومت کمزور ہوئی اور علاقائی حکومتیں قائم ہو گئیں تو اس کا ایک مثبت پہلو یہ سامنے آیا کہ اب ہندوستان کے کئی شہروں میں علم وفن اور ادب وشاعری کی سرپرستی ہونے لگی۔ اب ایک دہلی کی جگہ کئی شہر علم وادب کے مراکز بن گئے۔ وہاں تصنیفی کام انجام پائے۔ بڑے بڑے ارباب فن اور اہل علم ان درباروں سے وابستہ ہوئے۔ وہاں علمی ادارے اور مدارس قائم ہوئے' تعلیم وتدریس کا فروغ ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علاقائی زبانوں کو فروغ ملا اور ان زبانوں میں بھی علمی کام انجام پانے شروع ہوئے۔

ان علاقائی حکومتوں میں سے علم وفن کے حوالے سے چند حکومتیں بڑی اہم رہی ہیں' دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی اور گلبرگہ

اور بیدر کو مرکزیت حاصل ہوئی۔ اس حکومت میں شیخ خواجہ گیسودرازؒ جیسے بزرگ تشریف لائے جنھوں نے اردو ادب کی ابتدائی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپ کی کتاب معراج العاشقین اسی دور کی یادگار ہے۔ فیروز شاہ بہمنی بڑا عالم و فاضل اور اہل علم کا قدر داں رہا ہے، محمود گاواں اور اس کے مدرسے کی شہرت آج بھی باقی ہے۔ بہمنی سلنت کے زوال کے بعد قائم ہونے والی پانچ سلطنتوں میں سے گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی حکومتوں میں بڑے اہم علمی کام انجام پائے اور جنوب کی متعدد علاقائی زبانوں کو بڑا فروغ ملا۔ محمد قاسم فرشتہ کی مشہور کتاب گلشن ابراہیمی، ابراہیم عادل شاہ کی طرف ہی منسوب ہے، جو تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

جونپور کی شرقی حکومت بھی علمی ترقی اور مدارس کے قیام کے لیے مشہور حکومت رہی ہے۔ جونپور کے مدرسہ میں ہی شیر شاہ سوری نے تعلیم پائی تھی۔ بڑے بڑے علماء و فضلاء، شعراء اور مشائخ شرقی حکومت کی شاہانہ عنایتوں سے مستفید ہوتے رہے تھے۔ علمی شہرت اور معیار کی وجہ سے جونپور کو شیراز ہند کہا جانے لگا تھا، قاضی شہاب الدین دولت آبادی (مشہور تصنیف پدماوت کا مصنف) جیسے فاضل اسی حکومت سے وابستہ رہے، سلطان ابراہیم شرقی کا دور علم و ادب کے حوالے سے یادگار ہے۔

گجرات کی مسلم حکومت نے صنعت و حرفت اور تعمیرات کے ساتھ علم و ادب کی بھی سرپرستی کی گجرات حکومت کے زیر سایہ متعدد شہروں میں اسلامی علوم کو ترقی ہوئی اور یہ علاقہ دہلی اور آگرہ پر سبقت لے جانے لگا۔ بنگال نے اسی دور میں علمی اعتبار سے ترقی کی، بنگال کے مسلم حکمرانوں نے بنگالی ادب کو بھی بڑا فروغ دیا۔ علاء الدین حسین شاہ نے بھگوت گیتا کا ترجمہ بنگالی میں کرایا اور اس کے بیٹے نصرت شاہ نے مہابھارت کا ترجمہ کرایا۔ اس طرح دیگر علاقائی حکومتوں میں بھی علم و ادب اور فنون کی سرپرستی ہوئی اور علمی خدمات کے دائرے وسیع ہوئے۔

8.3 دہلی سلطنت میں فن تعمیر

دہلی سلطنت کے کارناموں میں ایک اہم کارنامہ تعمیرات اور اس کا فن بھی ہے۔ مسلم سلاطین نے امن و امان، استحکام، عدل و انصاف، خوشحالی و فارغ البالی اور تعلیم و تمدن کے ساتھ تعمیرات سے بھی دلچسپی لی اور دہلی سلطنت کے پانچوں خاندانوں کی حکومتوں میں اس میدان میں نئے نئے تجربات کیے جاتے رہے۔ سلاطین دہلی کے یہ تعمیراتی کارنامے آج بہت کچھ مٹ چکے ہیں۔ لیکن جو کچھ باقی ہیں وہ اپنی عظمت و شوکت، نقش آرائی اور پختگی و حسن کے جلوے دکھانے کے لیے کافی ہیں، ان ہی نمونوں کو سامنے رکھ کر عہد سلطنت کے فن تعمیر کے نقوش کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شاہان دہلی نے اپنی ان خدمات کے تذکرے اپنی اور اپنے مؤرخوں کی تصنیفات میں کرائے ہیں۔ ان سے بھی عہد سلطنت کی تعمیرات اور ان کے طرز و صنعت پر روشنی پڑتی ہے۔

دہلی سلطنت کے فن تعمیر میں خاص بات یہ ہے کہ پورے تین سو برس کی مدت میں یہ فن مسلسل ارتقاء پذیر رہا، ہر بعد والے دور میں پہلے کی بہ نسبت کچھ نئے خیالات، نئے نقش و نگار، نئے طرز و انداز اور نئی اشیاء کے استعمال کو روبہ عمل لایا جاتا رہا۔ سلاطین اور ان کے امراء نے نہ صرف اپنے پیش رووں کی خدمات کو سراہا اور ان کے نقش قدم پر چلے، بلکہ اپنے ذوق و جدت طرازی کا استعمال کرکے اپنی

علاحدہ شناخت بھی بنائی۔

سلاطین دہلی کی تعمیرات مختلف مقاصد کے لیے استعمال ہوتی رہی ہیں ' انہوں نے مذہبی مقاصد سے لے کر مقبرے 'فوجی اہمیت کے قلعے 'تعلیم گاہیں ' محل ' دروازے ' منارے ' شہر اور اس کی دیواریں 'حوض اور سرائے وغیرہ متعدد قسم کی عمارتیں تعمیر کیں 'گوکہ ان عمارتوں کے مقاصد استعمال مختلف تھے 'لیکن انہوں نے ان سب میں اپنے طرز تعمیر کے نقوش ثبت کیے ہیں۔

مسلم حکمراں جب ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ مختلف فنون کے ماہرین کو نہیں لائے تھے ' چنانچہ ابتداء میں انہوں نے ہندوستانی ماہرین کی خدمت سے فائدہ اٹھایا۔ فن تعمیر میں بھی مستری اور کاریگر ہندوستانی تھے ' جو ہندوستان کے فن تعمیر سے آشنا تھے ' سلاطین دہلی نے انہیں کے ذریعہ اپنے اسلامی ذوق اور عربی انداز کی آمیزش کرتے ہوئے تعمیراتی کام انجام دیے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ عالم اسلام کے شہروں سے ماہرین فن بھی ہندوستان آنے لگے۔ بغداد و بخارا اور سمر قند کی تباہی سے بھی بہت سے اہل فن نے ہندوستان کارخ کیا' ان علاقوں سے آنے والے شاہی خاندان کے شہزادوں کے ساتھ بھی ان سے وابستہ اہل کمال اور ماہرین فن دہلی آئے' ان ماہرین اور اہل فن کے ذریعہ دہلی کے طرز تعمیر میں نئے نئے تجربات کیے گئے اور یوں فن تعمیر میں ارتقا ہوتا رہا۔

8.3.1 عہد غلاماں میں فن تعمیر

ہندوستان فن تعمیر میں پہلے سے ترقی یافتہ تھا۔ شمال اور جنوب میں بڑے بڑے مندروں کی عمارتیں اور ان کے نقش و نگار بلکہ اجنتا اور ایلورا کے غاروں کی تعمیر اور نقاشی اس کی روشن مثالیں تھیں۔ جب قطب الدین ایبک نے دہلی سلطنت کی بنیاد رکھی اور شمالی ہندوستان کے علاقوں کو فتح کیا تو اس کے سامنے ہندوستانی عوام کی شاندار تعمیرات موجود تھیں۔ یہاں کی عوام کے ذہنوں میں اپنی سلطنت کی عظمت کا نقش قائم کرنے کے لیے یہ مناسب تھا کہ بلند و بالا اور پر شکوہ عمارتوں کی تعمیر کی جائے۔ قطب الدین ایبک نے اس کے لیے مسجد قوۃ الاسلام کی بنیاد رکھی اور اس کے اذان خانہ کے طور پر عظیم الشان قسم کا مینارہ بنوایا۔ یہ منارہ جو اب قطب مینار کہلاتا ہے۔ دراصل مسجد کا اذان خانہ تھا' مسجد بڑی وسیع و عظیم بنانے کا منصوبہ تھا اور مینار کی تعمیر میں اس نے اپنے اسلامی ذوق اور عظمت و شکوہ کے اظہار کو سمویا تھا۔ اس مینارہ کی تعمیر میں زیادہ تر یہیں کے کاریگر جیسے مستری اور سنگ تراش استعمال کیے گئے۔ مسلم دنیا میں مینار اس سے قبل موجود تھے لیکن یہ مینار کچھ انفرادیت رکھتا تھا' اس کی اونچائی 71.4 میٹر رکھی گئی۔ بعد میں اس کی اوپر کی ایک منزل گر گئی تھی اور فیروز تغلق نے اس کی مرمت کرواکے ایک منزل کا اور اضافہ کرا دیا تھا۔ قطب مینار بلند تخیل کے ساتھ اور بہت عمدہ طریقہ پر بنایا گیا تھا۔ اس کے چھجے (بالکونی) اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں جو اس میں ابھرے اور باہر نکلے ہوئے ہیں۔ قطب مینار کی پہلی منزل پر آیت قرآنی لا اکراہ فی الدین (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) کندہ ہے۔ پورے مینار کو بہترین نقاشی سے آراستہ کیا گیا ہے۔

شمس الدین التمش نے ایبک کے کاموں کو آگے بڑھایا۔ اس نے مسجد قوۃ الاسلام کی توسیع کرائی اور شمال' جنوب اور مشرق کی سمتوں میں مسجد کے اندر اضافہ کر دیا جس سے یہ مسجد تین گنی ہو گئی۔ اس نے قطب مینار میں بھی اضافہ کرایا۔ التمش نے اجمیر میں ڈھائی دن کا جھونپڑا تعمیر کرایا' بدایوں میں مسجد اور دوسری عمارتیں بنوائیں۔ اس نے خود اپنا مقبرہ بنوایا جو مربع شکل کی عمارت تھا اور چاروں کونوں پر

ہشت پہل کی شکل دے کر گنبد تعمیر کیا گیا تھا' اندرونی دیواروں پر متاثر کن نقاشی کی گئی تھی جس میں خطاطی کے اندر ہندوستان کی گل کاری کی آمیزش کی گئی تھی۔ یہ گویا ہندو مسلم روایات کے آپسی امتزاج کا نشان تھا۔

بلبن کے دور میں وسط ایشیا سے آئے ہوئے مسلم ماہرین فن' ریاضی داں اور ماہرین تعمیرات سے بھی استفادہ کیا گیا چنانچہ بلبن کے مقبرہ میں محراب میں فنی اعتبار سے زیادہ پختگی نظر آتی ہے' اس میں محراب کو دونوں طرف ابھرے چھجے یا منڈیر جیسے پتھروں پر براہ راست ابھارا گیا ہے اور ہندوستان میں پہلے سے رائج طریقہ ترک کیا گیا ہے جس میں پتھر پر پتھر رکھ کر فاصلے کم کرتے جاتے تھے اور پھر اوپر ایک پتھر کی سل رکھ کر اسے ڈھک دیتے تھے۔

8.3.2 خلجی دور میں فن تعمیر

علاء الدین خلجی کے عہد سے مسلم فن تعمیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے' بلبن کے زمانہ میں بیرونی حملوں کی روک تھام اور اندرونی استحکام پر زیادہ توجہ ہونے کی وجہ سے تعمیرات پر توجہ زیادہ نہ ہو سکی۔ علاء الدین خلجی کے دور میں اس میدان میں ترقیاں ہوئیں اور بہت زیادہ عماراتی کام ہوا۔ علاء الدین نے سیری میں اپنا پایہ تخت تعمیر کرایا جو قطب سے کچھ کیلو میٹر کے فاصلہ پر تھا۔ اب اس کے نشان ناپید ہو چکے ہیں۔ علاء الدین نے قطب مینار سے دوگنا اونچا ایک اور مینار تعمیر کرانا چاہا لیکن اس کا یہ منصوبہ پورا نہیں ہو سکا' البتہ اس نے قوۃ الاسلام میں داخلہ کا ایک دروازہ بنوایا جو علائی دروازہ کہلاتا ہے۔ اسے نئے اصول پر بنایا گیا تھا جو ہندوستان میں اپنے طرز کی پہلی عمارت تھی۔ اس کی صنعت اور آرائش جاذب فکر و نظر ہے۔ نقادوں کے مطابق علائی دروازہ مسلمانوں کی ابتدائی تعمیرات کا بہت ہی حسین اور مکمل نمونہ ہے۔ اس دروازہ میں ایک مربع شکل کی عمارت ایک ہشت پہل میں تبدیلی ہو گئی ہے جس پر گنبد کا انحصار ہے۔ دروازہ کی اندرونی دیواریں بہت ہی مرصع نقش و نگار سے مزین ہیں اور ان میں عمدہ نفاست برتی گئی ہے۔

علاء الدین آخری سلطان ہے جس نے غلام عہد کے سلاطین کے فن تعمیرات کو برقرار رکھا۔

8.3.3 تغلق دور میں فن تعمیر

غیاث الدین تغلق کے دور میں طرز تعمیر کے اندر نقاشی اور نقش نگاری کو چھوڑ کر سادہ انداز اختیار کر لیا گیا' انتہا درجہ کی سادہ تعمیرات کا نیا اسٹائیل اس نے پیدا کیا' جس کا نمونہ تغلق آباد کا قلعہ ہے۔ اس قلعہ کی بنیاد ایک بلند پہاڑی پر ہے' اس کی چاروں طرف خندق ہے' قلعے میں چاروں طرف برج' فصیل' مینارے اور دروازے دیے گئے ہیں۔ اس کی شکل نیم مخمسی ہے۔ اس نئے طرز کی مثال ملتان میں غیاث الدین تغلق کا مقبرہ ہے۔ جو ہشت پہل ہے' اس کے مختلف زاویوں میں برج بنے ہیں۔ غیاث الدین تغلق کا یہ مقبرہ مشہور بزرگ شیخ رکن الدین ملتانی کو دے دیا گیا تھا' کیونکہ سلطان کی وفات اچانک دہلی میں ہو گئی تھی۔

محمد تغلق نے تعمیرات سے دلچسپی لی' اس کی تعمیرات میں دولت آباد کا قلعہ' شہر جہاں پناہ' دہلی کا لال گنبد اور غیاث الدین کا مقبرہ وغیرہ ہیں۔ محمد تغلق نے طرز تعمیر اور اس کے تصور میں کچھ تبدیلی کی' اس نے مقبرہ کے سوگوارانہ ماحول کو ختم کیا۔ مقبرہ کو جھیل کے

درمیان بنایااور گنبد اور دیواروں کے نقش ونگار کے ذریعہ دیکھنے والوں کے لیے ایک اچھامنظر فراہم کیا۔لال گنبد میں بھی اس نے نقش ونگار کے ذریعہ خوبصورتی پیدا کی۔

محمد تغلق کا سب سے اہم تعمیراتی کارنامہ دولت آباد کا قلعہ ہے۔ اس قلعہ میں حربی فن تعمیر کا بہترین استعمال کیا گیا ہے، اور محمد تغلق نے اپنی جدت پسندی اور بلند خیالی کا عکس دکھایا ہے۔ قلعہ کو ایک ایسی پہاڑی پر بنایا گیا جہاں تک پہنچنے کا راستہ بہت پیچ وخم کے ساتھ لے جایا گیا۔ تاکہ ایک چھوٹی فوج بھی دیر تک دشمن کا مقابلہ کرسکے اور ہر طرف سے دشمن پر حملہ کرنا ممکن ہو۔ روزنوں کی تعداد زیادہ رکھی گئی پھر قلعے کے دوحصے بنائے گئے۔ اوپر کی منزل فوجیوں کے لیے تھی، اور اسے نیچے کی منزل سے علاحدہ کر دیا گیا، اور اوپر کی منزل کا راستہ نیچے کی منزل سے علاحدہ کر کے زمین دوز اس طرح اوپر لے جایا گیا تھا کہ اگر دشمن نیچے کی منزل پر قبضہ کرے تو اوپر کی فوج کو مقابلہ میں دشواری نہ ہو۔ پھر زمین دوز راستوں کے بالائی حصہ پر ایک آہنی آنگیٹھی رکھی گئی تھی، جس میں حملہ کے وقت آگ جلادی جاتی تو اس کے دھویں اور شعلوں سے حملہ آور آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

محمد تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق بادشاہ ہوا تو غیاث الدین تغلق کے آسان اسٹائل کی طرف متوجہ ہوا، اس کی عمارتوں میں بڑی سادگی اور نشیب آ گیا۔ اس کی تعمیر میں اس کا مقبرہ اور قلعہ ہے جو فیروز شاہ کوٹلہ کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سی قدیم عمارتوں، مسجدوں اور مقبروں کی مرمت کرائی اور ان میں ترمیم و اضافے کرائے، فیروز شاہ کا مدرسہ بھی اس کی تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس نے اس کے علاوہ کثرت سے نہریں جاری کیں، کنویں کھدوائے، مسجدیں اور خانقاہیں بنوائیں، نئے شہر بسائے، حمام تیار کرائے، شفاخانے بنوائے، ہزاروں باغ لگوائے، جن سے اچھی آمدنی بھی ہونے لگی۔ فن تعمیر میں کسی جدت کے بجائے اس کی توجہ رفاہ عام، زراعت کی ترقی اور لوگوں کی بہبود پر رہی۔

فیروز شاہ کی عمارتوں میں پتھروں پر گچ یا چونے کے مسالے کی ایک بڑی سی تہہ چڑھائی جاتی تھی، جس پر سفید پتائی کی جاتی تھی۔ یہ طریقہ بعد میں بھی رائج رہا۔ فیروز کی عمارتوں میں سجاوٹ میں کنول نظر آتا ہے۔

فیروز کے وزیر خان جہاں تلنگی نے بھی عمارتیں بنوائیں۔ البتہ اس نے مسجدوں کی تعمیر میں جدت کی، جہاں پناہ کی کھڑکی مسجد اور نظام الدین کی کالی مسجد میں مسقف چبوترہ بنوا کر اس کے کھلے ہوئے حصوں کو چار صحنوں میں تقسیم کر دیا تاکہ اندر جانے والے لوگ دھوپ اور تپش اور بارش سے بچ سکیں۔ اس کا مقبرہ چھوٹا اور ہشت پہل ہے۔ مقبرہ کی یہی شکل بعد میں مدتوں تک اپنائی جاتی رہی ہے۔

8.3.4 سادات اور لودھی عہد میں فن تعمیر

سادات سلاطین کے زمانہ میں بڑے پیمانے پر مقبرے تعمیر ہوئے، ان میں سائز کا اضافہ ہوا، رنگ و زینت میں اضافہ کیا گیا، اور فرش اور دیواروں کو مزین کیا گیا۔ ان عمارتوں میں بہترین قسم کے میناروں، چھتریوں اور بڑے گنبدوں کا اضافہ کیا گیا۔

لودھیوں کے زمانے میں زینت و آرائش میں اور اضافہ ہوا، رنگین ٹائل کا استعمال کیا گیا، انہیں اونچے چبوتروں پر اٹھایا گیا۔ جس سے وہ عالیشان نظر آنے لگیں۔ کچھ مقبروں کو باغات میں تعمیر کیا گیا۔ لودھی گارڈن اسی کی مثال ہے۔ اس دور میں ایک نیا طریقہ یہ اختیار

کیا گیا کہ گنبد دوہرے بنائے گئے' سکندر لودھی کے مقبرے میں یہ فن پوری طرح اختیار کیا گیا ہے' اس میں اوپر اور نیچے گنبد ہوتے' اوپر کے گنبد کی اونچائی زیادہ رکھی جاتی اور نیچے کا گنبد اتھلا بنایا جاتا' اس کا فائدہ یہ تھا کہ اوپر کا گنبد زیادہ اونچا رکھنا آسان ہو گیا۔ بعد میں یہی طریقہ عام عمارتوں میں استعمال ہونے لگا۔

8.3.5 ہند اسلامی فن تعمیر

فن تعمیر کا یہ طرز جس میں ہندوستانی طرز کی آمیزش کرتے ہوئے اسلامی ذوق ورجحان کو برتا گیا' ہند اسلامی فن تعمیر کہلایا۔ مسلم سلاطین نے اپنی عمارتوں میں ہندوستان کے کئی اسٹائل اور بالخصوص نقاشی میں گل و بوٹے وغیرہ استعمال کیے۔ پھر ہندو مندروں میں مسلم طرز تعمیر سے متاثر ہو کر وسیع گنبد اور درباروں میں زیبائش و آرائش کے ملتے جلتے انداز اختیار کئے گئے۔ علاقائی حکومتوں کی تعمیرات میں اسی طرز کے اندر علاقائی اثرات بھی شامل ہوتے گئے' اور نئے نئے انداز کی عمارتیں بنیں۔

اس طرح سلاطین دہلی نے فن تعمیر کے میدان میں اپنے اعلیٰ ذوق' بلند خیالی اور وسیع تصور کے ساتھ اسلامی آہنگ کو شامل کر کے عمدہ و پختہ تعمیرات کی لافانی یادگاریں چھوڑی ہیں۔

8.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- دہلی سلطنت کے بادشاہوں نے علم کے فروغ اور تعمیرات دونوں سے دلچسپی لی۔ پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک خود تعلیم یافتہ اور اہل علم کا قدر داں تھا' صلحاء اور شعراء کی اس نے سرپرستی کی' مولانا بہاؤ الدین اوش جیسے عالم اور جمال الدین محمد اور قاضی حمید الدین جیسے شعراء اس کے دربار سے جڑے رہے' حسن نظامی نیشاپوری نے تاج المآثر ایبک کی خواہش پر لکھی۔ مشہور مؤرخ فخر مدبر نے بحر الانساب ایبک کو پیش کی' مولانا رضی الدین حسن صغانیمشہور مؤلف کتاب مشارق الانوار بھی اس دور میں تھے' جنہیں ایبک نے لاہور کی قضائت پیش کی تھی۔
- التمش کے دور میں بغداد اور دوسرے اسلامی شہروں کی تباہی سے بڑی تعداد میں علماء وفضلاء دہلی آگئے تھے۔ التمش نے ان کی بے حد قدر افزائی کی' اور ان کے لیے وظائف مقرر کیے۔ التمش نے علم کے فروغ کے لیے مدرسہ معزیہ اور مدرسہ ناصریہ قائم کیا اور طلبہ واساتذہ کے لیے اوقاف مقرر کیے۔ اس نے بغداد وغیرہ سے عمدہ کتابیں ہندوستان منگوائیں۔ التمش اکثر اہل علم کی صحبت میں رہتا اور علماء وصلحاء سے عقیدت مندانہ استفادہ کرتا تھا۔
- بلبن کے زمانے میں علماء وفقہاء کثرت سے دہلی آگئے تھے جنہوں نے علم کی اشاعت پر توجہ دی' ایسے علماء کی طویل فہرست ہے جن کی قدر دانی بلبن کرتا تھا اور اپنے دستر خوان پر انہیں شامل کرتا تھا۔ اس دور میں مشائخ کبار بھی متعدد تھے جن سے بلبن کے گہری عقیدت مندانہ مراسم تھے۔

- جلال الدین خلجی خود اچھا شاعر تھا' علاء الدین کے عہد میں دہلی میں سب سے زیادہ علماء وفقہاء جمع ہو گئے تھے۔ تعلیم کی اشاعت' اور وعظ ونصیحت سے کافی دلچسپی لی جاتی تھی۔ اس دور میں سنسکرت اور دوسری مقامی زبانوں میں بھی تصنیفی کام انجام پائے۔
- علمی کاموں کے ساتھ سلاطین دہلی نے تعمیرات سے بھی دلچسپی لی اور عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرائیں۔ قطب الدین نے مسجد قوۃ الاسلام بنوایا اور عظیم الشان قطب مینار تعمیر کرایا جو سلطنت دہلی کی تعمیری عظمت کا نشان ہے۔ التمش نے مسجد اور مینار میں اضافہ کے ساتھ اجمیر وغیرہ میں مسجدیں بنوائیں۔ علاء الدین خلجی کے زمانہ سے مسلم فن تعمیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے' اس نے خوبصورت علائی دروازہ بنوایا۔ سیری میں پایہ تخت تعمیر کرایا۔

8.5 نمونہ امتحانی سوالات

8.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مشہور ومعروف تاریخ "تاج المآثر" کس نے لکھی؟

(a)حسن نظامی نیشاپوری (b)مبارک شاہ (c)مولانا بہاء الدین (d)تمام غلط

2. سلک السلوک اور طوطی نامہ کے مصنف کون ہیں؟

(a)ضیاء بخشی (b)مبارک شاہ (c)حسن نظامی (d)مولانا بہاء الدین

3. اپنا دارالسلطنت کس نے آگرہ کو بنایا؟

(a)سکندر لودھی (b)التمش (c)قطب الدین ایبک (d)رضیہ سلطانہ

4. لکھ بخش کس کو کہا جاتا تھا؟

(a)قطب الدین ایبک (b)التمش (c)رضیہ سلطانہ (d)محمد بن تغلق

5. مورخ مبارک شاہ کی تصنیف کا نام بتائیں؟

(a)بحر الانساب (b)تاج المآثر (c)مشارق الانوار (d)مجمع البحرین

6. خواجہ محبوب الٰہی کے شاگرد امیر خورد نے ان کی حیات کو کس نام سے مرتب کیا؟

(a)سیر الاولیاء (b)مفتاح العاشقین (c)ملفوظات (d)تمام غلط

7. مدرسہ فیروز شاہی کس نے قائم کیا۔

(a)محمد بن تغلق (b)فیروز شاہ (c)التمش (d)رضیہ سلطانہ

8. کنز منار اور حسامی پر کس نے حاشیے لکھے۔

(a)مولانا معین الدین عمرانی (b)مبارک شاہ (c)ضیاء بخشی (d)مولانا بہاء الدین

9. مشارق الانوار کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a)مولانا رضی الدین صغانی (b)مبارک شاہ (c)ضیاء بخشی (d)مولانا بہاء الدین

10. قاضی منہاج سراج کی تصنیف کا نام بتائیں۔

(a)طبقات ناصری (b)تاج المآثر (c)مشارق الانوار (d)مجمع البحرین

8.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. علاء الدین کے عہد میں دہلی علماء وفضلاء کا مرکز تھا' وضاحت کیجیے۔
2. غیاث الدین بلبن کی علمی دلچسپیوں پر روشنی ڈالیے۔
3. محمد بن تغلق کی تعمیراتی خدمات کا تعارف کرائیے۔
4. مقامی زبانوں میں علمی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
5. لودھی عہد میں علمی خدمات پر تبصرہ کیجیے۔

8.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عہد غلاماں کی علمی خدمات پر گفتگو کیجیے۔
2. تغلق خاندان کے دور کی علمی اور تصنیفی خدمات پر مضمون لکھیے۔
3. علاء الدین خلجی سے مسلم فن تعمیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ تبصرہ کیجیے۔

8.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. آب کوثر : شیخ محمد اکرام' فرید بک ڈپو' دہلی
2. عہد وسطیٰ کا ہندوستان' حصہ اول : پروفیسر ستیش چندر' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' دہلی اردو ترجمہ: عزیز الدین
3. ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک : سید صباح الدین عبد الرحمن' دار المصنفین' شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 2012
4. بزم مملوکیہ : سید صباح الدین عبد الرحمن' دار المصنفین' شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 1999ء
5. خلجی خاندان : کے ایس لال' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' دہلی' اردو ترجمہ' یسین مظہر صدیقی
6. مختصر تاریخ ہند : سید ابو ظفر ندوی' دار المصنفین' شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 2006
7. "A Comprehensive History of Medieval India: Salma Ahmed Farooqui,Pearson:2011

اکائی 9: بہمنی حکومت

اکائی کے اجزا:

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 بہمنی حکومت کا قیام

9.3 اہم حکمراں

9.3.1 علاء الدین بہمن شاہ(1347-1358)

9.3.2 محمد شاہ اول(1358-1375)

9.3.3 تاج الدین فیروز شاہ(1397-1422)

9.3.4 احمد اول(1422-1436)

9.3.5 ہمایوں شاہ1457-1461

9.3.6 نظام الدین احمد سوم(1461-1463)

9.3.7 شمس الدین محمد سوم1463-1482

9.3.8 شہاب الدین محمود شاہ(1482-1518)

9.3.9 محمود گاوان

9.3.10 نظام حکومت کا انتظام

9.3.11 علم وعلماء کی سرپرستی

9.4 بہمنی سلطنت کا نظم ونسق

9.4.1 مرکزی نظام حکومت

9.4.2 صوبائی نظام حکومت

9.5 تعمیرات

9.6 علمی سرپرستی

9.7 اکتسابی نتائج

9.8 نمونہ امتحانی سوالات

9.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

9.8.2 مختصر جواب کے حامل سوالات

9.8.3 طویل جواب کے حامل سوالات

9.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

دکن میں پہلے پہل مسلمان تبلیغ اسلام کے لیے آئے تھے اس کے بعد شمال کے حملے ہوئے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ دکن کے کچھ حصے کو علاء الدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے 1310ء میں فتح کرکے اپنے مقبوضہ علاقے کو راس کماری تک پہنچادیا تھا۔ اس کے بعد 1323ء میں ورنگل فتح ہوا، اس کا نام سلطان پور رکھا گیا۔ اس کے بعد محمد بن تغلق کے عہد میں جب اس نے دیوگڑھ (دولت آباد) کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو دکن اس کے زیر نگیں رہا۔ مگر محمد بن تغلق کے ہی عہد میں جب دارالسلطنت دولت آباد سے دہلی کو منتقل کیا گیا تو اس کے آخری زمانہ میں سارے ملک میں انتشار پیدا ہو گیا اور سلطنت دہلی کئی حصوں میں بٹ گئی اور مختلف علاقائی حکومتیں قائم ہوگئیں جن میں دکن کے علاقے میں قائم ہونے والی بہمنی سلطنت نے نہ صرف وسعت کے اعتبار سے بلکہ اپنے رعایا پروری عدل و انصاف اور علوم وفنون کے ارتقا کے اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ بہمنی سلطنت کے قیام کے اسباب اور اس کے عروج وزوال سے واقف ہوسکیں۔ اسی طرح بہمنی سلطنت کے اہم حکمراں کے کارناموں کا جائزہ لے سکیں گے۔ بہمنی حکومت کے قیام کے بعد جنوب ہند میں اسلامی تعلیمات کے اثرات سے نموپانے والی تہذیب کا بھی جائزہ لے سکیں گے۔ اس دور میں علم وادب اور تعمیراتی اور رفاہ عام کے کاموں پر بھی روشنی ڈال سکیں گے۔

9.2 بہمنی حکومت کا قیام

بہمنی سلطنت کا قیام دہلی سلطنت کے تیسرے خاندان تغلق کے دور میں ہوا۔ اس کا اہم سبب محمد تغلق کی تلون مزاجی اور دار

السطنت کی دہلی سے دولت آباد اور دولت آباد سے دہلی کی منتقلی کو گردانا جاتا ہے۔ تغلق کے دور میں جب سیاسی طور پر دہلی سلطنت کا زوال شروع ہوا اس وقت دکن کے علاقے کا سپہ سالار اور گورنر حسن گنگو تھا جس کو سلطان نے ظفر خان کا لقب دیا تھا۔ اس نے آگے چل کر علاء الدین حسن بہمن شاہ کے لقب سے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور دکن کا بادشاہ بن گیا۔ اس کی تاج پوشی دولت آباد میں کی گئی اور اس نے 1347ء میں حکومت سنبھالی۔

9.3 اہم حکمراں

بہمنی حکومت میں جملہ 18 حکمراں ہوئے جن میں سے چھ حکمرانوں نے اپنے کارناموں کی بنا پر نمایاں مقام حاصل کیا۔ آخر دور کے حکمراں زیادہ تر امرا کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے رہے۔ یہ سلطنت اپنے دور زوال میں پانچ مشہور حکومتوں میں تقسیم ہو گئی۔

9.3.1 علاء الدین بہمن شاہ (1347-1358)

حسن گنگو ایک اولو العزم حکمراں تھا دائرۃ المعارف اسلامیہ کے مطابق اس کی نیت یہ تھی کہ دہلی سمیت تمام سلطنت کو اپنے زیر نگین کرلے لیکن اس کے وزیر اعظم ملک سیف الدین غوری نے اس سے باز رکھا اور مشورہ دیا کہ پہلے دکن پر اپنا قبضہ جمائے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے قندھار، کوٹ گر، مرام اور اکل کوٹ کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد اس نے کلیانی فتح کیا اور اس کا نام دارالامان رکھا۔ بعد ازاں اس نے گلبرگہ پر بھی قبضہ کر لیا اور اسے اپنا دارالسلطنت بنایا اور اس کا نیا نام حسن آباد رکھا اس کا عہد شمال، جنوب اور مغرب کی مہمات میں گزرا۔ اس کے انتقال کے وقت اس کے براہ راست قبضہ میں جو مملکت تھی وہ شمال میں مانڈو سے لے کر مغرب میں دابول اور گوا تک پھیلی ہوئی تھی اور ورنگل کے راجہ اسے خراج دیتے تھے۔ اس نے اپنی سلطنت کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا:

1. حسن آباد گلبرگہ مع رائچپور اور مدگل جو وزیر سیف الدین غوری کے سپرد تھا۔
2. دولت آباد مع بیڑ، جنیر اور چال جو بادشاہ کے بھتیجے محمد بن علی شاہ کے پاس تھا۔
3. برار اور ماہولی صفدر جان سیستانی کے ماتحت
4. اندور، کولاس اور بہمنی کو تلنگانہ کا الگ صوبہ بنا کر وزیر سیف الدین غوری کے لڑکے اعظم ہمایوں کے سپرد کیا۔

اخلاق و کردار

علاء الدین حسن ایک اچھا علم دوست بادشاہ تھا اس کا دربار ہمیشہ علماء سے بھرا رہتا تھا۔ محمد نصیر الدین ہاشمی اپنی کتاب ''دکنی کلچر'' میں لکھتے ہیں کہ اس کے دربار میں مولانا لطف اللہ، ملا اسحاق سرہندی، ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیر الدین شیرازی، شریف سمرقندی، مولانا عاصامی وغیرہ تھے۔ اسے دکن کے آثار قدیمہ سے بھی دلچسپی تھی وہ 1352ء میں ایلور کے غاروں کو دیکھنے گیا اور اپنے ساتھ ایسے لوگوں کو لے گیا جو کتبوں کو پڑھ سکیں اور دیواروں پر منقش تصاویر کے مفہوم کو بتا سکیں۔ ہارون خان شیروانی نے اپنی کتاب ''دکن کے بہمنی سلاطین'' میں رقم طراز ہیں کہ علاء الدین حسن شاہ کی حکومت کے حالات سے اس کے کردار کا اظہار ہوتا ہے، اس کی تمام مہمات میں

سے کسی ایک میں بھی ظلم کا شائبہ تک نظر نہیں آتا اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر خود بادشاہ یا اس کے نمائندہ نے مفتوحہ ریاست اس مغلوب حکمران کو واپس کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ ورنگل کے رائے جیسے طاقتور حکمران نے بلا کشت وخون کے علاء الدین حسن کا اقتدار اعلیٰ قبول کر لیا اور اس کو معزز دوست اور حلیف سمجھنے لگا۔ مولانا عاصامی جو اس کے دربار میں تھے لکھا ہے کہ علاء الدین میں اچھے بادشاہوں کی تینوں صفات موجود تھیں یعنی وہ ہمیشہ مظلوموں کی مدد کرتا تھا، غریبوں پر مہربانی کرتا تھا اور احکام خداوندی کی پیروی کی پوری کوشش کرتا تھا۔ یہی نہیں اس نے اپنے بیٹے محمد شاہ ثانی کو جو اس کا ولی عہد بنا، کی شادی مبارک کے موقع پر ہزاروں تھان زربفت، مخمل اور ریشم کے کپڑے اور ایک ہزار عربی اور عراقی گھوڑے اور بارہ مرصع تلواریں اپنے امراء میں تقسیم کیں اور خاص وعام کو غلہ تقسیم کیا اور دارالسلطنت کے غربا اور محتاجوں کو پکا ہوا کھانا کھلایا اور یہ سلسلہ پورے سال بھر چلا۔ علاء الدین سے اس کی کامیابی کا راز پوچھے جانے پر اس نے جواب دیا کہ ہر ایک کے ساتھ خواہ دوست ہو یا دشمن مہربانی کا سلوک کرنا اور غریبوں اور محتاجوں کو فیض پہنچانا۔ عاصامی نے لکھا ہے کہ اس کے کردار کی دو خصوصیات تھیں ایک انصاف اور دوسرا فیض رسانی۔ وہ اپنے ملک کے لوگوں ہی کے لئے فیض رساں نہ تھا بلکہ 1354ء میں اس نے مکہ معظمہ میں ایک رباط بھی بنوائی تھی۔ ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں میں پہلا بادشاہ تھا جس نے حکم دیا کہ غیر مسلموں سے فوجی خدمت کے عوض جزیہ نہ لیا جائے اور یہ بھی حکم دیا کہ غلہ اور ہر قسم کے مویشی وپیداوار اس کی سلطنت میں بلا محصول کے آیا کریں۔

اس کی نصیحت، ہدایت وغریب پروری کا سلسلہ بستر مرگ پر بھی قائم رہا۔ بستر مرگ پر اس نے اپنے بیٹوں کو ہدایت دی کہ انہیں ایک جان دو قالب ہو کر رہنا چاہیے، ولی عہد کی اطاعت پر زور دیا اور روپیہ اور استعمال کی چیزیں گلبرگہ کی جامع مسجد میں حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کی ہدایت دی۔

9.3.2 محمد شاہ اول (1375-1358)

علاء الدین حسن بہمنی نے اپنے عہد میں تمام مخالف عناصر پر قابو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ مگر ملک میں اب بھی چور اور ڈاکو بھرے ہوئے تھے اور اندرونی طور پر لا قانونیت تھی جسے محمد شاہ نے سخت اقدامات کے ذریعے قابو میں کیا اور سلطنت کو منظم کیا نیز اس کا آئین بنایا۔ اس نے سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا جن کے مرکز دولت آباد، برار، بیدر اور گلبرگہ تھے اور ان کے گورنروں کو بھی علی الترتیب مسند عالی، مجلس عالی، اعظم ہمایوں اور ملک نائب کے خطابات دئے۔ ان میں گلبرگہ کا صوبہ اہم تھا جس کا حاکم ملک نائب کہا جاتا تھا۔

محمد شاہ نے فوج کو بھی اسی طرح منظم کیا۔ کمانڈر ان چیف کے عہدہ کا نام امیر الامراء تھا اور افسروں کی ایک جماعت باربرداران کے نام سے قائم کی گئی تھی جو بادشاہ کے ذاتی اسلحہ کی ذمہ دار تھی ان کے علاوہ چار ہزار آدمیوں کا ایک مسلح دستہ شاہی باڈی گارڈ تھا جو خاصہ خیل کہلاتا تھا اس کے علاوہ خفیہ اطلاعات کا محکمہ بھی قائم تھا۔ اس منظم اور مستحکم فوج کی وجہ سے محمد شاہ نے ورنگل اور تلنگانہ کے حاکم کو شکست دی۔ وارنگل اور تلنگانہ کے حاکموں اور محمد شاہ کے بیچ معاہدہ ہوا جس میں خراج دینے کے علاوہ گولکنڈہ کا شہر مع متعلقات کے راجہ تلنگانہ کو چھوڑنا پڑا۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق بہمنی سلطنت کا محمد شاہ پہلا حکمراں ہے جس نے سب سے پہلے سونے اور چاندی کے سکے جاری

کیے۔ سکہ کے ایک طرف کلمہ طیبہ اور چاروں خلفائے راشدین کے نام کندہ تھے اور دوسری طرف حکمران بادشاہ کا نام اور ڈھالنے کی تاریخ لکھی تھی۔ اس کے پہلے وجے نگر کے سکے رائج تھے جن کے استعمال پر محمد شاہ نے پابندی لگادی "دکن کے بہمنی سلاطین میں" ہارون خان شیروانی نے لکھا ہے کہ 1360ء میں مادر ملکہ نے جب مکہ معظمہ کا سفر کیا تو انہوں نے مصر میں عباسی خلیفہ المعتضد سے خط و کتابت کی اور اپنے لڑکے کے لئے خطبہ و سکہ کے اجرا کے حق میں باضابطہ اجازت حاصل کی۔

محمد شاہ خود علم دوست تھا۔ بچپن سے اس کو علم و فن سے دلچسپی تھی۔ علامہ فضل اللہ اس کے زمانہ میں شیراز سے دکن آئے، ان کے علم و فضل کی محمد شاہ نے بڑی قدر کی۔ اس کے دربار میں علماء اور شعراء کی بڑی آؤ بھگت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ المشائخ زین الدین دولت آبادی، عین الدین بیجاپوری، مولانا نظام الدین برنی، حکیم ظہیر الدین تبریزی جیسے اہل علم اس کے دربار میں تھے جس سے دکن اہل علم کا گہوارہ اور سارے ہندوستان کے لئے قابل رشک بن گیا تھا۔ سلطنت بہمنیہ کے بڑے بڑے شہروں مثلاً گلبرگہ، بیدر، دولت آباد، جنیر، دابیل وغیرہ میں مدرسے قائم کیے گئے۔ جہاں قابل اساتذہ درس دیتے تھے، طلبا کے لئے وظائف بھی جاری تھے۔ اس کے عہد میں سارے ملک میں امن رہا۔ اس نے اپنا سارا وقت سلطنت کو مستحکم کرنے میں صرف کیا۔ وہ ہر سال اپنے ملک کے صوبوں کا دورہ کرتا۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق اس کے حکومت کے آخری زمانہ میں ہر شخص خوشحال اور فارغ البال تھا۔

محمد شاہ کی وفات کے بعد علاء الدین مجاہد (1378-1375) 19 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور تین سال سے بھی کم عرصہ تک حکومت کی۔ وہ اپنے عہد میں وجے نگر کے خلاف مصروف جنگ رہا۔ اسے دھوکہ سے داؤد جو اس کا چچا اور وفادار اسپہ سالار تھا خیمے میں قتل کر کے خود تخت نشین ہوا۔ داؤد کے عہد میں خانہ جنگی پھیل گئی۔ علاء الدین مجاہد کے دوسرے سپہ سالار اور اس کی بہن روح پرور آغا نے بغاوت کی، اور داؤد کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد روح پرور نے بہمن شاہ کے پوتے محمد شاہ دوم کو تخت نشین کرایا۔ اس کی حکومت بہمنی تاریخ میں سب سے زیادہ پر امن رہی۔ اس نے مجاہد کے قاتلوں کا خاتمہ کیا اور سیف الدین غوری، جو سلطان علاء الدین مجاہد کا سسر تھا، وزیر اعظم مقرر کیا اور ہر ضروری معاملہ میں اس مشورہ لیتا تھا۔ اس نے وجے نگر سے مصالحت تا کہ ملک میں امن کو بحال کیا جا سکے۔ اس کے بعد غیاث الدین 1397ء جون۔ اپریل 1397ء اور شمس الدین جون 1397ء نومبر۔ جون 1397ء نے مختصر مدت کے لئے حکومت کی۔

اگر ہم پچھلے پانچ حکمرانوں کے حالات کا تجزیہ کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد دوم کے عہد کو چھوڑ کر بد نظمی اور بے اطمینانی کا دور تھا۔ لیکن دو ایک پہلو ایسے ہیں جو اس کی تلافی کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس مدت میں سے انیس سال محمد دوم کی شائستہ اور ترقی پذیر حکومت کے ہیں جو دکن کی تاریخ کا ایک سنگ میل ہے اس لئے کہ محمد دوم ہی نے اس ملک کو تہذیب اور علم و فضل کا گہوارہ بنانے کی کوشش کی۔ دوسرا یہ کہ دکن اور وجے نگر کے درمیان لڑائیوں کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

9.3.3 تاج الدین فیروز شاہ (1422-1397)

یہ سلطان محمد شاہ دوم کا داماد تھا اور اپنے خسر کی روایت کو یعنی دکن کو تمدن کا گہوارا بنانا، قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے امن قائم کرنے کے لئے اپنی حکومت میں ہندوؤں کو ذمہ داری دی اور برہمنوں کو بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ اس کا دور حکومت سلطنت بہمنی کے عروج

کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانہ میں سیاسی تدبر اور تدبیر مملکت سے ایک طرف کو ملک کو بلند منزل پر پہنچایا گیا اور دوسری طرف پاکیزہ تہذیب و تمدّن سے ملک کو زینت دی۔

فیروز شاہ اپنی علمی قابلیت میں مشہور تھا۔ اس کا شمار ہندوستان کے فاضل ترین بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ وہ قرآن، حدیث، فقہ، صوفی مصطلحات اور علوم عقلیہ میں حکمت، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، علوم طبعی، اقلیدس، فن مناظرہ اور اخلاقی علوم میں ماہر تھا اس نے باضابطہ ہفتہ میں تین دن ان علوم میں خود درس و تدریس کے لئے مخصوص کر لیے تھے۔ وہ ایک ممتاز شاعر بھی تھا۔ فیروز شاہ ان علوم کے ساتھ ساتھ دنیا کی کئی زبانوں سے بھی واقف تھا۔ مورخ فرشتہ کے مطابق وہ عربی، فارسی اور تُرکی زبانوں سے تو خوب واقف تھا ہی، اس کے ساتھ وہ تلنگی، کنڑی، مرہٹی، گجراتی، بنگالی کے علاوہ کئی اور زبانیں بھی جانتا تھا۔ لوگوں سے وہ انہیں کی زبانوں میں بلا تکلف گفتگو کرتا تھا۔ اہل علم کے ساتھ وہ بے تکلف تھا، شام کا ایک حصہ اس لئے مخصوص رکھتا تھا کہ شعراء، اہل علم، داستان گو وغیرہ سے گھل مل کر بات چیت کر سکے۔ اس کی فضیلت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ تعمیر عامہ کے سلسلہ میں اس نے جو کام کئے ان میں دولت آباد کے قریب پہاڑی میں 1408ء میں بالا گھاٹ کے نام سے ایک رصد گاہ کی تعمیر تھی، جس کے لئے سید محمود گرزونی اور حکیم حسن گیلانی کو مامور کیا تھا۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

سیاسی صورت حال

فیروز شاہ نے تقریباً پچیس سال حکومت کی اور یہ مدت اس نے ہمسایہ حکومتوں مثلاً وجے نگر، کھیرلا، تلنگانہ سے کشمکش میں صرف کی۔ کھیرلا کے راجا شمال سے اور وجے نگر کے رائے جنوب سے حملہ آور ہوئے۔ فیروز شاہ نے پہلے وجے نگر کے رائے سے نمٹنے کا فیصلہ کیا اور کھیرلا کی مہم کو ملتوی کیا۔ شہزادہ وجے نگر بکّا نے فیروز شاہ سے مقابلہ کے لئے بہت بڑی فوج تیار کی تھی جس میں 80,000 تیر انداز اور بندوقچی تھے۔ اس نے تنگ بھدرا ندی کو پار کر کے موگل، رائچور اور دوآبہ کے دوسرے بہمنی مقبوضات پر چڑھائی کر دی۔ اس کے مقابلہ کے لیے فیروز شاہ نے فوج بھیجی لیکن وہ زمانہ بارش کا تھا اور کرشنا ندی سیلاب پر تھی، جس کو عبور کرنا دشوار تھا ایسی صورت میں فیروز شاہ کے ساتھیوں میں سے ایک قاضی سراج تھا جو چند آدمیوں کے ساتھ دریا عبور کر کے اور وجے نگر کی کچھ طوائفوں کے ساتھ شاہی کیمپ میں گھس گیا اور جیسے ہی ناچ گانا شروع ہوا اور شاہزادہ اور اس کے ساتھی شراب کے نشے میں مست ہوئے، قاضی سراج شہزادہ پر حملہ آور ہوا اور قتل کر ڈالا۔ اسی دوران فیروز شاہ نے اپنے چار ہزار سپاہی گھوڑوں کو روانہ کیا اور صبح ہوتے ہی خود بھی دریا پار کر کے وجے نگر کی فوج کا تعاقب کیا۔ دونوں میں معاہدہ ہوا اور دس لاکھ شاہی خزانہ میں جمع کیا گیا۔

وجے نگر کی کامیابی کے بعد فیروز شاہ کھیرلا کی طرف روانہ ہوا لیکن جب وہ ماہور پہنچا تو وہاں کے حاکم مقدم نے جو کیرلا کا حکمران نرسنگھ کا ساتھ دیتا تھا، معافی مانگی اور خراج کی پیش کش کی۔ فیروز شاہ نے نرسنگھ کو بھی خراج دینے کو کہا مگر اس نے نفی میں جواب دیا۔ دونوں فوجوں کے بیچ بہت سخت لڑائی ہوئی۔ نرسنگھ کے لڑکے کوشل سنگھ کو قید کر لیا گیا۔ نرسنگھ کھیرلا کے قلعہ میں چھپ گیا۔ فیروز شاہ نے قلعہ کا محاصرہ کیا کچھ عرصہ کے محاصرہ کے بعد نرسنگھ نے ہتھیار ڈال دئے اور خراج دینے پر راضی ہو گیا اور اپنی بیٹی کو شاہی خادم کے طور پر دیا۔

کھیرلا کی مہم کے بعد فیروز شاہ تلنگانہ کی طرف روانہ ہوا اور وہاں کے راجا سندری کو شکست دی لیکن بارش کی وجہ سے فیروز شاہ کو پوری کامیابی نہیں ملی اور مقامی سرداروں کو پورے طور پر زیر کئے بغیر ہی واپس لوٹنا پڑا مگر یہ سردار خراج کی رقم دیتے رہے۔

بہمنی سلطنت اور تیمور کے ساتھ اچھے تعلقات تھے فیروز کو جب یہ خبر ملی کہ تیمور ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے تو اس نے اپنا پیغام اور تحائف بھیجے۔ پیغام یہ تھا کہ اگر تیمور کا قصد دہلی پر حکومت قائم کرنے کا ہے تو وہ خود حاضر ہو کر اسے سلامی دے۔ اس کے جواب میں تیمور نے فیروز کو ایک فرمان بھیجا جس میں اسے اپنا لڑکا کہہ کر مخاطب کیا اور اس کے دکن کی سلطنت کے قبضہ کی تصدیق کی جس میں گجرات اور مالوہ بھی شامل تھا۔ اگرچہ یہ دونوں فیروز کی دسترس سے باہر تھے۔

محمد گیسودراز

فیروز شاہ کے عہد میں چشتیہ سلسلہ کے مشہور و معروف صوفی سید محمد گیسودراز گلبرگہ آکر بس گئے۔ چونکہ گیسودراز کے والد محمد تغلق کے عہد میں دولت آباد آئے تھے اس لئے دکن کے عوام پر ان کا بہت اثر تھا۔ گیسودراز قلعہ گلبرگہ کی جامع مسجد کے قریب اپنے مریدوں کے ساتھ ایک خانقاہ میں مقیم ہوئے۔ گلبرگہ میں بہت جلد مریدوں کا ایک حلقہ تیار ہو گیا۔ فیروز شاہ نے ان کی اور مریدوں کی گزر اوقات کے لئے کئی گاؤں وقف کئے۔ لیکن گیسودراز نے فیروز شاہ کے ذہن پر جو اثر ڈالا تھا وہ جلد ہی ختم ہو گیا اور دونوں میں تناؤ بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ فیروز شاہ نے انہیں محل شاہی سے دور چلے جانے کو کہا۔ اس پر گیسودراز گلبرگہ سے چند میل دور چلے گئے جہاں آج ان کا مزار و مقبرہ ہے۔

فیروز شاہ کی حکومت کا خاتمہ

فیروز شاہ نے اپنے کمسن بیٹے حسن شاہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ چونکہ فیروز شاہ کی عمر 70 سال کی ہو گئی تھی اس لئے اس نے کم و بیش اپنے سارے اختیارات دو غلاموں کو سونپ دیئے تھے۔ ان دونوں غلاموں نے فیروز شاہ کو باور کرانا شروع کیا کہ احمد، جو فیروز شاہ کا بھائی تھا اور بڑی صلاحیت اور قابلیت کا مالک تھا علاوہ ازیں لوگوں میں مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ سید گیسودراز سے بھی اچھے تعلقات تھے اور وہ کہیں بغاوت نہ کر دے لہٰذا اسے قتل کرا دیا جائے فیروز اس پر تیار نہیں ہوا مگر کمزوری کی حالت میں اس تجویز پر راضی ہو گیا کہ احمد کو اندھا کر دیا جائے۔ احمد کو اس سازش کا پتہ چلا تو اس نے فوج جمع کی اور فیروز شاہ پر حملہ بول دیا۔ فیروز شاہ بھی آگے بڑھا مگر ضعف کی وجہ سے بغیر لڑے ہی میدان جنگ میں بے ہوش ہو گیا۔ لوگوں نے احمد کو اپنا نیا بادشاہ قبول کر لیا۔ فیروز شاہ جب ہوش میں آیا تو اس نے بھی اپنی غلطی کا اقرار کیا اور احمد کی بادشاہت کو قبول کیا، اس کی کمر میں تلوار باندھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھا دیا۔

9.3.4 احمد اول (1436-1422)

احمد اول نے حکومت سنبھالتے ہی اپنے دارالسلطنت کو 1424ء میں گلبرگہ سے بیدر منتقل کیا۔ ہارون خان شیروانی نے دکن کے بہمنی سلاطین میں دارالسلطنت کی تبدیلی کی کئی وجوہات گنائی ہیں:

- فیروز شاہ اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا مگر احمد اول جنگ سے حکومت پر قابض ہوا۔
- سید گیسو دراز کے انتقال کے بعد احمد کو محسوس ہوا کہ اب گیسو دراز کے مریدوں کی مدد نہیں ملے گی۔
- بیدر کا علاقہ زیادہ زرخیز تھا۔
- بیدر دکن کے تقریباً کنارے واقع تھا اور زیادہ محفوظ تھا اور اس کے علاوہ دور دراز گلبرگہ کے مقابلہ میں بیدر نئی سلطنت کے درمیان میں واقع تھا۔

سیاسی حالات

1422ء میں احمد اول نے تخت سنبھالتے ہی اپنے دوست و دشمن دونوں سے مصالحت کا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے اپنے دوست خلف حسن بصری کو جس نے اس کی جان بچائی تھی سلطنت کا وزیر اعظم بنا دیا۔ اسی کے ساتھ اپنے مخالفین میں عین الملک ہوشیار اور نظام الملک بیدار کو جو فیروز شاہ کے غلام اور مشیر کار تھے کو بھی اعلیٰ عہدے عطا کئے۔ فیروز شاہ کے بیٹے حسن کو بھی 500 کا منصب اور ایک جاگیر دی۔ اس کے علاوہ احمد اول نے منصب داری کے طریقے کو منظم کر دیا اور سر لشکر کو 2000 کا منصب دیا، امیر الامراء کو 1500، وکیل کو 1200 اور دوسرے امراء کو 100 سے 1000 تک کا منصب دیا۔

وجے نگر اور تلنگانہ

فیروز شاہ کے آخری زمانے میں وجے نگر نے بہمنیوں کو جو شکست دی تھی اس کا بدلہ لینے کے لیے احمد اول نے تخت نشینی کے بعد ہی چالیس ہزار سواروں کی زبردست فوج لے کر وجے نگر کی طرف بڑھا۔ بکّا نے جو وجے نگر کا حکمران تھا یہ محسوس کیا کہ اس میں تنہا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے چنانچہ اس نے تلنگانہ کے راجا سے مدد مانگی۔ بہمنی اور وجے نگر کی فوجوں کا مقابلہ تنگ بھدرا کے کنارے ہوا۔ وجے نگر کے پاس اگرچہ پیادہ فوج، توپ خانہ اور تیر اندازوں کی تقریباً دو لاکھ فوج تھی مگر انہوں نے چھاپا مار جنگ کا فیصلہ کیا اور روزرات کو بہمنی کیمپ پر حملہ کر کے بہت سے آدمی اور گھوڑے مار ڈالے۔ کچھ دنوں کے انتظار کے بعد احمد اول نے 2000 توپ گاڑیاں لے کر تنگ بھدرا کو پار کیا لیکن باضابطہ کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ وجے نگر کی فوج اور پیچھے ہٹ گئی اور اپنا علاقہ احمد کی فوج کو تاراج کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اسی دوران ایرانی نوروز کے دن احمد بطور تفریح ایک جھیل کے کنارے شکار کھیلنے نکلا اور اصل کیمپ سے آٹھ میل دور چلا گیا جہاں اسے دشمنوں کے پانچ چھ ہزار فوجیوں نے گھیر لیا۔ جنگ شروع ہوئی احمد کے دو سو ہمراہی مارے گئے مگر وہ خود اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ دوسری طرف احمد کے غائب ہونے کی وجہ سے بہمنی کیمپ میں کھلبلی مچ گئی اور ایک اعلیٰ افسر عبد القادر نے دو تین ہزار فوج لے کر اسی سمت چلا جدھر احمد تھا۔ وجے نگر اور بہمنی افواج کے بیچ جنگ ہوئی۔ بہمنیوں کو غلبہ ہوا اور احمد اول کی جان بچی۔ اس کے بعد سلطان احمد اول نے خود وجے نگر پر چڑھائی کی اور بکّا سے بقایا خراج بھی وصول کیا۔

ماہور

وجے نگر اور تلنگانہ کی مہمات کے بعد 1426ء میں چونکہ تلنگانہ کے راجا نے وجے نگر کی مدد کی تھی اس لئے احمد اول اسے سزا دینا چاہتا تھا اور 1425ء میں تلنگانہ پر چڑھائی کی دونوں فوجوں کے بیچ جنگ ہوئی اور تلنگانہ کا حاکم اناپوتا دوم مارا گیا۔ احمد اول کا تلنگانہ پر قبضہ ہوا اور خان اعظم کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ احمد اوّل ماہور کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا جس پر ایک مقامی رئیس نے قبضہ کر رکھا تھا۔ احمد اول جب فوج لے کر پہنچا تو وہ ماہور کے جنگل میں بھاگ گیا اور چھاپا مار جنگ شروع کی، جس میں احمد اول کو شکست ہوئی مگر ملک کو تاراج کر دیا۔ اگلے سال احمد اول نے پھر ماہور پر چڑھائی کی لیکن اب بھی اسے کامیابی نہیں ملی اور واپس لوٹنا پڑا۔ تیسری بار احمد اول نے پھر حملہ کیا اور اس بار اسے کامیابی ملی۔ اس مہم میں اس نے خاص طور پر بڑی سختی کی اور رئیس کو فوراً قتل کرا دیا۔

مالوہ

احمد اول آمد و رفت کا راستہ صاف کرنے کے لئے مالوہ، خاندیش اور گجرات پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ کھرلا کی ریاست مالوہ اور دکن کے درمیان میں واقع تھی، اور کھیرلا کے حکمران نرسنگھ نے فیروز شاہ کے عہد میں بہمنیوں کی باجگزاری قبول کرلی تھی مگر جب اسے احمد کے قبضہ کرنے کے ارادہ کا اندیشہ ہوا تو نرسنگھ مالوہ کے حاکم ہوشنگ شاہ سے جاملا اور احمد کے ارادوں اور اس کے فوجی مہم کے متعلق اسے بتایا۔ ہوشنگ اپنی حفاظت کے لئے تیزی سے 20,000 کی فوج لے کر کھیرلا پہنچ گیا۔ احمد کے پاس چونکہ فوج کی تعداد کم تھی اس لئے وہ اپنے حدود میں لوٹ آیا اور مصالحت کا راستہ نکالا کہ آپس میں جنگ کرنے سے اعراض کرنا چاہیے لیکن ہوشنگ شاہ بہمنیوں کی طرف بڑھتا آیا۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں بہت خونریز جنگ ہوئی اور آخر کار احمد کو مالوہ کی فوج پر غلبہ حاصل ہوا، ہوشنگ شاہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ احمد شاہ نے مالوہ پر قبضہ کیا اور اپنے لڑکے کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔

ولی عہدی

احمد اول نے اپنی حکومت کے آخری سال میں اپنے سب سے بڑے لڑکے علاء الدین ظفر خان کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور اسے خود اپنی زندگی میں سلطنت کا پورا اختیار دے دیا اور اپنے دوسرے لڑکوں کو مختلف صوبوں کا گورنر مقرر کیا اور سب سے حلف لیا کہ وہ کسی حال میں ایک دوسرے کے مخالف نہ ہوں گے۔

اخلاق و کردار

احمد اول نے بڑے بیٹے کی جانشینی کا قانون بنا کر سلطنت کی بنیاد کو پورے طور پر مضبوط کر دیا تاکہ جانشینی کو لے کر کبھی آپس میں جنگ نہ ہو۔ اس کا عہد حکومت انصاف اور مساوات برتاؤ کے لئے مشہور تھا اور اپنے سابقہ دشمنوں سے اس کا فیاضانہ سلوک ایک نمایاں خوبی ہے۔ اس نے وجے نگر کے ولی عہد کا استقبال شاہانہ انداز سے کیا۔ کھیرلا کے نرسنگھ کو شکست دینے کے بعد اسے عہدے پر برقرار رکھا۔ اپنی

حکومت کے آخری سال اس نے تلنگانہ کی شورش کو فرو کرنے کے بعد تقریباً تمام مفتوحہ قلعے ان کے سابقہ مالکوں کو واپس کر دئے۔

وہ ایک نیک دل اور خدا ترس انسان تھا اور آج تک دکن کی بہت بڑی اکثریت اسے ولی سمجھتی ہے۔ اس کے عہد میں بیدر ایران، عراق اور عرب کے ہر حصہ کے ذی علم اور متقی لوگوں کا گہوارہ بن گیا۔ احمد خود بھی صاحب علم اور فن موسیقی کا ماہر تھا۔ وہ اپنی رعایا کا بہت خیال رکھتا تھا، خاص کر جب دکن میں قحط پڑا تو اس نے رعایا کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا۔ ایک مصری عالم ابو بکر بن عمر المخزومی نے احمد اول کی بہت تعریف لکھی ہے۔ وہ ان دنوں وہیں تھا وہ لکھتا ہے کہ وہ گلبرگہ اس لئے آیا کہ اس نے اس عظیم شہر کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اس کی تصدیق کرے اور جو سلطان اس ملک پر حکمران ہے اور جس کا ملک غیر میں اس قدر شہرہ ہے اس کی حقیقت معلوم کرے۔ اس کا بیان ہے کہ بادشاہ ہر خاص وعام میں بہت ہر دل عزیز تھا اور اسے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو بادشاہ کا دشمن ہو۔ سلطان کو بہادر، باوقار اور دوسروں کی مدد کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ ملک کے اندر اس کی نرم پالیسی اور بیرون ملک سے دوستانہ تعلقات کے نصب العین نے بہمنی سلطنت کو معزز اور قابل احترام بنا دیا تھا۔

احمد اول کے انتقال کے بعد علاء الدین ظفر خان تخت نشین ہوا اور علاء الدین احمد کا لقب اختیار کیا۔ اس کو کئی مہمیں نہ صرف وجے نگر اور تلنگانہ کی ہندو سلطنتوں کے خلاف بلکہ گجرات، خاندیش اور مالوہ کی مسلم حکومتوں کے خلاف بھی کرنی پڑیں۔

محمد خان کی بغاوت

وجے نگر سے پہلی لڑائی 1436ء میں خراج کی رقم ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ حصول خراج کے لئے علاء الدین احمد دوم نے اپنے بھائی محمد خان کو بھیجا۔ محمد خان اس مہم میں کامیاب ہوا۔ اس کامیاب مہم نے اسے سلطان کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا کیونکہ اس کی فوج کے کچھ افسروں نے اسے بہکایا کہ اس کے والد کی یہ وصیت تھی کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر حکومت کرے لیکن اس کے بھائی نے اسے دوسرے درجے کے کام میں لگا دیا، اس لئے یہ بالکل حق بجانب ہے کہ وہ سلطنت کی تقسیم کا مطالبہ کرے کہ اسے نصف سلطنت دی جائے اور کوئی فیصلہ اس کی رضامندی کے بغیر نہ کیا جائے۔ محمد خان ان کی چال میں پھنستا چلا گیا اور بغاوت کر کے مدگل، رائچور، شولاپور کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور کرشنا ندی کے کنارے ایک مقام پر اپنے سر پر تاج بھی رکھ لیا۔ یہ خبر سنتے ہی علاء الدین احمد دوم فوج لے کر روانہ ہوا اور محمد خان کو شکست دی۔

خسر ناصر خان سے جنگ

محمد خان کو شکست دینے کے بعد علاء الدین احمد دوم نے اپنے وزیر اعظم دلاور خان کو سنگ میشور اور رانیل کے راجاؤں کے خلاف فوج دے کر روانہ کیا۔ دلاور خان کو جلد ہی کامیابی ملی گئی اور وہ سنگ میشور کی حسین لڑکی کو لے کر واپس ہوا، جس کے ساتھ سلطان احمد دوم نے شادی کر لی اور اسے زیبا چہرہ کا خطاب دیا جس کی وجہ سے اسے اپنے خسر ناصر خان سے جو خاندیش کا حکمراں تھا، جنگ کرنی پڑی۔ ناصر خان کو گجرات کے احمد شاہ اور گونڈوانہ کی فوجی امداد حاصل تھی اس لئے سلطان علاء الدین کو متحدہ افواج پر غلبہ پانا مشکل تھا۔ شروع

میں علاء الدین احمد دوم کو شکست ہوئی مگر اس کے مشیر خلف حسن کے مشورہ پر فوج کو دو حصوں میں یعنی دکنی اور غیر دکنی (Native and Non-Native) میں منقسم کر کے دو طرف سے حملہ کروایا اور ناصر خان کو شکست دی۔

تلنگانہ، مالوہ، خاندیش اور وجے نگر کی مہمات کے بعد سلطان علاء الدین کا عہد پر امن رہا۔ وہ ہر کسی کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرتا تھا اور سلطنت کے معاملات میں سرگرمی کے ساتھ دل چسپی لیتا تھا اس نے نظم و قانون کے نفاذ میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور ذی علم لوگوں کو نظام سلطنت میں شامل کیا۔ اس نے جوا، شراب نوشی اور زنا کاری جیسے جرائم کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ بہت اچھا خطیب بھی تھا اور دارالسلطنت کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن تقریر بھی کیا کرتا تھا۔

9.3.5 ہمایوں شاہ 1457-1461

ہمایوں شاہ کو عام طور پر ظالم کہا گیا ہے، مورخ فرشتہ نے اس کا خاکہ بدترین رنگ میں کھینچا ہے اور سنگین ترین جرائم اس سے منسوب کئے ہیں۔ فرشتہ کے مطابق اس نے تمام بندشوں کو پس پشت ڈال دیا وہ اپنی رعایا کے بچوں کو ان کے والدین کی گود سے چھین کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا تھا۔ وہ اکثر سڑک پر برات کو روک لیتا تھا اور دلہن کو چھین کر اس سے لطف اندوز ہوتا اور پھر اسے گھر بھیج دیتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ اپنے محل کی عورتوں کو معمولی سے معمولی قصور پر قتل کر دیتا تھا اور اگر کسی امیر کو اس کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تو وہ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو کر جاتا جیسے وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ "دکن کے بہمنی سلاطین" میں ہارون خان شیروانی نے لکھا ہے کہ ہمایوں معمولی طرز کا بہمنی حکمراں تھا مگر اسی کے ساتھ نظم و ضبط کا بڑا خیال رکھنے والا تھا۔ دکنی اور غیر دکنی باشندوں میں توازن قائم کرنے میں کوشاں رہتا تھا اور اپنی حکومت کو حتی الامکان پر امن رکھنا چاہتا تھا یہ قابل لحاظ بات ہے کہ اس کے پورے عہد حکومت میں ایک بھی مہم حدود سلطنت کے باہر نہیں پیش آئی، جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بجائے دوسروں کے خلاف جارحانہ کاروائی کے خود اپنی سلطنت کو مستحکم کرنا چاہتا تھا لیکن اندرونی ہنگاموں نے اس کے تمام قابل تعریف منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور اس کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم نے اس کی شہرت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ ہمایوں کا انتقال 1461ء میں ہوا، اسے سوتے میں کسی خادمہ نے قتل کر دیا۔

9.3.6 نظام الدین احمد سوم (1461-1463)

ہمایوں کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا احمد آٹھ سال کی عمر میں نظام الدین احمد شاہ سوم کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ہمایوں نے اپنے عہد میں ہی ایک مجلس ولایت مقرر کر دی تھی جس کے اراکین خواجہ جہاں ترک، ملک التجار محمود گاواں اور مادر ملکہ مخدومہ جہاں بیگم تھے اور مادر ملکہ کو آخری رائے کا حق تھا۔ اس کے عہد میں محمود گاواں کو عمدۃ الملک اور وزیر کل اور طرفدار بیجاپور بنا دیا گیا اور خواجہ جہاں ترک کو وکیل اور طرفدار تلنگانہ۔ یہی تینوں حکومت کے منتظمین تھے۔ حکومت کا آغاز لوگوں کی عام معافی سے ہوا جنہیں ہمایوں نے سیاسی قصور یا فرقہ واری رجحان کی بنا پر قید کیا تھا اور دوسری طرف ان لوگوں کی سرپرستی کی گئی جو علم و فن یا سلطنت کی خدمت میں ممتاز تھے۔

بادشاہ کی کمسنی سے فائدہ اٹھا کر اڑیسہ کے حکمران کپلیشور اور مالوہ کے حکمران محمود خلجی حملہ آور ہوئے۔ کپلیشور اپنے تلنگانہ کے اتحادیوں کے ساتھ دارالسلطنت سے دس میل کے فاصلہ کے اندر تک بڑھ آیا اور بہمنی سلطنت سے خراج کا بھی مطالبہ کر دیا۔ نظام الدین

احمد سوم نے اپنی فوج اس کے خلاف بھیجی اور شکست دی اور اس سے پانچ لاکھ نقرئی ٹنکہ تاوان جنگ وصول کیا۔ دوسرا حملہ مالوہ کے حکمران محمود خلجی نے خاندیش کے فاروقی حکمران اور اُڑیسہ کے کپلیشور کے ساتھ مل کر کیا اس نے برار اور دولت آباد کے سبھی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ان حالات میں محمود گاوان نے گجرات کے حکمران محمود سے مدد طلب کر محمود خلجی پر حملہ آور ہوا اور شکست دی۔

9.3.7 شمس الدین محمد سوم 1463-1482

شمس الدین محمد سوم جس وقت تخت نشین ہوا اس وقت اس کی عمر 10-9 سال کے درمیان تھی۔ محمد سوم بہمنی سلاطین کا سب سے زیادہ باکمال حکمراں تھا۔ حکومت سنبھالنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد خواجہ جہاں ترک اپنے خود سرانہ طرز عمل کی وجہ سے قتل کر دیا گیا۔ خواجہ جہاں کے قتل کے بعد سلطان شمس الدین محمد سوم نے محمود گاوان کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا اور اسے سلطنت کے تمام صوبے سپرد کئے اور تمام ادنیٰ و اعلیٰ معاملات کا اختیار دیا۔ اسے نہ صرف خواجہ جہاں کا خطاب دیا گیا بلکہ سرکاری کاغذات میں آقائے ساکنان عالم، معتمد قصر شاہی اور نائب السلطنت لکھا جانے لگا۔

9.3.8 شہاب الدین محمود شاہ(1518-1482)

شمس الدین محمد سوم کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین محمود شاہ جانشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر 12 سال تھی اسی وجہ سے حکومت کی باگ ڈور نظام الملک کے ہاتھوں میں تھی جو محمود شاہ کا وزیر اعظم بھی تھا۔ شروع کے چار سال حکومت کا سیاہ و سفید کا مالک نظام الملک بنا رہا۔ اس دور میں ملکی دکنیوں کو کافی اہمیت دی گئی اور شہر کی ترکی آبادی کو ختم کرنے کا فیصلہ لیا گیا اور شہر کے پھاٹک اندر سے بند کر کے ترکوں کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ اس طرح حکومت کا نظم و نسق چار سال تک چلتا رہا لیکن 1486ء میں سلطان محمود نے ان حالات سے چھٹکارہ پانے کیلئے نظام الملک کو تلنگانہ مہم پر بھیج کر قتل کرا دیا اور حالات پر قابو پانے کے لئے سلطان نے اپنا جھکاؤ غیر ملکی دکنیوں کی طرف کیا۔ جس سے ملک کے حالات اور خراب ہوئے اور دکنیوں نے سلطان کو قتل کرنے کی سازش کی۔ 1487ء میں دکنیوں نے محل میں سلطان پر حملہ بول دیا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس واقعہ کے بعد سلطان محمود نے دکنیوں کے قتل عام کا حکم دیا اور ان کی جائداد کو ضبط کرا لیا۔ یہ قتل عام تین دن تک جاری رہا لیکن یہ قتل عام اس کے زوال کی وجہ بنا کیونکہ جان بچ جانے کی خوشی میں سلطان نے چالیس دن تک جشن منانے کا حکم دیا اس کے بعد محل میں جو شراب نوشی اور رنگ رلیوں کا دور چلا اس سے حکومت کا نظام نہ صرف محل کے اندر متاثر ہوا بلکہ شہری آبادی بھی متاثر ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاقی بے راہ روی کی تمام بندشیں ختم ہو گئیں۔

اس وقت سلطنت کے مختلف گورنروں اور جاگیرداروں نے محسوس کیا کہ حکومت سخت بے حسی کی حالت میں پہنچ گئی ہے اور یہ خیال کر کے کہ سلطنت کا زوال قریب ہے اپنا اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کرنے لگے۔ سب سے پہلے جس نے سر اٹھایا وہ قاسم برید تھا جس کے پاس قندھار اور اوسا کی جاگیر تھی۔ سلطان محمود نے جب یہ سنا تو اپنی فوج بھیجی جسے قاسم برید نے شکست دی اور سلطان شہاب الدین محمود کا وزیر اعظم بن گیا اور سبھی سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا۔ 1518ء میں سلطان شہاب الدین محمود کا انتقال ہوا تو سلطنت کی کمزوری کے پیش نظر تمام جاگیرداروں نے شاہی لقب اختیار کر لئے۔ اور آگے حکمراں ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گئے۔

بہمنی حکومت کا خاتمہ

سلطان شہاب الدین وزیر اعظم قاسم برید اور اس کے بیٹے امیر علی برید کے ہاتھوں کٹھ پتلی تھا۔ 1518ء میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد اس کے فرزند احمد (1518 سے 1521)، علاء الدین (1521)، ولی اللہ (1521-1524) اور کلیم اللہ یکے بعد دیگرے حاکم بنے۔ کلیم اللہ بہمنی سلطنت کا آخری حکمراں تھا اس نے اپنی حکومت کو بچانے کے لئے مغل حکمران بابر سے مدد طلب کی مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ 1526ء میں کلیم اللہ کا انتقال ہوا اور اسی کے ساتھ بہمنی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اور بہمنی حکومت پانچ حصوں میں منقسم ہوئی اور پانچ آزاد حکومتیں قائم ہوئیں جو بعد میں سلطنت بیجاپور، سلطنت احمد نگر، سلطنت برار، سلطنت گول کنڈہ اور سلطنت بیدر کے نام سے مشہور ہوئیں۔

9.3.9 محمود گاوان

محمود گاوان کی وزارت عظمیٰ میں بہمنی سلطنت نے وہ عروج حاصل کیا جو اس کی پوری تاریخ میں کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس کے عہد وزارت میں خالص کلچرل کامیابی ہی نہیں ہوئی بلکہ اس نے کونکن علاقے کو گوا تک فتح کیا اور مشرق میں گوداوری کرشنا دوآبہ کو سلطنت میں شامل کرکے سرحدوں کو وسیع کر دیا اور اُڑیسہ کے اندرونی حصے کانچی تک اور کارومنڈل کے ساحل پر کامیاب مہمات کیں۔ اس طرح بہمنی سلطنت کی حدود پہلی مرتبہ سمندر تک پہنچ گئیں اور مالوہ، اُڑیسہ اور وجے نگر کے حوصلوں کو کچھ دنوں کے لئے پست کر دیا۔

کونکن کے ہندو مخالفین کا خاتمہ کیا اور 1471ء میں سنگ میشور کے حکمران کو اپنا باجگزار بنایا۔ مالوہ کے حاکم محمود خلجی کو بھی شکست دی۔ 1472ء میں گوا پر قبضہ کیا۔ گوا جو وجے نگر کا حفاظتی علاقہ تھا اور مغربی سمندری کنارے کی سب سے مشہور بندرگاہ تھی۔ 1473ء میں اس نے بیلگام کو فتح کرنے کے بعد مغربی سمندری ساحل پر مکمل قبضہ کر لیا۔ مورخوں کا ماننا ہے کہ محمود گاواں کا اہم کارنامہ دابھول اور گوا سمیت سبھی مغربی علاقوں پر بالادستی اختیار کرنا تھا جس کی وجہ سے ایران اور عراق سے سمندری تجارت میں کافی اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ 1470ء میں اڑیسہ کا حکمران کپلیشور گجپتی کے انتقال کے بعد جانشینی کو لے کر خانہ جنگی ہوئی جس میں محمود گاوان نے ہم ویر کا ساتھ دیا اور اسے تخت نشین کرانے میں کامیاب ہوا لیکن منگل رائے اسے گدی سے ہٹا کر خود تخت نشین ہو گیا اور پرشوتم گجپتی کا لقب اختیار کیا۔ اس نے سمندری ساحل کے کھیلنا اور سنگ میشور کے مقامی سرداروں کو شکست دی۔ چنانچہ ہم ویر نے اپنی سلطنت واپس لینے کے لئے بہمنی سلطان سے مدد کی درخواست کی۔ محمود گاوان نے ایک فوجی دستہ ملک حسن کی سربراہی میں اس کی مدد کو بھیجا جس کی مدد سے ہم ویر نے منگل رائے کو اڑیسہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ملک حسن نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ سلطان کی ایما پر آگے بڑھ کر راجہ سندری کو اور کوانڈاویڈو کے عظیم قلعہ کو بھی فتح کر لیا۔ لیکن 1478-77ء میں بہمنی اور اڑیسہ کے بیچ دوبارہ جنگ چھڑ گئی۔ ایک بہمنی افسر بھیم راج نے بغاوت کرکے کونڈ پلی پر قبضہ کر لیا اور پرشوتم گجپتی کو بہمنی علاقوں پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ لیکن محمد گاوان کے سیاسی اقدامات کی وجہ سے پرشوتم ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا۔

9.3.10 نظام حکومت کا انتظام

محمود گاوان ایک ہوشیار سیاست دان تھا اس نے ملکی اور غیر ملکی دونوں کے درمیان صرف توازن ہی برقرار نہیں رکھا بلکہ ہندو آبادی کی ہمدردی حاصل کرنے کی بھی کوشش کی اور فرقہ واریت کو ختم کیا۔ اس نے ملکی نظم ونسق کو درست کیا۔ محمود گاوان کے عہد وزارت میں سلطنت میں غیر معمولی وسعت ہوئی۔ بہمنی سلطنت نہ صرف مغرب میں کونکن کے سارے ساحلی علاقے بلکہ جنوب میں گوا، مشرق میں آندھرا پردیش کی آخری حد تک اور جنوب میں تنگ بھدرا کے علاقے تک پھیل گئی۔ اب تک یہ وسیع علاقے صرف چار صوبوں میں منقسم تھے۔ جس سے مرکزی حکومت پر برے اثرات پڑنے لگے کیوں کہ ہر صوبہ کا طرفدار (والی) عملی طور پر چھوٹا بادشاہ ہو گیا تھا جو کبھی کبھی مرکزی احکام کی خلاف ورزی بھی کرتا تھا۔ اس کو مد نظر رکھتے ہوئے محمود گاوان نے سلطنت کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا۔ یہ آٹھوں صوبے گاویل، ماہور، دولت آباد، گلبرگہ، بیجاپور، جنیر، راجہ سندری اور ورنگل تھے۔ ہر صوبے کے لئے نئے گورنر منتخب کئے گئے اس کے علاوہ کچھ حصہ الگ کر کے براہ راست بادشاہ کی ماتحتی میں رکھا جس سے گورنروں کے اپنے علاقہ کے اختیارات پر مستحکم روک ہو گئی۔ علاوہ بریں محمود گاوان نے فوجی نظام میں انقلابی تبدیلی کی۔ اس نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ ہر صوبہ دار کی ماتحتی میں صرف ایک قلعہ ہوگا اور باقی سب قلعوں کے قلعہ دار یا کمانڈر براہ راست مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر ہوں گے اور مرکز ہی کو جواب دہ ہوں گے۔

ان ملکی اور فوجی اصلاحات کے علاوہ محمود گاوان پہلا وزیر تھا جس نے زمین کی باضابطہ پیمائش کرائی، شہر اور گاؤں کی حدبندی کی اور مالگزاری کی تحدید کی۔ اس طرح ایک طرف تو اس نے سلطنت کے مالی تعین میں آسانی پیدا کر دی اور دوسری طرف اس نے امراء کے اختیارات کی حدبندی کر دی جس سے مرکز میں بادشاہ کی حکومت کی حیثیت مزید بڑھ گئی اور گورنروں کے بغاوت کے امکانات کم ہو گئے۔

9.3.11 علم و علماء کی سرپرستی

محمود گاوان علم اور علماء کا بہت بڑا قدردان تھا جس کی وجہ سے دکن کے بیرونی دنیا سے بہت گہرے کلچرل روابط ہو گئے تھے۔ وہ خود بھی بلند پائے کا عالم تھا اور اپنے عہد کا ممتاز ترین فارسی انشاپرداز سمجھا جاتا تھا۔ اس نے دارالسلطنت بیدر میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی جس کی عمارت نہایت بارعب انداز میں تین منزل کی بنی تھی اور رنگین کھپروں سے مزین تھی اس میں روشنی اور ہوا کا بہت عمدہ انتظام تھا۔ طالب علموں کو کتابوں کے علاوہ کھانا و کپڑے بھی مفت ملا کرتے تھے۔ محمود گاوان کی کوششوں سے اس وقت کے مشہور ترین علم و فن کے ماہر نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران و عراق کے ممتاز ترین افراد کا تعلق اس دارلعلوم سے تھا۔ اس نے اپنے عہد کے اعلیٰ ترین اصحاب علم جیسے مولانا نور الدین جامی، مشہور ایرانی عالم جلال الدین دوانی، شیخ صدر الدین، عبدالرحمٰن وغیرہ کو دکن بلانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ دارالعلوم کی اصل عمارت 1696ء میں اورنگ زیب کے عہد میں بارودوں کے ایک ذخیرہ میں آگ لگ جانے کے سبب گر گئی تھی۔

محمود گاوان کے خلاف سازشیں

محمود گاوان نے جو انتظامی اصلاحات کی تھیں وہ گورنروں اور اس کے دشمنوں کو سخت ناگوار گزری تھیں اور وہ لوگ ہمیشہ بادشاہ

کے کان بھرا کرتے تھے۔ محمود گاوان جب سلطان کے ساتھ وِجے نگر کی مہم پر تھا تو اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر اس کے مخالفین نے سازش رچی اور محمود گاوان کے محرر کو جواہرات و گھوڑے وغیرہ کے تحفوں سے لاد دیا اور اسے شراب پلا کر ایک سادہ پرچہ پر محمود گاوان کی مہر لگوالی۔ اب اس سادہ پرچہ پر ایک خط اڑیسہ کے پرشوتم کے نام بنایا گیا جس میں پرشوتم کو دکن پر حملہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس سازش میں بادشاہ بھی آ گیا اور محمود گاوان کا سر قلم کروا دیا۔

9.4 بہمنی سلطنت کا نظم و نسق

9.4.1 مرکزی نظام حکومت

سلطان: سلطان حکومت کا اہم مرکز تھا وہ حکومت کے سیاہ وسفید کا مالک ہوتا تھا۔ گرچہ وہ اپنے فیصلہ میں آزاد تھا مگر حکومت کا نظام آٹھ وزرا کی مدد سے چلتا تھا جو حسب ذیل ہیں۔

1. وکیل السلطنت: یہ وزیر اعظم کا عہدہ تھا سلطان کے سارے فرمان اسی کے ذریعہ نافذ کئے جاتے تھے وہ حکومت کی مہر کا ذمہ دار بھی ہوتا تھا۔
2. امیر الجملہ: یہ وزیر بیت المال تھا۔
3. وزیر اشرف: یہ وزیر خارجہ تھا (Foreign Minister)
4. وزیر کل: یہ نائب وزیر اعظم تھا جو وزراء کے کاموں پر نظر رکھتا تھا۔
5. پیشوا: وزیر کل کا مددگار ہوتا تھا۔
6. ناظر: وزیر بیت المال کا مددگار تھا۔
7. کوتوال: یہ صاحب الشرطہ تھا اس کا کام سماج میں امن و امان قائم رکھنا تھا۔ یہ پولیس کا سربراہ اور شہر کا منصف ہوتا تھا۔
8. صدر جہاں: یہ قاضی ہوتا تھا سلطان کی غیر موجودگی میں قاضی القضاۃ کا کام انجام دیتا تھا۔

9.4.2 صوبائی نظام حکومت

سلطنت کے ابتدائی دنوں میں حکومت کم و بیش فوجی قانون کے ماتحت رہتی تھی، لیکن محمد اول نے حکومت کو نیم فوجی بنیاد پر قائم کیا اس نے سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا جو برار، گلبرگہ، دولت آباد اور تلنگانہ تھا۔ ہر صوبہ میں ایک گورنر منتخب کیا جو طرفدار کہا جاتا تھا۔ ہر طرفدار اپنے صوبہ میں نظم و نسق کو قائم کرنے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اس کے اہم کاموں میں فوجی نگرانی، ٹیکس وصولنا اور اپنا نائب منتخب کرنا تھا۔ محمد شاہ سوم کے عہد میں سلطنت میں غیر معمولی توسیع ہوگئی تو محمود گاوان کے مشورہ سے سلطنت کو آٹھ صوبوں میں تقسیم گیا۔ برار کو گاویل اور ماہور میں، گلبرگہ کو بیجاپور اور گلبرگہ، دولت آباد کو دولت آباد اور جنیر اور تلنگانہ کو راجہ سندری اور ورنگل میں تقسیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ صوبوں کو مزید سرکار اور پرگنوں میں بھی تقسیم کیا گیا تھا اور ایک پرگنے میں بہت سے گاؤں ہوتے تھے۔

9.5 تعمیرات

بہمنی حکمرانوں میں محمد اول نے تعمیرات کے کام میں کافی دلچسپی لی اس کے عہد کی تین بڑی یادگار عمارتیں ہیں۔ ایک تو گلبرگہ کی جامع مسجد، دوسری گلبرگہ میں ہی شاہ بازار مسجد اور تیسری عثمان آباد میں حضرت شمس الدین کا مزار۔ ان عمارتوں میں ترک وایرانی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ترک اور ایرانیوں نے ہندو اثرات سے دکن کے فن تعمیر کو بالکل بدل دیا اور نئے طرز تعمیر کی بنیاد ڈالی جو بعد میں دکنی طرز تعمیر کہلایا۔ محمد اول کے عہد کا خاص معمار رفیع تھا جس کا تعلق قزوین سے تھا۔ سلطان تاج الدین فیروز کا مقبرہ بھی اپنی فنِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس میں ہندو اثرات کا نفوذ بڑی حد تک نمایاں ہے یہ ایرانی، ہندو اور دہلوی اسکولوں کا امتزاج ہے۔ اس کے علاوہ فیروز نے دریائے بھیما پر ایک بڑا شہر تعمیر کیا۔ جس میں کشادہ اور سیدھی سڑکیں، خوبصورت دکانیں اور بازار ہیں اور دریا سے پانی محل کے اندر تک پہنچایا گیا ہے۔ اس شہر کی تعمیرات فن تعمیر میں اپنی آپ مثال ہیں جن کے انوکھے تعمیری منصوبے دکن کے باہر کہیں اور نہیں نظر آتے۔ اس کی اصلی خصوصیت گنبد اور مخروطی چھت کا ملا جلا استعمال ہے۔ شہر کے چار بڑے پھاٹک ہیں۔ دیوان خاص کے قریب حرم شاہی کے کمرے ہیں۔ مسافر خانہ، زنان خانہ کے محرابی کمرے، غسل خانے اور مسجد۔ اس عہد میں گنبد اور مخروطی میناروں کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ چھتوں پر نیچی دیواریں بھی بالکل نئے طرز کی ہیں اور کناروں پر چھوٹے چھوٹے مینار بنے ہیں۔

گلبرگہ کی ممتاز یادگاروں میں حضرت گیسو دراز کا مقبرہ ہے اسی کے ساتھ ان کے فرزند سید اکبر حسینی کا مزار بھی ہے جو مخلوط ایرانی دکنی یا بہمنی فن تعمیر کا نمونہ ہے اس کے چار کونوں پر چار چھوٹے چھوٹے گلدان ہیں اور اوپر ایک عظیم الشان گنبد ہے جس پر پیتل کے نقوش ہیں۔ اس کی محرابیں سادی اور قریب قریب ہیں۔ گلبرگہ کی ایک اور مسجد ہے جسے یہاں کے گورنر قلندر خان نے تعمیر کیا تھا۔ اس میں پانچ محرابوں کی دوہری قطاریں ہیں اور چھت کے اوپر پانچ گنبد ہیں۔ ان محرابوں کے ستون لمبے ہیں۔

بیدر میں ایک قلعہ ہے جس کی چھت کی رنگین کھپروں سے آرائش کی گئی ہے اس قلعہ کے پاس سولہ کھمبا مسجد ہے اس کی چھت سولہ بھاری کھمبوں پر کھڑی ہے اس مسجد کی دو خاص باتیں ہیں ایک تو مسجد میں پانی کا ذخیرہ چھت پر ہے اور دوسرے اُس مسجد کا ہر نمازی امام کو دیکھ سکتا ہے اور ہوا کھلی آمد ورفت ہے۔ بیدر کا تخت شاہی محل اور اس کے متصل محلات بہت خوبصورت ہیں اس میں کئی بڑے بڑے وسیع ہال ہیں جو رنگین کھپروں سے مزین ہیں۔ تخت محل جس میں کئی بہمنی حکمرانوں کی تخت نشینی ہوئی اس کی محرابیں بلند ہیں اور کھپروں سے آرائش کی گئی ہے، جس کے پاسنگ میں منقش سیاہ رنگ کی دھاریاں ہیں جو بیش قیمت ہونے کے علاوہ اعلیٰ ترین مذاق سلیم کی نشاندہی کرتی ہیں کمروں کے اندرونی حصوں کا نقشہ نہایت فنکارانہ ہے۔ تخت محل کے مغرب اور مشرق دونوں طرف شیر اور اس کے پشت پر طلوع ہوتا ہوا آفتاب دکن کے فن پر ایرانی اثر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ شہر بیدر میں ان محلات کے علاوہ سلطان احمد شاہ کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرے کو باہر سے دیکھنے پر تین منزلیں معلوم ہوتی ہیں اور چاروں سمت داخلہ کے دروازوں پر جو محرابیں ہیں وہ بلند اور شاندار ہیں اس کے کناروں کے گلدان چھوٹے چھوٹے ہیں اور گنبد بیضوی ہے۔ مقبرے کے اندر کی آرائش خوش نویس مغیث شیرازی نے کی تھی جس نے حضرت محمد ﷺ اور حضرت علیؓ کا نام سینکڑوں طرز سے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ شیعی درود بھی اس نے دل کش انداز میں لکھا ہے اس لئے اس میں

ہمیں نمایاں طور پر شیعیت کا اثر نظر آتا ہے۔اس میں عربی خط کے کئی طرز مثلاً کوفی، طغرا، نسخ وغیرہ کے نمونے ہیں اور اس کے کتبے سنہرے اور قرمزی رنگ کے ہیں اور ان کی بنیاد بھی شوخ رنگ کی ہے جس میں جابجا چمکدار جواہرات جڑے ہوئے ہیں اور ایسا کہا جاتا ہے کہ اس میں بعض بیش قیمتی اصلی ہیرے ہیں۔

بیدر کی ایک اور مشہور عمارت شاہ نعمت اللہ کرمانی کا مقبرہ ہے۔اس مقبرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی گنبد نہیں ہے اور شیراز کے مغیث کا لکھا ہوا خط ثلث میں ایک نہایت خوبصورت کتبہ ہے۔ساری عمارت سادہ مگر پر شکوہ ہے محراب بہت خوبصورت ہے اس کے سنگ سیاہ کے حاشیوں میں بھی جن پر لکیروں، پتیوں اور پھولوں کے طرز کے نقوش کندہ ہیں۔ایک اور خوبصورت کھپرے کی لوح بھی ہے اس عمارت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رنگ برنگ کے نہایت خوبصورت کھپروں کا آزادانہ استعمال ہے، خصوصاً گہرے نیلے اور سبز رنگ۔اس کے علاوہ ایک خوبصورت سا مینار ہے جسے چاند مینار کہا جاتا ہے یہ ایک اکیلا مینار ہے جو 1445ء میں خالص ایرانی طرز پر تعمیر کیا گیا تھا، یہ مینار بالکل مدور ہے جس کے گرد ہوا اور روشنی جانے کے لئے اور موذن کو اذان کہنے کے لئے برآمدے نکلے ہیں یہ مینار نیچے سے اوپر کی طرف بتدریج پتلا ہوتا گیا ہے اور اوپر گنبد ہے۔

9.6 علمی سرپرستی

سلاطین بہمن عام طور پر علماء وفضلاء کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ان کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔بہمنی عہد حکومت میں عرب وعجم کے نہایت مشہور شعراء، صوفیاء کرام دکن آتے تھے۔انہیں انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔ایک بار محمود شاہ کے عہد میں ایک عجمی شاعر دکن آیا اور محمود شاہ کے دربار میں ایک قصیدہ پڑھا بادشاہ نے اسے ایک ہزار روپے کے برابر رقم کا ایک سونے کا سکہ دیا۔محمود شاہ ہر ایک کی قدر کرتا تھا اس کی شہرت بہت دور دور تک پھیل گئی تھی۔مصنف تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی جیسے بزرگ دکن کے سفر پر آمادہ ہوگئے۔خواجہ زین العابدین ہمدانی اور خواجہ محمد گازرونی جو اپنے عہد کے مشہور تاجر تھے ان لوگوں نے بھی حافظ شیرازی کے اخراجات کی کفالت کی ذمہ داری لی۔لیکن موسم کی خرابی کے وجہ سے وہ دکن کا سفر نہ کرسکے لیکن ایک غزل لکھ کر بھیجی۔سلطان محمد شاہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے کہا جو عالم دکن کے لئے روانہ ہوا وہ ہمارے انعام واکرام اور تحفہ وتحائف کا حقدار ہوگیا ہے اور اس نے ایک ہزار سکہ طلائی عنایت کئے۔

سلطان فیروز شاہ بھی علم کا دلدادہ تھا اور فن وکمال کا بہت قدردان تھا۔وہ خود کہا کرتا تھا کہ ہر ملک کا سب سے بہترین اور اعلیٰ تحفہ اس ملک کے ماہر کمال وفن اشخاص ہیں۔وہ ہر ملک کے اہل کمال کو اپنے دربار میں جمع کرنا چاہتا تھا اور یہی سبب تھا کہ ساری دنیا کے اہل کمال اس کے دربار میں حاضر ہوکر انعام واکرام سے مالامال ہوتے تھے۔وہ دنیا کی بہت سی زبانوں کا ماہر تھا اور ہر ملک کے باشندوں سے اسی کے ملک کی زبان میں بات چیت کرتا تھا اس کا حافظہ غضب کا تھا جو بات ایک بار سن لیتا تھا اس کو زندگی بھر نہیں بھولتا تھا۔مستند شعراء کے اشعار اس کو ازبر تھے۔وہ خود بھی کبھی عروضی اور کبھی فیروزی کے تخلص سے اشعار کہتا تھا۔ملا داؤد بیدری نے اس کی علمی سرپرستی اور ذوق کو

مد نظر رکھتے ہوئے ہی اپنی کتاب "تحفہ السلاطین" اس کے نام معنون کی ہے۔

فیروز شاہ کو تمام علوم سے دلچسپی تھی خاص طور پر تفسیر، اصول حکمت، طبعی اور نظری سے اور ان علوم میں اس کو دستگاہ بھی حاصل تھی۔ صوفیاء کرام کی اصلاحات سے بھی شغف تھا، ہفتے میں تین دن درس وتدریس کے لئے تھے اس کے پڑھنے کی خاص کتب زاہدی، شرح تذکرہ، فن ریاضی، شرح مقاصد کلام، اقلیدس، علم ہندسہ اور علم معانی وبیان کی تھیں۔ طلباء کو پڑھانے کا وقت اگر دن میں نہ ملتا تو رات کو پڑھاتا اور ذخیرہ معلومات سے ان کے دلوں کو معمور کر دیتا تھا۔

سلطان احمد شاہ بھی علم اور اہل علم کا سرپرست اور قدردان تھا اس کے عہد کے مشہور عالم شیخ آذری اسفرائنی تھے۔ آپ نے احمد شاہ کی اجازت سے بہمن نامہ لکھا تھا۔ اسفرائنی نے جب اپنے ملک جانے کی اجازت مانگی تو احمد شاہ نے کہا کہ حضرت گیسو دراز کے انتقال کے بعد جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو آپ نے کسی حد تک پر کر دیا ہے۔ اب اس طرح جدا ہو کر جانے سے مجھے بہت تکلیف ہو گی۔ شیخ آذری نے بادشاہ کو اتنا مہربان اور مخلص پایا تو اپنی اولاد کو بھی یہیں بلا لیا۔ شیخ آذری نے دارالامارات کے محل کی شان وشوکت میں بھی اشعار لکھے ہیں جسے خوش خط میں پتھر پر کندہ کروا کر محل کے دروازہ پر جڑ دیا گیا۔

سلطان شمس الدین محمد سوم کا وزیر اعظم محمود گاوان بھی علم کا شیدائی تھا وہ منقولات ومعقولات میں دسترس رکھتا تھا۔ خاص طور پر ریاضی اور طب میں تو اسے بہت ہی کمال حاصل تھا۔ نظم ونثر وانشاء میں وہ اپنی مثال آپ تھا خوش نویسی پر بھی اسے کمال حاصل تھا۔ اس کا دیوان اور رسالہ روضۃ الانشاء دکن کے اکثر اہل علم کے پاس موجود ہے۔ محمود گاوان کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنے عہد کے خراسانی اور عراقی فضلاء سے خط وکتابت کیا کرتا تھا۔ اس کے لکھے ہوئے خطوط اس کی کتاب انشاء میں شامل ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے خواجہ کی مدح میں ایک قصیدہ اور ایک قطعہ لکھا ہے۔

9.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- محمد بن تغلق کے آخری زمانہ میں ملک میں انتشار پیدا ہو گیا، ملک کے حصے بکھرے ہونے لگے تب دکن میں بہمنی سلطنت حسن گنگو نے قائم کی اور فتوحات سے سلطنت کو بہت وسعت دی وہ علم دوست بادشاہ تھا۔
- فیروز شاہ کا دور عروج کا زمانہ تھا اس نے اپنے عہد میں سیاسی تدبر اور تدبر مملکت سے ملک کو بلند منزل پر پہنچا دیا۔ وہ اپنی علمی قابلیت میں مشہور تھا اور کئی زبانوں کا عالم تھا۔ اس کے بعد اس کا بھائی احمد خان حکمران بنا اور اپنا دارالسلطنت گلبرگہ کے بجائے بیدر کو بنایا جس کو خوب ترقی دی اور یہ دنیا کے چند مشہور شہروں کے مد مقابل بن گیا۔
- نظام شاہ نے دو سال حکومت کی پھر محمد شاہ ثانی حاکم بنا جو بقول فرشتہ فیروز شاہ بہمنی کے بعد خاندان بہمن کا علم دوست، ذی علم اور شائستہ بادشاہ تھا۔ اس کے وزیر اعظم محمود گاوان کے تدبر وفراست کے باعث ملک کو وسعت حاصل ہوئی۔ اس نے ملک کو آٹھ

صوبوں میں منقسم کیا اور والی مقرر کئے اور امن امان بحال کیا۔ لیکن بعد میں سلطان محمد ثانی اور محمود گاوان میں اختلاف پیدا ہوا اور محمود گاوان کو قتل کر دیا گیا۔

9.8 نمونہ امتحانی سوالات

9.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. بہمنی حکومت کا قیام کس سن میں ہوا؟

(a) 1358 (b) 1385 (c) 1428 (d) 1527

2. بہمنی سلطنت کا دارالسلطنت-------------تھا۔

(a) دہلی (b) گولکنڈہ (c) گلبرگہ (d) وجے نگر

3. کس بہمنی حکمراں کے عہد میں خواجہ گیسو دراز گلبرگ میں سکونت پذیر ہوئے؟

(a) محمد اول (b) فیروز شاہ (c) محمود گاواں (d) حسن گنگو

4. محمود گاواں کون تھا؟

(a) بہمنی بادشاہ (b) وزیر اعظم (c) گورنر (d) سب صحیح

5. بہمنی حکومت کی بنا کس نے ڈالی؟

(a) حسن گنگو (b) محمود خلجی (c) فیروز شاہ (d) محمد اول

9.8.2 مختصر جواب کے حامل سوالات

1. تاج الدین فیروز شاہ کے عہد حکومت اور نظام سلطنت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. محمود گاوان کے سیاسی نظام پر روشنی ڈالیے۔
3. عہد بہمنی کی تعمیرات کا جائزہ لیجیے۔
4. بہمنی دور میں علماء کی سرپرستی پر نوٹ لکھیے۔
5. بہمنی حکومت کے قیام میں حسن گنگو بہمنی کے رول پر روشنی ڈالیے۔

9.8.3 طویل جواب کے حامل سوالات

1. بہمنی سلاطین کے اہم حکمرانوں کے دور کا اجمالی جائزہ پیش کیجیے؟
2. بہمنی سلطنت کے مرکزی اور صوبائی نظام و نظم و نسق پر ایک تجزیاتی مضمون قلم بند کیجیے۔

3. بہمنی حکومت کے دور حکومت پر تبصراتی نوٹ تحریر کیجیے۔

9.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ فرشتہ : محمد قاسم عبدالکریم فرشتہ
2. جامع تاریخ ہند : محمد حبیب، خلیق احمد نظامی
3. دکن کے بہمنی سلاطین : ہارون خاں شیروانی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू युनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 10: عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتیں

اکائی کے اجزا:

10.0 تمہید
10.1 مقاصد
10.2 پس منظر
10.3 عادل شاہی حکومت
10.3.1 عادل شاہی حکمراں
10.3.2 علمی اور ادبی سرپرستی
10.3.3 تمدنی ومعاشرتی پس منظر
10.4 نظام شاہی حکومت(1490-1636)
10.4.1 نظام شاہی حکمراں
10.4.2 ملک عنبر
10.5 قطب شاہی حکومت
10.5.1 قطب شاہی حکمران
10.6 عماد شاہی حکومت
10.7 برید شاہی حکومت
10.8 اکتسابی نتائج
10.9 نمونہ امتحانی سوالات
10.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
10.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
10.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

ہندوستان کی دہلی سلطنت کے زوال کے دور میں قائم ہونے والی بہمنی سلطنت کے بارے میں آپ نے پچھلی اکائی میں پڑھا اور یہ بھی جانا کہ یہ باوقار علم دوست حکومت تھی جس نے دکن کے علاقے کی تہذیب و سماج پر نمایاں اثر ڈلا۔ بہمنی حکومت 1538ء میں ختم ہوگئی اور اس کے کھنڈروں پر پانچ چھوٹی سلطنتوں برید شاہی سلطنت، عماد شاہی سلطنت، نظام شاہی سلطنت، عادل شاہی سلطنت اور قطب شاہی سلطنت وجود میں آئیں۔ اس اکائی میں ہم عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کا اجمالی طور پر جائزہ لیں گے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کے قیام و عروج کے بارے واقفیت حاصل کرسکیں اور اسی طرح ان حکومتوں کی علمی سرپرستی اور فن تعمیر وفنون لطیفہ کے میدان میں ان کے کارناموں کا بھی جائزہ لے سکیں۔ اس اکائی میں آپ نظام شاہی حکومت کا اجمالی تعارف حاصل کرسکیں گے اور برید شاہی اور برار شاہی حکومت کے احوال مختصر طور پر تبصرہ کرسکیں گے۔

10.2 پس منظر

بہمنی سلطان شمس الدین محمد سوم کے انتقال کے بعد اس کا شیر خوار بیٹا شہاب الدین محمود شاہ سلطان بنا، وہ کم سن تھا اس لئے حکومت کی باگ ڈور نظام الملک کے ہاتھوں میں رہی جو بعد میں اس کا وزیر اعظم بن گیا۔ اس کے عہد میں دکنیوں اور غیر دکنیوں میں کشید گی بڑھتی گئی۔ سلطان اس کشید گی سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ نظام الملک کا جھکاؤ دکنیوں کی طرف تھا اور سلطان کا غیر دکنیوں کی طرف اس لئے سلطان شہاب الدین محمود شاہ نے نظام الملک کو قتل کرادیا جسکی وجہ سے دکنیوں نے محل پر حملہ بول دیا لیکن غیر دکنیوں کی مدد سے سلطان کی جان بچ گئی۔ اس واقعہ کے بعد سلطان نے دکنیوں کا یک طرفہ قتل عام کرایا اور یہی بہمنیوں کی زوال کی وجہ بنی اور دن بدن بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرتا چلاگیا اور صوبے کے گورنروں نے اس کا فائدہ اُٹھاکر اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ جس کے نتیجہ میں بہمنی سلطنت پانچ خود مختار حکومتوں میں تقسیم ہوگئی جو حسب ذیل ہیں:

1. بیجاپور میں یوسف عادل شاہ نے 1489ء میں عادل شاہی حکومت کی بنیاد رکھی۔
2. احمد نگر میں ملک احمد نے 1490ء میں نظام شاہی حکومت کی بنا رکھی۔
3. برار میں فتح اللہ عماد نے 1490ء میں عماد شاہی حکومت قائم کی۔
4. گولکنڈہ میں قلی قطب شاہ نے 1512ء میں قطب شاہی حکومت کی بنیاد رکھی۔
5. اور بیدر میں امیر علی برید نے 1619ء میں برید شاہی حکومت کی بنیاد رکھی۔

10.3 عادل شاہی حکومت

بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کا بانی یوسف عادل شاہ ہے جس کے متعلق یہ عام رائے ہے کہ وہ سلاطین عثمانیہ ترکی کے خاندان سے تھا۔ بہمنی حکومت کے دور میں بیجاپور کا صوبہ دار تھا۔ بہمنی حکومت کے کمزور ہونے پر 1489ء میں یوسف عادل شاہ نے بیجاپور میں حکومت قائم کی۔ یکے بعد دیگرے نواشخاص حکومت کرتے رہے بالآخر سکندر عادل شاہ کے عہد میں 1686ء مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے بیجا پور کو فتح کر کے حکومت عادل شاہی کا خاتمہ کر دیا۔

10.3.1 عادل شاہی حکمراں

.10.3.1.1 یوسف عادل شاہ(1510-1490)

یوسف عادل شاہ اپنی قابلیت کے لحاظ سے اپنے عہد میں ممتاز تھا وہ دور اندیش اور تجربہ کار فرمانروا تھا۔ یوسف عادل شاہ کی شخصیت شجاعت، سخاوت اور انصاف جیسے محاسن کا مجموعہ تھی۔ ذاتی اوصاف کے ساتھ ساتھ وہ علمی کمالات سے بھی متصف تھا۔ خوش خطی کے علاوہ وہ علم وشاعری کا بھی ماہر تھا۔ اسے علم موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ طنبور وعود کو نہایت عمدگی سے بجاتا تھا اور اس فن کے استادوں کی بے حد قدر کرتا تھا۔ دور دور سے علماء اور اصحاب علم کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دیتا اور ان کو قیمتی تحائف ارسال کرتا تھا۔ مشہور مورخ فرشتہ نے اس کی علم دوستی اور علماء کی سرپرستی کی بڑی تعریف کی ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے "اس دور میں حنفی، شافعی اور شیعی علماء بڑے خلوص اور محبت سے ملتے تھے اور باہم کسی طرح کا بغض وکینہ نہ رکھتے تھے"۔ اس کا نکاح مرہٹہ کے ایک سردار کی بہن پونجی خانم سے ہوا تھا۔ اس سے ایک لڑکا اسماعیل اور تین لڑکیاں تولد ہوئیں۔ اس کے عہد میں شیعہ مذہب کو ترجیح دی گئی تھی۔

.10.3.1.2 اسماعیل عادل شاہ:(1534-1510)

یوسف عادل شاہ کے بعد اس کا فرزند اسماعیل مسند پر بیٹھا اور 1534ء تک بڑی شان وشوکت سے حکمرانی کی۔ اس کے عہد میں 1510ء میں پرتگالیوں نے گوا اور وجے نگر کے حاکم کرشنہ دیو نے رائچور دوآب پر قبضہ کر لیا۔ اسماعیل عادل شاہ بھی اپنے والد یوسف عادل شاہ کی طرح علم دوست اور صاحب علم اور شاعر تھا، وفائی کے تخلص سے شاعری کرتا تھا وہ بہت سخی تھا۔ اس کی سخاوت سے ملک کی آمدنی اخراجات کے لئے کافی نہ ہوتی تھی۔ وہ نرم دل تھا خطاکاروں کی خطاؤں پر چشم پوشی کرتا تھا۔ وہ فحش الفاظ کبھی زبان سے نہیں نکالتا تھا اور ہمیشہ عالموں اور فاضلوں کے درمیان رہتا تھا۔ علم وموسیقی سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ اس کی شاعری کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے کہ دکن کے کسی بادشاہ نے اسماعیل عادل شاہ جیسے لطیف اور متین اشعار نظم نہیں کئے۔

.10.3.1.3 ابراہیم عادل شاہ:(1558-1534)

اسماعیل عادل شاہ کے انتقال کے بعد اسکا بیٹا ملو کی تخت نشین ہوا۔ وہ نااہل حکمراں ثابت ہوا اور چھ ماہ کے بعد اسکے چھوٹے بھائی ابراہیم عادل شاہ نے تخت پر قبضہ کیا اور 1534ء میں بادشاہ بنا۔ وہ بھی صاحب علم اور علم دوست تھا اس نے اپنے باپ دادا کے مذہب شیعہ کو

ترک کر کے سنی مذہب اختیار کیا اس کی وجہ سے ایرانی اثر دربار میں کم ہو گیا۔ دکن کے ارباب کمال اس کے مقرب بن گئے۔ اس کی وجہ سے دکنی زبان کو عروج ہوا یعنی ہندوی (دکنی اردو) نے فارسی زبان کی جگہ لے لی۔ اس کے عہد میں ہندوؤں کو اونچے اونچے عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ابراہیم عادل شاہ اول کے متعلق مورخ فرشتہ لکھتے ہیں کہ وہ وہ بڑا بہادر تھا اور اپنی مردانگی اور شجاعت کی وجہ سے کسی بات کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

10.3.1.4. علی عادل شاہ اول:(1580-1558)

ابراہیم عادل شاہ کے بعد اس کا فرزند علی عادل شاہ اول مسند حکومت پر 1558ء میں متمکن ہوا۔ اس کے عہد میں شولا پور کے قبضہ کو لے کر احمد نگر اور بیجاپور کے بیچ چلی آ رہی کشیدگی بہت بڑھ گئی۔ علی عادل شاہ نے اپنے کو مضبوط کرنے کے لئے وجے نگر کے حکمران رامارائے سے معاہدہ کیا۔ دونوں فوجوں نے مل کر احمد نگر پر حملہ کیا۔ احمد نگر کا حاکم حسین نظام شاہ بھاگ کر جنیر چلا گیا بعد میں علی عادل شاہ نے حسین نظام شاہ کی صاحبزادی چاند بی بی سے نکاح کر کے احمد نگر کے ساتھ بھی معاہدہ کر لیا۔ اس کے عہد حکومت میں عادل شاہی سرحدیں ہونا ور بندرگاہ سے لے کر تنگ بھدرا ندی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ علی عادل شاہ نے مغل حکمران اکبر سے خوشگوار رشتہ قائم کیا اور دونوں طرف سے سفیروں کا آنا جانا ہوا۔ 1580ء میں ایک خواجہ سرا نے علی عادل کو اس کے حرم میں قتل کر دیا۔

علی عادل شاہ بھی اپنے اجداد کی طرح صاحب علم تھا اسے مطالعہ کا ایسا شوق تھا کہ سفر میں بھی چار سو صندوق کتابوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اس کے کتب خانے میں بیسیوں کاتب، خوش نویس، مجدول اور نقاش مامور تھے۔ اس نے سنی مذہب ترک کر کے شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔ وہ بہت سخی تھا۔ اس نے زر کثیر دے کر ملا فتح اللہ شیرازی کو طلب کیا۔ علی عادل شاہ نے باپ کے تمام اندوختے اور خود اپنے عہد کی تمام دولت ایران، عرب اور روم کے دیگر ممالک کے فضلا اور مستحقین کو عطا کر دی۔ اس کے عہد میں بادشاہوں اور وزیروں کے مکانوں میں علمی جلسے ہوا کرتے تھے۔ محمد علی، سید مصطفی خاں، شاہ عبدالحسن اور شاہ ابوالقاسم جیسے علماء اس کے درباری زینت بنے ہوئے تھے۔ ملا محمد رضا مشہدی اس کا درباری شاعر تھا۔ اس کے عہد تعمیرات میں گول گنبد بہت اہم ہے اس کی خصوصیت دکن اور غیر دکنی تعمیرات کا سنگم ہے۔

10.3.1.5. ابراہیم ثانی:(1627-1558)

علی عادل شاہ کے قتل کے بعد اس کی جگہ اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی فرماں روا ہوا۔ اس کی کم سنی کے باعث اول تو کئی سال تک نائب حکومت کرتے رہے خاص کر اس کی چچی چاند بی بی۔ جس سے حکومت کا شیرازہ بکھر تا گیا۔ اس لئے ابراہیم نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی تو اس کو اپنے ہمسایوں سے کئی جنگیں لڑنی پڑیں، مغلوں نے احمد نگر پر حملہ کر قبضہ کر لیا اور ابراہیم نے ان کی باجگزاری قبول کر لی پھر اپنی بیٹی کا نکاح شہزادہ دانیال سے کر دیا۔

ان سیاسی اُتھل پُتھل کے باوجود بھی اس کے عہد میں علم وادب کی ترقی ہوئی۔ نہ صرف احمد نگر سے کئی ارباب علم بیجاپور آئے بلکہ

ایران اور حجاز سے بھی اصحاب علم وسلوک بیجاپور میں آتے رہے۔ دکن کا مشہور مورخ فرشتہ اس کے عہد میں بیجاپور آیا تھا اس نے ابراہیم کے کردار کی بڑی تعریف کی ہے۔ ابراہیم کو شاعری اور موسیقی سے بڑی انسیت تھی جس کا ثبوت اس کی کتاب ''نورس'' سے ملتا ہے۔ لفظ نورس سے اس کو بڑی دلچسپی تھی۔ اسی نام پر ایک شہر آباد کیا، قلعہ بنایا، درباری شاعر عبدالقادر کو نورس کا لقب دیا، یہاں تک کہ شاہی مہر پر بھی نورس کندہ تھا۔ وہ مشہور چشتی صوفی بندہ نواز گیسودراز کا گرویدہ تھا۔ ان کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ ابراہیم مرہٹی، دکنی، اردو اور کنڑ زبانوں کا ماہر تھا۔ اس کے عہد میں کئی ہندوؤں کو اعلیٰ مرتبہ حاصل تھا۔ اس نے شیعہ، سنی اور دیگر مذہب میں ہم آہنگی پیدا کی۔ اسے خوش خطی سے بھی دلچسپی تھی اس کی ان مختلف صفات کی وجہ سے عوام نے اسے ''جگت گرو'' کا خطاب دیا تھا۔

10.3.1.6. محمد عادل شاہ:(1627-1656)

ابراہیم کے انتقال کے بعد اس کا فرزند محمد عادل شاہ سولہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور دو امراء دولت خان (مقلبہ خواص خان) اور مرزا محمد امین لاری (مقلبہ مصطفی خان) کی مدد سے حکومت کی۔ محمد عادل شاہ کا دور حکمرانی کئی وجوہ سے اہمیت رکھتا ہے ایک طرف تو جنگ وجدال اور معرکہ آرائیاں ہیں تو دوسری طرف علم وادب کی سرپرستی کے لئے بھی مشہور ہے۔ احمد نگر کی نظام شاہی حکومت نے دو مرتبہ فوج کشی کی مگر دونوں مرتبہ ناکام لوٹنا پڑا اس کے عہد میں مغل بادشاہوں جہانگیر اور شاہ جہاں نے بھی حملہ کیا۔ 1636ء میں محمد عادل شاہ نے شاہ جہاں سے معاہدہ کیا اور بیجاپور کی حفاظت کی۔ دونوں میں خوش گوار رشتہ ہونے کے سبب شاہ جہاں نے محمد عادل شاہ کو 1648ء میں شاہ کا لقب عطا کیا۔ عادل شاہی حکمرانوں میں مغلوں کے طرف سے شاہ کا لقب صرف محمد عادل شاہ کو ہی ملا تھا۔ محمد عادل شاہ کو ملک کے بعض باغی اور خودسر امیروں کی بغاوت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ان میں شاہ جی اور اخلاص خاں کی بغاوتیں اہم ہیں۔ ان لڑائیوں کے علاوہ محمد عادل شاہ نے ملک گیری بھی کی جس سے مملکت کے حدود وسیع ہوگے۔ 1636ء میں شاہ جہاں سے معاہدہ کے سبب شمال میں تو اضافہ نہ ہوسکا مگر مغرب میں کونارک، پونے، دھبول (ممبئی): جنوب میں میسور اور مشرق میں کرناٹک اور تلنگانہ عادل شاہی حکومت کے قبضہ میں آگیا۔ اس کے عہد میں عادل شاہی حکومت کا دبدبہ بحر عرب سے لے کر بنگال کی خلیج تک تھا۔

10.3.1.7. علی عادل شاہ ثانی:(1656-1672)

محمد عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ ثانی کا دور حکومت شروع ہوتا ہے۔ علی عادل شاہ نے انیس سال کی عمر میں عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لی۔ اس کا دور حکومت بھی محمد عادل شاہ کی طرح جنگ وجدال سے بھرا ہے۔ اس عہد میں شاہ جہاں کی طرف سے اورنگ زیب نے حملہ کرکے بیدر اور کلیانی وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اورنگ زیب بیجاپور کی طرف روانہ ہوا مگر شاہ جہاں کی علالت کے باعث اورنگ زیب عارضی صلح کے بعد دہلی واپس لوٹ آیا۔ اس صلح کے بعد عادل شاہی حکومت ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ شیواجی نے سرتابی کی۔ اس کے مقابلہ میں سدی جوہر الخاطب صلابت خاں کو بھیجا گیا مگر وہ شیواجی سے مل گیا۔ اس لئے اب خود علی عادل شاہ کو اپنے باغی امیروں کی بیخ کنی کرنی پڑی اور صلابت خان کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ شیواجی نے دوبارہ بغاوت کی اس مرتبہ اس کی سرکوبی کے لئے وہ خود گیا اور شیواجی کو شکست دے کر اسے پونہ کی طرف فرار ہونے پر مجبور کیا۔

10.3.1.8. سکندر عادل شاہ:(1672-1686)

علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد اس کا کم سن بیٹا سکندر علی شاہ جس کی عمر صرف چار سال تھی کو مسند حکومت پر بٹھایا گیا۔ اس لئے اس کے عہد میں نائبوں اور وزراء نے حکومت کی جو امراء اور فضلاء کے بیچ خانہ جنگی کی وجہ بنی۔ صوبائی حکمرانوں نے بغاوت شروع کی جس سے مرکزی حکومت کمزور پڑ گئی۔ مغل اور مراٹھا سے کئی معرکے ہوئے۔ اورنگ زیب پوری طرح بیجاپور پر قبضہ کرنے کی نیت سے 1685ء میں حملہ آور ہوا اور بیجاپور کو فتح کیا۔ سکندر شاہ کو زنجیر میں باندھ کر اورنگ زیب کے سامنے لایا گیا۔ اورنگ زیب نے اسے دولت آباد قلعہ میں نظر بند کر دیا اور اسی حالت میں اس کی وفات ہوئی۔ اس طرح عادل شاہی کی دو سو سالہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

بیجاپور کی مملکت شاہ جہاں کے تخت نشین ہونے تک دہلی کے مغل شہنشاہوں کے براہ راست حملوں سے بچی رہی لیکن جب مغلوں کے حملے سے احمد نگر کی ریاست کمزور ہو رہی تھی تو بیجاپور نے اس مملکت کے بعض علاقوں پر قبضہ کرنے کو خود لے لینے کی کوشش کی۔ پھر مغلوں اور بیجاپور میں ٹکر ہوئی اور 1636ء میں مغلوں نے بیجاپور پر چڑھائی کی اور اسے صلح پر مجبور کیا جس کی رو سے بیجاپور نے مغلوں کی شہنشاہی کا اعتراف کر لیا اس کے بعد بیس سال تک اس مملکت میں امن وامان رہا۔ 1656ء میں جب علی عادل شاہ حکمراں ہوا تو شاہ جہاں نے اپنے شہنشاہی دعوے پر اعتراض کی وجہ سے اورنگ زیب کو حملہ کرنے کا حکم دیا لیکن شاہ جہاں کی علالت کی وجہ سے جنگی اقدامات روک دیئے گئے۔ مغلوں کے علاوہ بیجاپور کو مرہٹہ سردار شیواجی کی طرف سے بھی خطرے کا سامنا کرنا پڑا جس نے 1656ء میں کمین لگا کر بیجاپور کی ایک فوج اور اس کے سالار افضل خان کا خاتمہ کر دیا اس کے بعد بیجاپور کی مملکت کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے بمشکل کبھی نجات ملی۔ بیجاپور سکندر عادل شاہ کے عہد میں مغلوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں رفتہ رفتہ اپنے صوبوں سے محروم ہونے لگا یہاں تک کہ 1656ء میں اورنگ زیب نے ایک سال سے زائد محاصرے کے بعد خود بیجاپور کو سر کر لیا اور مملکت کے باقی ماندہ حصے مغلیہ سلطنت میں شامل ہو گئے۔ عادل شاہی حکمرانوں نے بڑی عمارتیں تعمیر کیں۔ انہوں نے اپنے دارالسلطنت بیجاپور کو ہندوستان میں مسلمانوں کے تعمیری کمالات کی ایک نہایت شاندار یادگار بنادیا وہ علم وادب کے بھی بڑے سرپرست تھے۔ مشہور مورخ فرشتہ نے اپنی تاریخ ابراہیم عادل شاہ ثانی ہی کی سرپرستی میں لکھی تھی۔

10.3.2 علمی اور ادبی سرپرستی

عادل شاہی حکومت کی اگر علمی اور ادبی سرپرستی وخدمات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ عادل شاہی حکومت کا بانی یوسف عادل شاہ سے لے کر آخری چشم وچراغ سکندر عادل شاہ کے عہد تک سبھی حکمرانوں نے خوب بڑھ چڑھ کر دلچسپی لی اور ادبی کارناموں کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ ادبی کتابیں فارسی اور اردو زبان میں مرتب ہوتی رہیں۔ محمد عادل شاہ کے زمانہ میں آتشی نے خمسہ نظامی کے جواب میں پانچ مثنویاں لکھیں۔ ملا ظہور نے محمد نامہ مرتب کیا، ملا محمد حسین نے رفیع الدین شیرازی کی کتاب احوال السلاطین کا تکملہ کیا۔ محمد ابراہیم صنعتی، قاضی نور اللہ مقیمی اور مرزا دولت کی علمی کارنامے سامنے آئے۔ محمد عادل شاہ کے عہد میں تعلیم کو وسعت ہوئی۔ مدارس کھولے گئے طلباء کو وظائف جاری کئے گئے اور اصحاب علم کو فکر معاش سے مستغنی کیا گیا۔

علی عادل شاہ بھی علم کی آبیاری اور اصحاب علم وفن کی قدر دانی میں اپنے اجداد سے کم نہیں رہا۔ علماء، فضلاء، شعراء وادباء سلطان کے دست کرم سے نہال ہوئے۔ قاضی نور اللہ نے تاریخ عادل شاہ قلم بند کی۔ نصرتی نے علم نامہ اور گلشن عشق جیسی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔ علی عادل شاہ کے متعلق مولف احوال السلاطین لکھتا ہے کہ چونکہ اسے اپنی خاص زبان دکنی اور اردو سے رغبت تھی اس لئے بیجاپور سے بہت سارے دکنی گو شاعر پیدا ہوئے ان میں نصرتی، ابو المعالی، ملا عبد الرزاق، رفعت عبد القادر، عبد الطیف اور عبد النبی بلند پائے کے شاعر تھے۔ علی عادل شاہ کی علمی دلچسپی اور اس کے بہترین کردار کا تذکرہ اورنگ زیب عالمگیری مورخ خافی خان نے ان الفاظ میں لکھا ہے،

”ایک ایسا بادشاہ تھا جو فوج کو عزیز رکھتا تھا۔ سخاوت، شجاعت اور وسعت اخلاق کے باعث مشہور تھا۔ فضلاء کو دوست رکھتا تھا، شاعروں کی قدر کرتا تھا۔“

عادل شاہی حکومت کا آخری فرمانرواں سکندر شاہ گو کہ اس کا دور جنگی مصائب کا عہد رہا ہے مگر علم کی سرپرستی میں کمی نہیں آئی، مشہور مورخ نصرتی نے تاریخ اسکندری قلم بند کی جس سے اس دور کے بارے میں اہم معلومت ملتی ہیں۔

حکمران عادل شاہی کے علمی وادبی سرپرستی کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ حکومت علمی کاوشوں، ادبی شہ پاروں، تاریخی دستاویزات کی تصنیف کے علاوہ شاعری، موسیقی اور مصوری جیسے فنون لطیفہ کی سرپرستی کے لحاظ سے بھی تاریخ میں یادگار ہے۔ اس دور کے ادیبوں اور شاعروں نے جو نقش چھوڑے ہیں ان کو زمانہ مٹا نہیں سکتا۔

10.3.3 تمدنی ومعاشرتی پس منظر

عادل شاہی عہد حکومت کے تہذیب وتمدن اور معاشرت پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دکن کی اسلامی حکومت نے جو روایات چھوڑی تھیں اور جن کی نشو نما عادل شاہی حکومت میں ہوئی تھی وہ آج بھی نظر آتی ہیں۔ کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے، رہنے سہنے کے جو طریقے رائج تھے وہ باقی ہیں اس تہذیب وتمدن میں ایک طرف اسلامی روایات، ایرانی، مغل اور ترکی مراسم نے جگہ لی تھی تو دوسری طرف ہندی روایات بھی شامل ہوگئی تھیں؛ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں اور ہندوؤں کے طریقہ معاشرت اور رسم ورواج میں فرق نظر آتا تھا ان کے لباس، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقے جداگانہ تھے۔ مذہب کو زندگی کا جزو سمجھتے تھے۔ دعا مانگی جاتی تھی اور اس کو اثر پذیر خیال کیا جاتا تھا۔ دستر خوان پر کھانا کھاتے تو تمام قسم کے کھانے کے لوازمات، نمکین وشیرین دستر خوان پر چُنے جاتے تھے۔ ملازم تول سے مکھی اُڑاتے، موسیقی کا عام رواج تھا، رقص بھی ہوتا تھا، ماتم کرنے کا دستور تھا اور ماتم کے وقت عورتیں سر کے بال کھول دیا کرتی تھیں۔ سواری کے لئے گھوڑے، ہاتھی اور بیل گاڑی رہتے تھے۔ سیر وشکار مردوں کی زندگی کا جزہوتا تھا، عورتوں کے لئے باغوں میں جھولے ڈالے جاتے، پکوان ہوتا اور گیت گائے جاتے تھے۔ مخلوط محفلوں کا رواج نہیں تھا مرد اور عورتوں کی محفلیں جداگانہ ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں مردانہ کھیل اور فوجی کرتب بھی ہوتے تھے۔

10.4 نظام شاہی حکومت(1490-1636)

نظام شاہی سلطنت کا بانی ملک نظام احمد شاہ بحری ہے اس کا باپ حسن وجے نگر کے ایک معزز برہمن خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ محمد شاہ بہمنی کے دور میں اس نے اسلام قبول کیا اور اس کو نظام الملک کا خطاب دیا گیا اور منصب سر لشکری سے سرفراز ہوا۔ بہمنی سلطنت کے جب حصے بخرے ہوئے تو حسن نظام الملک کا فرزند ملک احمد نے خود مختار نظام شاہی سلطنت قائم کی۔ اس خاندان کے چودہ بادشاہ 1490-1635 تک یعنی تقریباً 145 سال حکومت کرتے رہے، اس کے بعد شاہ جہاں کے عہد میں اس علاقے کو مغلوں نے اپنے حدود میں ملا لیا۔

10.4.1 نظام شاہی حکمراں

10.4.1.1. ملک احمد(1490-1510)

ملک احمد نہایت متقی اور پرہیز گار تھا اچھے کردار اور قابل تعریف عادتوں کی وجہ سے نیک نام ہوا۔ بہمنی سلطنت میں وہ جنیر کا گورنر تھا۔اس نے بہمنی سپہ سالار جہانگیر خان کو 1490ء میں شکست دے کر نظام شاہی سلطنت کی بنا رکھی تھی جس کی سرحدیں دو سلطنتوں: سلطنت گجرات اور سلطنت گولکنڈہ کے بیچ واقع تھیں۔ 1494ء میں شہر احمد نگر کی بنیاد رکھ کر اپنا دارالسلطنت بنایا۔ ملک احمد نظام شاہ نے کئی کوششوں کے بعد دولت آباد کے عظیم اور مضبوط قصر پر قبضہ کیا۔ جنگ وجدل کے علاوہ اس کے عہد میں علم وفن کو ترویج دی گئی یہاں تک کہ بیجاپور کے کئی مشاہر، علماء اور اصحاب علم اولاً احمد نگر میں ہی آئے تھے۔

10.4.1.2. برہان نظام شاہ(1511-1553) اور حسین نظام شاہ(1553-1565)

احمد نظام شاہ کے بعد اس کا فرزند برہان نظام شاہ تخت نشین ہوا، یہ احمد نگر کا پہلا حکمراں تھا جس نے نظام شاہ کا لقب اختیار کیا۔ برہان نظام شاہ چونکہ شیر خوار تھا اس لئے اس کا نائب و وزیر مکمل خان دکنی تھا جس نے اپنی قابلیت سے امن وامان کو بحال رکھا۔ 1553ء میں برہان کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حسین نظام شاہ حکمراں ہوا۔ اس کے عہد کو نظام شاہی عہد کا عہد زرین کہا جاتا ہے اس کے عہد میں 1562ء بیجاپور کے عادل شاہ، گولکنڈہ کے ابراہیم قطب شاہ اور وجے نگر کے رام رائے تینوں افواج نے مل کر احمد نگر پر حملہ کیا اور خوب جم کر لوٹا اور تباہ وبرباد کیا۔ ان تینوں افواج کا سرغنہ وجے نگر کا راجہ رام رائے تھا۔ اپنی ہار کا بدلہ لینے کے لئے حسین نظام شاہ نے دکن کی مسلم سلطنتوں کی ایک مشترکہ فوج بنائی اور 1565ء میں تالی کوٹ کی جنگ میں وجے نگر کو بری طرح شکست دی۔

10.4.1.3. مرتضیٰ نظام شاہ(1565-1588)، میراں حسین(1588-89) واسماعیل(1589-1591)

حسین نظام شاہ کے بعد اس کا بیٹا مرتضیٰ نظام شاہ تخت نشین ہوا۔ مرتضیٰ نظام شاہ بہت ظالم تھا۔ اس کے خوف سے اس کے بھائی برہان نظام شاہ نے مغل حکمراں اکبر کے پاس جا کر شمالی ہند میں پناہ لی تھی۔ اس کے عہد میں مغلوں نے پہلی بار احمد نگر پر حملہ کیا۔ مرتضیٰ نظام شاہ دماغی فتور کے باعث اپنے فرزند میران حسین کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی میران حسین کا شکار ہوا۔ اس کے بعد میران حسین

تخت نشین ہوا وہ بھی بہت ظالم بادشاہ تھا اس وجہ سے رعایا و امراء مخالف ہوگئے اور وہ زیادہ دنوں تک حکومت نہیں کر سکا اور اس کی جگہ مرتضیٰ نظام شاہ کے بھائی برہان نظام شاہ کے فرزند اسمٰعیل جو نظر بند تھا کو مسند حکومت پر متمکن کیا۔ اسمٰعیل کے دو سالہ میں دور شیعہ اور مہدوی طبقوں کے بیچ آپس میں جھگڑے ہوتے رہے۔

10.4.1.4. برہان نظام شاہ(1591-1595)

جب برہان نظام شاہ کو اطلاع ہوئی کہ اس کا بیٹا اسمٰعیل کو حکمران بنادیا گیا ہے تو شمالی ہند سے واپس آکر بیٹے کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت بھی صرف چار سال رہی۔ لیکن ان چار سالوں میں جو مذہبی فرقہ وارانہ جھگڑے چل رہے تھے اس کو ختم کیا اور حکومت میں اس طرح امن وامان قائم کیا کہ نظام شاہوں کی کھوئی ہوئی عظمت و شوکت دوبارہ حاصل ہوگئی۔ 1595ء میں اس کا انتقال ہوا۔

10.4.1.5. ابراہیم نظام شاہ و چاند بی بی

برہان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم تخت نشین ہوا۔ مگر چند ماہ بعد ہی ایک تیر لگنے سے فوت ہوا۔ اس کے انتقال پر احمد نگر میں افراتفری پھیل گئی قریب قریب یہی وقت تھا جب چاند بی بی احمد نگر آئیں۔ تخت کے متعدد دعویدار تھے۔ سب سے اہم شخصیت بہادر کی تھی جو ابراہیم نظام شاہ کا کم سن بیٹا تھا۔ دوسرا شخص تھا احمد، یعنی حسین نظام شاہ کے ایک بھائی کا مبینہ پوتا۔ چاند بی بی نے پوری قوت کے ساتھ بہادر کی حمایت کی لیکن میاں مانجو نے جو احمد کو تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔ اپنے کو کمزور پایا تو اس نے مغل حکمران اکبر کے بیٹے شہزادہ مراد کو، جو اس وقت گجرات کا حاکم تھا اپنی مدد کے لئے بلایا۔ مراد چونکہ پہلے سے اس انتظار میں تھا اس لئے فوراً دارالحکومت پر چڑھائی کردی۔ ادھر چاند بی بی نے بہادر کے تخت نشینی کا اعلان کرکے گولکنڈہ اور بیجاپور سے مدد طلب کی اس طرح چاند بی بی نے دو مرتبہ مغلوں کے محاصرہ کو ناکام کیا۔ مراد نے بارود کی سرنگیں بچھادی تھی چاند بی بی نے اسے بھی کھدوا کر مٹی بھروادی۔ اس کے علاوہ جب قلعہ کی فصیل میں شگاف پڑا تو چاند بی بی بہ نفس نفیس اس شگاف پر پہنچ گئی اور راتوں رات شگاف کو بھر دیا اس کے بعد چاند بی بی کی بہادری کو قبول کرتے ہوئے اسے سلطانہ تسلیم کیا گیا۔

دائرۃ المعارف میں لکھا ہے کہ دکن کی یہی ایک ملکہ تھی جس نے سلطان کا مردانہ لقب اختیار کیا جسے دکن کی پانچ سلطنتوں اور مغلوں نے تسلیم کیا تھا۔ اس کے بعد مغلوں سے معاہدہ ہوا، جس کے مطابق برار کا علاقہ مغلوں کی طرف منتقل ہوگیا اور اس کے بدلے میں احمد نگر کی مکمل آزادی و خود مختاری تسلیم کرلی گئی۔

اس بحران کے ختم ہوجانے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے حالات سدھر گئے۔ لیکن داخلی امن زیادہ دن برقرار نہ رہ سکا۔ پھر لوگ چاند بی بی کے مخالف ہوگئے انہوں نے اب مغل شہزادہ دانیال کو مدد کے لئے بلایا۔ چاند بی بی سلطان نے بھی دوبارہ گولکنڈہ اور بیجاپور سے مدد طلب کی۔ لیکن اس دفعہ اتحاد کامیاب نہ ہوسکا اور 1592ء میں گوداوری کے کنارے سون پت کے میدان میں سخت جنگ ہوئی جس میں چاند بی بی کے اتحادیوں نے شکست کھائی۔ مغلوں نے احمد نگر پر چڑھائی کرکے دوبارہ اس کا محاصرہ کرلیا۔ جس کا فائدہ ملک کے اندر مخالف

گروہ نے اٹھایا جس کا سردار حمید خان تھا، شہر کے اوباشوں کو ساتھ لے کر محل میں گھس گیا اور چاند بی بی کو قتل کر دیا اور دانیال کا 1600ء میں احمد نگر پر قبضہ ہو گیا۔

10.4.2 ملک عنبر

ملک عنبر ایک حبشی سردار تھا جو ابتداً ایک غلام تھا، بعد میں وہ وزارت کے عہدے تک ترقی کر کے پہنچا تھا اور نظام شاہی حکومت کی گرتی ہوئی طاقت کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ جب 1600ء میں شہزادہ دانیال نے احمد نگر کو فتح کر لیا، ملک عنبر اور ایک دکنی راجہ متّان نے باقی علاقے کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ ان کو قبضہ کرنے میں کامیابی ملی کیونکہ اس زمانہ میں سلیم کی بغاوت، اکبر کی وفات اور سلطان خسرو کی سرکشی کی وجہ سے عنبر کو اتنی مہلت مل گئی کہ اس نے اپنے ملک کا باقاعدہ انتظام درست کیا اور بہت سی افواج تیار کر لی۔ اس کی تیار کردہ فوج نے نہ صرف اپنے صوبہ کا انتظام درست کیا بلکہ کئی دفعہ مغلوں سے بھی جنگ کی جسارت بھی کی اس نے دکن میں ایک نیا مالی دستور جاری کیا۔ مگر جب شہنشاہ جہانگیر کا اقتدار جم گیا تو اس نے دکن پر کئی مہمات بھیجیں ملک عنبر مطیع نہ ہو سکا لیکن آخر کار اس نے وہ مقامات جو مغلوں سے لیے تھے 1620ء میں شاہ جہاں کو واپس کر دیئے۔ لیکن 1625ء میں ملک عنبر کا انتقال ہوا اور اس کے بعد شاہ جہاں کی فوج نے 1644ء میں احمد نگر پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا اور اس طرح نظام شاہی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

نظام شاہی سلطنت سے نہ صرف اپنے ہمسایہ حکومتوں کی لڑائی ہوتی رہی بلکہ شمال کی مغلیہ حکومت نے بھی دکن میں اس سلطنت پر حملہ کیا۔ اکبر کے دو فرزند یکے بعد دیگرے احمد نگر پر حملہ آور ہوئے۔ گجرات کے بادشاہوں سے بھی نظام شاہوں کو معرکے کرنے پڑے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ تو بہادر شاہ والی گجرات نے احمد نگر پر اپنا قبضہ بھی کر لیا تھا۔ نظام شاہی حکومت میں برہان نظام شاہ اور حسین نظام شاہ خاص کر سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے دور حکومت میں ایک طرف تو جنگ وجدال کے معرکے ہوتے رہے اور دوسری طرف علم وفن کی بھی قدردانی ہوتی رہی۔ دکن کی دوسری مملکتوں کی طرح یہ بھی آپس کی رقابت اور امراء کی سازشوں سے کمزور ہوتی گئی اور حکومت نظام شاہی کا خاتمہ ہو گیا۔

10.5 قطب شاہی حکومت

قلی قطب شاہ بہمنی دور میں تلنگانہ کا صوبہ دار تھا، دوسرے صوبے داروں کی طرح بہمنی حکومت کے زوال پر اس نے بھی 1518ء میں گولکنڈہ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی جو 1687ء تک قائم رہی۔ قطب شاہی حکومت کا آخری سلطان ابوالحسن تھا جسے مغل حکمراں اورنگ زیب نے 1687ء میں شکست دے کر اس کی حکومت کا خاتمہ کیا، اور اس مملکت کو اپنی حکومت میں ملا لیا۔

10.5.1 قطب شاہی حکمران

.10.5.1.1 قلی قطب شاہ (1518-1543)

قلی قطب شاہ نے خود مختار حکومت قائم کرنے کے بعد قرب وجوار کے علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسیع کیا اس نے تقریباً ستر

قلعے فتح کئے اور اپنی سلطنت کو ورنگل کی سرحد سے بندر گاہ مچھلی پٹم تک پہنچا دیا اور حکومت کو ایک باعظمت اور شاندار سلطنت بنا دیا۔ قلی قطب شاہ کا تمام وقت اپنی سلطنت کو مستحکم بنانے اور وسیع کرنے میں لگا۔ اس کا زیادہ تر وقت میدان جنگ میں گزرا۔ اس لئے تہذیب و تمدن کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے باوجود اس نے آتش خانے کے نام سے ایک خاص محل تعمیر کیا تھا جہاں شعراء و ادیب جمع ہوتے تھے۔ قلی قطب شاہ نے تلنگانہ میں پچاس سال حکومت کی جس میں سے ابتدائی چوبیس سال صوبہ دار کی حیثیت سے اور باقی چھبیس سال ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔ سلطان قلی کو اس کے بیٹے جمشید کے اشارہ پر 1543ء میں قتل کر دیا گیا۔

10.5.1.2. جمشید قلی اور سبحان قلی (1543-1550)

سلطان قلی قطب شاہ کے قتل کے بعد اس کا بیٹا جمشید تخت نشین ہوا اور سات سال تک حکومت کی۔ اس کو شعر و سخن سے دلچسپی تھی جمشید اس کا تخلص تھا۔ وہ اپنی شجاعت اور خودداری کے باعث بہت شہرت رکھتا تھا۔ جمشید قلی کے بعد اس کا بیٹا سبحان قلی صرف چند ماہ حکومت کر سکا کیونکہ امرائے ملک نے جمشید کے بھائی ابرہیم قلی کو مسند قطب شاہی پر متمکن کر دیا۔

10.5.1.3. ابراہیم قلی (1550-1580)

جمشید قلی اور سبحان قلی کے عہد میں ان کے خوف سے ابراہیم قلی وجے نگر میں مقیم تھا۔ امرائے ملک نے اسے طلب کر تخت نشینی عطا کی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا دور حکومت قطب شاہی سلطنت کے لئے بڑا اچھا ثابت ہوا۔ اس کے عہد میں گولکنڈہ کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ ملک میں امن وامان قائم ہوا، بقول فرشتہ سوداگر تو سوداگر ایک بڑھیا بھی سارے قلمرو قطب شاہی میں بغیر تعرض سونا اچھالتی جاسکتی تھی۔ ابراہیم قلی نے تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت کے فروغ میں دلچسپی لی۔ وہ ایک سیاست دان تھا اور وجے نگر کے خلاف تنظیم میں مسلمان سلطنتوں کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ 1580ء میں اس کی وفات ہوئی۔

10.5.1.4. محمد قلی قطب شاہ (1580-1612)

ابراہیم قلی کے انتقال کے بعد اس کا فرزند محمد قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کا دور حکومت قطب شاہی کا عروج کا دور ہے۔ اس کے عہد میں جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑوں کی خونی فضا بدل گئی۔ امن وامان اور صلح و آشتی کا دور دورہ تھا۔ مشہور مورخ فرشتہ نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ محمد قلی میں چند باتیں ایسی جمع ہو گئیں تھی جو بہت کم بادشاہوں میں ہوتی ہیں۔ محمد قلی اپنے بھائیوں کو بہت عزیز رکھتا تھا اور ان کو اپنا مصاحب اور ہم نشین بنا کر رکھتا تھا۔ حکومت کے طویل عرصہ میں وہ کبھی اپنے بھائیوں سے ناراض نہیں ہوا۔ دوسرا یہ کہ میر محمد مومن استر آبادی جیسے قابل اور لائق شخص اس کے دربار میں 25 سال تک وکیل سلطنت کی حیثیت سے رہے۔ ان کی مسلمہ قابلیت اور ہمہ گیر لیاقت کے باعث نظم ونسق حکومت میں کوئی خرابی نہیں آئی۔

محمد قلی کے عہد میں مغلوں کے حملے دکن پر شروع ہو گئے وہ یورشوں کی روک تھام اور دکن کی آزادی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہا۔ وہ گولکنڈہ کی چاروں طرف سے حفاظت کرتا رہا۔ اس کی کوشش رہی کہ سلطنت کے حدود بھی مستحکم اور محفوظ رہیں۔ اس نے حکومت کے نظم

ونسق کو درست کیا۔ اس کا دور ارتقائے تمدن و تہذیب اور تعلیم کے فروغ کے لحاظ سے ایک زریں دور کہا جاتا ہے۔ اس نے شہر حیدر آباد آباد کیا اور اس کو عالی شان عمارتوں، خوبصورت ایوانوں، سر سبز و خوشنما باغوں اور نہروں سے آراستہ کیا۔ اس شہر کی تنظیم اور عمرانی لوازم کو نہایت سلیقہ سے کیا۔ اس شہر میں کشادہ راستے بنائے گئے شہر کے وسط میں چار مینار تعمیر ہوا جو کالج کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہی عمارتیں اپنی وسعت، بلندی، خوبصورتی اور شان و شوکت کے لحاظ سے ممتاز تھیں۔ مریضوں کے لئے دار الشفاء، سوداگروں کے لئے کارواں سرائے اور وسیع بازار بنائے گئے۔ دل بستگی، شگفتگی اور زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے باغات لگائے گئے، حمام تعمیر ہوئے اور تلنگانہ کے طول و عرض میں بہترین اجتماعی زندگی کی بناڈالی گئی۔ اس کو فنون لطیفہ کی ہر ایک شاخ سے دل چسپی تھی۔ علاوہ ازیں اسے شاعری اور موسیقی سے خصوصی دلچسپی تھی۔ خوبصورت عالی شان محل اور ایوان تعمیر کر کے ان میں نقش و نگار اور مصوری کے شاہ کار جمع کر دئے گئے تھے۔

سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں نہ صرف علوم اسلامی کو فروغ ہوا بلکہ عربی و فارسی کے شاہ کار مرتب ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ دکنی اور تلنگی ادب کی بھی ترقی ہوئی وہ خود بھی ان زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ اسے دکنی اردو میں پہلا مصنف دیوان کہا جاتا ہے اس لئے محمد قلی کو دکنی اردو یا ہندی کا موجد مانا جاتا ہے۔ 1612ء میں اس کا انتقال ہوا۔

.10.5.1.5 سلطان محمد (1612-1626)

سلطان محمد قلی کے بعد اس کا بھتیجہ سلطان محمد تخت نشین ہوا وہ اپنے علم و فضل اور پاکیزگی کی وجہ سے بہت مقبول تھا۔ اس کے عہد میں تمام سلطنت میں امن رہا کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اس کے چودہ سالہ عہد میں ملک کی علمی اور عمرانی دولت میں اضافہ ہوا۔ وہ مذہب پسند، صاحب فہم و فراست بادشاہ تھا۔ حیدر آباد میں مکہ مسجد کی تعمیر اس کا بڑا کارنامہ ہے۔ ایک شہر سلطان نگری کے نام سے بسایا، پرانی عید گاہ بھی اسی کی تعمیر کردہ ہے، ایک محل امان محل کے نام سے تعمیر کرایا۔ اس کو علم و فن سے بڑی دلچسپی تھی۔ تاریخ قطب شاہی اسی کے عہد میں مرتب ہوئی۔ اسے شاعری سے بھی شغف تھا۔ فارسی اور دکنی زبان میں طبع آزمائی کرتا تھا، ظل الٰہی اس کا تخلص تھا اس کے عہد میں اردو کو خاص ترقی ہوئی۔ خواص، قطبی، ابن نشاطی اور جنیدی وغیرہ اس دور کے نامور شعراء ہیں۔ علاوہ ازیں محمد سلطان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے خود اپنے علم و فن کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ 1626ء میں اس کا انتقال ہوا۔

.10.5.1.6 عبد اللہ قطب شاہ (1626-1672)

سلطان محمد کی وفات کے بعد اس کا بارہ سالہ لڑکا عبد اللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کی کم سنی کی وجہ سے اس کی ماں حیات بخش بیگم اور دادی خانم آغا نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ انتظام سلطنت کے لئے ایک مجلس بنائی گئی ان میں منصور خان کو ملک الماس، الملک یوسف کو انتظام ملک، علامہ شیخ محمد کو پیشوا، مولانا اویس کو دبیر کے عہدے پر فائز کیا گیا علاوہ ازیں مرزا قاسم، حکیم نظام الدین، حکیم جبرئیل اور اخلاص خاں وغیرہ کو اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا گیا۔ سلطان عبد اللہ قطب تو کم سنی کی وجہ سے امور سلطنت انجام نہیں دے سکا اور جب شعور آیا تو اس میں سیاسی تدبیر اور بیدار مغزی کا فقدان تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کو سیر و شکار اور عیش و عشرت سے دلچسپی تھی۔ ہمیشہ رقص و سرور، نغمہ و طرب اور نشاط کے جلوس میں مصروف رہا۔ ایسی صورت میں خود غرض امراء اپنے مفاد کے لئے کام کرنے لگے۔ جس کا انجام یہ

ہوا کہ شمال سے مغلوں کے حملے شروع ہوگئے۔ لیکن حیات بخش بیگم کی وجہ سے مغلوں سے صلح ہوئی اور اب قطب شاہی حکومت مغلوں کی ایک باجگزار حکومت بن گئی۔ 1672ء میں اس کا انتقال ہوا۔

10.5.1.7 ابوالحسن (1672-1687)

عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد چونکہ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے اس کا داماد ابوالحسن تخت نشین ہوا۔ ابوالحسن کا دور حکمرانی مغلوں کے حملوں اور بالآخر سلطنت کے خاتمہ کی وجہ سے افسوس ناک ہے، لیکن ملک کی ترقی کے لئے اس کے زمانہ میں جو امور کارنامے دئے گئے وہ فراموش نہیں کئے جاسکتے، زراعت کو فروغ دینے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے تمام ملک میں جدید باؤلیاں اور تالاب کھودے گئے۔ وصول مالگزاری کا مکمل انتظام کیا گیا۔ کاشتکاروں پر ہورہے ظلم وستم کو روکا گیا۔ جو دیہات ویران ہوگئے تھے انہیں از سرِ نو آباد کیا گیا۔ اجارہ داری کے طریقے کو موقوف کرکے مستقل تنخواہ یاب ملازم مامور کئے گئے۔ اوقاف کا انتظام بہتر طریقے سے کیا گیا۔ معدنیات کی کھدائی جو بند ہوگئی تھی وہ از سرنو شروع کی گئی اس طرح ملک میں خوش حالی کا اضافہ ہوا۔

قطب شاہی خاندان کے ہر ایک حکمران نے قطب شاہ کا امتیازی لقب اختیار کیا اگرچہ مغل شہنشاہوں نے انہیں کبھی یہ لقب نہیں دیا بلکہ وہ انہیں ہمیشہ قطب الملک ہی بلاتے رہے۔ اورنگ زیب نے 1687ء میں گول کنڈہ فتح کر قطب شاہی حکومت کا خاتمہ کیا۔ گول کنڈہ دکن کی پانچوں آزاد ریاستوں میں اہمیت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر تھا۔ حیدر آباد کے گول کنڈہ کی سلطنت نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ دراصل دکنی کلچر کا آغاز اور مسلمانوں کے تمدن اور تہذیب میں تلنگانہ کے کلچر کو داخل کرنے کا بڑا سہرہ قطب شاہی سلطنت کے سر ہے خصوصیت سے ابراہیم سے لے کر محمد قلی قطب شاہ تک اس کے ہیرو قرار دئے جاسکتے ہیں۔

10.6 عماد شاہی حکومت

برار کی عماد شاہی حکومت کے بانی فتح اللہ عماد الملک نے بہمنی حکومت کے دوسرے صوبہ داروں کی طرح 1490ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ لیکن بعض مورخ اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ اس نے بادشاہی کا اعلان نہیں کیا تھا بلکہ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے علاء الدین نے تخت نشینی کے بعد اپنی بادشاہی کا اعلان کیا۔ اس کے عہد میں گجرات کے حکمران بہادر شاہ نے برار پر فوج کشی کی اور علاء الدین نے اس کی اطاعت قبول کرلی۔ علاء الدین کے فرزند دریا عماد شاہ نے اس جنگ وجدال کو ختم کرنے کے لئے اپنی بیٹی کی شادی نظام شاہی حکمران حسین نظام شاہ سے کردی جس کی وجہ سے کچھ عرصہ تک برار میں امن وامان رہا۔ دریا عماد شاہ کے بعد چونکہ اس کا بیٹا برہان عماد شاہ کم سن تھا اس کا فائدہ اُٹھا کر اس کے ایک امیر تفال خان نے اسے نظر بند کرکے خود بادشاہ بن بیٹھا۔ چونکہ نظام شاہی حکمران سے عماد شاہی حکومت کی رشتہ داری قائم ہوچکی تھی اس لئے مرتضٰی نظام شاہ نے تفال خان کے خلاف برار پر فوج کشی کی اور 1572ء میں پورا علاقہ برار کا اپنی حکمرانی میں شامل کرلیا۔

10.7 برید شاہی حکومت

بیدر کی برید شاہی حکومت کا بانی قاسم برید ہے اس نے بھی دوسرے بہمنی گورنروں کی طرح بیدر میں علیحدہ حکومت قائم کی۔ اس خاندان میں پانچ اشخاص یکے بعد دیگرے بیدر میں حکومت کرتے رہے۔ ہمسایہ حکومتوں میں سے عادل شاہوں کے ان سے معرکے ہوتے رہے کبھی ان کو اور کبھی عادل شاہوں کو غلبہ حاصل ہوتا۔ محمد عادل شاہ کے زمانہ میں بیدر عادل شاہی حکومت میں شامل ہوا اس طرح برید شاہی حکومت ختم ہوگئی۔ برید شاہی حکومت بہت مختصر عرصہ کے لئے ہی قائم ہوئی تھی مگر اس خاندان نے علم وفن کی خدمت کی اور دکن کلچر کو فروغ دیا۔

10.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- پندرہویں صدی کی آخری دہائی میں بہمنی سلطنت میں دکنیوں اور غیر دکنیوں کی کشیدگی کے سبب حکومت کا شیرازہ بکھرتا گیا اور ان کے پانچ علاقوں کے والیوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا وہ عادل شاہی، نظام شاہی، قطب شاہی، عماد شاہی اور برید شاہی ہیں۔
- بیجاپور میں عادل شاہی حکومت کی بنا یوسف عادل خان نے رکھی۔ خود مختار بیجاپور کی تاریخ 1489ء سے لے کر 1686ء تک ہے اس کے بعد ہندوستان کی مغلیہ سلطنت نے اس ریاست کو فتح کر کے اپنے حدود میں ملا لیا۔ اس عہد حکومت میں شیعہ عقائد کی ترویج ہوئی۔ اسی کے عہد میں پرتگیز نے ہندوستان میں گوا کی بندرگاہ پر قبضہ جمالیا۔
- بیجاپور کی عادل شاہی حکومت دکن کی سیاسی تاریخ میں مختلف ریاستوں بیدر، احمد آباد، گول کنڈہ اور وجے نگر کے ساتھ جنگ وجدال کے واقعات سے لبریز ہے۔ بیجاپور کی طاقت وخوشحالی ابراہیم ثانی کے عہد میں اپنے عروج کی انتہا پر پہنچ گئی تھی
- احمد نگر میں ملک احمد نے نظام شاہی مملکت کی بنیاد رکھی اور اس کی اولاد تقریباً دو سو سال تک حکومت کرتی رہی، اس خاندان کے چودہ بادشاہ 1490ء سے 1635ء تک حکومت کرتے رہے۔ احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت بھی دکن کی دوسری سلطنتوں کی طرح علوم وفنون کو ترویج وترقی دیتی رہیں۔ بیجاپور کے کئی مشاہر، علماء اور اصحاب علم اولاً احمد نگر ہی میں آئے تھے۔
- دکن کے ان پانچ خود مختار حکمران خاندانوں میں سے ایک قطب شاہی خاندان ہے جو بہمنی سلطنت کے خاتمے پر ظہور میں آیا، اور قطب شاہی لقب سے موسوم ہوا جو بہمنی بادشاہوں کے ماتحت اس کے بانی سلطان قلی کو حاصل تھا جب احمد نگر، بیجاپور اور برار کے صوبائی گورنروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اس وقت تک سلطان قلی بہمنی حکمران محمود کے دربار ہی میں تھا۔ 1493ء میں سلطان قلی کو قطب الملک کا لقب ملا اور اس نے باغیوں کو پسپا کیا تو 1495ء میں اسے بطور انعام تلنگانہ کی حکومت دے دی گئی۔ اس نے 1512ء تک ظاہری طور پر بہمنیوں سے وفاداری قائم رکھی اس کے بعد اس نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔
- برار کی عماد شاہی حکومت کے بانی فتح اللہ عماد الملک نے بہمنی حکومت کے دوسرے صوبہ داروں کی طرح 1490ء میں اپنی خود مختاری کا

اعلان کیا اور آگے چل کر یہ حکومت نظام شاہی حکومت میں ضم ہو گئی۔

- بیدر کی برید شاہی حکومت کا بانی قاسم برید ہے اس نے بھی دوسرے بہمنی گورنروں کی طرح بیدر میں علیحدہ حکومت قائم کی لیکن آگے چل کر یہ حکومت بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کا حصہ بن گئی

10.9 نمونہ امتحانی سوالات

10.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. کس عادل شاہی حکمراں کو مغلوں نے شاہ کا لقب عطا کیا؟

(a) محمد عادل شاہ (b) علی عادل شاہ (c) سکندر عادل شاہ (d) عبد اللہ عادل شاہ

2. چاند بی بی کو سلطان کا لقب کس نے دیا تھا؟

(a) مغل (b) قطب شاہی (c) عادل شاہی (d) سب صحیح

3. دکنی اردو یا ہندی کا موجد کس بادشاہ کو مانا جاتا ہے؟

(a) عبد اللہ قطب شاہ (b) عادل قطب شاہ (c) محمد قلی قطب شاہ (d) ابو الحسن تانا شاہ

4. قطب شاہی حکومت کا پایہ تخت کہاں تھا؟

(a) بیجاپور (b) احمد نگر (c) بیدر (d) گولکنڈہ

5. عماد شاہی حکومت کی بنا کس گورنر نے ڈالی؟

(a) محمد قاسم (b) قلی قطب شاہ (c) علی عادل شاہ (d) تمام غلط

10.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. عادل شاہی حکمرانوں کی علمی سرپرستی پر نوٹ لکھیے۔
2. عادل شاہی حکومت کی معاشرتی زندگی مختصراً بیان کیجیے۔
3. محمد قلی قطب شاہ کے عہد پر نوٹ لکھیے۔
4. چاند بی بی کون تھیں؟ ان کے انتظامی اقدامات پر روشنی ڈالیے۔
5. عماد شاہی حکومت کا خاتمہ کیسے ہوا؟

10.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. بہمنی سلطنت کے خاتمے پر کون کون سی حکومتیں قائم ہوئیں؟ ان کا اجمالی تعارف پیش کیجیے ۔

2. عادل شاہی اور نظام شاہی حکومت کے عروج وزوال پر نوٹ لکھیے۔

3. قطب شاہی حکومت پر نوٹ لکھیے۔

10.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ فرشتہ: : محمد قاسم (مترجم عبدالحی خواجہ) لاہور پاکستان

2. دائرۃ المعارف: : شعبہ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

3. محمد نصیر الدین : دکنی کلچر

4. Masudul Hasan : History of Islam

5. S.K.Panday : Medieval India

اکائی 11: مغلیہ حکومت کا قیام و عروج

اکائی کے اجزا:

11.0 تمہید
11.1 مقاصد
11.2 مغلیہ حکومت کا قیام
11.3 ظہیر الدین محمد بابر (عہد حکومت 1526-1530ء)
11.4 نصیر الدین محمد ہمایوں (1508-1556)
11.5 جلال الدین محمد اکبر (1556-1605)
11.6 نور الدین جہانگیر (1605-1627)
11.7 شہاب الدین شاہجہاں (1627-1657)
11.8 محی الدین اورنگ زیب عالمگیر (1658-1707)
11.9 اکتسابی نتائج
11.10 نمونہ امتحانی سوالات
11.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

ہندوستان کی تاریخ میں مغلیہ حکومت کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور کے حکمرانوں نے ہندوستان کو ایک متحدہ اکائی بنایا' اور توسیع کی۔ ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ٹھوس اقدامات کیے۔ رواداری کی پالیسی اختیار کی۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اہم پالیسی بنائی

اور اس کو نافذ کیا۔ ملک کے نظم و نسق کو مضبوط بنایا۔ علم و ادب کی خوب سر پرستی کی اور فن تعمیر و فنون لطیفہ میں بے مثال کارنامے انجام دیے۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ مغلیہ حکومت کے قیام کے اسباب سے واقفیت حاصل کرتے ہوئے اس حکومت کے قیام واستحکام میں بابر اور ہمایوں کے کردار کا جائزہ لے سکیں گے۔ اسی طرح اکبر اعظم کے کارناموں اور پالیسیوں جس کی بنا پر مغل حکومت ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی اس پر تبصرہ کر سکیں گے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ مغلیہ سلطنت کے دیگر اہم حکمرانوں جہاں گیر، شاہجہاں کے کارناموں اور خدمات پر تبصرہ کر سکیں گے نیز اورنگزیب عالمگیر کے دور میں معاشی اور سماجی صورتحال پر گفتگو کر سکیں گے۔

11.2 مغلیہ حکومت کا قیام

مغل حکمرانوں کا تعلق چنگیز خاندان سے تعلق رکھنے والے مشہور زمانہ فاتح تیمور سے ہے۔ تیمور کی سلطنت سط ایشیا کے ممالک میں واقع تھی۔ اس کی وفات کے بعد تیموری شہزادوں اور امرا نے مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلی تھیں۔ ان ہی ریاستوں میں ایک ریاست فرغانہ تھی جس کا امیر شیخ عمر مرزا تھا۔ مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر اسی عمر شیخ کا جرا تمند اور بلند اقبال بیٹا تھا۔ تاریخ کے مطابق بابر کا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے امیر تیمور اور ماں کی طرف سے چنگیز خان سے جاملتا ہے۔ بابر کے والد کی وفات کے وقت اس کی عمر 12 سال تھی جس کا فائدہ اٹھا کر اس کے چچانے اس کی حکومت پر قبضہ کرلیا کافی عرصہ اپنی حکومت کو واپس حاصل کرنے کی تگ و دو کرنے کے بعد بابر نے فرغانہ چھوڑ کر ان ممالک کا رخ کیا جن کو کبھی امیر تیمور نے فتح کیا تھا۔ اس طرح اس نے افغانستان کی طرف پیش قدمی کی اور کابل فتح کرکے اپنی کامیابی کا آغاز کیا۔ اور پھر ہندوستان میں دہلی سلطنت کے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی

ہندوستان میں مغل حکومت 315 سال تک رہی۔ پہلے 181 سال بابر کی تخت نشینی (1526ء) سے لے کر اورنگ زیب کی وفات (1707ء) تک مغل سلطنت کے عروج کا زمانہ ہے۔ اگر ان 181 سالوں میں سے 15 سال جب اقتدار شیر شاہ سوری اور اس کے خاندان میں رہا (1540ء تا 1555ء) نکال دئے جائیں تو مغلیہ سلطنت کے عروج کا زمانہ 166 سال کا ہوتا ہے۔ اس دوران نہایت عظیم صلاحیتوں کے چھ بادشاہ مغلیہ سلطنت کو نصیب ہوئے:

1. ظہیر الدین بابر (1526ء تا 1530ء)
2. نصیر الدین ہمایوں (1530ء تا 1556ء)
3. جلال الدین اکبر (1556ء تا 1605ء)
4. نور الدین جہانگیر (1605ء تا 1627ء)

5. شہاب الدین شاہجہاں (1627ء تا1657ء)

6. محی الدین اورنگ زیب عالمگیر(1657ء تا1707ء)

11.3 ظہیر الدین محمد بابر(عہد حکومت1526-1530ء)

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد ظہیر الدین محمد بابر نے 1526ء میں رکھی۔ ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ مرزا کی والدہ کا نام قتلغ نگار خانم تھا۔ والد کی طرف سے اس کا سلسلہ نسب امیر تیمور سے اور والدہ کی طرف سے چنگیز خان سے ملتا ہے۔ تیمور سے اس کا سلسلہ نسب اس طرح ہے: بابر بن عمر شیخ مرزا بن ابو سعید مرزا بن مرزا سلطان بن میران شاہ بن تیمور۔

بابر اپنے والد عمر شیخ مرزا کی وفات کے بعد جون 1494ء میں گیارہ سال کی عمر میں فرغانہ کا حکمراں بنا۔ لیکن سیاسی حالات نے اسے چین نصیب نہ ہونے دیا۔ اس کی ابتدائی زندگی مشکلات سے گھری ہوئی تھی۔ یہ مشکلات اس کے مخالف چچا اور ماموں نے پیدا کی تھیں۔ جو فرغانہ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اس نے 1497ء اور 1503ء میں سمرقند پر جو تیمور کا پایہ تخت تھا۔ قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ اس کے بعد وہ کابل چلا آیا۔

1504ء میں اس نے اپنے چچا الغ بیگ مرزا کی وفات کے بعد کابل پر قبضہ کرلیا۔ وہاں ایک مضبوط حکومت قائم کرلی۔ تیموری حکمراں اب تک مرزا کہلاتے تھے۔ بابر نے پہلی مرتبہ 1507ء میں شاہ کا لقب اختیار کیا۔ 1511ء میں بابر نے ایران کے شاہ اسمٰعیل صفوی کی مدد سے سمرقند، بخارا اور خراسان پر فتح حاصل کرلی۔ لیکن یہ فتح دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ اور 1512ء میں بابر کو کابل واپس جانا پڑا۔ سمرقند پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد بابر نے اپنے موروثی علاقوں کے حکمراں بننے کے دیرینہ خواب کو خیرباد کر دیا۔ اور اپنی پوری توجہ ہندوستان کی طرف مرکوز کردی۔ بابر ہندوستان کے ان علاقوں پر جو تیمور فتح کرچکا تھا اپنا خاندانی اور موروثی حق سمجھتا تھا اور اس پر حکومت کرنے کا دعویٰ رکھتا تھا۔ اسی لیے اس نے ہندوستان کی فتح کا منصوبہ بنایا۔ اپنی فوجی طاقت کو منظم و مضبوط کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ دو ترکی توپچیوں استاد علی رومی اور دوسرے ماہر مصطفی رومی کی مدد سے ایک جدید توپ خانہ فراہم کیا۔ 1419ء میں بابر نے باجور کا محاصرہ کیا اور قبضہ کرکے اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ اس کے بعد اس نے دریائے سندھ پار کیا اور پنجاب کا رخ کیا، جس کو تقریباً 120 سال پہلے تیمور کی ریاست کا حصہ بننے کے سبب وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔

ابراہیم لودھی کے دو امیروں دولت خاں گورنر پنجاب اور ابراہیم کے چچا علام خاں علاء الدین نے جو اپنے بادشاہ ابراہیم لودھی سے ناراض ہوگئے تھے، بابر کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی۔ اس دعوت پر بابر نے ہندوستان پر پانچ حملے کیے۔ 1524ء میں بابر نے ہندوستان پر اپنا چوتھا حملہ کیا اور لاہور اور دیپال پور کو فتح کرلیا۔ 1525ء میں ہندوستان پر پانچواں حملہ کیا اور پنجاب میں اپنے مخالفین کو شکست دے کر دہلی کی جانب بڑھا۔ دہلی کا بادشاہ ابراہیم لودھی بھی بابر سے مقابلہ کے لیے پنجاب کی طرف بڑھا۔ بابر کے سپاہیوں کی کل تعداد کا تخمینہ 8 سے 24 ہزار تک کیا جاتا ہے، لیکن وہ انتہائی منظم تھے۔ ان کے ساتھ جدید اور کارکرد توپ خانہ تھا اور لائق جنرل کمانڈر تھا۔ ابراہیم کی فوج

تقریباً ایک لاکھ تھی۔ لیکن وہ نہ تو اتنی تجربہ کار تھی اور نہ ہی منظم تھی۔ 21 اپریل 1526ء کو دونوں افواج پانی پت کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل صف آراء ہوئیں۔ جنگ صبح دس بجے سے شروع ہوئی۔ غروب آفتاب تک جاری رہی۔ اس جنگ میں بابر کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ پندرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ ابراہیم لودھی بھی مارا گیا۔ اس کے بعد فوری طور پر دہلی اور آگرہ بابر کے قبضے میں آ گئے۔ اس طرح ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد پڑی جو آگے چل کر اپنی وسعت' آبادی' وسائل اور تہذیب کے لحاظ سے عظیم الشان حکومت بن گئی۔

پانی پت کی تاریخی فتح کے بعد بابر نے اپنی فوج کا ایک دستہ اپنے لڑکے مرزا ہمایوں کی قیادت میں آگرہ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا اور مہدی خواجہ کو' جو کہ بابر کا برادر نسبتی تھا' دہلی کی طرف روانہ کیا۔ جمعہ 27 اپریل کو دہلی کی مسجد جامع میں بابر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا' اور غربا و فقراء کو خیرات تقسیم کی گئی۔ 10 مئی 1526ء کو بابر دہلی سے آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ آگرہ میں ہمایوں نے اس کو کوہ نور ہیرا پیش کیا جو اس نے گوالیار کے راجہ و کرماجیت کے اہل و عیال سے حاصل کیا تھا۔ متعدد افغان سرداروں نے آگرہ میں آ کر بابر کی حکمرانی کو قبول کیا۔ بابر کے سپاہیوں نے سنبھل' اٹاوہ' قنوج' کالپی' دھول پور' بیانہ وغیرہ کے علاقوں پر قبضہ کر کے ان کو حکومت میں شامل کر لیا۔ 16 مارچ 1527ء کو بابر نے میواڑ کے راجپوت والی رانا سانگا سے جنگ کی۔ جو کہ بابر کی دوسری اہم جنگ ہے۔ خانوہ کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ جس میں راجپوتوں کو شکست ہوئی اور رانا سانگا زخمی ہوا اور کچھ دنوں بعد اس کی وفات ہو گئی۔ رانا سانگا کی موت سے راجپوتوں کی قوت کمزور ہو گئی۔

ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد افغان سردار مشرق کی جانب فرار ہو گئے تھے اور بہار میں اپنا پیر جمانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہاں انہوں نے بنگال کے حکمراں نصرت شاہ کی مدد بھی حاصل کی۔ لیکن بابر نے ان کو بہار اور اودھ کی سرحد پر گھاگرہ ندی کے کنارے 6 مئی 1529ء کو ایک بار پھر شکست فاش دی۔ اس فتح سے بہار پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا اور اب مغلیہ حکومت کی حدود سندھ سے بہار تک اور ہمالیہ سے گوالیار اور چندیری تک پھیل گئی۔

1528ء سے بابر کی صحت آہستہ آہستہ گر رہی تھی۔ بابر جسمانی و ذہنی طور پر کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ آخرکار بیمار پڑا اور 26 دسمبر 1530ء کو 47 سال کی عمر میں آگرہ میں وفات پائی۔

بابر غیر معمولی لیاقت و استعداد کا مالک تھا اس کی شخصیت بڑی دلکش تھی۔ وہ صرف ایک نہایت محتاط سپہ سالار اور قابل حکمراں ہی نہیں نہ تھا بلکہ وہ ایک نقاش' باغوں اور گلزاروں کا شوقین اور ایک باکمال شاعر اور مصنف بھی تھا۔ وہ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اس کی کتاب "تزک بابری" ترکی ادب کا ایک شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ بابر کی ایک تصنیف اس کا دیوان ہے جس کا اکثر حصہ ترکی زبان میں ہے اور جو نظم کی ہر صنف سخن پر مشتمل ہے اس میں چند نظمیں فارسی زبان میں بھی ہیں۔ وہ خطاط بھی اعلیٰ درجہ کا تھا اور ایک خاص خط ایجاد کیا تھا جسے خط بابری کہا جاتا ہے۔

11.4 نصیر الدین محمد ہمایوں (1508-1556)

ہمایوں بابر کی وفات کے بعد ہندوستان کا دوسرا مغل حکمراں بنا۔ ہمایوں کا پورا نام نصیر الدین محمد ہمایوں ہے۔ وہ بابر کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ 6 مارچ 1508ء کو کابل کے محل میں پیدا ہوا۔ اسے باپ کی زندگی ہی میں کئی ایسے مواقع میسر آئے جن سے فائدہ اٹھا کر اس نے فوجی اور مملکت داری کے تجربے حاصل کیے۔ بادشاہ بننے سے پہلے بابر نے اپنی زندگی میں دو بار بدخشاں کی حکومت اس کے سپرد کی۔ پہلی مرتبہ 1520ء سے 1525ء تک اور دوسری مرتبہ 1527ء سے 1529ء تک۔ ہندوستان میں 1529ء میں کچھ عرصہ کے لیے وہ ایک بہت ہی شورش پسند علاقہ ''سنبھل'' کا بھی گورنر رہا۔ بابر کی وفات کے چار روز بعد 29 دسمبر 1530ء کو شہر آگرہ میں ہمایوں تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اس وقت 23 سال تھی۔ امراء و افسران حکومت نے غیر مشروط وفاداری کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد ہمایوں نے امرا و افسران کی گذشتہ کارروائیوں کی جانچ پڑتال کیے بغیر ان کو اپنے اپنے عہدوں پر برقرار رکھا۔

ہمایوں کو باپ سے وراثت میں ایک وسیع مملکت ملی تھی جو کہ دریائے آمو سے بہار تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے مغربی علاقے قندز، بدخشاں، کابل، غزنی اور قندھار تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ملتان، پنجاب، اتر پردیش اور بہار کا کچھ علاقہ اس کی حکمرانی میں شامل تھا۔ بیانہ، رنتھنبور، گوالیار، الور اور چندیری اس کی سلطنت اور راجپوتانہ و مالوہ کی ریاستوں کے درمیان ایک غیر مستقل حیثیت رکھتے تھے۔ اس سلطنت کا نظم و نسق غیر مستحکم تھا۔ نیز ہمایوں کے مخالفین میں قریبی عزیز تھے۔ بابر نے جب وفات پائی تو ہمایوں کا بھائی کامران کابل اور قندھار پر قابض تھا، ہمایوں نے سنبھل کی حکومت اپنے دوسرے بھائی ہندال کے سپرد کی اور میوات اپنے تیسرے بھائی عسکری کو دیا۔ کامران سازشی تھا۔ ہندال اور عسکری کمزور تھے۔ دوسری طرف افغان اپنے سردار محمود دلودی اور شیر خاں سوری کی قیادت میں اپنی طاقت کو منظم و مستحکم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بنگال کا حکمراں نصرت شاہ بھی افغانوں کا حلیف تھا۔ گجرات میں بہادر شاہ ایک طاقتور حکمراں تھا اور ہمایوں کا حریف تھا۔

ہمایوں نے کالنجر کی فتح پر توجہ مرکوز کی اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ مزید دباؤ ڈالنے کے لیے اس نے جونپور اور چنار گڑھ کا بھی محاصرہ کر لیا جہاں اس نے شیر شاہ سوری کو شکست دی۔ 1532ء میں گجرات کے سلطان بہادر شاہ کے خلاف فوج کشی کی اور اولاً مانڈو کے قلعہ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد بہادر شاہ کے تعاقب میں چمپانیر فتح کرتا ہوا آگے تک پہنچا کیونکہ اس نے باغی مغلوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ گجرات کی تسخیر ہمایوں کے لیے ایک عظیم کامیابی تھی۔ اپنے برادر خورد مرزا عسکری کو گجرات کا حاکم مقرر کر کے ہمایوں آگرہ واپس چلا آیا۔ گجرات سے ہمایوں کی غیر موجودگی اور فوج کی نااہلی کا فائدہ اٹھا کر بہادر شاہ نے یکے بعد دیگرے گجرات کے اہم فوجی مرکزوں پر پھر سے قبضہ کر لیا۔ اس طرح ہمایوں کی کامیابی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔

اسی اثناء میں بہار کے افغانی حکمراں شیر شاہ سوری نے ہمایوں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت کو مستحکم کر لیا۔ ہمایوں نے شیر خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اس سے پیدا ہونے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اکتوبر 1537ء میں اس کے خلاف فوج کشی کی اور

چنار کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ چھ مہینے کی پیہم جدوجہد کے بعد مارچ 1538ء میں ہمایوں نے چنار پر فتح حاصل کرلی۔ پھر ایک طویل مہم کے بعد اگست 1538ء کو ہمایوں نے بنگال کے دارالحکومت گور پر بھی فتح حاصل کرلی۔ شیر خاں نے اس دوران مغل حکومت کے شمالی علاقوں پر حملہ کر کے تلیا گڑھی سے قنوج تک کے سارے علاقوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اسی دوران آگرہ میں ہمایوں کے چھوٹے بھائی ہندال نے علم بغاوت بلند کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ان نازک حالات کے مد نظر ہمایوں نے مجبوراً گور سے آگرہ جانے کا فیصلہ کیا۔ مارچ 1539ء میں ہمایوں گور سے رخصت ہوا اور مونگیر کے راستے جون 1539ء میں بکسر سے کچھ فاصلہ پر شمال مغرب میں واقع چوسا کے مقام پر قیام کیا۔ 25 جون 1539ء کی رات کو شیر خاں نے مغل فوجوں پر شب خون مارا اور زبردست شکست دی اور ہمایوں کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

شیر خاں نے چوسا کی جنگ میں تاریخی کامیابی کے بعد اپنا لقب شیر شاہ اختیار کیا' اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا اور آگرہ کی جانب چل پڑا۔ اس کے سرداروں نے لکھنؤ اور قنوج پر قبضہ کر لیا۔ قنوج کی جنگ میں ہمایوں کو دوسری مرتبہ پھر شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ہمایوں کے سامنے اپنے باپ کی بنائی ہوئی' مملکت کو خیر باد کہنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ ہمایوں نے اپنے بھائیوں کی نااتفاقی اور سرداروں کی نااہلی کے پیش نظر نومبر 1540ء میں ہندوستان کو خیر باد کہہ کر راجپوتانہ کے راستے سندھ چلا گیا۔ سندھ میں قیام کے دوران ہمایوں نے شیخ اکبر جامی کی بیٹی حمیدہ بانو سے 29 اگست 1541ء میں شادی کرلی۔ اسی بیگم کے بطن سے 15 اکتوبر 1542ء جلال الدین محمد اکبر پیدا ہوا۔

ہمایوں ہرات پہنچا تو شاہ ایران نے قزوین میں استقبال کیا اور تخت کی بازیابی میں شاہ طہماسپ نے اس کی بھرپور مدد کی۔ 1544ء میں شاہ طہماسپ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ ہمایوں کو قندھار روانہ کیا۔ اس نے قندھار و کابل پر فتح حاصل کرلی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب شیر شاہ کے بعد جانشین اپنے اپنے حق کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ اس طرح سے سوری حکومت اپنی فوجی و سیاسی طاقت کھو چکی تھی۔ شیر شاہ سوری (وفات 1545ء) اور اسلام شاہ سوری (وفات 1553) کے بعد سوری حکومت طوائف الملوکی اور آپسی نااتفاقی کا شکار ہوگئی۔ اور سوری حکمراں عادل شاہ سوری کے خلاف علم بغاوت بلند ہونے لگا۔

ہمایوں نے حالات موافق پا کر ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی حکومت کو دوبارہ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور قندھار اور کابل پر قبضہ کرنے کے بعد 25 دسمبر 1554ء میں پیشاور پہنچا۔ پیشاور پر قبضہ کے بعد لاہور پر فتح حاصل کی۔ پھر مغل فوج نے یکے بعد دیگرے دیپال پور' ہریانہ اور جالندھر پر قبضہ جما لیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس کے وفادار مصاحب بیرم خاں کی قیادت میں مغل فوجوں کی افغانوں سے ماچھی واڑہ کے میدان میں 15 مئی 1555ء کو معرکہ آرائی ہوئی۔ اس جنگ میں افغانوں کو شکست ہوئی۔ دوسرا مقابلہ مغلوں اور افغانوں کے درمیان 22 جون 1555ء میں سرہند میں ہوا۔ اس جنگ میں مغل افواج نے سکندر شاہ سوری کو شکست دی۔ اس جنگ کے بعد دہلی کی فتح کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔ جب 23 جولائی 1555ء میں دہلی پہنچا تو اس کی کوئی مزاحمت نہ ہوئی اور اس طرح سے وہ اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمایوں نے اپنے بیٹے جلال الدین اکبر کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا اور خود اس نے نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ ہمایوں کا یہ دوسرا دور مشکل ہی سے چند مہینے ہی گزرا تھا کہ 24 جنوری 1556ء کی شام کو دہلی میں شاہی کتب

خانہ کے زینہ سے گر کر شدید زخمی ہوا اور وفات پائی۔ مرنے کے بعد "جنت آشیانی" اسکا لقب ہوا۔ اس کی بیوہ حاجی بیگم نے دہلی میں اس کے لیے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کروایا۔

ہمایوں فطری طور پر کریم النفس تھا جب کسی کو سزا دینا چاہتا تو وہ اسے معاف کر دیتا۔ زندگی میں وہ ایک پر خلوص دوست اور ساتھی تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود حکمراں کی حیثیت سے اس میں فوجی فراست، تدبر، مہارت اور سیاسی دانائی کی کمی تھی۔ کتب بینی کا دلدادہ تھا۔ شاعر بھی تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔ تمدنی اقدار کا بھی عاشق تھا۔

11.5 جلال الدین محمد اکبر (1556-1605)

ابو الفتح، جلال الدین محمد اکبر بن ہمایوں بن بابر، ہمایوں کی وفات کے بعد ہندوستان میں خاندان مغلیہ کا تیسرا حکمراں بنا۔ جلال الدین محمد اکبر 15 اکتوبر 1542ء کو امر کوٹ (سندھ) میں پیدا ہوا۔ اکبر کی عمر 13 سال کی ہوئی تو اس کے والد ہمایوں کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت اکبر دہلی سے دور کالانور (ضلع گورداس پور، پنجاب) میں تھا۔ 14 فروری 1556ء کو بیرم خاں نے اکبر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا، اور تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ اکبر کی تخت نشینی کے وقت مغل حکومت کے سامنے بہت سنگین مسائل تھے۔

عادل شاہ سوری کا وزیر ہیمو بقال نے دہلی اور آگرہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور خود تخت کا دعویدار بن بیٹھا۔ اس کی خبر اکبر کو جالندھر میں ملی تو مغل فوج تیزی سے اکبر اور اس کے اتالیق بیرم خاں کی سر گردگی میں دہلی کی طرف روانہ ہوئی۔ 5 نومبر 1556ء میں پانی پت کے تاریخی میدان میں مغل فوج اور افغان فوج کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔ جس میں افغان فوج ہار گئی اور ہیمو بقال زخمی ہو کر گرفتار ہوا اور بعد میں قتل کر دیا گیا۔ اس فتح کے بعد دہلی اور آگرہ پر اکبر کا پھر سے قبضہ ہو گیا۔

سلطنت کے استحکام کے لیے ضروری تھا کہ ارد گرد کی خود مختار ریاستوں اور سرکش و باغی سرداروں کو مطیع کیا جائے، خصوصاً افغان سرداروں کے ذہن سے بادشاہت کا خیال نکال دیا جائے، چنانچہ سب سے پہلے سکندر سور کے خلاف اقدامات کیے گئے، جو مان کوٹ میں محصور ہو گیا تھا۔ 24 مئی 1557ء کو اس نے اطاعت قبول کر لی اور بہار چلا گیا۔ اس طرح پورا پنجاب اس کے ماتحت آ گیا۔ اسی سال اجمیر پر اور 1559ء میں گوالیار پر قبضہ ہو گیا۔ 1559ء تک خان زماں نے عادل شاہ کے امراء کو شکست دے کر سنبھل سے لکھنو اور الہ آباد سے جونپور تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ ان فتوحات سے ہندوستان میں مغل حکومت کو کافی استحکام حاصل ہوا۔ مغلیہ حکومت کے دائرہ کی یہ توسیع بڑی حد تک اتالیق بیرم خاں کی کوشش و محنت کا ثمرہ تھی

جلال الدین محمد اکبر نے 1556ء سے 1560ء تک اپنے اتالیق بیرم خاں کی سرپرستی میں حکومت کی۔ بیرم خاں کے حریفوں اور مخالفین کی کوششیں رنگ لائیں۔ 1560ء میں اکبر نے ایک فرمان کے ذریعہ بیرم کو اس کے عہدے سے سبکدوش کر کے حجاز جانے کی اجازت دیدی اور تمام شاہی اختیارات خود سنبھال لینے کا اعلان کر دیا۔ آخر کار سفر حرمین کے دوران ہی کھمبایت میں مبارک خاں لوحانی کے ہاتھوں 31 جنوری 1561ء میں بیرم خان قتل کیا گیا۔

توسیع سلطنت

بیرم خان کے قتل کے بعد اکبر نے عنان حکومت مکمل طور سے اپنے ہاتھوں میں لے لی اور بیرم خاں سے ملک گیری اور عملی سیاست کے جو گر اس قدر تجربات حاصل کیے تھے ٗانہیں استعمال میں لاتے ہوئے اپنی پوری توجہ توسیع مملکت کی طرف مبذول کر دی اور ایک بہت ہی مختصر مدت میں مالوہ ٗ گونڈوانہ ٗ رنتھبور کالنجر، گجرات اور بنگال کے علاقے اپنی حکومت کے حدود میں شامل کر لیے۔ اکبر نے ایک طرف تو کالنجر ٗ رنتھمبور ٗ گوالیار اور چتور جیسے اہم مستحکم قلعے فتح کر کے اپنی عسکری قابلیت اور مستحکم فوج قوت کا ثبوت پیش کیا اور علاقائی فرمانرواؤں کو یہ احساس بھی دلایا کہ ان کی حکومتیں اور جاگیریں اب شہنشاہ کی اطاعت کے بغیر باقی نہیں رہ سکتیں تو دوسری جانب ادہم خان ٗ خان زماں ٗ بہادر خان اور عبد اللہ خاں ازبک جیسے نامور اور طاقتور سرداروں کی بغاوت کا خاتمہ کر کے ثابت کر دیا کہ مغل حکومت مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔ 1976ء تک اکبر کی حکومت کے حدود میں کم و بیش پورا شمالی ہند آ چکا تھا۔ اس کے بعد بھی حدود مملکت میں توسیع کی پالیسی قائم رہی اور بعض ایسے صوبے بھی فتح کر لیے گئے جو اب تک سلطنت دہلی کی حدود میں کبھی نہیں آئے تھے۔ کشمیر ٗ سندھ ٗ بلوچستان و مکران اور قندھار فتح کیا گیا۔ پھر اکبر نے دکن کا رخ کیا اور 1591ء میں جنوبی ہند کی چار آزاد ریاستوں خاندیش ٗ احمد نگر ٗ بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمرانوں کے یہاں مغلیہ سلطنت کا باجگزار بن جانے کا پیغام دے کر اپنے نمائندوں کو بھیجا۔ لیکن صرف خاندیش کے حکمراں راجہ علی خاں فاروقی نے اس کے پیغام کو قبول کیا۔ 1593ء میں اکبر نے ایک فوج عبد الرحیم خانخاناں اور شہزادہ مراد کی سر کردگی میں احمد نگر کی فتح کے لیے روانہ کی لیکن سات سال کی مسلسل فوج کشی کے باوجود بھی احمد نگر کی مہم میں مغلوں کو مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اسی اثناء میں راجہ علی خان کے جانشین اور خاندیش کے حکمراں میراں بہادر شاہ فاروقی نے بغاوت کا پرچم بلند کیا اور اسیر گڑھ کے قلعہ میں قلعہ بند ہو کر مغل فوج کے خلاف لڑائی لڑی۔ اکبر نے بنفس نفیس 1599ء میں خاندیش پر حملہ کیا اور دار الحکومت برہان پور پر قبضہ کر لیا اور چاروں طرف سے اسیر گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر میراں بہادر شاہ نے شکست مان لی اور 6 جنوری 1601ء کو اسیر گڑھ پر مغل پرچم لہرا دیا گیا اور خاندیش کو اکبر نے اپنی مملکت کی حدود میں شامل کر لیا۔ ایسے ہی دکن کی دیگر ریاستوں کے خلاف بھی اکبر فوجی مہم کا ارادہ رکھتا تھا لیکن الہ آباد میں اپنے بڑے لڑکے شہزادہ سلیم کی بغاوت کے سبب مجبوراً دکن کی تسخیر کی پالیسی کو نامکمل چھوڑ کر آگرہ رخصت ہونا پڑا۔ اکبر کو اپنی آخری عمر میں بہت سے صدمات برداشت کرنے پڑے۔ اکبر کی زندگی کے آخری ایام شہزادہ سلیم کی باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اور بھی تکلیف دہ بن گئے تھے۔ اکبر 3 اکتوبر 1605ء کو بیمار پڑا اور تین ہفتوں کی علالت کے بعد 26 اکتوبر 1605ء کو 63 سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔

اکبر کا شمار دنیا کے عظیم فاتح حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ذہین و فطین حکمراں تھا ٗ اس نے انتظام سلطنت اور مذہبی امور میں کئی ایجادات کیں۔ اس کا عظیم کارنامہ نظام محاصل ہے۔ اس کے ذریعہ پچھلی دس سالہ جمع بندی کے تحت آئندہ دس برسوں کی جمع بندی کی گئی۔ لگان وصول کرنے کے ضابطے مقرر ہوئے۔ زراعت کو ترقی دینے کے طور طریقے اور مزارعین کی اصلاح کے تعلق سے قوانین جاری ہوئے۔ اکبر کے عہد سے پہلے فوجیوں کو جاگیریں اور انعامات ملا کرتے تھے۔ اکبر نے اپنے دور میں پہلی مرتبہ تنخواہ دینے کی شروعات کی۔ اس کے دور میں پورے ملک میں اصول انصاف کی باقاعدہ سختی سے پابندی کرائی جاتی۔ ہندوؤں کے فیصلے پنڈتوں کے سامنے اور مسلمانوں

کے فیصلے قاضیوں کی عدالت میں ہوتے تھے۔ اوزان پیمائش ٗ غذائی اشیا کی جانچ پڑتال اور جرائم کے سدباب کے لیے صوبوں میں محتسب مقرر کیے جاتے تھے۔ غیر مسلم رعایا کے مذہبی رجحانات کا احترام کیا جاتا تھا۔ مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے 1526ء میں جنگی قیدیوں کو جبریہ غلام بنانے کے قانون کو منسوخ کر دیا گیا۔ 1563ء میں ہندو زائرین پر لگایا جانے والا "یاتری محصول" معاف کر دیا گیا۔ 1564ء میں غیر مسلموں پر لگایا جانے والا مذہبی محصول جزیہ کو معاف کر دیا گیا۔ غیر مسلموں کو فوج اور حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کر کے اکبر نے مذہبی وسیع النظری اور آزادی کی ایک بہترین مثال قائم کی۔

اکبر اہل علم و فضل کا بہت قدر دان تھا۔ اس کے دور میں علوم و فنون کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس کے دربار سے ابوالفضل، فیضی، عبدالقادر بدایونی، عبدالرحیم خانخاناں، نقیب خان، نظام الدین بخشی، ملا مبارک اور میر فتح اللہ شیرازی جیسے مشہور و معروف علماء وابستہ تھے۔ جنھوں نے علم و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ عرفی، نظیری، شکیبی اور حیدری تبریزی جن میں فارسی کے بڑے شعراء اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ نیز کئی مصور، خطاط، ماہر معمار اور ماہر موسیقی کار کا تعلق بھی اس کے دربار سے تھا۔ جیسے میر سید علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد، اشرف خاں، سید حسینی، رام داس، میاں چاند محمد حسین کاشمیری، تان سین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اکبر کا ایک بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ سنسکرت، عربی اور ترکی کی کئی اہم کتابوں کے ترجمے کروائے اور فارسی میں نئی کتابیں تصنیف کروائیں۔ تراجم میں مہابھارت، رامائن، پنچ تنتر، اتھروید، لیلاوتی، سنگھاسن بتیسی، تزک بابری، حیاۃ الحیوان، معجم البلدان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ فن تعمیر کے متعدد قابل قدر نمونے اکبر کی یادگاریں ہیں جیسے دہلی میں ہمایوں کا مقبرہ، سیکری میں مقبرہ سلیم چشتی؛ اسی طرح اٹک، آگرہ، فتح پور سیکری، لاہور اور الہ آباد کے قلعے قابل دید ہیں۔

11.6 نورالدین جہانگیر (1605-1627)

اکبر کے بعد اس کا بڑا شہزادہ نورالدین محمد جہانگیر دہلی میں خاندان مغلیہ کے چوتھے بادشاہ کے طور پر تخت نشین ہوا۔ جہانگیر کی والدہ مریم الزمانی تھی۔ اس کی پیدائش 31 اگست 1569ء میں آگرہ کے قریب فتح پور سیکری کے مقام پر ہندوستان کے مشہور بزرگ شیخ سلیم چشتی کی خانقاہ میں ہوئی۔ اس بزرگ ہستی کے نام پر شہزادے کا نام بھی سلیم ہی رکھا گیا۔ لیکن اکبر ہمیشہ شہزادے کو شیخو بابا کے نام سے پکارتا تھا۔ کیونکہ اکبر احتراماً بزرگ شیخ کا نام زبان پر لانا نہیں چاہتا تھا۔

اکبر کی وفات کے آٹھ روز بعد 3 نومبر 1605ء کو جہانگیر ابوالمظفر نورالدین محمد پادشاہ غازی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ تخت نشینی کے چھ ماہ بعد ہی جہانگیر کو اپنے سب سے بڑے بیٹے خسرو کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ خسرو اکبر کا چہیتا پوتا تھا اور حکومت کے بعض امراء جن میں راجہ مان سنگھ اور مرزا عزیز خان کوکہ شامل تھے اس کو سلیم کی جگہ پر اکبر کا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اکبر نے اپنی حیات میں ہی سلیم کو اپنی پگڑی اور تلوار دے کر اپنا جانشین مقرر کرایا تھا۔ خسرو کی بغاوت کے بعد اگرچہ بادشاہ جہانگیر اور خسرو میں مصالحت ہو گئی لیکن جہانگیر نے اپنے بیٹے کی اس گستاخی کو کبھی معاف نہیں کیا۔ بالآخر خسرو نے 1622ء میں برہان پور کے مقام پر انتقال کیا۔ اس کے انتقال سے

جہانگیر کی ایک بڑی پریشانی دور ہوگئی۔ 1611 میں جہانگیر نے نور جہاں سے شادی کی۔ نور جہاں غیاث الدین کی بیٹی تھی‘ جو اعتماد الدولہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک حکمراں کی حیثیت سے جہانگیر کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ شہنشاہ جہانگیر سے شادی ہو جانے کے بعد نور جہاں نے آہستہ آہستہ تمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سلطنت پر کافی اثر انداز ہونے لگی اور اس کا نام شہنشاہ کے نام کے ساتھ طلائی سکوں پر کندہ ہونے لگا۔

میواڑ کی تسخیر جہانگیر کے دور حکومت کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اکبر اپنے دور میں بہت کوششوں کے باوجود اس کو مکمل طور پر فتح کرنے میں ناکام رہا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنے دور میں باپ کے چھوڑے ہوئے اس ادھورے کام کو پورا کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ 1605ء میں اس نے اپنے بیٹے شہزاد اور پرویز کو فتح میواڑ کی مہم پر مامور کیا لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جہانگیر نے متعدد امرا کو اس کام کے لیے تعینات کیا لیکن کامیابی نہیں ملی۔ فتح میواڑ کے لیے آصف خاں کو جے پور کے راجہ جگن ناتھ کو شریک کار کی حیثیت سے کمان دی گئی۔ اس کے بعد مہابت خان کو 1608ء میں اور پھر عبد اللہ خاں کو 1609ء میں کمان دی گئی۔ آخر کار 1614ء میں جہانگیر نے شہزادہ خرم کو اس مہم پر روانہ کیا۔ اس کے بعد شہزادہ خرم کی سیاسی اور فوجی تدبیریں کام آئیں اور 1615ء میں راجہ امیر سنگھ نے صلح کی درخواست کی۔ خرم کے آگے رانا نے اطاقت قبول کی اور فراخدلانہ شرائط پر معاہدہ امن ہوا جو کہ مغل۔ راجپوت تعلقات کی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

1608ء میں جہانگیر نے عبد الرحیم خانخاناں کو احمد نگر کی مہم پر مامور کیا۔ لیکن احمد نگر کے حبشی سردار ملک عنبر نے اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ پھر 1610ء میں جہانگیر نے شہزادہ پرویز اور آصف خاں کو احمد نگر کے خلاف فوج کشی کا حکم دیا لیکن یہ مہم بھی ناکام رہی۔ آخر کار 1617ء میں شہزادہ خرم کو احمد نگر پر اہم فتح حاصل ہوئی۔ جہانگیر نے اس فتح کا جشن منایا اور خرم کو شاہ جہاں کا لقب دیا۔ 1620ء میں ملک عنبر نے صلح کی شرائط توڑ کر احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔ ایک مرتبہ پھر شہزادہ خرم کو دکن کی مہم پر جانا پڑا۔ بالآخر 1621ء میں فریقین میں ایک مرتبہ پھر معاہدہ ہو گیا اور ملک عنبر نے احمد نگر سلطنت کے کچھ اور علاقے مغلوں کے حوالے کر دیے۔ احمد نگر‘ بیجاپور اور گولکنڈہ نے 12 لاکھ‘ 18 لاکھ اور 20 لاکھ روپے سالانہ محصول کے طور پر مغل حکومت کو دینا قبول کر لیا۔

1622ء میں جہانگیر کے بیٹے شہزادہ خرم نے اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس بغاوت میں شہزادہ خرم اور نور جہاں کی باہمی رنجش کا بڑا دخل تھا۔ شہزادہ خرم کی شادی نور جہاں کے بھائی آصف خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی اور شہریار جو جہانگیر کا چھوٹا بیٹا تھا اس کا عقد نور جہاں کی بیٹی لاڈو بیگم سے ہوا جو نور جہاں کے پہلے شوہر شیر افگن سے تھی۔ نور جہاں کی خواہش یہ تھی کہ جہانگیر کے بعد اس کا داماد جانشین بنے۔ خرم کی بغاوت خاصی پھیل گئی اور 1625ء سے 1626ء تک خرم شاہی افواج سے لوہا لیتا رہا۔ آخر کار اس نے مہابت خاں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور باپ سے معافی مانگ لی۔

1626ء میں جہانگیر کابل کے لیے روانہ ہوا۔ جہلم کے کنارے جب شاہی کیمپ قائم تھا تو مہابت خاں نے اچانک شہنشاہ کو اپنی تحویل میں لے لیا لیکن آخر کار نور جہاں نے اسے آزادی دلانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد مختلف بیماریوں میں مبتلا رہنے کی وجہ سے

1627ء میں لاہور میں اس کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر 58 سال تھی۔ اس نے کل 22 سال حکومت کی۔ لاہور میں ہی دفن کیا گیا۔ جہاں اس کی بیوہ نے اپنے خرچ سے ایک شاندار مقبرہ تعمیر کروایا۔

جہانگیر کے دور حکومت کے دو مشہور واقعات قاضی نوراللہ شوستری کا قتل اور حضرت مجدد الف ثانی کی اسیری ہے۔ جنہیں جہانگیر کے حکم پر گوالیار کے قلعے میں قید کیا گیا تھا، لیکن کم و بیش ایک سال کے بعد بادشاہ نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے انہیں رہا کر دیا۔

جہانگیر ایک عالم و فاضل شخص تھا۔ وہ مردم شناس اور مسائل میں گہری نظر رکھنے والا تھا۔ وہ نرم دل اور کریم النفس بھی تھا۔ انصاف پسند اور عادل بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے محل کی دیوار کے ساتھ سونے کی ایک زنجیر مع گھنٹیوں کے نصب کروائی تھی اور حکم دے رکھا تھا کہ جس شخص کو کوئی شکایت ہو اور ہم سے ملنا چاہتا ہو وہ رات کے وقت بھی اس زنجیر کو ہلا کر بادشاہ سے فریاد کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عدل و انصاف کی کہانیاں اب تک مشہور ہیں۔ اس کا دور حکومت رعایا کے لیے امن و خوشحالی کا دور تھا۔ اس دور میں صنعت و تجارت کو بھی خوب فروغ حاصل ہوا اور سیاسی لحاظ سے سلطنت میں استقلال و استحکام پیدا ہوا۔

جہانگیر ادب، فنون لطیفہ اور بالخصوص مصوری کا نہایت دلدادہ تھا۔ وہ فارسی، ترکی، عربی اور ہندوستانی زبانوں میں مہارت رکھتا تھا۔ بابر کی طرح اس نے بھی اپنی سوانح حیات خود اپنے ہاتھوں سے تصنیف کی اور اس کا نام "تزک جہانگیری" رکھا۔ اس کی سرپرستی میں فن مصوری نے بہت ترقی کی اور مصوری کا وہ دبستان جس کو مغل مصوری کہا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں اپنے معراج کو پہنچ گیا تھا۔ استاد ابوالحسن نادر الزماں، استاد منصور، بشن داش اور گوردھن اس دور کے ممتاز مصور تھے۔

11.7 شہاب الدین شاہجہاں (1627-1657)

جہانگیر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا خرم، شہاب الدین محمد شاہجہاں پادشاہ غازی کے نام سے تخت نشین ہوا۔ تخت نشینی کو ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ بندیل کھنڈ کے راجا جے جھر سنگھ نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے شاہجہاں فوری طور پر گوالیار پہنچا۔ جے جھر نے شاہی فوج سے مقابلہ کرنا بے سود سمجھا اور مہابت خان کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد 1629ء میں خان جہاں لودھی نے بغاوت کر دی اور دکن فرار ہو گیا۔ بالآخر 1631ء میں شیہونڈا کے مقام پر (جو ضلع باندہ میں ہے) مادھو سنگھ راجپوت کے نیزے سے زخمی ہو کر مارا گیا۔

شاہجہاں نے 1629ء میں دکن کی نامکمل تسخیر کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے دکن پہنچ کر احمد نگر اور بیجاپور کے خلاف مہم کا آغاز کیا اور بالا گھاٹ، ناسک اور سنگم نیر پر فتح حاصل کی۔ 1691ء میں شاہجہاں کی محبوب بیوی ممتاز محل کی 7 جون 1631ء کو وفات ہو گئی۔ ممتاز محل کی موت کی وجہ سے شاہجہاں کو دکن کی مہم کو نامکمل چھوڑ کر آگرہ کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ پھر 1632ء میں مہابت خاں کو جنوبی مہم پر مامور کیا گیا۔ مہابت خاں نے 1633ء میں احمد نگر سلطنت کے قلعہ دولت آباد پر قبضہ کر لیا اور احمد نگر کے سلطان حسین نظام شاہ کو گوالیار

میں قید کر دیا گیا اور یوں احمد نگر کے نظام شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ 1636ء میں ایک مرتبہ پھر دکن کی تسخیر کے لیے شاہجہاں خود دولت آباد روانہ ہوا اور آخر کار بیجاپور کے سلطان سے مصالحت ہو گئی۔ صلح کی شرائط کے مطابق سلطان بیجاپور نے 20 لاکھ روپے سالانہ ادا کرنا منظور کیا' نیز مراٹھوں کے خلاف مہم میں مغلوں کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ شہنشاہ شاہجہاں نے بیجاپور کے سلطان کو پارندہ اور کونکن کے علاقے جاگیر میں عطا کیے۔ 1936ء میں ہی ریاست گولکنڈہ کے سلطان عبد اللہ قطب شاہ سے بھی مصالحت ہو گئی۔ اور مئی' جون 1636ء میں عبد اللہ قطب شاہ نے مغل شہنشاہ کی مرضی کے مطابق ایک معاہدہ پر دستخط کر دیا۔ اس معاہدے میں یہ بات شامل تھی کہ خلفائے راشدین کے نام کے ساتھ ساتھ مغل شہنشاہ کا نام بھی خطبے میں پڑھا جائے گا اور سکوں پر بھی ان کا نام کندہ ہو گا۔ گولکنڈہ کے حاکم نے یہ وعدہ کیا کہ وہ شہنشاہ کا مطیع رہے گا' اگر بے وفائی کی تو ریاست چھین لی جائے گی۔ قطب شاہ نے سالانہ چھ لاکھ روپیہ پیش کش دینا قبول کیا۔

سولھوی صدی عیسوی کی ابتدا میں پرتگالی ایک تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور جلد ہی ہندوستان کے مغربی ساحل کی اہم بندرگاہوں کو چین' گوا' دمن اور دیو پر اپنا قبضہ جمالیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد ہگلی کی بندرگاہ پر بھی قبضہ کر لیا اور بنگال کی تجارت میں مداخلت شروع کر دی۔ 1632ء میں بنگال کے صوبہ دار قاسم خان نے شاہجہاں سے پرتگالیوں کے خلاف فوج کشی کی اجازت مانگی۔ شہنشاہ نے اجازت دے دی۔ تقریباً چھ مہینے کے محاصرہ کے بعد پرتگالیوں کو سخت شکست ہوئی اور ہگلی کو پرتگالیوں سے چھین لیا گیا۔ 1634ء میں شاہجہاں نے ایک چھوٹی مہم بلتستان کے حکمراں ابدال کے خلاف بھیجی اور ابدال کو مغل شہنشاہ کا اقتدار قبول کرنے اور سالانہ پیش کش دینے پر مجبور کیا۔

ہندوستان اور ایران دونوں کے درمیان عرصہ سے قندھار کے تعلق سے نزاع چلا آ رہا تھا۔ شاہ ایران کے وزیر سے شدید اختلافات کی وجہ سے قندھار کے ایرانی حاکم علی مردان خاں نے مغلوں سے مدد مانگی اور قندھار کو حوالہ کرنے کی پیش کش کی۔ 1638ء میں اس نے مغل شہنشاہ سے وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے قلعہ حوالے کر دیا۔ اس طرح سے قندھار مغلوں کے قبضہ میں آ گیا اور علی مردان خاں کو مغل کی طرف سے انعام و اکرام سے نوازا گیا اور کچھ دنوں کے بعد علی مردان کو کشمیر کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا' لیکن ایرانیوں نے 1649ء میں قندھار کو دوبارہ لے لیا' اور قندھار کا قلعہ مغلوں کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔

شاہجہاں کے دور حکومت کا ایک اہم واقعہ وسط ایشیا کے خلاف فوج کشی کا ہے۔ شاہجہاں نے شہزادہ مراد کو اس مہم کا سربراہ بنایا۔ جولائی 1645ء میں مراد بدخشاں میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک طاقتور فوج کی مدد سے بلخ پر حملہ کر کے فتح کر لیا۔ بلخ کے حاکم اور ازبکوں کے سردار نذر محمد مراد کی کامیابی سے پریشان ہو کر ایران فرار ہو گیا لیکن مراد نے اس مہم کی زیادہ دنوں تک قیادت نہیں کی اور باپ کی حکم عدولی کر کے کابل واپس چلا آیا۔ شاہجہاں نے مراد کی جگہ شہزادہ اورنگ زیب کو اس مہم کی قیادت کے لیے مقرر کیا اور مہم جاری رکھنے کا حکم دیا' لیکن شہزادہ اورنگ زیب بھی اس مہم کو زیادہ دیر قائم نہ رکھ سکا اور ان علاقوں پر تسلط قائم کرنے میں ناکام رہا اور وہاں سے واپسی پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح سے وسط ایشیا کی مہم ناکام ہو گئی۔

1652ء میں شہزادہ اورنگ زیب کو دوبارہ دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا' جہاں اس کی جارحانہ حکمت عملی کو شاہجہاں نے روکا اور حکم دیا کہ حاکم گولکنڈہ عبد اللہ قطب شاہ' جس پر اس نے حملہ کر دیا تھا' سے صلح کر لے۔ چنانچہ 1656ء میں مغلوں اور گولکنڈہ کے درمیان

صلح ہو گئی ،لیکن اورنگ زیب نے بیجاپور کے حکمراں علی عادل شاہ کے خلاف فوج کشی کر کے بیدر اور کلیان پر قبضہ کرلیا۔

ستمبر 1657ء میں شاہجہاں شدید بیمار ہوا تو اس کی علالت کی خبر پا کر اس کے چاروں بیٹوں داراشکوہ ٗ شجاع ٗ اورنگ زیب اور مراد بخش میں حصول اقتدار کے لیے آپس میں کشمکش شروع ہو گئی۔ اورنگ زیب نے داراشکوہ کو ساموگڑھ میں شکست فاش دی اور شاہ شجاع کو الہ آباد کے قریب کھجوہ کے مقام پر شکست دی اور وہ اراکان کے جنگلوں میں فرار ہو گیا جہاں اس کی وفات ہو گئی اور مراد بخش کو قید کر کے قتل کرا دیا۔ نیز شاہجہاں کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر کے خود آگرہ میں تخت نشین ہو گیا اور شاہجہاں نے طویل نظر بندی کے دن گزارنے کے بعد 22 جنوری 1666ء کو 74 سال کی عمر میں وفات پائی۔

شاہجہاں کا تیس سالہ دور حکومت مغلیہ سلطت کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس کا دور خوشحالی کا دور تھا۔ تہذیبی امور میں شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہندوستان نے کافی ترقی کی۔ اس دور میں علم و ادب کا بھی خوب فروغ ہوا۔ شاہجہاں کے دو بیٹے داراشکوہ اور اورنگ زیب صاحب تصنیف اور انشاء پرداز تھے۔ اس کی بیٹی جہاں آراء بیگم کی کتاب مونس الارواح کافی مشہور ہے۔ اس کے امراء میں ظفر خاں احسن اور نواب شکر اللہ خان بھی صاحب تصنیف تھے۔ بادشاہ خود فارسی اور سنسکرت ادب کے دلدادہ تھا۔ سنسکرت کے عظیم شاعر جگناتھ پنڈت ٗ چنتا منی اور سندر داس اس کے دربار سے متعلق تھے۔ ایسے ہی حاجی محمد ٗ جان قدسی ٗ ملک الشعر ابو طالب کلیم ٗ غنی کاشمیری ٗ منیر لاہوری وغیرہ اسی دور سے متعلق تھے۔

فن تعمیر اور فنون لطیفہ کو بھی اس دور میں کافی ترقی ملی۔ آگرہ کی تزئین و آرائش شاہجہاں آباد کی تعمیر ٗ جامع مسجد دہلی ٗ لال قلعہ دہلی ٗ تاج محل آگرہ وغیرہ کی تعمیر عہد شاہجہانی کی عظمت اور شان و شوکت کی آج بھی شہادت دے رہی ہے۔ فن موسیقی میں تان سین کا داماد لال خاں اور ماہر موسیقی جگن ناتھ بہت مقبول ہوئے۔ عہد شاہجہانی میں شبیہ سازی کو بڑی ترقی ملی اور تصویریں رنگ و حواشی کے لحاظ سے زیادہ شاندار ہو گئیں۔ فن خطاطی بھی اس عہد میں اوج کمال تک پہنچی۔ چنانچہ عبد الرشید دیلمی مشہور خطاط کا تعلق اسی زمانے سے ہے۔ اس کا خط نستعلیق خاص ندرت رکھتا ہے۔ کندہ کاری ٗ نگینہ کاری ٗ مہر سازی جیسے فنون کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔

11.8 محی الدین اورنگ زیب عالمگیر (1707-1658)

ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر 3 نومبر 1618ء کو مالوہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی زمانے ہی سے اس کی تعلیم و تربیت کا اچھا انتظام کیا گیا اور اس نے عربی ٗ فارسی ٗ قرآن و حدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور شاہجہاں کے دور حکومت میں کئی اہم عہدے پر فائز رہا۔ ستمبر 1657ء میں جب شاہجہاں شدید بیمار ہوا اور اس کے چاروں بیٹوں کے درمیان حصول تخت کے لیے چپقلش بڑھی تو جون 1658ء میں اورنگ زیب نے شاہجہاں کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا اور سلطنت مغلیہ پر فرمانروائی کا آغاز کر دیا۔

اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کی پہلی رسم دہلی کے قریب باغ اعز آباد میں (جو بعد میں شالیمار باغ کے نام سے مشہور ہوا) نہایت سادگی کے ساتھ ادا کی اور ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کا لقب اختیار کر کے 31 / جولائی 1658ء میں اپنی

بادشاہت کا باضابطہ اعلان کیا۔ اس نے حصول تخت کے خواہاں دیگر بھائیوں سے نمٹنے کے بعد اپنی دوسری رسم تخت نشینی شان وشوکت کے ساتھ 5 /جون 1659ء کو دہلی میں ادا کی۔

اورنگ زیب نے پچاس سال دوماہ اور ستائیس دن حکومت کی۔ اس نے اپنی طویل دور حکومت میں توسیع سلطنت اور استحکام وتحفظ مملکت کے لیے کئی جنگیں لڑیں اور بغاوتوں کو ختم کیا اور اصلاحات کیں۔ اپنی دور حکومت کے پہلے پچیس سال شمالی ہندوستان میں بغاوتوں کو ختم کرنے اور اصلاحات نافذ کرنے اور آخری پچیس سال دکن کے حالات درست کرنے میں صرف کیے۔

اورنگ زیب نے تخت نشین ہوتے ہی اہم صوبوں میں اپنے آدمی مقرر کیے' چنانچہ دکن کی ذمہ داری شائستہ خان کے سپرد کی اور میر جملہ کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا۔ بنگال کا صوبہ دار میر جملہ ایک کامیاب سپہ سالار اور منتظم تھا۔ میر جملہ نے کوچ بہار کے قلعہ پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد میر جملہ نے دریائے برہم پتر کو عبور کیا اور آسام کو فتح کرکے اسے پہلی مرتبہ مغل بادشاہ کا باجگذار بنایا۔ میر جملہ کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے اپنے ماموں شائستہ خان کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کردیا۔ شائستہ خان نے کئی اہم کارنامے انجام دیے۔ اس علاقے میں سواحل پر ماگ قوم فرنگی قزاقوں سے مل کر لوٹ مار کرتی رہتی تھی۔ اورنگ زیب نے شائستہ خان کو حکم دیا کہ ان غارت گروں کی سرکوبی کرے اور استیصال کرے' چنانچہ 1666ء میں شائستہ خان نے اپنے بڑے بیٹے امین خان کو باقاعدہ اس مہم پر روانہ کیا۔ پرتگیز حلیفوں نے تولوگوں کا ساتھ چھوڑ دیا' لیکن اراکان کے رئیس اور راجہ ان کے حامی بن گئے اور کئی دریائی معرکے ہوئے۔ آخر کار چٹگانگ کے مضبوط قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس کامیابی پر بادشاہ نے شائستہ خان اور اس کے ساتھیوں کو انعام واکرام سے نوازا اور شائستہ خان کو ہفت ہزاری کا منصب بھی دیا۔ شائستہ خان نے بنگال کے نظم ونسق کو اچھی طرح درست کیا۔ اس کے دور میں متعدد مدرسے' مسجدیں' پل اور سڑکیں تعمیر ہوئیں اور اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول کیا گیا۔

پنجاب اور کابل کے درمیان جنگجو قبائل تھے' وہ اکثر بغاوتیں اور شورشیں کرتے رہتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں بھی اس علاقے کے قبائل نے بغاوتیں کیں۔ خصوصاً یوسف زئیوں نے 1667ء میں سوات' باجور اور پشاور کے علاقے میں علم بغاوت بلند کیا اور آفریدیوں نے 1672ء میں اپنے سردار اکمل خان کی قیادت میں بغاوت کی اور علی مسجد کی جنگ میں افغانستان کے حاکم محمد امین خان کو شکست دی۔ خٹک قبائل نے آفریدیوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح سے اورنگ زیب کے لیے ان علاقوں میں انتظامی مسئلہ پیدا ہوگیا۔ مزید صورت حال کو بگڑتا دیکھ کر بادشاہ بذات خود حسن ابدال روانہ ہوا اور وہاں ڈیڑھ سال قیام کرکے قبائل پر قابو پانے کی کوشش کی۔ تادیبی دستے ہر طرف پھیلادیے۔ چند مہینوں میں باغیوں اور سرکشوں نے سزا پائی۔ ہرناکے پر شاہی فوج تعینات ہوئی اور جنگی چوکیاں قائم ہوئیں۔ اس طرح سے ان قبائل کی بغاوت کو ختم کرنے میں کامیابی ملی۔ 1676ء میں اورنگ زیب نے امیر خاں کو کابل کا صوبہ دار مقرر کیا امیر خان نے اپنی وفات 1698)ء(تک کابل پر حکمرانی کی اور مغلیہ حکومت کی شمال مغربی سرحدوں پر نظم ونسق بحال رکھا۔

1675-1668ء کے درمیان متھرا میں جاٹوں نے' نارنول میں ستنامیوں (جو جوگیوں کا ایک فرقہ تھا) نے اور پنجاب میں سکھوں نے بغاوتیں کیں۔ مشہور مورخ پروفیسر عرفان حبیب کے مطابق یہ بغاوتیں بہت حد تک کسانوں کی تھیں جو کہ زرعی محصول یا مالگزاری کے

نظام میں تبدیلی کی وجہ سے حکومت سے ناراض تھے۔ ان بغاوتوں کو دبایا گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کو1678ء سے 1681ء کی مدت میں مارواڑ (جودھپور) اور میواڑ (اودے پور) کے راجپوتوں کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔10 / دسمبر 1678ء میں مارواڑ کے لاولد راجہ جسونت سنگھ کی وفات ہوگئی' اس کے بھتیجے اندر سنگھ کو جودھپور کا راجہ مقرر کیا گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد متوفی کی دورانیوں سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ جن میں ایک پیدائش کے بعد ہی فوت ہوگیا اور دوسرا بیٹا اجیت سنگھ بعد میں جودھپور کا راجہ بنا۔ اجیت سنگھ کی ماں " ٹھاکر درگاداس اور دیگر حامیوں نے اورنگ زیب سے اجیت سنگھ کو راجہ بنانے کا مطالبہ کیا۔ بادشاہ اورنگ زیب کے انکار کرنے کے بعد ٹھاکر درگاداس اور دیگر راجپوت سرداروں نے علم بغاوت بلند کردیا۔ صوبائی حکام نے اس کی سرکوبی کرنی چاہی لیکن وہ بھاگ کر میواڑ (اودے پور) پہنچ گیا۔ اودے پور کا رانا سنگھ بھی اس کا حامی و مددگار بن گیا۔ نتیجتاً راجپوتوں نے بغاوت کردی۔ بغاوت کو کچلنے کے لیے ستمبر 1679ء میں شہزادہ اکبر کو بھیجا گیا۔ راجپوتوں نے مجبوراً سازش کی راہ تلاش کی۔ رانا اودے پور اور ٹھاکر نے شہزادہ اکبر کو بادشاہی کے سبز باغ دکھائے۔ اور خود اس کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ اس طرح سے شہزادہ اکبر کو باپ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرکے اپنے ساتھ ملالیا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے اورنگ زیب بذات خود اجمیر کی طرف روانہ ہوا اور اجمیر سے دس میل جنوب دوہارا میں قیام پذیر ہوا۔ اورنگ زیب نے حالات کا نہایت ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔ ہوشیاری اور حکمت عملی سے کام لے کر شہزادہ اکبر اور راجپوتوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح اس نے راجپوتوں کو شہزادے سے علاحدہ کردیا۔ بادشاہی فوج ایک پچیس سالہ شہزادے کا ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ چند ہی دنوں میں بہت سے سردار اور سپاہی شہزادہ اکبر کو چھوڑ کر اجمیر چلے آئے جہاں اس وقت اورنگ زیب مقیم تھا۔ اورنگ زیب نے ازسرنو لشکر مرتب کیا۔ اکبر شکست کھانے کے بعد اپنے راجپوت حلیفوں کے ساتھ دکن فرار ہوگیا اور پھر وہاں سے ایران چلا گیا اور وہیں وفات پائی۔

درگاداس ٹھاکر بھی اکبر کے ساتھ ہی راجپوتانے سے فرار ہوگیا تھا' اودے پور کا رانا بھی پہاڑوں میں جاچھپا تھا۔ مگر وہاں بھی اورنگ زیب کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ مجبوراً معافی طلب کی' اور دو پرگنے اورنگ زیب کو پیش کیے۔ اورنگ زیب نے درگزر سے کام لیا اور ان کی ریاست بحال کردی اس طرح سے ان علاقوں میں حالات معمول پر آگئے اور امن قائم ہوگیا۔

اورنگ زیب نے اپنے دور حکومت میں دکن کی نامکمل تسخیر کو پائے تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا۔ 1665ء میں اس نے راجہ جے سنگھ کو دکن کا صوبے دار مقرر کرکے بیجاپور اور مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی سرکوبی کا حکم دیا۔ دکن میں مراٹھا سردار شیواجی نے (جو شاہ جی بھونسلے کا لڑکا تھا) اپنی طاقت بہت بڑھالی تھی۔ شیواجی اعلیٰ درجہ کا مدبر' گوریلا طرز جنگ کا ماہر سپاہی تھا' اس نے دکن کے کئی قلعوں پر قبضہ جمالیا تھا۔ راجہ جے سنگھ نے دکن پہنچنے کے بعد شیواجی کے خلاف محاذ قائم کیا اور اسے شکست دے کر صلح کرنے پر مجبور کردیا۔ جے سنگھ نے معاہدہ پورندھ کے ذریعہ شیواجی کو مجبور کیا کہ اپنے 37 قلعوں میں سے 23 قلعے مغلوں کے حوالے کردے۔ شیواجی نے بادشاہ کی اطاعت قبول کرنے کے بعد بیجاپور اور گولکنڈہ کے خلاف جنگ میں مغلوں کی حمایت کا یقین دلایا۔ جے سنگھ نے اس فتح کے بعد بیجاپور کے خلاف مہم چھیڑی لیکن اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ 1666ء میں اورنگ زیب نے اسے واپس بلالیا۔ جے سنگھ کے بعد دیگر

صوبیداروں بہادر خاں اور دلیر خان نے بھی بیجاپور کے محاذ میں ہزیمتیں اٹھائیں۔ اس لیے ستمبر 1681ء میں اورنگ زیب کو برہان پور خود آنا پڑا۔ اورنگ زیب نے برہان پور پہنچنے کے بعد سب سے پہلے مراٹھوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ چاروں طرف سے مراٹھا حکمراں شمبھاجی کے علاقوں پر حملہ کیا' لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آخر کار مقرب خاں کی قیادت میں 1689ء میں مغل فوج نے رتناگری کے قریب قائم مراٹھا کیمپ پر اچانک حملہ کر دیا اور فتح حاصل کی۔

مراٹھوں کے خلاف محاذ آرائی میں بادشاہ اورنگ زیب کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ مراٹھا قوت پوری طرح اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ بیجاپور اور ریاست گولکنڈہ سے نہ نپٹ لیا جائے۔ چنانچہ 1685ء میں شہزادہ محمد معظم کی قیادت میں مغل فوج نے بیجاپور کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر 22 / ستمبر 1686ء کو بیجاپور کے سلطان سکندر عادل شاہ نے قلعہ اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ عادل شاہ کو خاں کا لقب ملا اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ بطور پنشن دے کر سبکدوش کر دیا گیا اور بیجاپور کو سلطنت مغلیہ کا حصہ بنا لیا گیا۔ پھر اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر چڑھائی کی۔ آٹھ ماہ تک گولکنڈہ کا محاصرہ چلا پھر بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ آخر کار اورنگ زیب نے گولکنڈہ کے ایک افغان امیر عبداللہ کی مدد سے قلعہ کو فتح کیا۔ اس طرح گولکنڈہ کی ریاست کا خاتمہ ہو گیا اور اس کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح کے بعد اورنگ زیب نے 1689ء سے 1707ء تک مسلسل مراٹھوں کی طاقت کو ختم کرنے میں لگا رہا۔ سب سے پہلے بسنت گڑھ فتح ہوا پھر ستارا' تورنا اور کھیلنا وغیرہ کے قلعے تسخیر ہوئے۔ پرنالا اور بھوسان گڑھ کے قلعوں پر بھی قبضہ ہو گیا۔ لیکن مغل سرداروں کی آپسی چپقلش اور سازش کی وجہ سے مراٹھوں کی طاقت کو مکمل طور سے کچلنے میں اورنگ زیب کامیاب نہ ہو سکا۔ سخت محنت اور مسلسل فوج کشی نے اورنگ زیب کی صحت پر بُرا اثر ڈالا اور اورنگ زیب کا 89 سال کی عمر میں 3 مارچ 1707ء کو احمد نگر میں انتقال ہو گیا۔

اورنگ زیب کا شمار مغلیہ حکومت کے اہم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ تخت نشینی کے بعد رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے اورنگ زیب نے کئی اہم اصلاحی اقدامات کیے۔ مغلیہ دور میں سکوں پر کلمہ طیبہ لکھا جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے کلمہ طیبہ کی بے حرمتی کا خیال کرتے ہوئے آئندہ کے لیے سکوں پر کلمہ کا کندہ کرانا بند کرا دیا۔ بھنگ کی کاشت بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ مسلمانوں کے اخلاق و اطوار کی اصلاح کے لیے محکمہ احتساب قائم کیا۔ ملک کے اندر تمام قصبوں اور شہروں میں بڑے مستعد محتسب مقرر کیے جو لوگوں کو معاشرتی برائیوں یعنی شراب پینے 'جوا کھیلنے سے منع کرتے تھے۔ غلاموں کی خرید و فروخت کو بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ دربار میں ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کی رسم رائج تھی اسے بھی ختم کر دیا گیا۔ دربار میں گانا بجانا اور رقص و سرور کی محفلیں بند کر دی گئیں۔ جشن نوروز بند کر دیا گیا۔ بادشاہ کے ماتھے پر تلک لگانا' زمین بوسی اور جھروکے درشن کی رسمیں موقوف کر دی گئیں۔ جشن ولادت اور جشن تخت نشینی سادہ طریقے سے منانے کا حکم دیا گیا۔ بادشاہ کو سونے اور چاندی میں تولنے کی رسم ختم کر دی گئی۔ درباری لباس میں اصلاح کی گئی۔ امراء کے لیے زیورات اور ریشمی کپڑے پہننا ممنوع قرار دیا گیا۔ ستی کی رسم ممنوع ہو گئی۔ ملک میں اسّی کے قریب ناجائز ٹیکس وصول کیے جا رہے تھے۔ ان میں محصول راہ داری جو اشیا تجارت پر مالیت کے اعتبار سے دس فیصد شرح سے عائد تھا معاف کر دیے گئے۔ ٹول ٹیکس اور مختلف دیگر محصول جن کو ابواب کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور گنگا جمنا پر نہانے کا ٹیکس وغیرہ بھی معاف کر دیا گیا۔ ان اقدامات سے عام آدمی کو فائدہ پہنچا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت تقریباً 150 سال تک قائم رہی۔ اورنگ زیب کے بعد اس کے جانشینوں کے دور حکومت میں بڑی تیزی سے مغل حکومت کا زوال ہونے لگا۔ اس کے جانشینوں میں بہادر شاہ اول (عہد حکومت 1707-1712ء) ایک طاقتور حکمراں تھا اور اس کے دور میں مغلیہ حکومت کی سرحدیں تقریباً اتنی ہی تھیں جتنی اورنگ زیب کے وفات کے وقت تھی۔ اس کے بعد فرخ سیر (عہد حکومت 1712-1719) کے زمانہ میں اگرچہ حکومت میں خرابیاں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں، لیکن اس کے باوجود اس وقت تک مغلیہ حکومت کے اثر و اقتدار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پھر محمد شاہ (عہد حکومت 1719-1754) تخت نشین ہوا۔ اسی دور سے مغلیہ حکومت کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ اسی زمانے میں ایرانی حکمراں نادر شاہ کا حملہ (1739ء) دہلی پر ہوا۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے احمد شاہ (عہد حکومت 1748-1754) عالمگیر ثانی (عہد حکومت 1754-1759)، شاہ عالم ثانی (عہد حکومت 1759-1806)، اکبر شاہ ثانی (عہد حکومت 1806-1837) اور بہادر شاہ ظفر (عہد حکومت 1837-1857) نے حکومت کی۔ اس طرح ہندوستان میں جس حکومت کی بنیاد بابر نے 1526ء میں رکھی تھی 1857-ء میں ہمیشہ کے لیے اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

11.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ظہیر الدین محمد بابر نے 21/اپریل 1926ء کو ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں تاریخی شکست دی اور ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اور کئی علاقے فتح کر کے مغلیہ حکومت کو وسیع کیا۔ اس کی کوششوں سے مغلیہ حکومت کی حدود سندھ سے بہار تک اور ہمالیہ سے گولیار اور چندیری تک پھیل گئی۔
- بابر کی وفات کے بعد اس کا لڑکا نصیر الدین محمد ہمایوں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے دور میں اٹھنے والی بغاوتوں کو ختم کیا اور آخر کار چوسا کی جنگ میں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران چلا گیا۔ پھر شاہ ایران سے مدد حاصل کی اور ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کو دوبارہ استحکام دیا
- ہمایوں کے بعد جلال الدین محمد اکبر 13 سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے ابتداء میں اپنے اتالیق بیرم خان کی سرپرستی میں حکومت کی۔ بیرم خان کے قتل کے بعد اکبر نے عنان حکومت مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لی۔ اپنی حکومت کی حدود کو وسیع کیا۔ نظام محاصل کو درست کیا۔ انتظام سلطنت اور مذہبی امور میں کئی ایجادات کیں۔
- نور الدین جہانگیر کے بعد دور حکومت میں بھی کئی بغاوتیں ہوئیں۔ ان بغاوتوں کو ختم کیا۔ میواڑ کی تسخیر اس دور کا اہم واقعہ ہے۔ اس کے دور میں سیاسی لحاظ سے سلطنت میں استقلال اور استحکام پیدا ہوا۔ اس دور کے عدل و انصاف کی کہانیاں اب تک مشہور ہیں۔ اس دور میں خصوصاً مصوری کو بہت فروغ ملا۔
- جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ اس دور میں بھی کئی علاقے فتح کیے گئے۔ شاہجہاں کا دور تہذیبی لحاظ سے کافی اہم شمار کیا

جاتا ہے۔اس کا تیس سالہ دور خوشحالی کا دور تھا۔

- اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی دور حکومت کے پچیس سال دکن کے حالات درست کرنے میں صرف کیے۔اورنگ زیب کے بعد مغلیہ حکومت زوال پذیر ہوگئی۔اس کے نااہل جانشینیوں نے حکومت کے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔بالآخر 1857ء میں مغلیہ حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

11.10 نمونہ امتحانی سوالات

11.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. ابراہیم لودھی کو------------------نے شکست دی۔

(a)بابر (b)ہیموبقال (c)شہاب الدین غوری (d)اکبر

2. بابر کے والد عمر شیخ------------------ریاست کے حاکم تھے۔

(a)سمرقند (b)بخارا (c)افغانستان (d)ہندوستان

3. ------------حکمراں نے ہمایوں کی سوری خاندان کے خلاف مدد کی۔

(a)سلیم اول (b)شاہ طہماسپ (c) شہنشاہ اکبر (d)سب صحیح

4. خرم------------------مغل بادشاہ کا نام تھا۔

(a)بابر (b)اکبر (c)جہاں گیر (d)شاہ جہاں

5. کس مغل حکمراں نے انصاف کے لیے محل سے باہر رسی لٹکا رکھی تھی۔

(a) اکبر (b)جہاں گیر (c)شاہ جہاں (d)اورنگ زیب

6. تاج محل کی تعمیر کس مغل بادشاہ کا کارنامہ ہے؟

(a)اکبر (b)جہاں گیر (c)شاہ جہاں (d)اورنگ زیب

7. نورجہاں کس مغل حکمران کی ملکہ تھی؟

(a)بابر (b)اکبر (c) جہاں گیر (d)شاہ جہاں

8. 1652ء میں شہزادہ------------------کو دوبارہ دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔

(a)اورنگ زیب (b)مراد (c)بہادر شاہ (d)سلیم

9. ----------- حکمران کی وفات کے بعد مغل حکومت کمزور ہوگئی۔

(a) بہادر شاہ ظفر (b)مراد (c)اورنگ زیب (d)سب غلط

10. کس حکمران کے عہد میں مغلیہ سلطنت سب سے زیادہ وسیع تھی؟

(a) اکبر (b)شاہ جہاں (c)اورنگ زیب (d)بہادر شاہ ظفر

11.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد کیسے پڑی؟
2. ہمایوں نے ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ کیسے حاصل کیا۔
3. شاہجہاں کی حکومت پر روشنی ڈالیے۔
4. فنون لطیفہ کے ارتقا میں جہانگیر کی دلچسپی پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
5. پانی پت کی جنگوں کے احوال مختصراً بیان کیجیے۔

11.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. بابر کی زندگی اور کارناموں پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔
2. جلال الدین محمد اکبر کی فتوحات اور اس کی انتظامی اصلاحات پر تبصراتی مضمون لکھیے۔
3. اورنگ زیب کے دور حکومت میں دکن کی تسخیر سے متعلق اپنی معلومات تحریر کیجیے۔

11.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ : (حصہ دوم) ثروت صولت۔ مرکزی مکتبہ اسلامی، پبلشرز۔ نئی دہلی
2. مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال : آر۔پی۔ ترپاٹھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
3. اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر : شبلی نعمانی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔
4. تزک بابری : بابر
5. منتخب التواریخ : عبدالقادر بدیوانی
6. اکبرنامہ : ابوالفضل
7. تاریخ فرشتہ : محمد قاسم فرشتہ

اکائی 12: مغلیہ حکومت کا نظم ونسق

اکائی کے اجزا:

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 نظم ونسق

12.2.1 بادشاہ اور کار مملکت

12.2.2 دیوان خاص وعام کا طریقہ کار

12.2.3 دیوان (وزیر مال وفینانس)

12.2.4 میر بخشی (وزیر فوج)

12.2.5 میر ساماں

12.2.6 صدر: (محکمہ عطیات اور امور مذہبی کا سربراہ)

12.2.7 نظام عدلیہ

12.2.10 نظام فوج

12.3 صوبائی نظام

12.4 اکتسابی نتائج

12.5 نمونہ امتحانی سوالات

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

12.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت ایک طویل عرصہ تک قائم رہی۔ اس وسیع حکومت کا نظم ونسق مضبوط بنیادوں پر قائم تھا۔ مغلیہ حکومت کے نظم ونسق کا معمار بادشاہ اکبر تھا۔ اکبر کی اکثر انتظامی پالیسیز کو انگریزوں نے باقی رکھا اور آج بھی ان میں سے بہت ساری انتظامی پالیسیز رائج ہیں۔ ملکی امور کو انجام دینے کے لئے کئی اہم شعبے تھے۔ شعبوں کے عہدہ داران قابل، فرض شناس اور بادشاہ کے وفادار ہوتے تھے۔ تمام اعلیٰ عہدیداران بادشاہ کی نگرانی میں اپنے امور انجام دیتے تھے اور بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھے۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو مغل حکومت کے نظم ونسق سے متعارف کروانا ہے تاکہ آپ اس عظیم الشان حکومت کے اہم عہدوں کا تعارف کرواسکیں اور اس کی انتظامی پالیسیوں پر گفتگو کرسکیں۔ اسی طرح آپ مغل حکومت کے مرکزی اور صوبائی نظام پر بھی معلومات پیش کرسکیں۔

12.2 نظم ونسق

مغلیہ دور تقریباً 331 سالوں پر محیط ہے۔ اس وسیع حکومت کی عظمت واستحکام کا انحصار اس کے بہترین نظم ونسق پر تھا۔ اس نظم ونسق کا معمار بادشاہ اکبر تھا۔ یہی نظم حکومت معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں قائم رہا۔ مرکزی حکومت کے انتظامی امور کو انجام دینے کے لئے بادشاہ اکبر نے کئی اہم شعبے قائم کئے۔ ہر شعبہ کی نگرانی ایک بڑے عہدیدار یا وزیر کے سپرد کی گئی۔ حکومت کا سب سے اعلیٰ اور بڑا عہدیدار خود بادشاہ ہوتا تھا۔ وہ مطلق العنان ہوتا تھا، اسے غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ وہ صدر مملکت، افواج حکومت کا سپہ سالار، عدل وانصاف کا سرچشمہ، سب سے بڑا قانون ساز اور حکومت میں قطعی اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔ امور حکومت کی انجام دہی اور نظم ونسق قائم رکھنے کے لئے بادشاہ مرکزی حکومت میں کئی عہدیداروں سے مدد لیتا تھا۔ ان میں ایک اہم عہدیدار وکیل یا وزیر اعظم ہوتا تھا۔ وکیل کے عہدہ کی مستقل حیثیت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وکیل کا عہدہ ہمیشہ پُر نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ عام طور سے بادشاہ کی کم سنی یا کمزوری یا خرابی صحت کے دور میں مقرر کیا جاتا تھا۔ اس عہدے پر خاندانی امیروں کی اجارہ داری نہ تھی بلکہ موزوں اشخاص کا انتخاب چھوٹے درجہ کے لوگوں میں سے بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس طرح سے وکیل کے تقرر کا انحصار کلی طور پر بادشاہ کی مرضی پر تھا۔ لیکن جب بھی کسی کو سلطنت کے وکیل کے عہدہ پر مقرر کیا جاتا تھا تو وہ بادشاہ کے بعد حکومت کے سربراہ کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ نظام حکومت کو چلانے کے لئے حکومت کے فرائض واختیارات چار وزیروں میں تقسیم تھے۔

دیوان۔ وزیر مال وفینانس	میر بخشی۔ وزیر فوج
میر سامان۔ وزیر کارخانہ جات اور اسٹور	صدر۔ وزیر عدالت اور امور مذہبی

سرکاری محکمہ جات کا انتظام ان چار وزیروں کے ذمہ تھا‘لیکن مجالس مشاورت میں وزیروں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شریک کئے جاتے تھے۔ دربار میں‘ دوروں اور مہمات میں بادشاہ کی موجودگی اور نظم ونسق کی سرگرمیوں پر اس کی گہری نظر سے یہ مرکزی نظام موثر اور کارکرد بن گیا تھا۔

12.2.1 بادشاہ اور کار مملکت

بادشاہ کا تصور یہ تھا کہ بادشاہ خدا کا خلیفہ ہوتا ہے اور اسے بادشاہت کرنے کا حق خدا کی جانب سے ملتا ہے۔ وہ اپنے دائرہ کار میں اعلیٰ ترین فرد ہوتا ہے۔ خدا کے اس عظیم عطیہ کو حاصل کرنے کی صورت میں بادشاہ پر اس کی عبادت اور شکریہ ادا کرنا فرض ہے اور اس کے لئے عبادت کا سب سے بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے رعایا کے تمام متعلقہ فرائض بہ حسن وخوبی انجام دیتا رہے۔

بادشاہ اکبر نے جو مغلیہ سلطنت کے نظم ونسق کا معمار تھا‘شہنشاہیت کے تصور کو اپنے عمل کے ذریعہ حمایت بھی کی‘اکبر نے اپنے عہد حکومت میں جھروکہ درشن کی رسم کو رائج کیا۔ اس دور کے مورخ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ ’’اس رسم کا مقصد یہ تھا کہ خاص وعام بلا روک ٹوک بادشاہ کے حضور میں باریاب ہونے کا شرف حاصل کر سکیں‘‘ یہ رسم بادشاہ اکبر کے بعد اس کے بعض جانشینوں کے دور میں بھی رائج رہی۔ عقیدت مند صبح کے وقت جھروکے کے نیچے اکٹھا ہوتے تھے جن میں خواص وعوام‘ سپاہی‘ تاجر‘ سوداگر‘ اہل حرفہ اور دیہاتی ہر طرح کے لوگ درشن کے لئے جمع ہوتے تھے۔ بادشاہ اکبر جھروکے میں نمودار ہوتا اور درشن دینے کے بعد دربار عام منعقد کرتا تھا۔

اکبر روزانہ امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے خلوت گاہ سے تین دفعہ باہر نکلتا تھا۔ پہلی دفعہ طلوع آفتاب کے بعد درشن کیلئے‘ جھروکہ درشن کے بعد ہی دربار عام منعقد کرتا تھا۔ جس میں ہندو‘ مسلم خاص وعام اور مرد وعورت ہر ایک کو اپنی معروضات اور درخواست پیش کرنے اور اپنے مقدمات کو براہ راست بیان کرنے کی اجازت تھی۔ دوسری مرتبہ دوپہر کے بعد جب وہ ان جانوروں کا معائنہ کرتا تھا جن کی نگرانی کا کام مرکزی حکومت کے سپرد تھا۔ اس کے بعد وہ کارخانوں اور دیگر امور کا جائزہ لیتا۔ اگر کام زیادہ ہوتا تو غروب آفتاب کے بعد تک اجلاس جاری رہتا تھا۔ اس طرح سے دن میں تین مرتبہ شاہی دربار منعقد کرنے سے انتظام سلطنت پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ دن کا درمیانی وقت شاہی حرم کے معاملات کے لئے وقف ہوتا تھا۔ یہ وقت اندرون خانہ صرف ہوتا تھا۔ یہاں بیگمات اور دیگر عرضی گزار خواتین کے معاملات پر توجہ دی جاتی تھی۔ رات کا وقت صرف نجی مجالس کے لئے تھا۔ اس مجلس میں علماء‘ دانشوران‘ حکماء شریک ہوتے۔ اور مختلف موضوعات پر بحث ومباحثہ ہوتا۔ کبھی کبھی اس وقت بھی امور سلطنت انجام دیئے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں صرف متعلقہ امور کے عہدیداران اور چند خدمت گار ہی کو اس مجلس میں شرکت کی اجازت ہوتی تھی۔

12.2.2 دیوان خاص وعام کا طریقہ کار

صبح میں امور سلطنت انجام دینے کے بعد دوبارہ دوپہر کے وقت بادشاہ پورا دربار منعقد کرتا تھا۔ یہ مجلس دیوان خاص وعام میں منعقد ہوتی تھی۔ اور وہاں روز مرہ کے کام انجام دیئے جاتے تھے اور جانوروں کا معائنہ ہوتا تھا۔ اسی دربار میں نئے خریدے ہوئے جانوروں

کی قیمت طے کی جاتی تھی۔ اور پرانے جانوروں کی حالت کا معائنہ کر کے ان کے نگرانوں پر جرمانہ عائد کیا جاتا تھا یا انہیں انعامات سے نوازا جاتا تھا۔

مرکزی حکومت کے کارخانوں اور مال گوداموں میں جو کام ہتھیاروں، جواہرات، کپڑوں، زردوزی، نقاشی، خطاطی، مصوری وغیرہ سے متعلق ہوتا تھا اسے بھی بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ نیز تراجم اور ادبی تصانیف سے متعلق جو کام تھا وہ بھی پیش کیا جاتا تھا۔ عہدوں پر نئے تقررات کیے جاتے تھے۔ اسی دربار میں عہدیداروں کو ترقیاں دی جاتی تھیں اور مستحق افراد کو جاگیریں بخشی جاتی تھیں۔ ممتاز اشخاص، سفرا اور غیر ملکی حکمراں پہلے عام دربار میں حاضر ہوتے تھے اگر ضرورت محسوس ہوتی تو بعد میں انہیں مخصوص کمرے میں حاضر ہونے اور گفتگو کرنے کا موقعہ دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات جنگی قیدی، شکست یافتہ دشمن اور گرفتار باغی بھی اس دربار میں پیش کئے جاتے تھے۔

دیوان خانہ اور حرم سرا کے درمیان ایک کمرہ تھا۔ اس کمرہ میں گنے چنے قابل اعتماد اشخاص کو ملاقات کا موقعہ دیا جاتا تھا۔ بعد میں دیوان اور بخشی بھی امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے وہیں طلب کئے جانے لگے۔ بعض امرائے دربار کو بھی حاضری اور رکنے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح امور مملکت وہیں انجام دیئے جانے لگے۔ اور غسل خانہ سے یہ کمرہ متصل تھا اس وجہ سے اس کمرے کو "غسل خانہ" کہا جانے لگا۔ شاہجہاں نے اپنے عہد میں اس کمرے کا نام "دولت خانہ خاص" رکھا۔ اس کے زمانے میں یہ کمرہ اسی نام سے مشہور تھا۔

اس کے علاوہ سہ پہر اور شام کا دربار نجی منعقد ہوتا تھا۔ اس اجلاس میں بھی صبح کی طرح سلطنت کے کام انجام دیئے جاتے تھے۔ یہ اجلاس صبح کے اجلاس کے مقابلے میں زیادہ محدود نوعیت کا تھا۔ اس میں زیادہ تر وزراء اور اعلیٰ عہدیداران سلطنت ہی شریک ہوتے تھے۔ یہ اجلاس صرف ضابطے کے معمولی کاموں کے لئے ہوتا تھا۔ اسی طرح شاہی دربار منعقد کرنے سے انتظام سلطنت پر گہرا اور اچھا اثر پڑتا تھا۔ اور امور سلطنت کی انجام دہی میں کافی آسانیاں ہوتی تھیں اور کھلے دربار منعقد کرنے کے رواج نے بادشاہ اور رعایا کے درمیان مضبوط روابط اور رشتے قائم کر دیئے تھے۔

12.2.3 دیوان (وزیر مال وفینانس)

دیوان۔ وکیل کے بعد دوسرا بڑا عہدیدار دیوان یا وزیر ہوتا تھا جو محکمہ مالیات کا سربراہ ہوتا تھا۔ جس کی ذمہ داری مالی معاملوں کی نگہداشت اور خصوصاً محصولات کی وصولی ہوتی تھی۔ اس کا انتخاب حیثیت یا درجہ کا لحاظ کئے بغیر ذاتی صلاحیتوں اور خوبیوں اور بادشاہ سے وفاداری کی بناء پر عمل میں آتا تھا۔

دیوان کا محکمہ اور اس کے دفتر کا کام

- محکمہ دیوان، دیوان اعلیٰ یا وزیر کے علاوہ مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل ہوتا تھا۔
- دیوان خالصہ۔ (خالصہ اراضی کے لئے)
- دیوان تان (تنخواہوں کے لئے)

- مشرف۔(محاسب خاص)
- مستوفی(حسابات کی جانچ پڑتال کرنے والا)

ان میں سے ہر عہدیدار کے ماتحت ایک ذاتی مددگار یا سیکریٹری ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دفتر کے متعدد محافظ اور اہل کاروں پر مشتمل ایک بڑا عملہ ہوتا تھا۔ یہ تمام محکمے کے طریقہ کار سے واقف اور اس کے متعلق خاص طور سے تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ دیوان محکمہ مالیات کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے وہ ہر اس عہدیدار پر نظر رکھتا تھا جو جاگیر سے اپنی تنخواہ وصول کرتا تھا۔ محکمہ مال کے اختیارات کے علاوہ صوبوں اور عہدیداران صوبہ پر بھی اختیارات حاصل تھے۔ ان عہدیداروں میں حاکم صوبہ سے لے کر عامل اور پٹواری تک سبھی شامل تھے۔ محکمہ مالیات کا وزیر ہونے کی حیثیت سے شاہی خزانہ میں پہنچنے والی یا اسے باہر جانے والی رقم پر اس کی نظر رہتی تھی۔ اسی طرح صوبہ کے نظم ونسق کے سبھی شعبوں تک اس کی رسائی تھی۔ اس عام نگرانی کی وجہ سے حکومت کے تمام وزراء میں اسے ممتاز ترین حیثیت حاصل تھی۔

12.2.4 میر بخشی(وزیر فوج)

سلطنت مغلیہ کے میر بخشی کو محکمے کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے کئی اہم اختیارات حاصل تھے۔ اور دربار میں اسے بادشاہ کی قربت حاصل ہونے کے بناء پر اس کا وقار بڑا تھا۔ اپنے محکمہ کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس کا ہر منصب دار سے تعلق تھا۔ اور اسی وجہ سے دربار میں اس کی حاضری اس کے فرائض کا ایک اہم جزو تھی۔ وہ دربار میں تخت شاہی کے داہنے جانب کھڑا ہوتا اور اپنے محکمے سے متعلق تمام معاملات بادشاہ کے حضور پیش کرتا تھا۔ وہ ملازمت کے امیدواروں کو بھی بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ نئے سپاہیوں اور منصب داروں کے گھوڑوں کو داغ ونشانی کے بعد بادشاہ کے سامنے بخشی پیش کیا کرتا تھا۔ ایسے ہی مستقل عہدہ داروں کے سپاہیوں اور گھوڑوں کو بھی بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ نیز وہ صوبوں سے آنے والے تمام عہدیداراں دارالحکومت سے اپنے صدر مقامات کو جانے والے عہدیداران اور دوسرے ملک سے آئے ہوئے سفرا اور معزز مہمانوں کو بھی بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کا کام انجام دیتا تھا۔ میر بخشی محل کے محافظوں کا اعلیٰ عہدیدار ہونے کی حیثیت سے محافظین کے نام بادشاہ کے سامنے انعامات کے لئے پیش کیا کرتا تھا۔

میر بخشی غسل خانے(خلوت گاہ) میں بھی بادشاہ کے ساتھ رہتا۔ یہاں بھی وہ بادشاہ کے دائیں جانب کھڑا ہوتا۔ اور معمول کے مطابق عہدیداروں کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار اور محکمہ فوج کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے محافظین کی فہرست میر بخشی کے پاس رہتی تھی۔ مختلف صوبہ جات سے وقائع نویسوں کے ارسال کردہ خبر ناموں کو وصول کرنے اور بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری بھی ہوتی تھی۔ اپنے محکمہ کا سربراہ اور بادشاہ ومنصب داروں کے درمیان واسطے کا خاص ذریعہ ہونے کی وجہ سے میر بخشی دوروں اور سیر وشکار میں ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور شاہی خیموں کی نگہداشت اور تمام منصب داروں کا ان کے مرتبے کے لحاظ سے جگہ متعین کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل تھا۔ اسی کے ذریعہ دورے پر جانے والے عہدیدار اور منصب دار بادشاہ کی خدمت میں شرف حاضری کی اجازت حاصل کرتے تھے۔ نیز فوجوں کے آرام اور آمد ورفت وغیرہ کا انتظام اسی کے سپرد تھا۔ میر بخشی یا اس کے رفقائے کار میدان جنگ میں بھی مختلف حیثیتوں سے حاضر رہتے تھے۔

فوج کے ہر شعبے کا ایک علاحدہ بخشی ہوا کرتا تھا۔ اکثر وبیشتر وقائع نویسی کے فرائض وہی انجام دیتا تھا۔ بادشاہ کے یہاں پوری پابندی سے اطلاعات بھیجی جاتی تھی۔ قرضے کی تقسیم، پیشگی رقم دینا اور میدان جنگ میں تنخواہیں تقسیم کرنا، میدان جنگ میں سرگرم فوجوں کے بخشی کا کام تھا۔ میر بخشی اور اس کے شریک کار خود میدان جنگ میں جاتے اور دوسرے عہدیداروں کی طرح جنگ بھی کرتے تھے۔

میر بخشی کے محکمہ میں درج ذیل کاغذات محفوظ رکھا جاتے تھے:

- مرکز اور صوبوں میں متعین منصب داروں کی فہرست
- منصب داروں کے ذمہ واجب الادا رقوم کا حساب وکتاب
- تنخواہوں کی ادائیگی کے گوشوارے
- ایسے ضوابط جن کا تعلق تنخواہوں، جاگیروں اور جاگیروں کے بعد نقد تنخواہوں میں تبدیل کئے جانے سے ہوتا تھا۔
- وہ فہرستیں جن میں منصب داروں کے درجے، ان کی تنخواہیں اور تنخواہ وصول کرنے کے طریقے درج ہوتے تھے۔
- ایسے کاغذات جن میں منصب داروں اور سواروں کا حلیہ درج ہوتا تھا۔
- وہ کاغذات جو گھوڑوں کو داغنے اور ان کے معائنے سے متعلق تھے۔
- صوبوں اور مختلف فوجوں میں منصب داروں کی حاضری کے کاغذات
- محافظین محل کی حاضری کے کاغذات
- فوجوں کی فہرستیں اور دشمنوں سے مقابلے میں ان کی ترتیب

اس طرح سے اختیارات، حیثیت اور اثر ورسوخ کے لحاظ سے میر بخشی کا دائرہ کار وسیع تھا۔ میر بخشی محکمہ فوج کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے منصب داروں کا خاص نمائندہ ہوتا تھا لیکن اس کی وجہ سے فوج پر اسے کوئی خاص اثر ورسوخ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہ تو سلطنت کے فوجوں کا سپہ سالار ہوتا تھا اور نہ ہی اپنے عہدے کی وجہ سے اسے کسی مہم کی قیادت کرنے کا حق حاصل تھا۔ یہ کلی طور پر بادشاہ کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ جس طرح چاہے مہم کی نوعیت، فوج کی تربیت اور منتخب کردہ سپہ سالاروں کو دیکھتے ہوئے مناسب انتظامات کرے۔ اکثر مہم پر جانے کے لئے علاحدہ بخشی کا تقرر ہوتا تھا جنہیں عسکر یا بخشی لشکر کہا جاتا تھا۔ اور ان کا انتخاب نہ تو میر بخشی کرتا تھا اور نہ ہی اس کا محکمہ بخشی سے ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ وہ صرف بخشی کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔

12.2.5 میر ساماں

کارخانہ جات اور ذخائر سامان کی نگرانی کے لئے ایک مستقل محکمہ قائم تھا جس کا سربراہ میر سامان کہلاتا تھا۔ دوسرے عہدیدار حسب ذیل تھے۔

دیوان بیوتات: یہ دوسرا اعلی عہدیدار ہوتا تھا جو خاص طور سے محکمے کے مالی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

مشرف کل وجز: (چھوٹی بڑی تمام چیزوں کا محاسب) یہ محکمے کا محاسب ہوتا تھا۔ محکمے کے ہر شعبے میں اس کا ایک مشرف ہوتا تھا۔

داروغہ: ہر شعبے یا کارخانے میں ایک داروغہ مقرر ہوتا تھا۔ جو براہ راست اپنے شعبے کے کاریگروں سے کام لیتا کاریگروں کے روز مرہ کے کام ان کے درمیان تقسیم کرتا اور ان کے پاس روزانہ جو سامان باقی بچ جاتا اسے اپنی تحویل میں لے لیتا تھا۔

تحویلدار: کارخانے میں ایک تحویلدار ہوتا تھا جس کی تحویل میں نقد رقم اور سامان رہتا تھا جس کی اس شعبہ میں ضرورت پڑتی تھی۔

مستوفی: کارخانوں کے حسابات کی جانچ پڑتال کرنا مستوفی کے حوالے تھا۔

داروغہ کچہری: دفتری عملے کی نگرانی اس عہدیدار کے سپرد تھی۔

ناظر: محکمے کے دیوان کے بعد دوسرا بڑا عہدیدار یہی ہوتا تھا۔ ناظر کا کام محکمہ دیوان کے کاموں پر نظر ثانی کرکے اس پر مہر لگانا تھا۔

میر سامان کی ذمہ داریاں

میر سامان محکمہ کے سربراہ کی حیثیت سے انتظامی امور انجام دیا کرتا تھا۔ نیز ہر شعبے کے اندرونی طریقہ کار کا نگراں بھی تھا۔ میر ساماں داروغہ، مشرف اور تحویلدار کی تقرری وبرخواستگی کے تعلق سے ابتدائی کاروائی کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ اور ان کے خلاف تادیبی کاروائی کرنے کا بھی حق حاصل تھا۔ وہ محکمے کے تمام کام انجام دیتا تھا۔ اور صوبوں سے کارخانے کے نام آنے والی تمام فرمائشوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ تمام اہم امور اور تجارتی معاملات کی جانب بادشاہ کی توجہ دلاتا تھا۔

12.2.6 صدر:(محکمہ عطیات اور امور مذہبی کا سربراہ)

مرکزی حکومت کے دوسرے محکموں کی طرح صدر کے ماتحت بھی ایک مستقل عملہ ہوتا تھا۔ جو تمام امور صدر کے احکام کے مطابق انجام دیتا تھا۔ محکمے سے مدد معاش سے متعلق جو حکم یا صداقت نامہ جاری ہوتا تھا اس پر صدر کی مہر ضروری ہوتی تھی۔ اراضی عطا کرنے اور نقد بھتے اور وظیفے دینے میں بھی صدر کا اہم رول تھا۔ وہ تخت کے دائیں جانب کھڑا ہوتا تھا۔ شاہجہاں کے دور میں اسے اس بات کا بھی موقعہ فراہم کیا گیا تھا کہ وہ "غسل خانے" میں ایسے درخواست گذاروں کو پیش کرے جنہیں وقت کی قلت کی وجہ سے دربار میں نہیں پیش کیا جاسکتا تھا۔ یا جن کی طرف وہ بادشاہ کو خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا تھا۔

صدر کی ایک دوسری ذمہ داری یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ غریبوں اور مفلسوں کی خبر گیری کرے اور اپنی تحویل میں رکھی ہوئی اس مد کی رقم سے ان کی ضروریات پوری کرے۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ خاص خاص مواقع یا قحط کے زمانہ میں غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اور ٹھنڈی کے موسم میں پہننے کے لئے گرم کپڑے تقسیم کئے جاتے تھے۔ صوبہ جات میں بھی صدروں کا تقرر ہوتا تھا۔ صوبائی صدر کا تقرر

محکمے کی تنظیم کے لئے کیا جاتا تھا۔

12.2.7 نظام عدلیہ

عدلیہ کسی بھی ملک یا علاقے کے انتظامی ڈھانچے کی بہت ہی اہم کڑی ہوتی ہے کیوں کہ سماجی اور معاشرتی انصاف کا دار و مدار اسی نظام پر ہوتا ہے۔۔ ہندوستانی تاریخ میں مغل عہد اس اعتبار سے ممتاز دور شمار کیا جاتا ہے کہ اس عہد میں نہ صرف عدالتی نظام کو مستحکم بنایا گیا تھا بلکہ اس کی تنظیم اس طرح سے کی گئی تھی کہ ہر حالت میں عوام الناس کو انصاف مل سکے۔

بادشاہ ایک قاضی القضاۃ یعنی صدر کا تقرر کرتا جسے ایک جج کے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ صدر کو ماتحت قاضیوں کی تقرری کا اختیار حاصل تھا۔ لیکن ایسے تمام تقررات میں بادشاہ کی منظوری اور مرضی کا شامل ہونا ضروری تھا۔ ایک شہر میں ایک سے زائد قاضی اپنے اپنے فرائض کی تصریح کے ساتھ مقرر ہوسکتے تھے۔ قاضی کے ساتھ میر عدل کا تقرر بھی عمل میں آتا تھا۔ اور اس کی رائے کو فوقیت دی جاتی تھی۔ بادشاہ فوج کے لئے قاضی عسکر بھی مقرر کرتا تھا۔ اور اس کے ساتھ بھی میر عدل ہوتا تھا۔ صرف مرکز' صوبائی صدر مقامات اور دوسرے بڑے شہروں ہی میں قاضی نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے علاقوں' قصبوں اور پرگنوں میں بھی قاضی مقرر کئے جاتے تھے۔ اوزان' پیمائشوں اور اشیائے خوردنی کی جانچ پڑتال' انسداد گداگری' معالجوں کی اسناد کی چھان بین' غلاموں کی حالت کی نگرانی' لوگوں کو جوے بازی اور شراب نوشی سے روکنے اور صوم وصلوٰۃ کا پابند بنانے کے لئے مرکز اور صوبوں میں محتسب کا تقرر عمل میں آتا تھا۔ غیر مسلم فریقین کے جو مقدمات وراثت اور شادی بیاہ وغیرہ سے متعلق ہوتے تھے وہ ان کے مذہبی رہنماؤں کے سامنے پیش ہوتے اور ان کے قانون کے مطابق طے پاتے۔ سرکاری عدالتوں کے علاوہ قدیم دیہی نظام اور ادارے یعنی پنچایت وغیرہ حسب دستور قائم رہے۔

12.2.8 عدلیہ اور اس کی تنظیم

مغل عہد حکومت میں عدالتی تنظیم کا ڈھانچہ تقریباً وہی رہا جو اس سے پہلے شمالی ہندوستان میں دہلی سلطنت کے زمانے میں قائم ہوچکا تھا۔ زیادہ تر ادارے بھی وہی رہے، جن کا قیام عہد سلطنت میں ہوچکا تھا۔ مثال کے طور پر اس عہد کے عدالتی نظام کا اصل مصدر سلطان تھا۔ حکومت کا سربراہ اعلیٰ ہونے کی وجہ سے وہ عدالتی نظام کا بھی سربراہ اعلیٰ تھا اور کسی بھی طرح کی حکومتی غلطی کی ذمے داری بھی اسی کی تھی۔ مغل دور کے عدالتی نظام کا دوسرا اہم مرکز قاضی تھا۔ اس عہد کے عدالتی نظام میں قاضی کا کردار بہت اہم تھا۔ وہ مقدمات کی سماعت کرتا اور فیصلے سناتا۔ مغل دور حکومت کے عدالتی نظام میں عدلیہ کے عہدے داران اور ذمے داران بھی تقریباً وہی تھے، جو عہد سلطنت میں تھے، لیکن حکمراں، وقت کے حالات اور نوعیت کے اعتبار سے ان میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ خاص طور سے اکبر کے عہد حکومت میں مغل دور کے عدالتی نظام میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عدالتی نظام میں سب سے بڑی تبدیلی جو اس عہد میں کی گئی وہ یہ تھی کہ عہد سلطنت میں صدر الصدور کے اختیارات بہت تھے۔ قاضیوں کی تقرری اور ان کے لیے مدد معاش کے طور پر اراضی کے عطیات دینا صدر کے ہاتھوں میں تھا، لیکن اکبر نے صدر کے اختیارات کو کم کیا۔ عدلیہ پر سے صدر کا کنٹرول ہٹا کر قاضی القضاۃ کے سپرد کیا گیا اور مدد معاش کی اراضی عطا کرنے میں بھی صدر کو 'دیوان' سے مشورے کا پابند بنایا گیا۔

بادشاہ:عدالتی تنظیم کا سربراہ اعلیٰ

مغل ہندوستان میں انصاف کی فراہمی کا سربراہ اعلیٰ بادشاہ تھا۔ گرچہ فقہا کا اس بات پر اختلاف ہے کہ بغیر قاضی کے بادشاہ کو انصاف کے بندوبست کا حق ہے، ساتھ ہی وہ اس بات پر متفق ہیں کہ ایک بادشاہ ذاتی طور پر انصاف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ لیکن جہاں تک قانون کے مطابق انصاف کے بندوبست اور انتظام و انصرام کی بات ہے تو اس کے لیے قانون اور اس سے متعلق علوم کی جانکاری ضروری ہے۔ اس کے لیے بادشاہ کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اپنے عہد کے سب سے قابل عالم کا اس عہدے کے لیے تقرر کرے۔ مغل عہد حکومت میں بادشاہ اس عہدے کے لیے ایک ایسے شخص کا تقرر کرتا جس سے وہ بذات خود اچھی طرح واقف ہوتا اور بادشاہ کی نظر میں وہ شخص اس عہدے کے لیے سب سے مناسب امیدوار ہوتا۔ اگر بادشاہ اس شخص سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوتا تو اہل علم کے ایک مخصوص گروہ کے ذریعے اس کی علمی صلاحیتوں کا امتحان لیا جاتا اور اس کے پڑوسی اس کے اخلاق و کردار کی گواہی دیتے۔ جس طرح سے بادشاہ کو قاضی کی تعیناتی کا حق تھا، اسی طرح اسے یہ حق بھی تھا کہ وہ اسے عہدے سے معزول کر دے۔

اسی طرح سے بادشاہ فوج کے لیے ایک الگ قاضی کا تقرر کرتا، جسے 'قاضی عساکر' کا نام دیا جاتا۔ اسی طرح سے بادشاہ کو یہ حق بھی تھا کہ وہ ایک شہر میں ایک سے زیادہ قاضیوں کا تقرر کرے لیکن ایسے موقعوں پر ان کے کام اور علاقوں کی توضیح و تشریح ضروری تھی۔ بادشاہ سے یہ امید کی جاتی تھی کہ اس کے پاس قانون کی تھوڑی بہت جانکاری ضرور ہونی چاہیے۔ کیوں کہ شخصی بادشاہت ہونے کی وجہ سے اس کا ایک جملہ کسی ایک شخص یا گروہ کو انصاف دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ جان لے بھی سکتا تھا اور زندگی عطا بھی کر سکتا تھا۔ اس کا فیصلہ حکومت کے لیے بہ یک وقت سود مند اور نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ اس کے فیصلوں کے تجزیے اور بدلنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اسے کسی بھی طرح کے فرامین جاری کرنے کا مکمل اختیار حاصل تھا۔

قاضی / قاضی القضاۃ

مغل عہد حکومت کی عدالتی تنظیم میں انصاف کے بندوبست کا دوسرا اہم مصدر 'قاضی' تھا۔ مغل دور کے عدالتی نظام میں قاضی کا تقرر بادشاہ کے ذریعے عمل میں آتا۔ وہ عدالت میں مقدمات کی سماعت کرتا اور ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کی اپیلیں بھی سنتا تھا۔ مغل عہد حکومت میں قاضی کی تقرری کے لیے درج ذیل شرائط ضروری تھیں۔ جن میں بالغ مرد ہونا، آزاد ہنا، عاقل اور ذی شعور ہونا، مسلمان ہونا، ایمان دار ہونا، اچھی سماعت اور بصارت کا ہونا شامل تھا۔

مغل عہد حکومت میں قاضی کے اختیارات اور اس کا دائرہ عمل بہت وسیع تھا، ساتھ ہی اس کی ذمے داریاں بھی بہت تھیں۔ قاضی کے عدالتی فیصلوں پر عمل آوری ضروری تھی۔ اصولی طور پر قاضی کے عدالتی اختیارات میں مداخلت کا حق بادشاہ کو بھی نہیں تھا۔ اگر قاضی کے ذریعے قانون کے مطابق کسی مقدمے کا فیصلہ سنایا جا چکا ہے اور بادشاہ دوبارہ اس مقدمے کو کھولنے کا حکم جاری کرے تو بادشاہ کا یہ حکم غیر قانونی شمار کیا جاتا۔ اپنی تقرری کے بعد ایک قاضی اپنے امین کے ذریعے تمام سابقہ دستاویزات پر قبضہ پاتا تھا، ساتھ ہی وہ سابق قاضی

کے عہد سے متعلق جائیداد، یتیموں، شادی بیاہ اور وراثت کی تمام فائلوں کی دوبارہ دیکھ ریکھ کر سکتا تھا۔ وہ مقدمات کی دوبارہ تحقیق کر سکتا تھا اور قانون کے مطابق فیصلے کا حق رکھتا تھا۔ ایک قاضی کے دفتر کے درج ذیل کام شمار کیے جاسکتے ہیں:

(1) مقدمات کی تحقیقات کرنا اور فیصلے سنانا (2) عدالتی فیصلوں کی تنفیذ (3) ان لوگوں کی جائیداد کے لیے نگراں متعین کرنا جو خود اس کی نگرانی نہیں کر سکتے، جیسے کہ نابالغ اور مجنون وغیرہ (4) اوقاف کا انتظام وانصرام اور ان کی نگرانی (5) وصیت ناموں کی تنفیذ (6) مطلقہ کی دوبارہ شادی کے اخراجات کا انتظام (7) مذہبی قوانین کے ذریعہ متعینہ سزاؤں کی تنفیذ (8) گلیوں، سڑکوں اور عمارتوں کی نگرانی کہ کوئی آدمی گلیوں اور سڑکوں پر غیر منظور شدہ عمارتوں کے ذریعہ قبضہ نہ کرے۔ (9) قانون اور عدالتی عہدے داروں کی نگرانی، جن کے عزل ونصب کا اختیار اسے حاصل ہے۔ (10) ان جگہوں پر صدقہ وصول کرنے والوں کی تعیناتی جہاں اس کی ضرورت ہو۔

قاضی عسکر

مغل دور حکومت میں فوج کے لیے ایک علیحدہ قاضی متعین کیا جاتا تھا، جسے قاضی عسکری کہا جاتا۔ وہ فوج کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا اور اس کا دائرہ کار بھی متعینہ حدود تک محدود ہوتا۔ اس مقدمے میں جس کا ایک فریق فوج سے متعلق ہوتا اور دوسرا عوام میں سے، ساتھ ہی دوسرا فریق یہ چاہتا کہ اس کا مقدمہ شہری قاضی کی عدالت میں چلے تو ایسے معاملات میں مقدمہ سننے کا خصوصی حق ہونے کے باوجود بھی قاضی عسکر مداخلت نہیں کرتا۔ اسی طرح سے اگر دونوں فریق فوج سے متعلق ہوتے اور وہ قاضی عسکر کے دائرہ کار میں آنے کے باوجود بھی یہ چاہتے کہ ان کا مقدمہ شہر کے قاضی کے ذریعہ فیصل کیا جائے تو وہ ایسا کر سکتے تھے اور شہر کا قاضی ان کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔

مفتی

مغل عہد حکومت کے عدالتی نظام میں مفتی کا عہدہ بھی کافی اہم شمار کیا جاتا تھا۔ مذہبی علوم کے ماہرین خاص طور پر علم فقہ اور مذہبی قانون میں دست رس رکھنے والے اشخاص مفتی شمار کیے جاتے تھے۔ عدالتوں میں جہاں پر قانون مکمل طور پر واضح نہیں ہوتا تھا وہاں پر مذہبی اعتبار سے ایسے مقدمات و معاملات کو فیصل کرنے کے لیے اس طرح کے مذہبی قانون کے ماہرین کی مدد لی جاتی تھی۔ بشیر احمد کے مطابق مغل عدالتوں میں مفتی شاہی سند کے ساتھ تقرر پاتے تھے اور کبھی کبھی پرگنہ کے مفتیوں کو محتسب کے عہدے کا اضافی چارج بھی دیا جاتا تھا۔ وہ ایک شارح قانون کی حیثیت میں عدالتوں سے منسلک ہوتے تھے، انہیں فیصلہ دینے کا اختیار نہیں تھا۔ مفتی کا کام قاضیوں کے سامنے مقدمے سے متعلق مثالوں اور نمونوں کو پیش کرنا تھا اور قاضی کو اس بات کا اختیار تھا کہ وہ فیصلہ سنائے۔ لیکن کسی بھی مسئلے پر قانون اور شریعت کے مطابق دیے گئے مفتی کے مشوروں کو قاضی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور رایوں کے اختلاف کے نتیجے میں اعلیٰ عدالتوں کی رائے ضروری شمار کی جاتی تھی۔

میر عدل

عمومی طور پر یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ عدالتی نظام کا وہ ڈھانچہ جو عہد خلافت میں تیار ہوا تھا، عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں دور سلطنت میں رائج کیا گیا اور مغل عہد میں بھی اسی کو برقرار رکھا گیا۔ لیکن اس عدالتی نظام کے مطالعے کے بعد چند قسم کے عہدے جو ہمیں عہد خلافت میں نہیں ملتے، ان میں سے ایک عہدہ میر عدل کا بھی ہے۔ عدالتی نظام میں یہ عہدہ، سب سے پہلے سکندر لودھی کے عہد حکومت میں متعارف ہوا۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں بھی قاضی کے ساتھ ساتھ میر عدل کا عہدہ برقرار رہا۔ ابوالفضل کے مطابق مغل دور حکومت میں دو عہدے دار مقرر کیے جاتے تھے۔ تحقیقات کرنے والے عہدے دار کو قاضی جب کہ نتائج اکٹھا کرنے والے کو میر عدل کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر بنی پرساد کے مطابق مغل عہد حکومت میں ہر قصبہ یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے قصبے میں بھی قاضی اور میر عدل کی تعیناتی ہوتی تھی اور یہ دونوں مل کر ایک عدالتی بنچ کی تشکیل دیتے تھے اور کبھی کبھی یہ دونوں عہدے ایک ہی شخص کے پاس ہوتے تھے۔ ڈاکٹر بی پی سکسینہ کے بقول شاہ جہاں کے عہد میں قاضی اور میر عدل کے عہدے بالعموم ایک ہی شخص کے پاس ہوتے۔

بشیر احمد کا قول ہے کہ قاضی کی بہ نسبت میر عدل کے پاس عدالتی اختیارات نہیں ہوتے تھے۔ عدالت میں اس کا یہ کام مفتی کے مشابہ تھا۔ عدالت میں مفتی کسی مسئلے پر قانون کے مطابق اپنی رائے دیتا اور میر عدل حقائق پر مبنی دستاویز تیار کرتا اور پھر قاضی کے ذریعہ مقدمے کا فیصلہ سنایا جاتا۔ حقیقت میں میر عدل عدالت کا سب سے اعلیٰ کلرک تھا۔ میر عدل کی یہ پوزیشن اورنگ زیب کے عہد میں بھی برقرار رہی اور اس عہد میں بھی اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ میر عدل کو الگ سے عدالتی اختیارات حاصل تھے۔ اسی طرح سے اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں کہ میر عدل کا عہدہ تمام ریاستوں میں نہیں تھا، جس کی واضح مثالیں گجرات اور بنگال کی عدالتیں ہیں۔

محتسب

مسلم تاریخ کے انتظامی امور میں محتسب کا عہدہ دور اول یعنی عہد خلافت سے ہی ملتا ہے۔ ابتدائی عہد میں محتسب کی ذمے داری عوام الناس کے اخلاق و کردار کی نگرانی کے ساتھ ساتھ تجارتی بد دیانتی کی روک تھام تھی۔ ساتھ ہی اس طرح کے مجرموں کی شناخت کے ساتھ انہیں سزا دلوانا بھی اس کی ذمے داری تھی۔ محتسب کا عہدہ دھیرے دھیرے مسلم حکومتوں کے نظم و نسق کا ایک اہم جزء بن گیا اور مسلم تاریخ کے ہر دور، حکومت اور علاقے میں یہ عہدہ برقرار رہا۔

محتسب کی ذمے داریوں میں بہت سی باتیں شامل تھیں، جن میں مضر رساں چیزوں پر روک، عوامی راستوں اور سڑکوں پر سے ناجائز قبضوں اور رکاوٹوں کو دور کرنا، دوسروں کی ملکیت والی زمینوں میں میت کو دفنانے سے روکنا، غلاموں اور جانوروں پر ظالمانہ اور غیر فطری سلوک سے ممانعت، مسجدوں میں نماز کی ادائیگی پر ابھارنا، رمضان کے مہینے میں عوامی مقامات پر کھانے پینے سے روکنا، مطلقہ اور بیوہ عورتوں پر عدت کے ایام کی تنفیذ، غیر شادی شدہ لڑکیوں اور عورتوں کی شادی پر ابھارنا، کسی بھی شخص کو شراب نوشی کی حالت میں پائے جانے پر سزا دینا وغیرہ شمار کی جاسکتی ہیں۔ بازار کے نگران اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے محتسب اپنے نائبین کے ساتھ روزانہ بازار میں گھومتے۔

اشیا اور ان کی قیمتوں کا معائنہ کرتے، وزن کرنے اور ناپنے والے آلات کی جانچ پڑتال کرتے۔ بہر حال، جہاں تک سزا دینے سے متعلق محتسب کے اختیارات کی بات ہے تو وہ محدود تھیں۔ معاملے میں اگر کسی شک کی گنجائش نہیں ہوتی تو محتسب کو سزا دینے کا اختیار تھا اور اگر کسی معاملے میں جانچ پڑتال اور شہادتوں کی ضرورت پڑتی تو اسے عدالت میں قاضی کے پاس منتقل کر دیا جاتا۔

مذکورہ بالا تمام ذمے داریوں کے ساتھ محتسب کا عہدہ مغل عہد حکومت میں بھی موجود تھا۔ محتسب کا یہ عہدہ مغل عہد حکومت میں دارالسلطنت کے ساتھ ساتھ صوبائی مراکز اور ذیلی صوبائی مراکز میں بھی موجود تھا۔ مغل عہد حکومت میں محتسب کو سزا دینے کا اختیار نہیں تھا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں محتسب کی ذمے داریوں میں ارتداد، مذمت دین، خلاف شرع کام کرنے اور شریعت پر عمل نہ کرنے کے معاملات کی نگرانی اور اس کی اطلاع دینا بھی شامل تھا۔ اس طرح سے اس عہد میں یہ عہدہ بہت اہم ہو گیا تھا۔ عمومی طور پر مغل عہد حکومت میں محتسب کو شرعی قانون کا مستغیث شمار کیا جاسکتا ہے، جو حکومت کی طرف سے استغاثہ دائر کرتا تھا۔

وکیل شرعی یا وکیل سرکار

مغل دور حکومت کے عدالتی نظام میں فریقین کی طرف سے قاضی کے سامنے عدالت میں مقدمے کو پیش کرنے اور اس پر مباحثے کے لیے وکیلوں کی موجودگی بھی ملتی ہے۔ بہت سے مؤرخین نے اس عہد میں اس پیشے کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بشیر احمد کے مطابق مورلینڈ کا یہ بیان کہ ''بلاشبہ مغل عہد حکومت میں مسلم اور ہندو قوانین کے عالم موجود تھے، لیکن عدالتوں میں فریقین کی طرف سے مقدموں کو پیش کرنے کے لیے وکلا نہیں ہوتے تھے۔'' سچائی پر مبنی نہیں ہے۔ انہوں نے نہ صرف وکیلوں کی موجودگی کے واضح ثبوت فراہم کیے ہیں بلکہ نو ایسے مقدمات کا ذکر بھی کیا ہے جس میں وکیلوں کی طرف سے مباحثے بھی کیے گئے۔

شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں حکومت کی طرف سے مستقل طور پر وکیل متعین کیے جاتے تھے تاکہ وہ حکومت کے خلاف عوام الناس کا دفاع کریں اور غریب مدعین کو بلا معاوضہ قانونی مشورے دیں۔ حکومت کی طرف سے تمام سرکاروں میں مستقل طور پر وکیلوں کا تقرر ہوتا تھا اور وہ 'وکیل سرکار' یا 'وکیل شرعی' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان وکیلوں کو حکومت کی طرف سے معاوضے کی شکل میں ایک روپیہ روزانہ کے اعتبار سے ادا کیا جاتا، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ وکیل اپنے موکلوں سے کتنی فیس لیتے تھے؟ بہر حال یہ سچائی ہے کہ یہ وکلاء اپنے موکلوں سے کچھ نہ کچھ فیس ضرور لیتے تھے، جس کی شہادت اورنگ زیب کے اس فرمان سے بھی ملتی ہے، جس میں اس نے سرکاری وکیلوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ مفلسوں اور غریبوں کو بلا معاوضہ مشورے دیا کریں۔ وکیلوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ سبھی مقدمات کے لیے عدالت میں اپنا وکالت نامہ داخل کریں اور موکل کو ہمیشہ اس بات کا اختیار تھا کہ وہ مقدمے کے کسی بھی مرحلے میں اپنے وکیل کے وکالت نامے کو کالعدم کر کے اپنا وکیل تبدیل کر سکتا تھا۔ گرچہ وکیل اپنے موکل کی طرف سے اعتراف نامے کی شکل میں مچلکہ داخل کر سکتا تھا، لیکن اس طرح کا اعتراف نامہ قابل قبول نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی اس کے موکل کے لیے یہ لازمی تھا۔

12.2.9 عدلیہ کی قسمیں

مغل عہد حکومت میں عدالتوں کا قیام اور ان کی تنظیم سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کے مطابق تھی۔ اس عہد کا انتظامی ڈھانچہ

گاؤں، پرگنہ، سرکار، صوبہ اور دارالسلطنت کے خانوں میں منقسم تھا۔ مغل عہد حکومت میں ان تمام سطحوں پر عدالتیں قائم تھیں، جہاں پر عوام الناس کے لیے انصاف کے حصول کا بندوبست تھا۔ مغل دور حکومت کے انتظامی ڈھانچے میں تکنیکی طور پر گاؤں کو سب سے چھوٹی اکائی کا درجہ حاصل تھا۔ گاؤں کی سطح پر حکومت کی طرف سے کسی قسم کا عدالتی بندوبست نہیں تھا، بلکہ گاؤں کی قدیم روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پنچایتی نظام کو جاری رکھا گیا تھا۔ دیہی عوام اپنے معمول تنازعات کو انہیں گرام پنچایتوں میں سلجھالیا کرتے تھے اور انہیں اپنے ان معمولی جھگڑوں اور تنازعات کے لیے عدالتوں کا رخ نہیں کرنا پڑتا تھا۔

پرگنہ عدالت

مغل دور حکومت میں ملک کے ہر پرگنہ میں ایک عدالت قائم تھی، جس کا بندوبست اور انتظام وانصرام ایک قاضی کے ذریعے چلایا جاتا اور اسی قاضی کی ذمے داری ہوتی کہ وہ اپنے پرگنہ کے اندر انصاف کا بندوبست کرے۔ پرگنہ قاضی کی تقرری شاہی سند کے ذریعے ہوتی اور اس کی ذمے داری ہوتی کہ اپنے پرگنہ کے اندر آنے والے تمام گاؤں کے لوگوں کو انصاف دلائے۔ مغل عہد کی عدالتی تنظیم میں پرگنہ عدالت کو گرچہ سب سے نچلی عدالت کا مقام حاصل تھا، لیکن ضرورت کے مطابق عہدے داران کی تقرری اور وسائل کی فراہمی اس کے عدالتی وقار کو قائم کرنے کے لیے کافی تھی اور اس نچلی عدالت کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ اپنے فیصلوں کا نفاذ کرسکے۔

ان پرگنہ عدالتوں سے قاضی کے علاوہ مفتی، محتسب اور داروغہ عدالت جیسے افسران منسلک ہوتے۔ کچھ پرگنہ عداتوں میں مفتی اور محتسب کے عہدے پر ایک ہی شخص کی تقرری ہوتی، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مفتی اور محتسب کے دفاتر آپس میں ضم کردیے گئے ہیں، بلکہ ایک معینہ مدت کے لیے مفتی کو محتسب کا بھی اضافی چارج دے دیا جاتا تھا۔

ضلعی (سرکار کی) عدالتیں

مغل انتظامی امور میں سرکار صوبوں کی ایک ذیلی تقسیم تھی، جس کے اندر متعدد پرگنے شامل ہوتے تھے۔ سرکار کی حکومت کا کام نہ صرف پرگنہ کے کاموں کی نگرانی رکھنا تھا بلکہ ان تمام امور اور مسائل کی بھی دیکھ ریکھ تھی جو پرگنہ کے دائرہ کار سے باہر تھے۔ انصاف کے بندوبست کے لیے سرکار کے اندر مختلف قسم کی عدالتیں قائم تھیں۔ دیوانی اور فوج داری عدالتیں قاضی سرکار کے ماتحت تھیں، جہاں پر نہ صرف دیوانی، فوجداری اور شرعی امور سے متعلق مقدمات سنے جاتے تھے بلکہ پرگنہ عدالتوں کی اپیلیں بھی درج کی جاتی تھیں۔ سرکار کا صدر اعلیٰ بھی، جو عام طور پر فوجدار ہوا کرتا تھا، عدالتی کارروائی انجام دینے کے اختیارات رکھتا تھا۔ وہ اپنی عدالت میں شورش وہنگامہ اور امن و سلامتی سے متعلق مقدمات کی سنوائی کرتا اور فیصلے سناتا۔ ڈاکٹر پی سرن کے مطابق ”مغل عہد حکومت میں فوج دار کے پاس کسی بھی طرح کا عدالتی اختیار نہیں تھا۔“ ان کا مزید کہنا ہے کہ ”قاضی اور کوتوال مل کر تمام طرح کے عدالتی مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ مجسٹریٹ، پولیس کے افسر اعلیٰ اور میونسپل افسران تمام عہدوں کو کوتوال کی صورت میں ایک جگہ جمع کردیا گیا تھا۔ ایک مجسٹریٹ کی صورت میں وہ فوج داری سے متعلق سرکار کے تمام مقدمات کی سماعت کرتا اور پولیس کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے اس کی عمل داری کو صرف سرکار کی دارالحکومت

سے متعلق قصوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ مقدمات کے بارے میں کوئی واضح تقسیم نہیں تھی کہ کون سے معاملات قاضی کے پاس جائیں گے اور کون سے کوتوال کے پاس؟ لیکن اس عہد کے چند مشہور مقدمات کو دیکھنے سے یہ فرق کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ فوج داری سے متعلق عام معاملات کوتوال کے پاس سنے جاتے تھے اور مذہب سے متعلق فوجداری مقدمات جیسے کہ شادی، طلاق اور وراثت ساتھ ہی تمام طرح کے دیوانی مقدمات قاضی کے یہاں طے پاتے تھے۔"

صوبائی عدالتیں

صوبہ مغل دور حکومت میں انتظامی تقسیم کا سب سے بڑا حصہ تھا، جس میں متعدد اضلاع (سرکاریں) شامل ہوتے تھے۔ صوبائی سطح پر ہر صوبے کی ذمے داری صوبے دار (گورنر) کی ہوتی تھی، جو اپنے ماتحتوں کے ساتھ نہ صرف صوبے کا نظم ونسق چلاتا تھا بلکہ اپنے علاقے کی نگرانی و دیکھ وبھال بھی کرتا تھا۔ انصاف کے نظم وانصرام کے لیے صوبائی سطح پر ہمیں تین طرح کی قانونی عدالتوں کا ذکر ملتا ہے۔ (1) ناظم صوبہ کی عدالت (2) قاضی صوبہ کی عدالت (3) دیوان صوبہ کی عدالت

(i) ناظم صوبہ کی عدالت

صوبائی گورنر کی ذمے داریوں میں سے ایک اہم ذمے داری یہ بھی تھی کہ وہ اپنے دائرہ کار یعنی صوبے میں انصاف کے قیام کا مکمل نظم ونسق کرے۔ جہاں تک صوبے میں انصاف کے قیام اور انتظام و انصرام کا تعلق ہے تو عام طور سے زیادہ تر صوبے دار اس میں اپنی عزیمت کا ثبوت دیتے تھے، وہ اپنے سستی و کاہلی کے ذریعے عوام کو ایذا میں مبتلا نہیں کرتے تھے۔ مقدمات کے حل کے لیے وہ قسموں اور گواہیوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے بلکہ بذات خود سچائی کی تحقیق کرتے تھے اور فریقین سے رحم دلی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ناظم صوبہ کی عدالت میں نئے مقدمات اور دوسری عدالتوں کی اپیلیں دونوں دائر کی جاسکتی تھیں۔ صوبے میں بادشاہ کا نمائندہ ہونے کی بنا پر وہ اپنے صوبے میں موجود تمام عدالتوں کی اپیلیں سنتا تھا یہاں تک کہ قاضی صوبہ کی عدالت کی اپیل بھی دائر ہوتی تھی۔ نئے مقدمے میں ناظم صوبہ یک رکنی جج کی حیثیت سے فیصلہ سناتا تھا اور اس کے فیصلے کی اپیل مرکزی عدالت میں کی جاسکتی تھی۔ جب وہ کسی دوسرے عدالت کے فیصلے کی اپیل سنتا تھا تو اس وقت عدالت دو رکنی ججوں پر مشتمل ہوتی تھی اور اس عدالت کا دوسرا ممبر قاضی صوبہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ زمینی مال گزاری کے مقدمات بھی اس کی عدالت میں دائر ہوسکتے تھے جب کہ عمومی طور پر یہ مقدمہ دیوان صوبہ کی عدالت کا تھا۔ ناظم صوبہ کی عدالت کے دو اہم افسر مفتی اور داروغہ عدالت ہوتے تھے جو مقدمے کو حل کرنے میں اس کا تعاون کرتے تھے۔

(ii) قاضی صوبہ کی عدالت

صوبے کی سطح پر عدالتی تنظیم کا شعبہ بنیادی طور پر قاضی صوبہ کے ماتحت تھا۔ گرچہ کچھ مورخین کی رائے ہے کہ قاضی صوبہ کا تقرر قاضی القضاۃ یا شرع جہان کے ذریعے عمل میں آتا تھا۔ لیکن حقیت یہ ہے کہ قاضی صوبہ کی تقرری کا حتمی فیصلہ بذات خود بادشاہ کے ذریعے ہوتا تھا بقیہ سب صرف سفارشی ادارے کا درجہ رکھتے تھے یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان اداروں کی حیثیت بہتر امیدوار کے انتخابات کی تھی نہ کہ انہیں تقرر دینے کی۔ قاضی صوبہ کی عدالت میں نئے قسم کے دیوانی اور فوجداری مقدمے بھی درج ہوتے تھے اور صوبوں میں نچلی

عدالتوں کے فیصلوں کی اپیلیں سننے کی مرکزی عدالت شمار ہوتی تھی۔ اس کے عدالتی اختیارات صوبائی گورنر کے برابر تھے اور گورنر کی عدالت میں بھی اس کی ایک مستقل سیٹ ہوتی تھی۔ اس کے پاس ضلعی قاضیوں کے فیصلوں کی اپیلیں آتی تھیں اور ان معاملات میں جہاں شاہی یا حکومتی اختیارات پر سوال اٹھتے تھے گورنر بھی قاضی صوبہ سے مشورے لیتا تھا۔ بجا طور پر قاضی صوبہ کی ذمے داری بڑی اہم اور نازک تھی کیوں کہ قانون کی ذراسی ان دیکھی انصاف کے خاتمے کا نتیجہ ہو سکتی تھی۔ قاضی صوبہ کی عدالت میں اس کے تعاون کے لیے وہ تمام عدالتی عملہ متعین ہوتا تھا جس کا تذکرہ قاضی سرکار کے ماتحت ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی قاضی صوبہ کی عدالت سے مفتی، محتسب، داروغہ عدالت، میر عدل، پنڈت، سوانح نویس اور وقائع نگار جیسے افسران بھی منسلک ہوتے تھے۔

(iii) دیوان صوبہ کی عدالت

صوبائی سطح پر واقع دیوان صوبہ کی عدالت کا کام صرف مال گزاری سے متعلق مقدمات کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس عدالت میں عامل کے احکامات اور فیصلوں کے خلاف اپیلیں درج کی جاتی تھیں۔ ان عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں اعلیٰ عدالتوں یعنی مرکزی عدالتوں اور ناظم صوبہ کی عدالت میں داخل کی جاسکتی تھیں۔

مرکزی عدالتیں

مغل دور حکومت میں عوام الناس کو انصاف کی فراہمی کے لیے دارالسلطنت میں بھی عدالتیں قائم تھیں، جہاں پر پورے ملک سے لوگ انصاف کے حصول کے لیے درخواستیں دے سکتے تھے۔ مغل عہد حکومت میں مرکزی سطح پر تین طرح کی عدالتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔
(1) شاہی عدالت (2) عدالت عظمیٰ (3) مرکزی مال گزاری عدالت

(i) شاہی عدالت

مرکز میں واقع شاہی عدالت سلطنت کی سب سے بڑی عدالت تھی۔ بادشاہ اپنی عدالت میں دیوانی اور فوجداری دونوں طرح کے مقدمات سنتا تھا اور مملکت میں واقع عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف آخری اپیل بھی سنتا تھا۔ جب وہ عدالتی فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سنوائی کرتا تو وہ عدالت میں موجود ججوں کا صدر اعلیٰ ہوتا اور یہ عدالت بادشاہ کے علاوہ قاضی القضاۃ اور اس کی عدالت کے دوسرے قاضیوں پر مشتمل ہوتی۔ بادشاہ جب اپنی عدالت میں کسی نئے مقدمے کی سماعت کر رہا ہوتا تو اس کی مدد کے لیے اس وقت مفتی یا میر عدل موجود ہوتے۔ اس کے سامنے درخواستیں داروغہ عدالت کے ذریعے پیش کی جاتیں، اگر اسے قانونی طور پر کسی صلاح ومشورے کی ضرورت ہوتی تو وہ اسے اس مقصد کے لیے موجود ایک بنچ کے سپرد کر دیتا۔

(ii) عدالت عظمیٰ

اس عدالت کا صدر اعلیٰ قاضی القضاۃ ہوتا جسے مغل سلطنت کا چیف جسٹس کہا جاسکتا ہے۔ عدالتی تنظیم میں اہمیت کے اعتبار سے اس کا درجہ بادشاہ کے بعد تھا۔ وہ قاضی القضاۃ کی حیثیت سے جانشینی کے وقت حکمراں کے حلف کا نظم وانصرام کرتا اور مسجدوں میں جمعہ کا

خطبے بادشاہ کے نام کے ساتھ پڑھنے کا حکم جاری کرتا۔ قاضی القضاۃ کی تقرری بادشاہ کے ذریعے عمل میں آتی۔ اس کی تقرری کے لیے دانشورانہ، علمی اور قانونی صلاحیتوں کے ساتھ اخلاق و کردار پر خصوصی توجہ صرف کی جاتی۔ اس کا تقرر سیدھے طور پر بھی ہو سکتا تھا اور کبھی کبھی صوبائی قاضیوں کو بھی اس عہدے پر ترقی دے دی جاتی تھی۔ قاضی القضاۃ کے پاس دیوانی اور فوج داری سے متعلق جدید مقدمات کی سماعت کا اختیار تھا، ساتھ ہی وہ نچلی عدالتوں کی اپیلیں بھی سنتا تھا اور صوبائی عدالتوں کے کاموں کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ اس کے پاس مستقل طور پر اس کے تعاون کے لیے نائب کی حیثیت ایک یا دو قاضی متعین ہوتے تھے۔

مذکورہ بالا ذمے داریوں کے علاوہ قاضی القضاۃ کی درج ذیل ذمے داریاں تھیں:

1. دارالحکومت میں نماز جمعہ اور عیدین کی امامت کرنا۔
2. شاہی گھرانوں اور دوسری اہم تعزیتوں میں شرکت کرنا۔
3. شاہی گھرانوں کی نکاح خوانی کرنا۔
4. احکام شریعت کی تنفیذ کی نگرانی کرنا۔

اسی طرح سے عوام الناس پر نئے محصول کے نفاذ کے وقت قاضی القضاۃ کا مشورہ ضرور لیا جاتا تھا۔ مغل دور حکومت میں دارالسلطنت کا علاحدہ قاضی مقرر کیا جاتا تھا، جس کا درجہ قاضی صوبہ کے برابر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی متعینہ مدت کے لیے عہدہ خالی ہونے کی صورت میں قاضی القضاۃ یا دوسرے قاضیوں کی ذمے داری بھی اسی قاضی کے ذریعے ادا کی جاتی تھی۔

مرکزی مال گزاری عدالت کا صدر دیوان اعلیٰ ہوتا تھا۔ وہ حکومت کی مال گزاری اور تمام طرح کے مالیاتی امور کا نگران اعلیٰ ہوتا۔ وہ مال گزاری سے متعلق جدید معاملات کی سماعت کرتا اور مال گزاری سے متعلق صوبائی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل بھی سنتا۔ ان تمام کے علاوہ حقیقی طور پر اس کے ذریعے سلطنت کی معاشی پالیسیاں طے کی جاتیں۔ عدالتی چارہ جوئی سے متعلق صوبائی سطح سے اپیلیں اس کے پاس بمشکل ہی آتی تھیں اور شاذ و نادر ہی کوئی درخواست حکمراں کے خلاف دائر کی جاتی تھی۔

12.2.10 نظام فوج

بادشاہ اکبر نے سلطنت کی منظم فوج تیار کی۔ اس کا بانی درحقیقت وہی سمجھا جاتا ہے۔ مغلیہ سلطنت ایک طرح کی فوجی مطلق العنان حکومت تھی۔ چنانچہ ہر صوبے کا حاکم سپہ سالار کہلاتا تھا۔ ہر پرگنے یا ضلع کے ایک حصے کے حاکم کو فوجدار کہتے تھے۔ اور عام طور پر تمام عہدیدار اور درباری حتیٰ کہ ان لوگوں کے مراتب جو شہری یا عدالتی عہدوں پر فائز تھے سواروں کے سرداروں کی حیثیت سے متعین ہوتے تھے۔ سواروں کی قیادت کو منصب کہتے تھے۔ اور ایسے عہدیدار کو منصب دار کہتے تھے۔ جن عہدیداروں کو برائے نام پانچ سو سے دو ہزار پانچ سواروں کا قائد سمجھا جاتا تھا' اِسے ''امیر'' کہتے تھے۔ وہ لوگ جو اس سے زیادہ تعداد کے قائد نامزد کئے جاتے تھے انہیں امیر کبیر کا خطاب حاصل ہوتا تھا۔ یہ سپہ سالاریاں اعزازی ہی ہوتی تھیں۔ جن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ منصب دار کی حیثیت اور مرتبہ معلوم ہو سکے۔ اور ان کے منصب کو ''منصب ذاتی'' شمار کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں میں سے جنہیں واقعی فوجی اختیارات حاصل ہوتے تھے ہر ایک کو اس کے منصب

ذاتی کے علاوہ منصب سواری بھی حاصل ہوتا تھا۔ جن منصب داروں کا منصب سواری ان کے منصب ذاتی کے برابر تھا۔ ان کو اول درجہ کا منصب دار مانا جاتا تھا۔ جن منصب داروں کا سوار منصب ان کے منصب ذاتی کے نصف یا اس سے زیادہ ہوتا تھا ان کو دوئم درجہ کا منصب دار مانا جاتا تھا۔ جن کا سوار منصب ان کے منصب ذاتی کے نصف سے کم ہوتا تھا وہ تیسرے درجے کے منصب دار کی فہرست میں آتے تھے۔ ہر منصب دار کو اپنے منصب کے مطابق گھوڑے' ہاتھی' اونٹ وغیرہ رکھنے ہوتے تھے۔ جنگ کے وقت میدان جنگ میں منصب دار اپنے سواروں اور جانوروں کے ساتھ جاتے تھے بہت کم منصب داروں کو نقد تنخواہ دی جاتی تھی جن کی نقدی منصب دار کہا جاتا تھا۔ لیکن عموماً منصب داروں کو ان کی تنخواہ کے برابر آمدنی والی جاگیر عطا کی جاتی تھیں۔

مغلیہ دور میں "داغ و محلی" یعنی جانوروں کو داغنے لگانے کا قاعدہ بھی جاری تھا۔ بادشاہ اکبر نے فوجیوں کو حتی الامکان خزانے سے نقد تنخواہ دینا شروع کی۔ ہر سپاہی کا حلیہ فوج کے کاغذات میں درج کرایا اور داغ و محلی کے قواعد جاری کئے جن کے ماتحت آدمیوں اور گھوڑوں کے صحیح اعداد و شمار محفوظ رکھے جانے لگے۔ اور گھوڑوں کو یہ جانچنے کے بعد کہ وہ جنگی استعمال کے لائق ہیں داغ دیا جاتا۔ اور اجتماعی پریڈوں کے مواقع پر صرف انہیں لوگوں کو تنخواہ دی جاتی تھی جو داغ شدہ گھوڑے لاتے تھے۔

شہزادوں اور منصب داروں کے فوجی دستوں کے علاوہ بادشاہ کی ذاتی فوجیں بھی ہوتی تھیں۔ اس کا ذاتی حفاظتی عملہ ایک فوج پر مشتمل ہوتا تھا جسے "والا شاہی" کہتے تھے۔ اس میں زیادہ تر وہ لوگ ہوتے تھے جو اس کی شہزادگی کے زمانے میں اس کی ملازمت میں تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور بڑا گروہ ایسے سواروں کا تھا جو تنہا کام کرتے تھے یہ "احدی" کہلاتے تھے۔ اور کسی فوج میں داخل نہ ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہ اہلیت پر منحصر تھی جو عام سواروں سے زیادہ ہوتی تھی۔

پیادہ فوج ہر لحاظ سے فوج کا ایک ادنی بازو خیال کی جاتی تھی۔ اور اس کے سپاہیوں کا شمار دربانوں' پہراداروں' ہرکاروں' مخبروں' تیغ زنوں' پہلوانوں اور پالکی برداروں کے ضمن میں ہوتا تھا۔ لیکن ان میں سے جنگ میں حصہ لینے والے سپاہیوں میں بندوقچی' تیر انداز اور نیزہ باز ہوا کرتے تھے۔ ان سپاہیوں کے علاوہ بعض اور سپاہی ہوتے تھے۔ جنہیں "داخلی" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک چوتھائی حصہ بندوقچیوں اور تین چوتھائی حصہ تیر اندازوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ وہ سپاہی تھے جنہیں پرگنوں یا تحصیلوں میں فوجداروں کو رکھنے کی اجازت تھی تاکہ وہ انہیں امن وامان قائم کرنے اور مالگذاری وصول کرنے میں مدد کرسکیں۔

توپ خانہ دو طرح کا تھا۔ ایک تو بھاری اور دوسرا ہلکا۔ بھاری توپ خانے کا انتظام عموماً عثمانی ترکوں یا پرتگیزی نو مسلموں اور بعض اوقات دیگر ملکوں کے افسروں اور کسی حد تک توپچیوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ہلکا توپ خانہ میدانی توپوں' دیواروں پر رکھنے والی توپوں وغیرہ ہلکی قسم کی توپوں پر مشتمل تھا۔ جنہیں چھکڑوں پر لاد کر لے جاتے تھے۔ سارے توپ خانے کا ایک افسر اعلیٰ ہوتا تھا جسے "میر آتش" کہتے تھے۔ ایک سو توپچیوں کے افسر کو "صدی وال" کہتے تھے اور "میر دھہ" یعنی دس کا افسر ہوتا تھا جس کے ماتحت صرف چند یا ایک توپ ہی ہوتی تھی۔ تمام فوجوں کا سپہ سالار اعلیٰ بذات خود بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن فوجی نظام کا مہتمم اعلیٰ ایک افسر بخشی الممالک ہوتا تھا اس کے ماتحت تین بخشی اور کئی محرر ہوتے تھے۔ اس شعبے کی ذمہ داریوں میں بھرتی کرنا' حاضری لینا' منصب داروں اور سواروں کی تنخواہوں کی ادائیگی کا حکم

جاری کرنا شامل تھا۔ اور وہ دیکھتے تھے کہ لوگ جانوروں کو داغ دینے کے ضوابط پر عمل کرتے ہیں یا نہیں۔ بخشی سال میں دو مرتبہ اس پوری سوار فوج کا جو دربار میں حاضر ہوتی تھی جائزہ لیتا تھا۔ سب گھوڑوں کا معائنہ کرنا اور یہ دیکھتا کہ ان میں سے کوئی زیادہ عمر کے اور کام کے ناقابل تو نہیں ہو گئے۔ اگر وہ ایسا پاتا تو ان کے مالکوں کو ان گھوڑوں کو علاحدہ کرکے نئے گھوڑے خریدنے کا حکم دیتا تھا۔

12.3 صوبائی نظام

بادشاہ اکبر نے اپنے عہد حکومت میں صوبوں کا ایک موثر نظام قائم کیا۔ 1580ء میں اس نے سلطنت کو 12 صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔ 1605ء میں صوبوں کی یہ تعداد بڑھ کر 15 ہو گئی تھی۔ (1) کابل معہ کشمیر (2) لاہور (3) ملتان مع سندھ (4) دہلی (5) اودھ (6) آگرہ (7) اجمیر (8) احمد آباد (9) مالوہ (10) الہ آباد (11) بہار (12) بنگال (13) خاندیش (14) برار (15) احمد نگر۔ شاہجہاں کے عہد حکومت میں صوبوں کی تعداد بڑھ کر 19 ہو گئی تھی اور اورنگ زیب کی وفات تک سلطنت میں کل 21 صوبے تھے۔ ہر صوبے کا سب سے اعلیٰ عہدیدار صوبہ دار ہوتا تھا۔ اسے سپہ سالار اور ناظم بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے فرائض میں صوبے میں امن وامان قائم رکھنا' بغاوت ختم کرنا اور بیرونی دشمنوں سے صوبے کی حفاظت کرنا تھا۔ صوبے کے مالی نظام کے محکمہ کا سربراہ دیوان ہوتا تھا جو مرکزی دیوان کے ماتحت اپنا کام انجام دیتا تھا۔ اور عام طور سے اس کا عہدہ صوبہ دار کے عہدے کے برابر ہوتا تھا۔ ہر صوبہ میں صوبائی بخشی اور صوبائی صدر بھی مقرر ہوتے تھے جو مرکزی میر بخشی اور صدر الصدور کی ماتحتی میں اپنے امور انجام دیتے تھے۔ اور صوبہ کے فوجی اور مذہبی امور کے اعلیٰ عہدیدار ہوتے تھے۔ صوبائی بخشی عموماً صوبہ کی واقعہ نویسی کا کام بھی انجام دیتا تھا۔ ان عہدہ داروں کا تقرر خود بادشاہ کرتا تھا۔ صوبوں کو سرکاروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ سرکار کا اہم ترین عہدیدار فوجدار ہوتا تھا۔ سرکار میں امن وامان بحال کرنے کا کام اس کے سپرد تھا۔ اس کی مدد کے لئے سرکار کے اہم علاقوں میں کوتوال تعینات کئے جاتے تھے جو محکمہ پولیس کا اعلیٰ عہدیدار ہوتا تھا وہ ایک منصف' پولیس افسر' حاکم اور محتسب کے فرائض انجام دیتا تھا۔ سرکار کے شعبہ مالیات کی ذمہ داری کروڑی اور عامل کے سپرد تھی۔ ہر سرکار کے تحت کئی پرگنے تھے۔ پرگنے یا محال کا اعلیٰ عہدیدار شق دار تھا۔ امین پرگنہ شعبہ مالیات کا سربراہ ہوتا تھا۔ ہر پرگنہ میں فوتہ دار یا خزانچی مقرر ہوتا تھا جو پرگنہ کے خزانے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ پرگنوں میں قانون گو بھی مقرر تھے جو پرگنے کے کسانوں کی زمینوں اور پیدا ہونے والی فصلوں کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ ہر پرگنہ کے ماتحت کئی گاؤں تھے۔ گاؤں کے اہم اہل کاروں میں پٹواری اور چوکیدار ہوتے تھے۔

12.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مغلیہ حکومت کی عظمت واستحکام کا انحصار اس کے بہترین نظام حکومت پر تھا جس کا معمار بادشاہ اکبر تھا یہی نظام معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں قائم رہا۔ مرکزی حکومت کے انتظامی امور کو انجام دینے کے لئے کئی اہم شعبے قائم تھے ہر شعبہ کا سربراہ ایک اعلیٰ عہدیدار یا وزیر ہوتا تھا۔ حکومت کا سب سے بڑا اور اعلیٰ عہدیدار بادشاہ ہوتا تھا۔ وہ مطلق العنان تھا۔

- بادشاہ امور حکومت کو انجام دینے اور نظم ونسق قائم رکھنے کے لئے کئی عہدیداروں سے مدد لیتا تھا۔ ان میں ایک اہم وکیل یا وزیر اعظم ہوتا تھا۔ لیکن یہ غیر مستقل عہدہ تھا۔ حکومت کے فرائض واختیارات چار وزیروں میں تقسیم تھے۔ (1) دیوان (وزیر مالیات) (2) میر بخشی (وزیر فوج) (3) میر سامان (وزیر کارخانہ جات اور اسٹور) (4) صدر (وزیر عدالت اور امور مذہبی) اس طرح یہ چار بڑے وزراء تھے۔
- بادشاہ اکبر نے اپنے دور حکومت میں جھروکہ درشن کی رسم کو رائج کیا۔ طلوع آفتاب کے بعد خاص وعام ہر طبقہ کے لوگ بادشاہ کے درشن کے لئے جمع ہوتے۔ بادشاہ جھروکے میں آتا اور لوگ درشن کرتے تھے۔ پھر دربار عام منعقد ہوتا اور لوگ اپنے معروضات بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اس طرح سے روزانہ امور حکومت کو انجام دینے کے لئے تین مرتبہ شاہی دربار لگتا تھا۔ جس کا انتظام سلطنت پر گہرا اور اچھا اثر پڑتا تھا۔
- مغلیہ حکومت کا ایک بڑا عہدیدار دیوان تھا جو محکمہ مالیات کا سربراہ ہوتا تھا۔ محکمہ دیوان' دیوان اعلیٰ کے علاوہ دیوان خالصہ (خالصہ اراضی کے لئے) دیوان تان (تنخواہوں کے لئے) مشرف (محاسب خاص) اور مستوفی (حسابات کی جانچ پڑتال کرنے والا) جیسے اہم عہدیداران پر مشتمل ہوتا تھا۔ اسی طرح میر بخشی (وزیر فوج) بھی ایک اہم عہدیدار تھا۔ یہ فوج کی تنخواہ' جانوروں کو داغنے اور فوجوں کے بھرتی اور حاضری وغیرہ کے متعلق امور انجام دیتا تھا۔ کارخانہ جات اور ذخائر سامان کی نگرانی کے لئے ایک مستقل محکمہ تھا جس کا سربراہ میر ساماں کہلاتا تھا۔ صدر بھی ایک اہم عہدہ دار تھا جو محکمہ عطیات اور مذہبی امور کا سربراہ ہوتا تھا۔
- صوبوں میں بھی صدر مقرر ہوتے تھے۔ جو اپنے محکمہ سے متعلق فرائض انجام دیتے تھے۔ حصول انصاف کے لئے عدلیہ کا بہترین نظام قائم تھا۔ عدالتوں کے علاوہ شکایتوں کے ازالہ اور انصاف وحق کے حصول کے لئے بادشاہ کا دربار بھی تھا جس میں خاص وعام اپنے مقدمات براہ راست پیش کرسکتے تھے۔ ہر صوبہ کا اعلیٰ عہدہ دار صوبہ دار ہوتا تھا۔ اسے سپہ سالار اور ناظم بھی کہا جاتا تھا۔ صوبوں میں بھی مرکز کے طرز پر محکمے قائم تھے جو مرکزی محکموں کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔

12.5 نمونہ امتحانی سوالات

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مغلیہ حکومت کے نظم ونسق کے معمار کی حیثیت کس حکمراں کو حاصل ہے؟

(a) بابر (b) ہمایوں (c) اکبر (d) جہانگیر

2. مغلیہ سلطنت میں جھروکہ درشن کی رسم کس بادشاہ نے ایجاد کی؟

(a) اکبر (b) جہانگیر (c) شاہ جہاں (d) اورنگ زیب

3. کارخانہ جات اور ذخائر سامان کی نگرانی کے لئے ایک مستقل محکمہ تھا جس کا سربراہ کیا کہلاتا تھا؟

(a)وزیر اعظم (b)صدر (c)میر ساماں (d)فوجدار

4. بادشاہ اکبر نے اپنے عہد حکومت میں صوبوں کا موثر نظام قائم کیا۔1580ء میں اس نے سلطنت کو---------میں تقسیم کیا تھا۔

(a)12صوبوں (b)19صوبوں (c)25صوبوں (d)سب غلط

5. کارخانوں کے حسابات کی جانچ پڑتال کرنا کا کام کس کے حوالے ہوتا تھا۔

(a)مستوفی (b)صدر (c)میر بخشی (d)داروغہ

12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. مغلیہ حکومت کے فوجی نظام پر روشنی ڈالیے۔
2. میر بخشی سے متعلق اپنی معلومات قلمبند کیجیے۔
3. مغلیہ حکومت کا صوبائی نظام کیا تھا؟ تفصیل کے ساتھ واضح کیجیے۔
4. مغل دور کے فوجی تنظیم کے بارے میں ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
5. مغل دور کے نظام عدل کے بارے میں نوٹ تحریر کیجیے۔

12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مغلیہ حکومت میں بادشاہ کی حیثیت اور کار مملکت پر روشنی ڈالیے۔
2. مغلیہ حکومت میں میر سامان کی حیثیت اور اس کی ذمہ داریاں کیا تھیں واضح کیجیے۔
3. مغلیہ حکومت کے نظام عدلیہ کو بیان کیجیے۔

12.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت : ابن حسن۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
2. اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء : محمد اطہر علی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
3. آئین اکبری : ابوالفضل
4. اکبر نامہ : ابوالفضل
5. مغلیہ حکومت کا عروج وزوال : آر۔پی۔ ترپاٹھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اکائی 13: مغلیہ حکومت میں نظام عدل اور سماجی و معاشی حالات

اکائی کے اجزا:

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 نظام عدل

13.3 سماجی تنظیم

13.3.1 دیہی آبادی

13.3.2 شہری آبادی

13.3.3 قبائل

13.3.4 حکمراں طبقہ / امراء

13.3.5 زمین دار

13.3.6 عورتیں

13.3.7 ذات پات کا نظام

13.3.8 ہندو مذہب

13.3.9 جین مذہب

13.3.10 سکھ مذہب

13.3.11 اسلام

13.3.12 عیسائیت

13.4 اکتسابی نتائج

13.5 نمونہ امتحانی سوالات

13.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

13.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

13.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

13.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

مغل عہد حکومت کی سماجی و مذہبی حالت سابقہ روایت پر ہی مبنی رہی۔ سماجی اعتبار سے عوام الناس مختلف بنیادوں پر طبقات میں منقسم تھے۔ ان کی پہچان عمومی طور پر حرفے اور پیشے کے ذریعے ہوتی تھی۔ مذہبی اعتبار سے ہندوستانی تاریخ کا مغل دور بہت اہم شمار کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ اس عہد میں نہ صرف بڑے پیمانے پر مذہبی تکثیریت کو فروغ حاصل ہوا بلکہ تمام مذاہب ایک دوسرے کے قریب آئے اور لوگوں میں مذاہب کے مطالعے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا جس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر علمی و ادبی سرمایہ اکٹھا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مذاہب کے آپسی میل جول کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغل دور کے ہندوستان میں مختلف طرح کی مذہبی تحریکوں کو ابھرنے اور فروغ پانے کا موقع ملا اور ان تحریکوں نے مغل عہد کی سماجی زندگی پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ مغل دور جس نے 300 سال سے زیادہ بر صغیر ہند پر حکومت کی اس دور میں عوام کی سماجی حالات کیا تھی سماج کتنے طبقات میں منقسم تھا۔ آپ اس بات کا بھی جائزہ لے سکیں گے مغل حکمراں عدل و انصاف کا کیا معیار تھا اور اس سلسلے میں کس حکمراں نے کیا خدمات انجام دیں۔ اسی طرح ان مسلم حکومت کا ہندو اکثریتی سماج میں مذہبی رواداری اور اسلام کے ہندوستانی سماج پر کیا اثرات مرتب ہوئے اس پر بھی آپ گفتگو کر سکتے ہیں۔

13.2 نظام عدل

ہندوستانی عدالتی نظام کی تاریخ میں مغل دور حکومت کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔ مغلوں نے اپنے عہد کے عدالتی نظام میں نئی تبدیلیوں کو روشناس کر کے ہندوستانی عدالتی نظام پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مورخین کے مطابق موجودہ عہد کے ہندوستانی عدالتی نظام پر مغل عدالتی نظام کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ دوسرے انتظامی ڈھانچوں کی طرح مغل عہد کا عدالتی نظام بھی بہت ہی مستحکم اور فعال شمار کیا جاتا ہے، جس کی سب سے اہم خصوصیت معاملات کا فوری حل تھا۔ مغلوں نے ملک میں امن و سکون کو رواج دینے کے لیے انصاف کے قیام پر خاص زور دیا جس کے لیے انہوں نے نچلی یعنی گاؤں کی سطح سے لے کر مرکزی سطح تک عدالتی نظام کا ایک جال بچھا دیا تا کہ عوام الناس کو انصاف کے حصول میں کسی بھی طرح کی کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

مغل ہندوستان کے ایک اہم مورخ ابن حسن کے مطابق مسلم حکومت کا تقاضہ تھا کہ حکمراں قرآنی قوانین کے مطابق حکومت کرے اور اپنی سلطنت میں شریعت کا نفاذ کرے۔ ابن حسن کے بقول مغل دور حکومت میں عوام الناس کو مسلم اور غیر مسلم کے خانوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور بادشاہ کی یہ ذمے داری تھی کہ وہ نہ صرف اس بات کو ممکن بنائے کہ مسلم عوام ایک حقیقی مسلم کی زندگی گزاریں بلکہ ان کی نگرانی بھی کرے اور ذمی کی حیثیت سے غیر مسلم رعایا کے تمام حقوق کی ذمے داری پوری کرے۔ ان کے جان ومال، عزت و آبرو اور مذہب سبھی کی حفاظت کرے۔ اس طرح مسلم نظام حکومت کا پہلا عنصر یہ ہے کہ حکمراں تمام ملکی ذمے داریوں کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کے وقار کو بھی بچائے رکھے اور اسلامی شریعت کے مطابق حکومت چلائے۔ مسلم نظام حکومت کا دوسرے بنیادی عنصر تمام رعایا کو چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم جان ومال، عزت و آبرو، امن وچین اور خوش حالی و انصاف کی ضمانت دینا ہے۔ مسلم فقہاء کا اس بات پر اصرار ہے اور خاص طور سے انصاف کے معاملے میں وہ قانون کے مطابق مسلم اور غیر مسلم دونوں کو یکساں نظر سے دیکھنے کی وکالت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انصاف اور احسان و کرم فرمائی تمام رعایا کے لیے یکساں ہونی چاہیے۔ حکمراں زمین پر خدائی سایہ ہوتا ہے اور خدائی احسان و کرم مسلم و غیر مسلم سب کے لیے مساوی ہوتا ہے۔ اس لیے ایک حکمراں کو چاہیے کہ وہ کمزور وناتواں پر اٹھنے والے ظالم کے ہاتھ کو روک دے کیوں کہ قول نبوی ہے کہ ”انصاف کے لیے مظلوم کی پکار خدا کے یہاں سے واپس نہیں کی جاتی چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔“

مغل دور حکومت میں بادشاہ کی عدالت بہت مشہور تھی۔ عوام الناس اس کی عدالت میں اپنے مقدمات اور فیصلوں کے خلاف اپیلیں لے کر آتے۔ بادشاہ روزانہ کھلے دربار میں معمولی مقدمات کی سماعت کیا کرتا تھا اور اہم مقدمات کی سماعت اس کی عدالت میں ہفتے میں ایک دن ہوتی تھی۔ تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے اس کے لیے جمعرات، جہاں گیر نے منگل اور شاہ جہاں نے بدھ کا دن متعین کر رکھا تھا۔

13.3 سماجی تنظیم

مغل عہد کا ہندوستانی سماج مختلف طبقات میں منقسم تھا اور اس سماجی تقسیم کی بنیادیں بھی مختلف تھیں۔ اس دور کی سماجی تقسیم کی پہلی بنیاد مذہب کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ تاریخی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ اس دور میں عوام الناس مذہبی بنیادوں پر ایک دوسرے سے الگ تھے۔ مختلف مذاہب نے ان کے درمیان معاشرتی طبقات کو جنم دیا تھا۔ اس عہد کی سماجی درجہ بندی کی دوسری بنیاد پیشہ کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ سماجی تقسیم کی ایک ایسی بنیاد ہے جس کا وجود انسانی تاریخ کے ہر دور اور علاقے میں رہا ہے۔ مغل دور حکومت میں بھی عوام اپنے پیشے کے لحاظ سے مختلف طبقات میں بٹے ہوئے تھے۔ اسی طرح سے رہائش کے اعتبار سے بھی عوام کی سماجی درجہ بندی کی جاتی ہے اور مغل دور میں بھی ہمیں اس طرح کی درجہ بندی کے ثبوت ملتے ہیں۔ مثلاً عوام کو دیہی اور شہری کے خانوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔

13.3.1 دیہی آبادی

مغل دور میں دیہی آبادی عام طور پر کاشت کاروں، دست کاروں اور کام گاروں پر مشتمل ہوتی تھی اور یہی تمام لوگ مل کر ایک گاؤں کی تشکیل کرتے تھے۔ مغل ہندوستان میں بھی ملک کی بڑی آبادی گاؤں میں ہی آباد تھی اور یہ تقریباً کل آبادی کا 85 فیصد حصہ تھی۔ مغل ہندوستان کی دیہی آبادی کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس عہد میں گاؤں کی بہت سی مختلف قسمیں تھیں۔ مثال کے طور پر مارواڑ، راجستھان میں ایسے گاؤں تھے جن کو 'بسی' کہا جاتا تھا، جب کہ دوسرے علاقوں میں اسی قسم کے گاؤں کو 'چھپر بند' کے زمرے میں شامل کیا جاتا تھا۔ یہ ایسے گاؤں تھے، جہاں کاشت کاروں کو سرداروں نے بسایا تھا، اس لیے انہیں وہاں رہ کر کم و بیش اپنے سرداروں کے بندو بست میں ہی گزر بسر کرنی پڑتی تھی۔ لیکن مغل دور میں ایسے گاؤں کی تعداد زیادہ تھی، جن میں عوام آباد تھے، یعنی ان گاؤں کی آبادی ایسے کاشت کاروں پر مشتمل تھی جو خود ہی کسی جگہ پر آباد ہو گئے تھے۔ حقیقت میں دوسری قسم کے گاؤں میں ہی دیہی آبادی کے نیم آزاد سماج کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ایسے گاؤں ہر جگہ دو طرح کے کاشت کاروں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف خود کاشت والے کاشت کار ہوتے تھے، جو ان لوگوں پر مشتمل تھے، جنہوں نے گاؤں کو آباد کیا تھا اور دوسری طرف مختلف جگہوں سے منتقل ہو کر آنے والے کاشت کار تھے، جن کی آراضی کو 'پاہی کاشت' کا نام دیا جاتا تھا۔ ان دوسری قسم کے کاشت کاروں کا گاؤں کے انتظامی امور سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ سولہویں صدی کے دستاویزات میں دیہاتوں کے رہنے والے ایسے بہت سے لوگوں کا ذکر ملتا ہے جو اپنے آپ کو 'پنچ' یا 'مقدم' کہتے تھے۔ انہیں گاؤں کی غیر مزروعہ زمین کو قیمتاً یا مفت کسی کو بھی دینے کا اختیار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کے 'مقدموں' یا 'پنچوں' کو جو اپنے آپ کو پورے گاؤں کا نمائندہ سمجھتے تھے، غیر مزروعہ یا افتادہ زمین پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ گاؤں کے دست کاروں، کام گاروں اور دوسرے نچلے کام کرنے والوں کو آراضی کے چھوٹے چھوٹے ٹکرے دیے جاتے تھے، جن پر کوئی محصول عائد نہیں ہوتا تھا۔ آراضی کے ان ٹکڑوں کے بدلے میں انہیں پورے گاؤں کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی خدمت میں زیادہ توجہ ان ہی لوگوں پر رہتی تھی، جو پنچ کے زمرے میں آتے تھے یا پھر ان لوگوں پر جو بعض روایتی ادائیگیاں کرنے کے اہل تھے۔

دستاویزات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ایک گاؤں کے پنچ عموماً ایک ہی قوم یا ذات سے تعلق رکھتے تھے لیکن کبھی کبھی ان کے درمیان متفرق فرقوں اور اقوام کے لوگ بھی شامل ہو جاتے تھے۔ مثلاً بعض گاؤں میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ پنچ کے زمرے میں شامل نظر آتے ہیں۔ ایسا شاید اس لیے تھا کہ کاشت کار اکثر مختلف ذاتوں اور برادریوں میں بٹے ہوئے تھے، جن کی سماجی حیثیت مختلف ہوتی تھی۔ بعض گاؤں میں تمام کاشت کار ایک ہی ذات سے متعلق ہوتے تھے۔ لیکن چند دوسرے گاؤں میں کاشت کاروں کی ایک سے زیادہ ذات برادریوں کے لوگ آباد تھے۔ عام طور پر دست کاروں اور گاؤں کی ملازمت کرنے والے زیادہ تر لوگ نہایت سختی کے ساتھ ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ نو آبادیاتی عہد سے پہلے اچھوت برادریاں دیہی کام گاروں کی اکثریت کی نمائندگی کرتی تھیں۔ کیرالا میں اس زمرے کے کام گار زرعی غلاموں کی حیثیت میں پائے جاتے تھے۔ بہار کے بعض حصوں میں بھی زرعی غلامی پائی جاتی تھی اور اس طرح کی صورت حال آسام کے آہوم رجواڑوں میں بھی تھی۔

13.3.2 شہری آبادی

مغل دور حکومت میں حکمراں طبقے کے پاس بڑے پیمانے پر وسائل موجود تھے۔ جس کی بنا پر شہری آبادی میں مستقل اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ مغل دور حکومت میں آگرہ کی آبادی ساڑھے سات لاکھ کے قریب پہنچ گئی تھی اور امکان یہ ہے کہ مغل ہندوستان میں شہری آبادی کل ملکی آبادی کا 15 فیصد کے قریب تھی۔

شہری آبادی میں بڑی تعداد مزدور اور نوکر پیشہ لوگوں کی تھی جو روزانہ یا ماہانہ اجرت پر کام کرتے تھے۔ ان کے علاوہ گھروں میں کام کرنے والے غلام تھے، جن میں وہ عورتیں بھی شامل تھیں جو زنان خانہ میں کنیزوں یا داشتاؤں کی حیثیت سے رکھی جاتی تھیں۔ عہد سلطنت کی صورت حال کے برخلاف مغل عہد میں غلاموں کی سر عام منڈیوں کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی غلام مزدوروں سے کام لینے کی صورت نظر آتی ہے۔ برنیر کے مطابق دست کاروں کی حالت خستہ تھی اور ان کی اجرت بھی بہت کم تھی، کیوں کہ امراء ان سے بسا اوقات زبردستی کام لیتے تھے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ تصویر بھی کسی حد تک بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا نتیجہ ہو۔ مثلاً تاریخی شواہد سے یہ ثابت ہے کہ احمد آباد میں زربفت بنانے والے کاری گر ایک بڑی تعداد میں دور دراز کے بازاروں کے لیے مال تیار کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان پر اعلیٰ طبقوں سے تعلق رکھنے والے ممکنہ خریداروں کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔

مغل عہد میں شہروں کو تجارتی مراکز بنا کر مختلف علاقوں کے درمیان تجارتی لین دین ہونے لگا تھا اور جن تجارتی ذرائع سے زرعی پیداوار کو شہروں تک لایا جاتا تھا وہ شہری تاجروں کے لیے بھی منافع بخش تھے۔ تجارتی سہولیات فراہم ہونے کی وجہ سے شہروں میں مقیم تجارت پیشہ لوگوں میں خوش حالی پیدا ہو چکی تھی۔ ساتھ ہی مغل سلطنت میں انتظامیہ کی مرکزیت اور اس کے اثر میں تجارت کے فروغ کی وجہ سے پیشہ وروں اور تاجروں پر مشتمل 'متوسط طبقات' سامنے آ چکے تھے۔

مغل سماج کا ایک بڑا حصہ جس میں دیہات اور شہر دونوں جگہوں کے لوگ شامل تھے، سپاہی پیشہ لوگوں پر مشتمل تھا۔ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں مختلف علاقوں میں زمین داروں کے خدمت گاروں کی تعداد درج کی ہے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق زمین داروں کے خدمت گاروں میں 3,85,558 سوار اور 42,77,057 پیادے تھے۔ عملاً یہ سب سپاہی تھے اور دیہات سے تعلق رکھتے تھے۔ چند مورخین کے مطابق یہ چالیس لاکھ سے اوپر پیادے یقیناً ہتھیار بند کسان تھے۔ لیکن سوار جو زمین داروں کی نوکری میں تھے یا وہ سوار جن کو مالی عملہ کے لوگ اپنے کاموں کے لیے استعمال کرتے تھے، شاید دیہات کے نسبتاً خوش حال طبقوں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ممکن ہے کہ انہیں مقدموں یا چھوٹے زمینداروں میں سے بھرتی کیا جاتا ہو۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ بادشاہ اور منصب دار جن پیادوں کو بندوقچیوں، توپچیوں اور بان پھینکنے والوں کی حیثیت سے نوکر رکھتے تھے، وہ سب کسانوں یا دیہاتی دست کاروں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ایک وقت میں اس قسم کے پیادوں کی کل تعداد چالیس ہزار تھی، جن کو شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ 1946-47 میں شاہی فوج کے سواروں کی کل تعداد، بشمول ان سواروں کے جو منصب داروں کی نوکری میں تھے، دو لاکھ کے قریب تھی۔ یہ سب مختلف طبقات یا گروہوں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ان میں بہت سے وسط ایشیا اور ایران سے آنے والے گھڑ سوار بھی تھے۔ ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے

جن کا تعلق راج پوت نسلوں سے تھا۔ دیہی علاقوں سے بھرتی کیے گئے سپاہی جب شہروں میں تعینات ہوتے تھے تو کبھی کبھی یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ شہر فوجی چھاؤنی بن گیا ہے۔

13.3.3 قبائل

مغل عہد کی سماجی تنظیم کا ایک اہم جزء وہ قبائل تھے، جو ذات پات کے نظام سے باہر تھے۔ اس عہد میں بعض ایسے بہت سے قدیم گروہ جنگل کے علاقوں میں ملتے تھے، مثلاً وہ 'بن مانس' جو آندھرا میں نند پال اور کرنول کے درمیان موجود ہیں، یہ لوگ کسی قسم کا کوئی کپڑا نہیں پہنتے تھے اور اپنی گزر بسر کے لیے شہد اور جنگلی بیجوں کو جمع کرنے کے علاوہ جانوروں کا شکار کرتے تھے۔ کچھ ایسی ہی حالت موجودہ ناگا قبائل کے آباء واجداد کی تھی۔ سترہویں صدی عیسوی کے اوائل کی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ بلوچستان اور سندھ علاقہ کے نہمردی قبیلہ کے لوگ، جن کا اصل پیشہ جانوروں کی پرورش تھا، اونٹوں، گھوڑوں، بھیڑوں، کھالوں، قالینوں اور پہاڑی علاقے میں پیدا ہونے والی دوسری اشیاء کی تجارت کرتے تھے۔ وہ ان اشیاء کے بدلے میں میدانی علاقوں سے اناج، مختلف قسم کے ہتھیار اور کپڑے لے جاتے تھے۔ اسی طرح وسطی ہمالیہ میں جانوروں کو پالنے والے خانہ بدوش قبائل بھی تجارت کرتے تھے۔

افغان قبیلے بھی ابتدا میں جانوروں کی پرورش کرنے والے لوگ تھے۔ گرچہ افغان قوم کا نام تاریخ میں بہت پہلے سے جانا جاتا ہے لیکن ان کے کچھ قبیلوں کے نام پہلی بار پندرہویں اور سولہویں صدیوں کی تحریروں میں ملنے شروع ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب افغانوں نے جانوروں کی پرورش کے ساتھ زراعت اور تجارت کے پیشوں کو اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران شمال کی طرف ان کے پھیلنے کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا، جو لمبے عرصے تک جاری رہا۔ افغانوں کی ان روایات سے، جو 'آئین اکبری' اور 'تاریخ خان جہانی' میں درج ہیں، پتہ چلتا ہے کہ ہر قبیلہ مختلف افراد کی اولاد ہونے کا دعوے دار تھا۔ یہ قبائل اکثر انہی افراد کے نام سے جانے بھی جاتے تھے۔ لیکن ان قبائل میں اکثر باہر کے افراد کو اپنے اندر شامل کر لینے کی رسم بھی تھی۔ اسی طرح سے مختلف قبائل کے لوگوں کے درمیان آپسی شادی بیاہ کے رشتے بھی عام تھے۔

13.3.4 حکمراں طبقہ / امراء

مغل دور کا ہندوستانی سماج جاگیر داری نظام پر مشتمل تھا اور اس سماجی نظام کا سربراہ اعلیٰ بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ پورے ملک کا حکمراں ہونے کی وجہ سے ملک کی تمام زمینوں پر اس کے مالکانہ حقوق تصور کیے جاتے تھے۔ شاہی خاندان کے لوگ، ان کے رشتے دار، دوست احباب اور بادشاہ کے مقربین حکمراں طبقے میں شمار کیے جاتے تھے اور سماجی اعتبار سے ان کا درجہ سب سے بلند ہوتا تھا۔

مغل عہد حکومت میں امراء بھی حکمراں طبقے میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا تعلق منصب داری اور جاگیر داری نظام میں سب سے اونچا ہوتا تھا، بادشاہت کے متبع ہوتے اور اعلیٰ طبقے کی حکمرانی میں ان کی بھی شمولیت ہوتی۔ مغل سلطنت اور اس عہد کی دوسری ریاستوں میں زرعی ٹیکس سے اصل فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ تھے، جن کو حکمرانوں کے امیروں کا درجہ ملا ہوا تھا۔ ان لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو زمینداروں میں سے بھرتی کیے گئے تھے۔ مغل حکمراں تمام امراء کو، جن میں چھوٹے بڑے سبھی شامل تھے، اپنا تنخواہ دار نوکر تصور کرتے

تھے اور ان کی تنخواہیں منصب کے مطابق مقرر ہوتی تھیں، جن کی ادائیگی کے لیے انہیں ایسے علاقے جاگیروں میں دیے جاتے تھے، جہاں سے ملنے والی زرعی ٹیکس کی آمدنی ان کی تنخواہ کے برابر ہوتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ تنخواہ کا ایک حصہ شاہی خزانے سے نقد ادا کر دیا جاتا تھا۔ منصب داروں کے درجے اور ان کی تعیناتی کی جگہوں میں تبدیلی کے مطابق جاگیریں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ عام طور پر کسی کو بھی دو تین برسوں سے زیادہ ایک جاگیر میں رہنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

مغل امراء کی بھرتی بعض خاصے جانے پہچانے گروہوں میں سے ہوتی تھی۔ ان میں سے بہت سے تو وسط ایشیا اور ایران سے آنے والے لوگ تھے۔ ترک وطن کر کے آنے والوں کا یہ سلسلہ مستقل جاری تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایران سے آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جس کے نتیجے میں وسط ایشیائی امراء کی بہ نسبت ان کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ یہ تارکین وطن عام طور پر اپنے ملکوں میں بھی امراء یا دفتری حکام کی آسامیوں پر کام کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ امراء کے درجے میں افغان، ہندوستانی مسلمان اور راج پوت بھی تھے، پھر سترہویں صدی میں مراٹھوں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ تارک وطن زمرے کے امراء اور ان کی اولاد امراء کی کل جماعت کے تقریباً نصف کے قریب تھے۔ مغل سلطنت میں بڑے امراء کے بیٹے اور دوسرے قریبی رشتے دار عموماً مخصوص عنایتوں کے مستحق قرار پاتے تھے۔ اس رعایت سے انہیں 'خانہ زاد' کا درجہ دیا جاتا تھا۔ اگر امراء کے طبقے میں شامل مختلف گروہوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان میں سے بہت کم لوگوں کا مقامی آبادی کے کسی بھی حصے سے سیدھا تعلق تھا۔ مقامی حالات سے اس طرح کی دوری کی کیفیت کو جاگیروں کے تبادلوں نے اور نمایاں کر دیا۔ امراء عام طور پر اپنے گھر بار اور دفاتر شہروں میں بناتے تھے اور دیہاتی علاقوں کے بجائے وہ اپنے شہری محلوں میں ہی قیام کرتے تھے۔

13.3.5 زمین دار

عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں کاشت کاروں اور ان کی مزروعہ زمینوں پر مختلف نوعیت کے موروثی حقوق کے دعوے دار کا ایک بڑا طبقہ موجود تھا۔ مختلف علاقوں میں اس طبقے کے مختلف نام تھے، لیکن مغل انتظامیہ ایسے تمام مقامی طور پر طاقت ور زرعی گروہوں کے لیے زمیندار کا لفظ استعمال کرتی تھی۔ زمین داروں میں ایک طرف نیم خود مختار مقامی حکمراں شامل تھے، وہیں دوسری طرف یہ لفظ ان لوگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا جو عملاً دیہات کے مقدّموں سے بہت مختلف نہیں ہوتے تھے۔ ان متفرق حیثیتوں کے موروثی حقوق رکھنے والوں کے درمیان بعض باتیں مشترک تھیں، مثلاً ان سب کو زرعی ٹیکس میں سے بھی ایک ادائیگی کی جاتی تھی جو نقد بھی ہو سکتی تھی اور معافی کی زمین کی صورت میں بھی دی جا سکتی تھی۔ اس طرح یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں زمین کے مالک نہیں تھے۔ یہ بات یوں بھی صاف ہو جاتی ہے کہ زمین کی پیداوار میں ان کا حصہ 'لگان' کے مطابق نہیں تھا، بلکہ خود انہیں جو کچھ ملتا تھا وہ ایک طرح کا زرعی ٹیکس تھا، جو فاضل پیداوار کے چھوٹے سے حصے کے برابر ہوتا تھا۔ یہ حصہ شمالی ہندوستان میں ایک تہائی یا پانچواں حصہ تھا۔ بعض علاقوں میں یہ لوگ کاشت کاروں کو زمین سے بے دخل کر کے ان کے بجائے نئے کاشت کار آباد کرنے کا حق رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کسی علاقے میں ایک زمین دار کے حقوق قائم ہونے کی روایت اکثر یہ ہوتی تھی کہ مخصوص برادری یا ذات کے لوگوں نے طاقت کے دم پر وہاں اپنا دبدبہ قائم

کرلیا تھا۔ اس طرح کسی علاقے میں زمینداروں کی بالادستی قائم رکھنے کے دو خاص ذرائع تھے۔ اول تو حاوی برادری کے لوگوں میں آپسی تعاون اور بھائی چارہ اور دوم ان میں سے بعض کی ملازمت میں مسلح افراد پر مشتمل جتھوں کا مہیا ہونا۔ لیکن مغل عہد کے آنے تک ہر جگہ زمینداری حقوق والے گروہ میں مختلف برادریوں کی نمائندگی بدلنے لگی تھی۔ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں ان زمیندار برادریوں کی تفصیلی فہرست درج کی ہے جہاں پر علاقہ یا پرگنہ کے زمیندار برادریوں کے نام درج کیے ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں شمالی ہندوستان کے اکثر حصوں میں زمین داریاں ہندوؤں میں سے اونچی ذاتوں کے پاس تھیں، خاص طور پر راج پوت برادریوں کے پاس۔ لیکن بہت سے ایسے مقامات بھی تھے جہاں ہندو اور مسلمان دونوں قسم کے زمین دار موجود تھے۔ اسی طرح 'آئین اکبری' میں زمین داروں کے زمرے میں مختلف برادریوں کا بھی ذکر آتا ہے۔

13.3.6 عورتیں

مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مغل دور حکومت میں عورتوں کو سماجی اعتبار سے وہ اختیارات اور مراعات حاصل نہیں تھیں جو مردوں کو حاصل تھیں۔ اسی طرح سے ان پر سماجی جبر روا رکھا جاتا تھا، لیکن یہ سماجی جبر مختلف طبقات اور گروہوں میں الگ الگ انداز میں بروئے کار آتا تھا اور وقت، حالات و مقام کے ساتھ اس کی نوعیت بھی بدلتی رہتی تھی۔ عام طور پر ہندو معاشرے میں عورتوں کو بہت محدود اختیارات حاصل تھے۔ بچیوں کی پیدائش کو فال بد شمار کیا جاتا تھا۔ بسا اوقات ان کی شادیاں بچپن میں ہی کردی جاتی تھیں۔ نچلی قوموں میں شادی کے موقع پر لڑکی کے والدین کو کسی نہ کسی انداز میں 'دلہن کی قیمت' کے طور پر کچھ نہ کچھ ادا کیا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف اونچی ذاتوں میں دولہا کے والدین کو دلہن کی طرف سے جہیز ملتا تھا۔ کئی کاشت کار اور مویشی پالنے والی ذاتوں، مثلاً جاٹوں، یادوؤں اور دوسری نچلی برادریوں میں بیواؤں کی شادیاں ہوسکتی تھی۔ اکثر ان کے متوفی شوہروں کے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ اور کبھی کبھی غیر مردوں کے ساتھ بھی یہ دوسری شادیاں انجام پاتی تھیں۔ اس طبقے کی عورتوں میں پردے کا کوئی رواج نہ تھا، عورتیں عام طور پر پانی بھرنے، سوت کاتنے اور آٹا پیسنے کا کام کرتی تھیں۔ بنگال کے بارے میں یہاں تک خیال کیا جاتا ہے کہ وہاں کام کا اصل بوجھ عورتوں کے کاندھوں پر رہتا تھا۔

ہندو معاشرے میں اونچی ذات کی عورتوں کو غالباً آرام کے کسی قدر زیادہ مواقع حاصل تھے، لیکن وہ بھی کئی قسم کی شدید مجبوریوں کا شکار تھیں، ان میں سے ایک مجبوری پردے کی سختی سے پابندی تھی۔ یہ واقعہ کہ اس زمانے کی اُہوم ریاست میں عورتیں، جن میں رانیاں بھی شامل تھیں اپنے چہروں یا سروں کو ڈھکے بغیر لوگوں کے سامنے نہیں آتی تھیں، مغل تحریروں میں ایک انوکھی بات کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ اونچی ذاتوں میں بیواؤں کی دوبارہ شادی کی سخت ممانعت تھی، راج پوتوں اور دوسری اقوام میں 'ستی' کی بھیانک رسم پر عمل کیا جاتا تھا۔ مغل حکومت نے 'ستی' کے واقعات کو کم کرنے کے لیے یہ قانون بنایا کہ ہر انفرادی کیس میں یہ یقینی بنانا ضروری ہے کہ بیوہ اپنی مرضی سے 'ستی' ہورہی ہے۔ گرچہ اس پالیسی کا کچھ اثر ضرور ہوا لیکن تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں گیر کے عہد میں ایک ہفتہ کے دوران دو یا تین مرتبہ 'ستی' کے واقعات رونما ہوجاتے تھے۔ پھر بھی اس بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اونچی ذات سے تعلق رکھنے والی تمام یا زیادہ تر بیوائیں 'ستی' ہوجانے پر مجبور تھیں۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ بعض بیوائیں نہ صرف منقولہ اثاثوں کی مالک تھیں بلکہ ان کے پاس زمینداری

حقوق بھی تھے جو بظاہر وراثت میں ہی مل سکتے تھے۔ کیرالا کی بعض اقوام میں وراثت ماں کی طرف سے چلتی تھی اور اسی قسم کی صورت حال میگھالیہ کے گھارو اور گھاسی قبائل میں بھی پائی جاتی تھی۔

مسلم معاشرے میں قانون کے مطابق ایک مرد کو چار بیویاں اور کئی باندیاں رکھنے کی اجازت تھی، لیکن یاد رہے کہ یہ ایک ایسی رعایت تھی جس کا صرف بہت مال دار اور با اقتدار لوگ ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مردوں کو اس قسم کی رعایت دیے جانے کو بعض اوقات ناپسندیدگی سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا اظہار شادی کے ان شرائط ناموں سے ہوتا ہے جو بعض اوقات فارسی دستاویزات کے مجموعوں میں ملتے ہیں۔ اسی قسم کی ایک دستاویز وہ ہے جو سترہویں صدی کے نصف اول میں سورت میں تیار کی گئی تھی۔ اس قسم کے دستاویزات میں عورتیں اپنے شوہروں سے یہ یقین دہانی حاصل کرتی تھیں کہ وہ دوسری شادی نہیں کریں گے اور نہ ہی کوئی باندی رکھیں گے۔ ان شرائط ناموں کے ذریعے شوہروں کو یہ بھی وعدہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو جسمانی و ذہنی تکلیف نہیں پہنچائیں گے اور انہیں گزر بسر کے لیے مناسب وسائل بھی فراہم کرتے رہیں گے۔ مسلم معاشرے میں سن بلوغ سے پہلے شادی گرچہ غیر قانونی نہیں تھی لیکن مسلمانوں میں اس کا چلن کم تھا۔ اس کے برخلاف بیوہ کی دوبارہ شادی نہ صرف قانونی طور پر جائز تھی بلکہ بسا اوقات ایسی شادیاں ہوتی بھی تھیں۔ اونچے گھرانوں کی مسلم عورتیں مکمل پردے میں رہتی تھیں۔ شادی کے وقت طے شدہ شرائط کے مطابق عورتیں اپنے شوہروں سے مہر کے روپیوں کے لیے دعویٰ کر سکتی تھیں اور انہیں وراثت میں جائیداد بھی مل سکتی تھی۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ اکبر نے قانون میں معدلت کے فقدان پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا تھا اور اورنگ زیب نے مدد معاش کی زمینوں میں وراثت کے اصول وضع کرتے وقت شریعت سے صرف نظر کرتے ہوئے بیواؤں کو اپنے متوفی شوہروں کی پوری مدد معاش کا زندگی بھر کے لیے وارث قرار دیا تھا۔

مغل عہد کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والی مسلم عورتیں عام طور پر پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ خاص طور پر ہمایوں کی بہن گل بدن بیگم کا معاملہ غیر معمولی تھا، جس کے بارے میں تاریخی شہادتیں ہیں کہ وہ تعلیم یافتہ تھی مگر اس کا شوہر غیر تعلیم یافتہ تھا۔ لیکن اس کے برخلاف متوسط طبقات سے تعلق رکھنے والی مسلم عورتیں بھی زیادہ تر غیر پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ ان تمام تاریخی شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغل دور حکومت میں عورتوں کی سماجی حیثیت اتنی اچھی نہیں تھی اور وہ مختلف قسم کی سماجی برائیوں کا شکار تھیں۔

13.3.7 ذات پات کا نظام

مغل دور کے ہندوستان کے سماجی ڈھانچے کی تشریح و توضیح بڑی حد تک ذات پات کی روشنی میں کی جا سکتی ہے کیوں کہ 1664ء کے آس پاس جب نینسی نے یہ دکھانا چاہا کہ سماجی اعتبار سے کس زمرے کے کسان مارواڑ کے علاقے میں رہتے ہیں تو اس نے ان کی ذاتوں کے نام لکھ دیے۔ اسی طرح سے جب 1595ء کے آس پاس ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں پرگنہ کے زمینداروں کا ذکر کیا تو اس نے ان کی ذاتوں کے نام لکھ دیے۔ ایک جگہ ایک برہمن فخریہ انداز میں لکھتا ہے کہ وہ برہمن ہے اور جب وہ کسی شخص کی مہربانی یا بھلائی کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس کی پوری ذات کی تعریف کرنا ضروری سمجھتا ہے، مثلاً اس کا جملہ ہے: ''کائستھ بہر حال فراخ دل اور وفا شعار ہوتے ہیں۔'' اسی طرح سے اس دور کی تحریروں میں ہر جگہ مختلف ذات برادریوں کے درمیان شادی بیاہ کے رشتوں پر پابندی اور ان کے اپنے آبائی پیشوں کو ترک نہ

کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ مغل دور کا سماج کس طرح سے ذات پات کے نظام میں جکڑا ہوا تھا؟ اس کا اندازہ مہاراشٹر کے اٹھارہویں صدی کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ ایک مورخ کا بیان ہے کہ جب کچھ درزیوں نے رنگ ریزی کا پیشہ اختیار کر لیا تو کچھ عرصے بعد ان کو اپنی ذات سے علیحدہ ذات تسلیم کر لیا گیا اور اس کے بعد ان کے اور پرانے درزی ذات کے بیچ شادی بیاہ کا رشتہ ممنوع قرار دے گیا گیا۔

سماجی ماہرین نے یہ بھی درج کیا ہے کہ کس طرح مختلف ذات برادریاں نئے پیشے اختیار کرنے کے بعد ذات پات کے نظام میں اپنا مقام بدل لیتی ہیں۔ انہوں نے اس عمل کو 'سنسکر ٹائزیشن' کا نام دیا ہے یعنی اونچی ذاتوں کی رسوم اور طریقوں کو اختیار کرنا مثلاً نباتات خوری، میت کو جلانے کی رسم، عورتوں کو گھروں کے اندر رکھنے کی رسم اور بیواؤں کی دوسری شادی پر پابندی وغیرہ۔ تاجروں کی مشہور برادری بنیوں کے بارے میں یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں بہت سی ایسی چھوٹی ذاتیں شامل تھیں جو صرف آپس میں ہی شادی بیاہ کے رشتے رکھتی تھیں۔

مذہبی حالات

صدیوں سے ہندوستانی سماج میں مذہبی تکثیریت کی موجودگی معاشرے کی ایک نمایاں خصوصیت شمار کی جاتی ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے مغل عہد کو اس کی عمدہ مثال تصور کیا جاتا ہے، جہاں پر مذہبی تکثیریت کے نتیجے میں ہمیں متحدہ تہذیب و ثقافت کا ایک بے مثال ظہور نظر آتا ہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں مغل حکومت کے قیام کے ساتھ ہی ہندوستانی سرزمین پر مختلف مذاہب، ذات پات، رنگ و نسل اور زبانوں کے بولنے والے لوگ ایک قومیت کے رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔ گرچہ اس کی بنیاد ہمیں ہندوستانی تاریخ کے عہد سلطنت میں ہی پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر جس طرح مغل عہد میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو ایک قومیت کے دھارے میں سمونے کی کوشش نظر آتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مغل دور حکومت میں اس کے مذہبی افق پر ہمیں ہندو، مسلمان، بدھ، جین، سکھ اور عیسائی غرض کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ ملتے ہیں۔ ساتھ ہی اس عہد میں مختلف مذہبی تحریکوں کا ظہور بھی نظر آتا ہے۔ مذکورہ تمام مذاہب کے لوگ اپنے مختلف عقائد و نظریات کے ساتھ مغل دور حکومت میں زندگی بسر کر رہے تھے، ساتھ ہی ایک دوسرے کو متاثر اور ان کے اثرات قبول بھی کر رہے تھے، جس کے نتیجے میں ہمیں گنگا جمنی تہذیب کا ظہور نظر آتا ہے۔

13.3.8 ہندو مذہب

مغل دور حکومت میں عوام الناس کی اکثریت ہندو مذہب کی پیروکار تھی اور اس عہد کی مذہبی صورت حال کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو یہاں پر اسلام اور ہندو مذہب کی ایک دوسرے کے ساتھ موجودگی کو شمار کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندو مذہب اور اسلام مذہب کی کسی ایک ہی تعریف پر پورے نہیں اترتے۔ مغل عہد حکومت 1653ء میں تحریر کی گئی کتاب 'دبستان مذاہب' کے مصنف کا بیان ہے کہ "ہندوؤں میں بہت سے مذاہب اور بے شمار اعتقادات اور رسوم ہیں۔" دوسرے الفاظ میں اس عہد میں ہر اس ہندوستانی کو جو مسلمان نہیں تھا، ہندو کہا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ہندو مذہب کو اسی معنی میں اعتقادات کا ایک نظام تصور نہیں کیا جا سکتا، جس معنی میں ہم عام طور پر اسلام یا دوسرے سامی مذاہب کے سلسلے میں سوچ سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ مختلف ہندو فرقے ایک دوسرے کے

ساتھ تفاعل کے ذریعے سامنے آئے تھے اور یہ تفاعل بڑی حد تک ایک مخصوص علمی زبان یعنی سنسکرت کے ذریعے ہی ممکن ہو سکا تھا۔ اس کے نتیجے میں مختلف ہندو فرقے نہ صرف ایک ہی قسم کی مذہبی اصطلاحات کا استعمال کرتے تھے بلکہ اکثر ان کے دیوتاؤں میں بھی مماثلت تھی۔ 'دبستان مذاہب' کی تصنیف سے تقریباً ساٹھ سال قبل 1595ء میں ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں ہندوؤں کے مذہبی عقائد کے بارے میں ایک تفصیلی اور جامع بیان درج کیا تھا۔

مغل عہد میں لکھی گئی ہندو مذہب کی مذہبی تحریروں میں راسخ العقیدہ ہندو مذہب کے ان تمام بنیادی عناصر پر زور دیا جاتا رہا، جن کا ذکر 'آئین اکبری' اور 'دبستان مذاہب' میں کیا گیا ہے۔ مثلاً نارائن بھٹ کی 1600ء کے آس پاس لکھی گئی کتاب 'مان میودیہ' میں 'می ماسا' کے فلسفے پر بحث ملتی ہے۔ اس فلسفے کے مطابق تناسخ کا عمل خود بخود جاری رہتا ہے۔ یہ ایک طرح سے زندگی کا آزاد عمل ہے، جس میں کسی ایک وقت میں روح کا مقام پچھلے مقاموں میں اس کے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ 'دبستان مذاہب' کے مصنف کے مطابق ہندوؤں میں یہ ایک عام اعتقاد تھا کہ دنیا کو بنانے والا ایک خدائے واحد ہے لیکن مخلوق کی زندگیاں ان کے پچھلے اعمال ہی سے متعین ہوتی ہیں۔ گویا اب مذہب کی کنجی وہ اعمال تھے جو اسمرتیوں کے مختلف مدارس نے طے کیے ہیں۔ اس میدان کے روایتی نظریوں پر اسمرتیوں کی تازہ ترین تحریروں میں برابر زور دیا جاتا رہا۔ 1567ء کے قریب بنگال میں نوادیپ کے راگھو نندن نے اپنی کتاب 'اسمرتی تتّوا' تصنیف کی۔ یہ کتاب رسوم اور وراثت سے متعلق مسائل پر بہت معتبر مانی جاتی ہے۔ 1612ء میں کملاکار بھٹ کے ذریعے لکھی گئی کتاب 'نرنیاسندھو' کو مہاراشٹر میں مذہبی اور قانونی امور سے متعلق معتبر تصور کیا جاتا تھا۔ اس کتاب میں راگھو نندن کا ایک استاد کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح جہاں گیر کے عہد میں مترامشرا نے ہندو قانون سے متعلق ایک اہم کتاب تصنیف کی۔ ان تحریروں میں پیش کردہ نظریوں سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ گزرے زمانے کی اسمرتیوں میں ذات پات کے نظام کے بارے میں جو قواعد وضع کیے گئے تھے، ان سے کسی بھی قسم کا انحراف پیدا ہو رہا تھا۔ عام طور پر ان سب تحریروں میں ان بندشوں کو دہرایا بلکہ بڑھا کر بیان کیا گیا ہے جو پرانی اسمرتیوں میں نچلے طبقات اور عورتوں پر عائد کی گئی تھیں۔ راگھو نندن نے یہاں تک کہہ دیا کہ برہمن اکیلی ایسی ذات ہے، جس کو دوبارہ پیدا ہونے والی یعنی اونچی ذات شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مطابق چھتری اور ویش طبقے کے لوگ اس کے زمانے تک شودروں کے درجے پر پہنچ چکے تھے۔

بھکتی سے متاثر فرقے

ہندو مذہب کے اعتبار سے سولہویں اور سترہویں صدی بجا طور پر ویشنو مذہب کی صدیاں قرار دی جائیں گی۔ شمالی ہندوستان میں شری رام کی پرستش سے عبارت اس مذہب کے سب سے بڑے مبلغ تلسی داس تھے، جنھوں نے اپنی کتاب 'رام چرتر مانس' میں رامائن کی کہانی کو بڑے مقبول انداز میں پیش کیا۔ تلسی داس بھکتی کے شوق اور ولولے سے پر اپنی شاعری میں ایک ایسے رام کی تصویر پیش کرتے ہیں کہ جو منصف تھا وہ ایک اوتار کے درجے سے اٹھ کر ذات باری تعالیٰ کے مقام پر پہنچ گیا تھا اور جسے تضاد قدر پر پورا اختیار تھا۔ بنگال کے رہنے والے برہمن پروہت چیتنیہ نے کرشن اور رادھا کی پرستش کی ایسی رسم شروع کی، جس میں ایک بھکت اپنے خداوند کے نام کے تکرار کے ذریعے اپنے آپ کو ایسی ذہنی اور جذباتی حالت میں پہنچا دیتا تھا جہاں وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس نے بندرابن میں کرشن کی رفیقہ کی جگہ

حاصل کرلی ہے اور وہ عشق کے ان تمام مدارج کا تجربہ کرتا ہے جن سے کرشن گزرے تھے۔ ان ذہنی تجربات کے ذریعے ایک بھکت ذات باری تعالیٰ کے ساتھ وصال کی کیفیت کا تجربہ کرتا تھا۔ گرچہ چیتنیہ کے زیادہ تر پیروکار بنگال میں ہی تھے لیکن انہوں نے اپنے خلفاء کو جنہیں گوسوامی کہا جاتا تھا، بندرابن میں متعین کیا تھا۔ ان گوسوامیوں نے اپنی سنسکرت تحریروں کے ذریعے اس مخصوص مذہبی رجحان کو فلسفیانہ اساس دی اور اس کے رسوم طے کیے۔ اپنے پیروکاروں کے لیے چیتنیہ خود بھی کرشن اور رادھا کے اوتار کا درجہ رکھتے تھے۔ گرچہ عام زندگی میں چیتنیہ کے ایک پیرو گھر بار کی ذمے داری اٹھانے والا شخص ہوتا تھا جو ذات پات کے نظام کے تمام شرائط کو پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اس مخصوص مذہبی رجحان میں نچلی ذات کے لوگوں کو پرستش کے حق سے محروم نہیں رکھا گیا تھا۔ اسی رجحان سے نکلنے والے اٹھارہویں صدی کے سہجیہ فرقے میں سمرتیوں کی تعلیمات کو قطعی طور پر برطرف کرکے کئی قسم کے شاکتک اور تانترک معمولات جاری کیے۔ آسام میں ایک دوسرا ویشنو فرقہ شروع ہوا جو چیتنیہ کے فرقے سے ملتا جلتا تھا۔

مہاراشٹر کے علاقے میں ویشنو تحریک کے وحدانیت کی طرف مائل ہونے کے ساتھ اس میں کئی قدامت پسند عناصر بھی موجود تھے۔ ایکناتھ (وفات 1599ء) نے بھکتی کے ایسے اصول وضع کیے، جن کی رو سے ہر ذات کے مردوں اور عورتوں کو ایک جگہ جمع ہوکر خداوند کی حمد و ثنا کرنے اور کیرتن میں شریک ہوکر حال و وجد کا مزہ لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ وہ جذبہ سے عاری رسوم کے قائل نہیں تھے۔ تکارام (وفات 1649ء) جن کا پیشہ کاشت کاری تھا اور شودر ذات سے تعلق رکھتے تھے، ممکن ہے کہ چیتنیہ فرقے سے متاثر رہے ہوں، لیکن اپنی عبادت میں وہ 'ویٹھوبہ' دیوتا سے رجوع کرتے تھے۔ تکارام کے خداوند وٹھل اور چیتنیہ کے کرشن کی بہ نسبت وحدانیت پرست کبیر کے رام سے زیادہ مشابہ تھے۔ وہ اپنی گیتوں میں یہ کہتے تھے کہ ہر پجاری چاہے اس کا سماجی درجہ کتنا ہی نیچا کیوں نہ ہو، اپنے خداوند تک پہنچ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اللہ کا نام استعمال کرنے میں بھی انہیں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اس سلسلے میں رام داس (وفات 1681ء) کا رویہ کسی قدر مختلف ہے۔ وہ ایک خداوند کی شکل میں رام کی پرستش کے ساتھ 'دھرم' کی بھی تائید کرتے تھے۔ 'دھرم' سے ان کا مطلب 'مہاراشٹر دھرم' تھا، جس کی رو سے برہمنوں اور دیوی دیوتاؤں کی حرمت برقرار رکھنا ضروری تھا۔ انہوں نے مٹھ یعنی سنیاسیوں کے مراکز قائم کیے، جنہیں مراٹھا حکمراں شیواجی (وفات 1680ء) کی سرپرستی حاصل تھی۔

کبیر اور تحریک وحدانیت

بنارس کے بُنکر کبیر (وفات 1518ء) کی تعلیمات نے ہندوستان کی مذہبی فکر میں زبردست تبدیلی پیدا کردی تھی۔ ان کی شاعری میں ایک طرف تو ویشنو، ناگ پنتھی اور بعض اوقات تانترک اعتقادات کے پردے میں بے پناہ وحدانیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ دوسری طرف اس میں اسلامی وحدانیت کے منطق کو پوری طرح قبول کرنے کے ساتھ اسلامی دینیات کو مسترد کیے جانے کا رویہ بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ کبیر نے اپنے خیالات لازمی طور پر ایسی زبان میں پیش کیے ہیں جن کو اسلامی ثقافت کے دائرے سے باہر کے لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔

13.3.9 جین مذہب

مغل عہد حکومت میں جین مذہب کے خاص اثر کا علاقہ گجرات تھا، پھر بھی اس مذہب کے لوگ دوسری جگہوں پر بھی مل جاتے تھے۔ جین مذہب کی تحریریں گجراتی، سنسکرت، پراکرت، برج، کناڈا اور دوسری زبانوں میں ملتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ یا تو مقدس ہستیوں کے حالات پر مبنی تحریریں ہیں یا پھر ہر کتاب یکساں باتیں دہراتی ہے۔ مغل عہد حکومت میں جدلیات کے بارے میں جینیوں کا تصور سب سے پہلے یشووجیا جی نے 1670ء میں لکھی اپنی کتاب 'جین ترک بھاشا' میں پیش کیا۔ مغل عہد میں یشووجیا جی نے کئی اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ وجے نگر سلطنت میں جینیوں کے دونوں فرقے شویتامبر اور دیگامبر پھل پھول رہے تھے۔ جین پروہتوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اکبر کے دربار میں ان کے بڑے اثر و رسوخ تھے۔ اس عہد میں جین فرقے کے عام لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں بنیہ اور بوہرہ ذاتوں کے تاجروں تک محدود ہوتے گئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اناج فروخت کرتے تھے اور کچھ نوکری پیشہ بھی تھے۔

13.3.10 سکھ مذہب

سولہویں صدی عیسوی میں سکھ مذہب دنیا کے منظرنامے پر ظاہر ہوا اور اب اس کا شمار دنیا کے چند معروف مذاہب میں ہوتا ہے۔ اس مذہب کی ابتدا گرونانک کے مریدوں پر مشتمل ایک فرقے کی طرح ہوئی تھی۔ گرونانک پنجاب کے ایک کھتری تھے۔ اس فرقے کے وجود میں آنے کی تاریخ بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ اس زمانے کے دوسرے وحدانیت پرست عوامی فرقوں کی تھی۔ سکھوں کی مقدس کتاب 'گروگرنتھ صاحب' میں گرونانک اور بعد کے دوسرے گروؤں کا کلام شامل ہے، اسے گرو ارجن دیو نے 1604ء میں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں سکھ گروؤں کے علاوہ مسلمان صوفی شیخ فرید اور نام دیو، کبیر، رام دیو اور بعض دوسرے بھگتوں کے کلام اسی طرح شامل ہیں، جس طرح ان کو دادوپنتھیوں کی کتاب 'پنچ وانی' اور رجب داس کی 'سربنگی' میں جگہ ملی ہے۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کم سے کم سترہویں صدی کی ابتدا تک گرونانک کے مریدوں میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ وہ وحدانیت سے عبارت رجحان کا ایک حصہ ہیں۔ گرچہ چند ایسی باتیں ضرور تھیں، جو نہ صرف طرز بیان کی رعایت سے بلکہ بعض اہم مسائل پر بھی اس عمومی رجحان میں شامل عناصر کو ایک دوسرے سے جدا کرتی تھیں۔

13.3.11 اسلام

مغل عہد حکومت میں اسلام ہندوستان کا دوسرا بڑا مذہب تھا۔ اس کے ساتھ حکمرانوں کا مذہب ہونے کی وجہ سے ایک طرح سے اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی اسلام کو مغل حکومت کا سرکاری مذہب نہیں قرار دیا جاسکتا، کیوں اسلام حکمرانوں کا مذہب ضرور تھا لیکن انہوں نے کبھی بھی اسے سرکاری یا حکومتی مذہب کے بطور عوام الناس پر نہیں تھوپا بلکہ انہوں نے مذہبی رواداری کی پالیسی کو اختیار کرتے ہوئے ہر ایک کو یہ حق دیا کہ وہ جس مذہب کی چاہیں پیروی کریں۔ اسی وجہ سے ہمیں مغل عہد کے ہندوستان میں مذہبی تکثیریت کا فروغ بڑے پیمانے پر نظر آتا ہے اور مختلف مذاہب کی مذہبی تحریکیں ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

اکبر کے عہد حکومت (1556-1605ء) میں مذہبی افکار و خیالات کی سطح پر جو زبردست دھماکے ہوئے، ان کی ابتدا کسی حد تک ان فکری محرکات یعنی وحدت الوجود اور مہدویت میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ اکبر کی ابتدائی مذہبی دلچسپی روایتی اسلام کے دائرے میں ہی تھی۔ اس نے مشہور شہر فتح پور سیکری، جہاں سب سے شان دار عمارت جامع مسجد کی ہے 1570 میں شیخ سلیم چشتی کے اعزاز میں تعمیر کروایا تھا۔ 1570ء میں شیخ تاج الدین نے، جو ابن عربی کے خیالات کے حامی تھے، ان کے نظریات کو دربار میں متعارف کرایا۔ شیخ مبارک (وفات 1593ء) جو نہ صرف شہاب الدین مقتول کی اشراقی تعلیمات سے واقفیت رکھتے تھے بلکہ ان کے بارے میں بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ مہدویت سے متاثر تھے، اسی دوران دربار میں ان کا اثر بھی بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ 1582ء میں اکبر نے حکم جاری کیا کہ 'تاریخ الفی' مرتب کی جائے، جو محمدؐ کی رحلت کے بعد گزرے ہزار برسوں کی تاریخی واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس حکم کے پس پردہ عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ محمدؐ کی رحلت کے پہلے ہزار سال کے آخر میں کوئی بڑی تبدیلی ہوگی، جس کے لیے کسی مجدّد کا ظہور لازمی ہے۔ کوشش یہی تھی کہ اکبر کو ایک مصلح کے طور پر پیش کیا جائے اور دوسری طرف اس کو ابن عربی کی روایت کے 'انسان کامل' کے پیکر میں بھی دیکھنا تھا۔ 'انسان کامل' کے تصور کو استعمال کرنے کی ایک ابتدائی کوشش وہ تھی جو 1579ء کے محضر میں ملتی ہے۔ یہ ایک بیان تھا، جس پر درباری علماء کے دستخط تھے۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ بحیثیت ایک منصف سلطان کے اکبر کو مسلم قانون کی تعبیر و توجیہ کرنے کا حق ہے اور تمام مسلمانوں کے لیے اس تعبیر و توجیہ کو تسلیم کرنا لازمی ہوگا۔

لیکن وحدت الوجود کے بڑھتے ہوئے اثرات کے نتیجے میں جلد ہی معاملات اس صورت حال سے بہت آگے نکل گئے، جس میں محضر کے ذریعے شہنشاہ کو بعض محدود قسم کے اختیارات دیے گئے تھے۔ اکبر کی موجودگی میں اب سنی علماء کے نمائندوں کے درمیان مباحث شروع ہوئے۔ یہ مباحث فتح پور سیکری میں واقع ایک مخصوص عمارت 'عبادت خانہ' میں پیش آتے تھے۔ پھر ان مباحث میں مختلف فرقوں کے مسلم علماء یعنی شیعہ، سنی اور صوفی کے علاوہ معقولات کے عالم بھی شریک ہونے لگے۔ اس کے کچھ عرصے بعد برہمن عالم، ہندو سنیاسی، جینی، پارسی اور عیسائی بھی شریک ہونے لگے۔ عیسائی اکبر کے دربار میں پہلی بار 1580ء میں پہنچے۔ ان مباحث کے نتیجے میں اکبر کے مذہبی نظریات تبدیل ہونے شروع ہوئے اور اسے اس بات کا یقین ہو چلا کہ اسلام کی کوئی ایک تعبیر ایسی نہیں جو پوری طرح یا قریب قریب صحیح ہو۔ اسے اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ کوئی ایک مذہب اکیلا سچا مذہب نہیں ہے بلکہ اس کے خیال میں سبھی مذاہب حق کے ایک مرکز سے کسی نہ کسی حد تک روشنی حاصل کرتے ہیں۔ اب وہ یہ سوچنے لگا کہ اللہ کی طرف سے ایک مخصوص بااختیار انسان کی حیثیت میں اس کی ذمے داری ہے کہ مختلف مذاہب اور گروہوں کے درمیان بے مقصد تنازعوں کو ختم کرنے کے لیے ان کے درمیان 'صلح کل' قائم کرے۔ اپنے مریدین و متبعین کے لیے اکبر نے یہ تجویز کیا تھا کہ وہ اپنے بادشاہ اور پیر و مرشد کی مکمل اطاعت کریں۔ ان کے لیے جو ضابطۂ اطوار تیار کیا گیا تھا، اس کو جہاں گیر نے مختصراً ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''مریدین و متبعین پر واجب ہے کہ وہ کسی دوسرے مذہب کے لوگوں سے عداوت میں اپنے اوقات ضائع نہ کریں۔ تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں انہیں 'صلح کل' کی راہ پر گام زن رہنا چاہیے۔ انہیں اپنے ہاتھ سے کسی جانور کو مارنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ انہیں میدان جنگ اور شکار کے علاوہ کسی اور جگہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر نہیں

جانا چاہیے۔ سورج اور چاند کی عزت کرنی چاہیے، کیوں کہ یہ دونوں اپنے مقدور کے مطابق خدائی روشنی پھیلاتے ہیں۔ خدا کو ہر حال میں خالق حقیقی اور علت دائم تسلیم کرنا چاہے اور ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اکیلے ہو یا دوسروں کے ساتھ، اس کا دھیان ایک لمحے کے لیے بھی خدا سے ہٹنے نہ پائے۔"

اکبر نے تمام مذاہب کے ساتھ یکساں سلوک کیے جانے کی پالیسی اختیار کی تھی، جو ان کو محض انگیز کر لینے کے رویے سے بہت مختلف چیز تھی۔ یہ پالیسی ان نئے خیالات سے مطابقت رکھتی تھی جو اکبر نے 1580ء کی دہائی میں اختیار کیے تھے۔ اس پالیسی کے مطابق مذہبی خیالات کے اظہار کی مکمل آزادی، تبدیلی مذہب اور مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں کی تعمیر کی اجازت دی گئی تھی۔ اکبر کے خیالات میں یہ تبدیلی اس صورت حال سے بھی متعین ہوئی کہ سیاسی لحاظ سے مذہبی رواداری کا رویہ بہت کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسی پالیسی اس زمانے سے بہت پہلے ہی اختیار کر چکا تھا، جب اپنی زندگی کے آخری پچیس برسوں میں اس نے ایک نیا ترقی یافتہ فلسفہ زندگی اختیار کیا۔ اکبر کے وزیر ابوالفضل نے اعلان کیا کہ بادشاہیت فرّایزدی' یعنی وہ روشنی ہے جو ذات باری تعالیٰ کا حصہ ہے اور حکمراں خدا کی طرح تمام انسانیت کا پرورش کرنے والا ہے۔ اس لیے حکمراں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں مذہبی اختلافات کی بنا پر آپسی نفرت کی دھول نہ اڑے۔ اس بیان کے بارے میں یہ بات قابل غور ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی فلسفیانہ یا مذہبی روایت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے تانے بانے حکمراں کی مطلق العنانی سے عبارت اختیارات اور رعایا کو مطمئن رکھنے کی اس کی ذمے داریوں سے ملتے ہیں۔

مغل دربار میں صلح کل اور وحدت الوجود جیسے تصورات کی اشاعت کے اہم نتائج برآمد ہوئے اور سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ یکایک ملک بھر میں دینیات اور اخلاقیات کے نہایت نازک پہلوؤں کو لے کر مسلمہ اور مروّجہ اعتقادات پر تنقید کی جانے لگی۔ اس بحث نے اسلامی حلقوں میں شیعیت کے رجحان کے لیے ایک جگہ پیدا کر دی۔ گرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس سے پہلے بھی شیعہ اور سنّی فرقوں کے درمیان معاندانہ بحث جاری تھی۔ لیکن اس صورت حال کے نتیجے میں جہاں ایک طرف راسخ العقیدہ مذہبی نقطہ نظر کو شدت اور اصرار کے ساتھ بیان کیا گیا، وہیں دوسری طرف اس رجحان نے سائنسی اور معقولیت میں عام دلچسپی کو نئے سرے سے بڑھاوا دیا۔ بالآخر مسلمانوں میں ایک نہایت اہم تحریک یہ پیدا ہوئی کہ ہندو مذہبی تحریروں اور ان کے یہاں پائی جانے والی وحدانیت کا مطالعہ یہ سمجھنے کے لیے کیا جائے کہ ہندوؤں میں 'حق' کا کیا تصور ہے؟ اکبر نے کئی سنسکرت تحریروں کے ترجمے کروائے، جن میں 'اتھروید، مہابھارت، رامائن' اور 'یوگ وششٹھ' جیسی تحریریں شامل تھیں۔ 'آئین اکبری' میں ابوالفضل نے فلسفہ کے مختلف ہندو مدارس فکر، ان کی دینیات، اعتقادات اور قوانین وغیرہ کا بھی نہایت درست اور اچھے انداز میں تذکرہ کیا ہے، جو قدیم تحریروں کے جدید مطالعے پر مبنی تھا۔ اس کے مطابق قدیم تحریروں کا ترجمہ کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئی تھیں۔ لیکن ان تحریروں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوا کہ اسلام اور ہندو مذہب کے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ ابوالفضل کے بقول: "گرچہ بعض مطالب اور دلائل میں اختلاف کی گنجائش ہے لیکن یہ ظاہر ہو گیا کہ ہندو بھی خدا کی عبادت اور وحدت میں یقین رکھتے ہیں۔"

مغل عہد میں مسلمانوں کی طرف سے ہندو مذہب کو سمجھنے کی کوششوں کا نقطۂ عروج داراشکوہ (1615-1659ء) کی دانشورانہ

کارگزاریوں میں ملتا ہے۔ داراشکوہ نے اپنی دانشورانہ روش کی ابتدا مسلم تصوف کے مطالعے سے کی، جس کے دوران وہ میاں میر (وفات 1636ء) اور ملا شاہ بدخشی (وفات 1661ء) کے ذریعہ قادریہ سلسلے سے متعلق ہو گیا تھا۔ اس کی ابتدائی تحریریں مسلم صوفیوں کے حالات سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن وحدانیت کے تصور اور صوفیوں کے اطوار میں اس کی دلچسپی نے بالآخر اس کو 1654-55ء میں 'مجمع البحرین' تصنیف کرنے پر آمادہ کیا۔ اس تحریر میں داراشکوہ نے ہندو روحانیت پر مرکوز بیانات میں استعمال ہونے والے اہم الفاظ اور تصورات کی توضیح کی ہے۔ اس توضیح میں داراشکوہ کا موقف بلکہ اصرار ہے کہ تلاش حق میں سرگرداں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زبان کے علاوہ ہر چیز یکساں ہے۔ 1657ء میں اس نے اپنشدوں کا ترجمہ 'سرالاسرار' کے عنوان سے کیا۔ اس کتاب میں سنسکرت کی بعض وقیع تحریروں کا نہایت صحیح ترجمہ ملتا ہے۔ فلسفیانہ نقطہ نظر سے تحریر کی گئی یہ اس کی سب سے اہم کوشش تھی۔ 1655-56ء میں داراشکوہ کی ایما پر حبیب اللہ نے 'یوگ وششٹھ' کا ایک نیا ترجمہ کیا۔

مغل دور حکومت کی علمی فضا کی نمائندگی اس عہد میں مذہب کے موضوع پر تحریر ہونے والی کتاب 'دبستان' کرتی ہے۔ اس کتاب کو 1653ء میں ایک ایسے مصنف نے تالیف کیا جسے اپنا نام اور مذہب ظاہر کرنے میں تامل تھا، لیکن اس نے اپنی اس تحریر میں کئی ایسی باتیں لکھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پارسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا تخلص 'موبد' تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ تمام مذاہب کا سچائی پر مبنی اور ہر قسم کے تعصب سے مبرا حال تحریر کرے۔ اس نے اپنی کتاب میں پارسی، ہندو، بدھ، یہودی، عیسائی اور اسلام جیسے مذاہب کے احوال کے ساتھ ان میں سے ہر مذہبی روایت کے اندر موجود مختلف فرقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس موضوع پر زیادہ تر مواد مصنف نے خود یکجا کیا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے ہر مذہب اور فرقہ کی نمائندہ تحریروں کے مطالعے کے علاوہ ان مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے گفتگو کے ذریعے بھی اطلاعات جمع کی تھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے کئی زبانوں پر خاصا عبور حاصل تھا۔ گرچہ 'دبستان' کا مصنف پارسی مذہب کا فرد تھا لیکن جس زبان میں اس نے اپنی کتاب تصنیف کی اس کے پڑھنے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ اس کتاب کے بے شمار مخطوطوں کی موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فارسی پڑھنے والوں میں یہ کتاب بہت مقبول تھی، جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔

اکبر کے عہد حکومت میں مذہب اور مباحث کی جو آزادی فراہم کی گئی تھی اس کے نتیجے میں شیعیت کو ایک گمراہ کن فرقے کے بجائے ہندوستان میں اسلام کی ایک مختلف شکل کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ قاضی نوراللہ شستری (1549-1610ء) پہلے اثنا عشری عالم ہیں، جنہوں نے ہندوستان میں اپنی اہم تصنیفات چھوڑی ہیں۔ انہوں نے تقیہ کے رویے کو بر طرف کرتے ہوئے کھل کر شیعی اعتقادات کے دفاع اور فروغ میں سنی نکتہ چینی کا جواب دیا۔ ان کے لیے ایسا کرنا اس لیے ممکن ہو سکا کہ اکبر نے مذہبی آزادی کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جہاں گیر کے حکم سے جسمانی ایذا پہنچائے جانے کے نتیجے میں 1610ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس بنا پر انہیں شیعہ فرقے کے شہیدوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایران سے نقل مکانی کر کے آنے والے بہت سے افراد، جو زیادہ تر شیعہ تھے، مغل سلطنت میں اونچے عہدوں پر فائز ہوئے اور شیعہ مذہبی رسوم کھل کر ادا کی جاتی تھیں۔ سترہویں صدی عیسوی میں حیدرآباد دکن اور اٹھارہویں صدی میں لکھنؤ اور فیض آباد شیعہ علوم و فنون

کے اہم مرکز بن گئے تھے۔

اکبر کے دور حکومت میں مذہبی اور فکری آزادی کے جو رجحانات اور میلانات ابھر کر سامنے آئے ان کے خلاف سنی مسلمانوں کے تقلیدی گروہ نے مختلف زاویوں سے اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ یہ ردعمل کتنے شدید اور متفرق تھے، اس کا اندازہ شیخ احمد سرہندی (1564-1624ء) کے افکار وخیالات سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی سب سے پہلی دستیاب تحریر 'رسالہ ردّ روافض' میں شیعہ اعتقادات کی تردید کی کوشش ہے۔ شریعت سے متعلق ان کے متشددانہ انداز فکر کا اظہار اکبر کی روادارانہ سیاسی حکمت عملی کے ردّعمل میں ہندوؤں اور ہندو اعتقادات کی سخت تنقید کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اکبر کے انتقال کے بعد لکھے گئے اپنے خطوط میں انہوں نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اسی دوران 1600ء میں وہ نقش بندی صوفی باقی باللہ (وفات 1603ء) کے مرید بن گئے۔ اس کے بعد انہیں ابن عربی کے وحدت الوجود اور انسان کامل کے تصورات سے ماخوذ نظریات میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ لیکن ان نظریات کو انہوں نے محض فروعی طور پر تسلیم کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ سالک کو اس نظریے کے ماوراء جاکر ہجر کی تکلیف کا تجربہ کرنا چاہیے۔ ان کے لیے وحدت الوجود کا مطلب تھا 'وحدت الشہود'۔ کیوں کہ بالآخر ان کی نظر میں ذات باری تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ ان کے مطابق شریعت کی سختی کے ساتھ پابندی ایک صوفی کے لیے اتنی ہی لازمی ہے جتنی کسی دوسرے شخص کے لیے اور اس کے ساتھ وہ ہر قسم کی بدعتوں اور خرافات کی مذمت کرتے تھے۔ اورنگ زیب نے عام طور پر روایتی اسلام کے شرعی احکام کو زیادہ اہمیت دی۔ اس بات کی سب سے عمدہ مثال اسلامی شریعت اور قانون کے موضوع پر اس کے ذریعے تیار کروائی گئی کتاب 'فتاویٰ عالم گیری' ہے۔ اس کتاب کو شیخ نظام نے عالموں کی ایک پوری جماعت کی مدد سے عربی زبان میں اس طرح تیار کیا تھا کہ وہ مختلف مسائل پر فقہاء کی آرا کا ایک مثالی مجموعہ بن جائے۔ اس کتاب میں مسائل کو موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔

13.3.12 عیسائیت

ہندوستان میں مغل دور حکومت میں پائے جانے والے مذاہب میں ایک اہم نام عیسائیت کا بھی ہے۔ یورپی نشاۃ ثانیہ کے بعد اور خاص طور پر نوآبادیاتی عہد کی ابتدا میں دنیا میں عیسائیت کا عروج بڑے پیمانے پر شروع ہوا، لیکن ان تمام سے پیش تر کیرالا کے ساحل پر ایک لمبے عرصہ سے عیسائی اور یہودی مذہب کے لوگ رہتے چلے آرہے تھے اور بحر احمر سے ہونے والی تجارت کے ذریعے ان لوگوں کا عیسائیت اور یہودی مذہب کی مشرقی شاخوں سے تعلق قائم رہا۔ پرتگالی تاجروں کے ساتھ ہندوستان میں کیتھولک عیسائیت کا بھی ظہور ہوا۔ فرانسس زیویر (1506-1552ء) پہلا عظیم کیتھولک مبلغ تھا جو ہندوستان آیا۔ اٹلی کے رہنے والے ایک دوسرے عیسائی مشنری رابرٹ ڈی نوبلی (1577-1656ء) نے عیسائیت کو ہندوستانی طرز میں پیش کرنے کی غرض سے اونچی ذاتوں اور دلتوں کے لیے الگ الگ کلیسے قائم کیے۔ عیسائیت سے متعلق تحریروں کو ہندوستانی زبانوں میں شائع کرنے کے لیے عیسائی مشنریوں نے چھاپہ خانے کا استعمال کیا۔ 1557ء میں گوا کو آرچ ڈیوسیز (Archdiocese) یعنی ایک آرچ بشپ کے رہنے کے مقام کا درجہ مل گیا۔ پرتگال کے زوال کا اثر ہندوستان کے کیتھولک کلیسا کی کارکردگی پر بھی پڑا۔ سیرین عیسائیوں کے کئی گروہوں نے جو پرتگالیوں کے زیر اثر پاپائے روم کو اپنا سربراہ تسلیم کرچکے تھے

1653ء میں دوبارہ اینٹوک (Antioch) سے اپنا تعلق قائم کر لیا۔ 1759ء میں پرتگال نے بھی عیسائی سلسلے کو غیر قانونی قرار دے دیا، لیکن ایک لمبے عرصے تک کیتھولک عیسائی فرقہ ہی نصرانی عقائد کا واحد ایسا گروہ تھا، جس سے ہندوستان کے لوگ واقف تھے۔ 'دبستان مذاہب' کے نصرانی عقائد کے باب میں کیتھولک تعلیمات کا بہت ہی صحیح اور تفصیلی بیان ملتا ہے لیکن اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف پروٹسٹنٹ اصلاحی تحریک سے قطعی ناواقف تھا۔

مارٹن لوتھر کی تعلیمات کو پھیلانے والے پہلے مشنری ڈنمارک کے تاجروں کے ساتھ 1706ء میں تامل ناڈو کے ٹرانکوبرنامی مقام پر پہنچے۔ ان مشنریوں میں ایک زی گینبالگ (Ziegenbalg) تھا، جس نے 1714ء میں چاروں آسمانی کتابوں کا تامل زبان میں ترجمہ کیا۔ ابتدائی ادوار میں ہندوستان میں فروغ پانے والے ہندو اور مسلم دونوں قسم کے مذہبی افکار پر عیسائیت کا بہت کم اثر پڑا۔ انیسویں صدی کے اوائل سے عیسائیت کے اثرات کسی قدر اہمیت اختیار کر چکے تھے۔

13.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مغل دور حکومت میں حکمرانوں نے اپنی عوام کو انصاف کی فراہمی کے لیے بڑے پیمانے پر کوششیں کیں۔ اس کے لیے انہوں نے مغل انتظامی ڈھانچے کی بنیادی اکائی یعنی گاؤں کی سطح سے لے کر مرکزی سطح تک مختلف قسم کی عدالتوں کا سلسلہ قائم کیا تاکہ عوام الناس کو انصاف کے حصول میں کسی بھی قسم کی پریشانی اور ایذا نہ پہنچے۔ ان عدالتوں کو فعال بنانے کے لیے انہوں نے ان میں مختلف قسم کے افسروں، عہدیداروں اور کارکنان کا تقرر کیا۔ تاکہ عوام کو اپنے معاملات کا فوری حل مل سکے۔
- مغل دور کی سماجی حالت کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی تاریخ کے پچھلے ادوار کی طرح اس دور میں بھی معاشرہ مختلف طبقات میں منقسم رہا۔ گرچہ مغلوں نے سماج کے طبقاتی نظام کے ان بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کی لیکن انہیں اپنے اس مقصد میں کوئی بڑی کامیابی نہ مل سکی اور لوگ اونچی نیچی ذاتوں میں ہی منقسم رہے۔ حرفے اور پیشے کی بنیاد پر ہی لوگوں کی پہچان ہوتی رہی۔
- مغل عہد حکومت کی مذہبی حالت بہت حد تک قابل رشک شمار کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں اس عہد کی سب سے اہم بات مذہبی تکثیریت ہے۔ مغلوں نے عوام الناس کو یہ اختیار دیا کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار کے اعتبار سے جس مذہب کو چاہیں مانیں، جس کی چاہیں عبادت کریں۔ اس عہد میں مذہبی افکار و نظریات کو بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ نئی تحریکیں وجود میں آئیں اور انہوں نے لوگوں کو مذہب کے معاملات میں کھل کر غور و فکر کا موقع فراہم کیا۔

13.5 نمونہ امتحانی سوالات

13.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. اکبر بادشاہ نے اپنی عدالت شاہی کے لیے کون سا دن مختص کیا تھا؟

(a) پیر (b) منگل (c) بدھ (d) جمعرات

2. مغل دور میں عوام کی ایک کثیر تعداد دیہی علاقوں میں سکونت پذیر تھی۔ دیہی علاقوں سے کیا مراد ہے؟

(a) گاووں (b) شہر (c) دارالسلطنت (d) سب صحیح

3. ہندوستان میں عیسائی مذہب کا ظہور کب ہوا؟

(a) پرتگالیوں کی آمد کے ساتھ (b) فرانسیسی کی آمد کے ساتھ (c) انگریزوں کی آمد کے ساتھ (d) مسلمانوں کی آمد سے پہلے

4. ان میں سے کون سا فرقہ بھکتی تحریک سے متاثر ہے؟

(a) جین مذہب (b) سکھ مذہب (c) وشنو تحریک (d) ہندومت

5. اکبر نے صلح کل اور کثیر سماج کے ساتھ امن کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے کونسا مذہب ایجاد کیا؟

(a) سکھ بذہب (b) دین الٰہی (c) اسلام (d) سب غلط

13.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. مغل سماج میں حکمراں طبقے کو ملنے والی مراعات کا جائزہ لیجیے۔
2. مغل عہد حکومت کی مذہبی حالت کا تجزیہ کیجیے۔
3. مغل عہد میں مذہب اسلام کی کیا حالت تھی؟ بیان کیجیے۔
4. مغل دور حکومت میں بھکتی سے متاثر فرقوں پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
5. مغلیہ دور کے سماجی طبقات کا مختصر اتعارف تحریر کیجیے۔

13.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مغل عہد حکومت کے عدالتی نظام کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔
2. صوبائی سطح پر مغل عہد حکومت میں کس کس طرح کی عدالتیں قائم تھیں؟ بیان کیجیے۔
3. مغل دور کی سماجی حالت پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

13.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی، ابن حسن، اردو ترجمہ : عبدالغنی نیازی، مجلس ترقی ادب، لاہور
2. آئین اکبری، ابوالفضل، اردو ترجمہ : مولوی محمد فدا علی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
3. عہد وسطیٰ کا ہندوستان ایک تہذیب کا مطالعہ : عرفان حبیب، اردو ترجمہ: اقتدار عالم خاں
4. اسلام اور ہندوستانی ثقافت : بی این پانڈے، اردو ترجمہ: تقی رحیم، خدا بخش لائبریری، پٹنہ
5. مغل دربار : ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاؤس، لاہور
6. رود کوثر : شیخ محمد اکرام، ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی
7. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ : جلد دوم، ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی

اکائی 14: مغلیہ حکومت میں علمی خدمات

اکائی کے اجزا:

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 مغل عہد میں تعلیمی ترقی

14.2.1 نظام تعلیم

14.2.2 غیر مسلموں کا تعلیمی نظام

14.2.3 مسلمانوں کا تعلیمی نظام

14.2.4 کتب خانے

14.2.5 عورتوں کی تعلیم

14.2.6 علمی وسائنسی اور تکنیکی ترقی

14.2.7 زبان وادب

14.3 فنون لطیفہ

14.3.1 فن مصوری

14.3.2 فن موسیقی اور رقص

14.4 اکتسابی نتائج

14.5 نمونہ امتحانی سوالات

14.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

مغل سلطنت نے ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں غیر معمولی اضافے کیے۔ مغل حکمرانوں نے نہ صرف پورے ملک میں علم و تعلیم کی فضا ہموار کی بلکہ خود بھی اس کے سرپرستوں میں شامل رہے۔ علم و ادب، سائنس و حکمت اور فنون لطیفہ و فن تعمیر سے مغل حکمرانوں کی خصوصی دلچسپی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پورے ملک میں اس کا چلن عام ہو گیا۔ امراء سے لے کر عوام الناس تک سبھی نے اس کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا۔ مغل دور کی تاریخ کے مطالعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علم اور فنون لطیفہ کے میدان میں جتنے اہم کارنامے اس دور میں انجام دیے گئے، شاید اس سے پہلے کی ہندوستانی تاریخ میں اتنے اہم کارنامے انجام نہیں دیے گئے تھے۔ اس وجہ سے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں مغل عہد اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ مغل دور حکومت میں علوم و فنون کے ارتقا کا جائزہ لے سکیں اور اس بات پر گفتگو کر سکیں کہ علوم کی سرپرستی میں کس مغل حکمراں نے کیا رول ادا کیا۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ یہ اس دور کے نظام تعلیم اور اہم علمی شخصیات سے بھی واقفیت حاصل کر سکیں گے۔ اسی طرح اس دور میں تصنیف کی گئی کتب اور فکری رجحانات کا بھی تنقیدی جائزہ پیش کر سکیں گے۔

14.2 مغل عہد میں تعلیمی ترقی

مغل حکمراں تعلیم کے بڑے سرپرست تھے۔ مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر خود اپنے عہد کا ایک عظیم دانش ور اور مصنف تھا۔ وہ نہ صرف عربی، فارسی اور ترکی زبان کا ایک بڑا عالم تھا بلکہ ایک باریک بیں نقاد بھی تھا۔ بابر نے ملک کے عوام کی ہمہ جہت ترقی اور ان کی بھلائی کے لیے جو نظام رائج کیا تھا وہ اس کے جانشینوں کے ادوار میں بھی جاری رہا۔ بابر کے وزیر سید معتبر علی کی کتاب 'تواریخ' سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے محکمۂ تعمیرات عامہ کو اس کے دیگر فرائض کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی سپرد کیا گیا تھا کہ وہ مدارس اور دار العلوم تعمیر کرے۔ یہ محکمہ بعد کے مغل حکمرانوں کے ادوار میں بھی باقی رہا۔ اس حقیقت سے کہ تعلیمی عمارتوں کی تعمیر کا کام مملکت کے ایک محکمے کے فرائض میں شامل کیا گیا تھا، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت تعلیمی امور پر توجہ دیتی تھی۔ بابر کے بیٹے اور جانشین نصیر الدین محمد ہمایوں کو بھی علم اور کتابوں کے مطالعے کا بڑا شوق تھا، علم فلکیات اور جغرافیہ میں اس کی خصوصی دلچسپی تھی۔ ہمایوں نے دہلی میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا اور دہلی کے پرانے قلعے میں شیر شاہ سوری کے ذریعے تعمیر کردہ عمارت شیر منڈل کو، جو عیش و نشاط کے لیے استعمال ہوتی تھی، ایک کتب خانے میں تبدیل کر دیا۔ اسی کے ساتھ مختلف تاریخی حوالوں سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں کا مشہور مقبرہ بھی کسی زمانے میں درس گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

جلال الدین محمد اکبر کا عہد اپنی ہمہ جہت ترقیات کے لیے مشہور ہے، اس دور میں تعلیم اور اس کے فروغ کے لیے نئے زاویے اختیار کیے گئے۔ اکبر نے اعلیٰ تعلیم کے بہت سے ادارے آگرہ اور فتح پور سیکری میں قائم کیے۔ اسی بنیاد پر ابوالفضل کا یہ بیان ہے کہ ”تمام مہذب قومیں اپنے نوجوانوں کی تعلیم کے لیے مدارس قائم کرتی ہیں، لیکن خصوصی طور پر ہندوستان اپنی درس گاہوں کے لیے مشہور ہے۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک پہاڑی پر ایک تعلیمی ادارہ تعمیر کرایا۔ ایسا شان دار تعلیمی ادارہ شاید ہی کسی سیاح نے کسی دوسرے مقام پر دیکھا ہو۔ لالہ سیل چند کا بیان شاید اسی مدرسے کے بارے میں ہو جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ ”اکبر نے اجمیر سے واپسی پر فتح پور کو اپنا دارالحکومت بنایا اور بہت سی عمارتیں وہاں تعمیر کیں، جن میں مدرسہ اور خانقاہ وغیرہ شامل ہیں۔“ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم تعلیمی ادارے کے علاوہ اس شہر میں اور بھی کئی مدرسے تھے، جن کو اکبر کی ایما پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی طرح آگرہ میں بھی کئی مدرسے تھے۔ لالہ سیل چند نے لکھا ہے کہ ایک بہت بڑا مدرسہ اس کے عہد تک آگرہ میں موجود تھا۔ دہلی میں واقع اکبر کے عہد کا ایک مدرسہ ادہم خاں کی ماں اور اکبر کی دایہ ماہم انگا نے تعمیر کرایا تھا۔ ماہم انگا کا مدرسہ دہلی کے اہم مدارس میں شمار ہوتا تھا۔

نورالدین جہاں گیر بھی ترکی اور فارسی زبان کا ایک اہم عالم تھا، اس نے اپنی آپ بیتی 'تزک جہاں گیری' کے نام سے ترتیب دی تھی۔ مورخین کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے کہ حکمراں بننے کے بعد اس نے بہت سے قدیم مدارس کی مرمت کرائی اور بہت سے دوسرے مدرسے تعمیر کرائے۔ اپنی حکومت کے آخری ادوار میں اس نے ایک قانون پاس کیا کہ جب کوئی دولت مند شخص یا کوئی مسافر انتقال کر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی جائیداد حکومت کے ذریعے ضبط کر لی جائے گی اور اسے مدرسوں و خانقاہوں وغیرہ کی تعمیر اور مرمت پر خرچ کیا جائے گا۔ شہاب الدین شاہ جہاں بھی ترکی ادب کے مطالعے کا بڑا شوقین تھا، اس کا معمول تھا کہ رات میں سونے سے پہلے کتابوں کا مطالعہ ضرور کرتا تھا۔ شاہ جہاں نے 'دارالبقا' نامی ایک ادارے کی مرمت کرائی اور دہلی میں ایک نئے کالج کی بنیاد ڈالی۔ شاہ جہاں کے بیٹے داراشکوہ نے ہر طرح کی تعلیمی سرگرمیوں کی سرپرستی کی۔

محی الدین اورنگ زیب نے بھی مسلمانوں کی تعلیم کے فروغ کی کوشش کی، اس نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں مدرسے اور کالج قائم کیے۔ 1678ء میں اورنگ زیب نے گجرات کے قدیم مدارس کی مرمت کے لیے ایک رقم منظور کی۔ اسی طرح 1697ء میں احمد آباد میں اکرام الدین خاں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے کے خرچ سے ایک دارالعلوم تعمیر کرایا اور اورنگ زیب سے اس کے لیے مالی امداد مانگی۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے دو گاؤں موضع سعدرہ، پرگنہ سنولی میں اور موضع سیہا، پرگنہ کڑی میں جاگیر کے طور پر عطا کیے۔ اورنگ زیب کے عہد میں سیال کوٹ مسلمانوں کے علم و فضل کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت کا زوال شروع ہو گیا اور بہادر شاہ اول کے تخت نشین ہونے کے بعد سے رفاہی کاموں کی تعداد کم ہونا شروع ہو گئی۔ اس کے باوجود بھی بہادر شاہ اول کے عہد میں دہلی میں دو مدرسوں کے قیام کا تذکرہ ملتا ہے۔ پہلا مدرسہ غازی الدین خاں نے قائم کیا جو دکن میں نظام خاندان کے بانی آصف جاہ کے والد تھے۔ انہوں نے دہلی کے اجمیری دروازہ کے قریب دارالعلوم تعمیر کرایا تھا۔ دوسرا مدرسہ خان فیروز جنگ نے تعمیر کرایا تھا۔ بہادر شاہ اول کے عہد میں قنوج میں بھی ایک مدرسہ قائم تھا، جو مدرسہ 'فخر المرابع' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ 1722ء میں محمد شاہ کے عہد

حکومت میں نواب شرف الدولہ نے دہلی میں ایک مدرسے اور ایک مسجد کی تعمیر کرائی۔ اسی طرح بعد کے ادوار یعنی عہد زوال میں بھی مغل حکمرانوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے اپنی سلطنت کے مختلف علاقوں میں مدرسے قائم کیے۔

14.2.1 نظام تعلیم

مغل حکومت کے تعلیمی نظام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے یہاں تعلیم کے دو مراحل تھے، ایک ابتدائی تعلیم اور دوسری اعلیٰ تعلیم۔ مغل عہد میں تعلیم کے یہ دونوں مراحل حکومت سے آزاد تھے۔ کیوں کہ مغل حکومت میں سرکاری سطح پر کوئی تعلیم کا شعبہ نہ تھا، جو عوام الناس میں باقاعدہ طور پر تعلیم کے فروغ کی کوشش کرتا اور حکومتی آمدنی کا ایک حصہ اس پر خرچ کرتا۔ اسی وجہ سے بہت سے مؤرخین اس کے لیے مغل حکومت پر تنقید بھی کرتے ہیں، خاص طور پر مغربی مؤرخین کہ مغل حکومت نے اپنی عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے سرکاری سطح پر عملی کوشش نہیں کی۔

یہ حقیقت ہے کہ مغل عہد میں تعلیمی ترقی انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ یہ انفرادی کوششیں مغل معاشرے کے ہر سطح پر نظر آتی ہیں، چاہے وہ حکمراں ہوں یا امراء، جاگیر دار اور زمیندار ہوں یا عوام الناس۔ لوگ اپنے بچوں کی تعلیم کا خود انتظام کرتے، وقت، حالات اور علاقے کے اعتبار سے تعلیم گاہوں میں بچوں کے داخلے کی عمر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن ان تمام کے باوجود بھی مغل عہد کی تعلیمی ترقی تشفی بخش شمار کی جاتی ہے۔ مغل عہد کے ابتدائی دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے اپنے علیحدہ تعلیمی ادارے قائم تھے۔ ہندو والدین عام طور پر اپنے بچوں کو پانچ سال کی عمر میں اسکول بھیجتے، جب کہ مسلمان اپنے بچوں کو چار سال، چار مہینے اور چار دن کی عمر میں مدرسے بھیجتے۔ شاہ جہاں نامہ میں اسے رسم مکتب کہا گیا ہے۔ ایل ایف اسمتھ نے 1801ء میں ملک کے شمال مغربی صوبے میں مسلمانوں کے درمیان اس رسم کے ادا کیے جانے کے طریقوں کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے ایک خط میں وہ اس کی تفصیلات اس طرح تحریر کرتا ہے ”جب بچے کی عمر چار سال، چار ماہ اور چار یوم کی ہو جاتی ہے تو اس کے لیے ایک چاندی کی تختی تیار کی جاتی ہے۔ اس پر سورہ اقرا الکھ دی جاتی ہے اور بچے کے سامنے اسے اس طرح پڑھا جاتا ہے کہ وہ بھی ساتھ ساتھ اسے دہراتا جائے۔ اس وقت ایک استاد اس کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے۔“

اکبر کے عہد حکومت میں مدارس اور جامعات میں تعلیم و تدریس کے نظام کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس عہد میں تعلیم کے میدان میں نئی اصلاحات جاری کی گئیں جو حکمراں کی بے تعصبی اور فراخ دلی کا نتیجہ تھیں۔ مسلم تاریخ اور خاص طور سے ہندوستانی تاریخ میں غالباً اکبر پہلا بادشاہ تھا، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیم کی یکساں طور پر ترقی چاہتا تھا اور اسی دور میں پہلی مرتبہ یہ بھی نظر آتا ہے کہ ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ مدارس اور جامعات میں تعلیم پا رہے تھے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں درج ذیل مضامین کی فہرست دی ہے:

علم الاخلاق، علم ہندسہ، حساب، زراعت، مساحت، فلکیات، جغرافیہ، اقتصادیات، علم رمل، امور خانہ داری، نظم و نسق، طب، منطق، فلسفہ، ریاضی، علم طبیعیات، علم الٰہیات، دینیات اور تاریخ کے علاوہ ہندوستانی علوم مثلاً ویاکرن، نیائے، ویدانت اور پتن جلی یعنی قواعد، منطق، وید اور یوگ۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق اکبر چاہتا تھا کہ طلبہ مدرسوں میں ان مضامین کو پڑھیں۔ اکبر نے جو کچھ تجویز کیا

تھا اس کو عملی جامہ پہنانا ایک مشکل کام تھا، لیکن ابو الفضل یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ان مضامین کے پڑھائے جانے سے مدرسوں میں نئی جان آگئی تھی۔ اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ یہ تمام مضامین ان مدرسوں میں حقیقی طور پر پڑھائے جاتے تھے، کیوں کہ زیادہ تر مدرسوں کا نصاب ہمیشہ کی طرح مسلم دینیات اور اس سے متعلق لاتعداد تحریروں پر ہی منحصر رہا۔ اعلیٰ تعلیم زیادہ تر مدرسوں کے باہر اساتذہ، اپنی ذاتی حیثیت میں ہی دیا کرتے تھے۔ جب طالب علم تحریر، مضمون یا علمی میدان میں عبور حاصل کرلیتا تو اس کو استاد کی طرف سے ایک سند مل جاتی تھی۔

14.2.2 غیر مسلموں کا تعلیمی نظام

مغل عہد حکومت میں ہندو ابتدائی تعلیمی ادارے مندروں سے منسلک ہوتے تھے۔ ان ابتدائی تعلیمی اداروں کا نظم و نسق عوامی تعاون یا اوقاف سے چلایا جاتا تھا اور طلبہ سے کسی قسم کی کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ ان اسکولوں میں مطبوعہ کتابیں نہیں ہوتی تھیں، بچے لکڑی کی تختیوں پر یا اپنی انگلیوں کی مدد سے زمین پر حروف کی مشق کرتے۔ مکمل طور پر حروف تہجی کی مشق کے بعد طلبہ کو مذہبی تحریریں پڑھنے کے لیے دی جاتیں اور برنیر کے مطابق عام طور پر انہیں 'پُران' کی عبارتیں پڑھنے کے لیے دی جاتیں۔

قدیم طرز تعلیم کی طرح اس عہد میں بھی پورے شہر میں اساتذہ کے اپنے گھروں میں تعلیم گاہیں قائم تھیں، جہاں پر طلبہ اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے پہنچتے تھے۔ بنارس کے بعد ہندو علوم اور تعلیم کا دوسرا اہم مرکز مغربی بنگال تھا۔

سولہویں صدی عیسوی میں واسدیو سروبھاؤما نے وہاں پر نیائے کا ایک اسکول قائم کیا تھا جو بعد کے عہد میں متھلا یونیورسٹی کی ہم سری کرنے لگا تھا۔ اسی طرح مغل عہد میں متھلا یونیورسٹی بھی ہندو اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز رہی۔ بہار کا ترہٹ (Tirhut) ڈویژن بھی ہندو اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز تھا، جس میں مظفر پور، مغربی چمپارن، مشرقی چمپارن، ویشالی، سیتامڑھی اور سیوہر کے ضلعے شامل تھے۔

متھرا بھی اس عہد میں ہندو تعلیم کا ایک اہم اور مشہور مرکز تھا، جسے ہندو فلسفے کی تعلیم کے لیے شہرت حاصل تھی اور وہاں پر لگ بھگ دس ہزار سے زائد طلبہ زیر تعلیم تھے۔ مہاراشٹر کے تین علاقے پیٹھن (Paithan)، کرہڈ (Karhad) اور تھاٹے (Thatte) بھی ہندو اعلیٰ تعلیم کے اہم مراکز تھے، ہیملٹن کے مطابق وہاں پر تقریباً چار سو تعلیمی ادارے موجود تھے۔ ان تعلیمی اداروں میں ہندو دینیات، فلسفہ اور سیاسیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ملتان کا تعلیمی مرکز فلکیات، نجوم، ریاضی اور طب میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے مشہور تھا اور اسی طرح سرہند میں بھی طب کا ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا۔

14.2.3 مسلمانوں کا تعلیمی نظام

مغل ہندوستان کے تعلیمی نظام میں مسلمان اپنے بچوں کو مسجدوں میں یا اس کے پاس واقع مکتب میں بھیجتے۔ اطالوی سیاح Delia Valle کے مطابق اس طرح کے اسکول ہر قصبے اور گاؤں میں موجود تھے۔ ان ابتدائی اسکولوں کا بنیادی نصاب ابتدائی فارسی اور قرآن پر مشتمل ہوتا تھا۔ جن میں شیخ سعدی کی گلستاں، بوستاں اور فردوسی کی نظمیں شامل ہوتی تھیں۔ بچوں کو پہلے فارسی کی ابجد سکھائی جاتی تھی،

ساتھ ہی تلفظ کی صحت پر زور دیا جاتا تھا اور اوقاف و اعراب سکھائے جاتے تھے۔ جب بچہ یہ چیزیں سیکھ لیتا تھا تو اسے دو حرفوں کا ملانا سکھایا جاتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد انہیں نثر یا نظم کے مختصر جملے پڑھائے جاتے تھے، جن میں مذہبی یا اخلاقی پند و نصائح ہوتے تھے اور سیکھی ہوئی ترکیبوں کا استعمال ہوتا تھا، وہ انہیں خود پڑھنے کی کوشش کرتے اور کبھی کبھی استاد بھی ان کی مدد کرتا، اس کے بعد استاد چند روز تک نئے فقرے یا مصرعے سکھاتا تھا اور نہایت تھوڑے وقت میں بچے روانی کے ساتھ پڑھنے لگتے تھے۔ استاد چھوٹے بچوں کے لیے چار مشقیں روزانہ مقرر کرتا تھا یعنی ابجد دہرانا، حروف جوڑنا، ایک نیا مصرع یا شعر یاد کرنا اور آموختہ دہرانا۔

اعلیٰ تعلیمی اداروں کو مدرسے کا نام دیا جاتا، جو ملک کے تقریباً ہر بڑے شہر میں موجود تھے۔ ان میں دہلی اور آگرہ تعلیم کے سب سے اہم مراکز تھے، جہاں پر شریعہ کالج کے ساتھ ساتھ لاتعداد مدرسے موجود تھے۔ دہلی کے مدرسوں میں ہمایوں کا بنوایا ہوا مدرسہ، ماہم انگا کا مدرسہ، جسے 'خیر المنازل' کے نام سے جانا جاتا تھا اور شاہ جہاں کا بنوایا ہوا مدرسہ 'دارالبقا' کافی اہم تھے۔ خیر المنازل ایک اقامتی اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا۔ مغل عہد میں اعلیٰ تعلیم کے میدان میں جون پور اپنی ایک شناخت رکھتا تھا، جسے 'شیر از ہند' کے نام سے تاریخ میں جانا جاتا ہے۔ یہاں پر ملک کے دور دراز علاقوں سے طلبہ حصول تعلیم کے لیے آتے تھے۔ مغل عہد میں گجرات بھی اپنے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے لیے مشہور تھا، وہاں کا 'فیض صفا' نامی مدرسہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کافی مشہور تھا۔ احمد آباد میں بھی کافی اہم مدرسے تھے، جن میں شیعہ مکتب فکر کا ایک مدرسہ، جسے اب 'بارہ اماموں کا کوٹلہ' کہا جاتا ہے، کافی مشہور تھا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں لاہور نے ایک اہم اعلیٰ تعلیمی مرکز کے طور پر لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ اسی طرح سے کشمیر بھی اپنی فطری خوب صورتی اور آب و ہوا کی وجہ سے دانشوروں کے لیے کافی اہمیت رکھتا تھا۔ مغل عہد میں مسلم اعلیٰ تعلیمی اداروں کے مرکز کے طور پر گوالیار، سیال کوٹ، انبالہ اور تھانیسر بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔

مغل عہد کے تعلیمی نظام میں اگلی کلاس میں طلبہ کی ترقی کے لیے باقاعدہ طور پر کوئی امتحان نہیں لیا جاتا تھا بلکہ استاد اس بات کا فیصلہ کرتا تھا کہ بچہ اگلی کلاس میں پہنچنے کے لائق ہے یا نہیں۔ تعلیمی ادارے بچوں کو کسی طرح کی کوئی سند نہیں دیتے تھے بلکہ کسی اہم تعلیمی ادارے یا اپنے فن میں کسی معروف و مشہور علمی شخصیت سے تعلیم یافتہ ہونا کافی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح سے وثوق کے ساتھ یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ تمام تعلیمی اداروں میں تعلیم یافتہ ہونے کے لیے ایک متعینہ مدت طے تھی۔ مغل عہد کے تعلیمی نظام کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے کے لیے دس سے سولہ سال تک کے حصول تعلیم کو کافی سمجھا جاتا تھا، جو کہ ہمارے موجودہ یونیورسٹی تعلیمی نظام کے ڈگری کورس کے مساوی ہوتا تھا۔ وہ طلبہ جو تدریس کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے یا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا چاہتے، انہیں اس فن کے ماہرین کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ یہ طلبہ ملک اور بیرون ملک واقع اپنے فن کے اہم تعلیمی مراکز سے بھی استفادہ کرتے، جسے ان کے نصاب کا ایک اہم حصہ شمار کیا جاتا۔

14.2.4 کتب خانے

ملک اور قوم کی تعلیمی ترقی کے لیے کتابوں اور کتب خانوں کا کردار ہمیشہ سے ہی بہت اہم شمار کیا جاتا رہا ہے۔ ساتھ ہی کسی بھی قوم

کے علمی اور تعلیمی معیار کا اندازہ وہاں پر واقع مدارس اور کتب خانوں کی موجودگی سے لگایا جاسکتا ہے۔ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مغل دور کی علمی و تعلیمی ترقی میں کتب خانوں کا بہت اہم رول ہے۔ کتابوں کی ذخیرہ اندوزی اور کتب خانوں کے قیام میں مغل معاشرے کے سبھی طبقات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چاہے حکمراں طبقہ ہو یا عوام الناس سبھی کے یہاں کتابوں سے دلچسپی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر عہد عروج کے تقریباً سبھی مغل حکمراں کتاب دوست دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی بابر اپنی دانشورانہ اور علمی صلاحیتوں کے لیے کافی شہرت رکھتا ہے۔ ہمایوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کتابوں کا دلدادہ تھا، فوجی مہموں کے دوران بھی وہ ایک منتخب کتب خانہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کاؤنٹ نایر کے بیان کے مطابق شیر شاہ سوری سے شکست کے بعد جب وہ ایک جائے پناہ کی تلاش میں راہ فرار اختیار کیے ہوئے تھا، اس وقت بھی اس نے اپنے کتب خانے کے مہتمم اور اپنی چند محبوب کتابوں کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ جس وقت وہ کھمبات کے مقام پر خیمہ زن تھا، اس وقت بھی اس کے پاس بہت سی کتابیں تھیں۔

اکبر کو بھی اہل علم اور کتابوں سے خاص دلچسپی تھی۔ اپنے دربار میں وہ علماء سے مختلف موضوعات پر بے تکلف گفتگو کرتا۔ اس نے اپنی پوری زندگی کے دوران مطالعہ جاری رکھا۔ روزانہ ایک شخص اسے کتابیں پڑھ کر سناتا تھا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ مشکل سے کوئی علمی، ادبی یا تاریخی کتاب باقی رہی ہوگی جسے بادشاہ کو نہ سنایا گیا ہو۔ حکمرانوں کی اس علم اور کتاب دوستی کی وجہ سے مغل عہد میں کتابوں کی ذخیرہ اندوزی اور کتب خانوں کا قیام بڑے پیمانے پر عمل میں آیا۔ مغل دور کا سب سے اہم کتب خانہ شاہی کتب خانہ تھا، جس میں حکمرانوں کی جمع کی گئی کتابیں موجود تھیں۔ اس شاہی کتب خانے کی بنیاد بابر کے عہد میں پڑی اور ہمایوں نے اس کتب خانے کو مزید وسعت دی۔ اکبر کے عہد میں بہت سے دوسرے کتب خانوں کو بھی اس شاہی کتب خانے میں ضم کر دیا گیا۔ مثلاً گجرات کی فتح کے بعد اعتماد خاں گجراتی کا کتب خانہ، جس میں بہت سی اہم اور عمدہ کتابیں تھیں، شاہی کتب خانے میں شامل کر دیا گیا۔ اسی طرح سے جب فیضی کا انتقال ہوا تو اس کا ذاتی کتب خانہ حکومت کے قبضے میں آیا۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق اس میں 4600 کتابیں تھیں۔ ان کتابوں میں سے بہت سی خود مصنّفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ کتابوں کے اس ذخیرے میں مختلف موضوعات پر مبنی کتابیں تھیں، جن میں ادب، لسانیات، طب، فلکیات، نجوم، علم ہندسہ، تفسیر، احادیث، دینیات، فقہ، تصوف اور موسیقی سبھی شامل تھیں۔ اس کتب خانے میں کتابوں کو موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا تھا۔

مغل عہد میں اس شاہی کتب خانے کے علاوہ شہزادوں، شہزادیوں اور امراء کے اپنے ذاتی کتب خانے بھی تھے۔ مغل شہزادیوں میں سلمیٰ سلطانہ اور زیب النساء کا اپنا ذاتی کتب خانہ تھا، فیضی کے کتب خانے میں 4600 کتابیں تھیں جسے اس کی وفات کے بعد شاہی کتب خانے میں ضم کر دیا گیا۔ عبدالرحیم خان خاناں کا ذاتی کتب خانہ بھی مغل عہد کے اہم کتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے، جس میں کتابوں اور نوادرات کی دیکھ بھال کے لیے 95 ملازم رکھے گئے تھے۔ مہاراجہ جے سنگھ کا بھی اپنا ایک اہم کتب خانہ تھا، جس کی زیادہ تر کتابیں فلکیات اور نجوم سے متعلق تھیں۔ برنیر نے بنارس یونیورسٹی کے ایک ہال کو کتابوں سے بھرا ہوا دیکھا تھا، جس میں مذہب، فلسفہ، طب اور تاریخ کی کتابیں تھیں۔ مغل دور میں طلبہ کے استعمال کے لیے تمام مدارس کے پاس بھی کتب خانہ ہوتا تھا، جس میں طلبہ کے ضرورت کی تمام کتابیں

موجود ہوتی تھیں۔ مدارس سے متعلق کتب خانوں یں سب سے اہم کتب خانہ مدرسہ فیض صفا کا شمار کیا جاتا ہے، جو اپنی اہمیت و افادیت کے لیے کافی مشہور تھا۔

14.2.5 عورتوں کی تعلیم

ہندوستانی تاریخ کے مغل دور میں بھی عورتوں کی تعلیم کے کچھ بندوبست ضرور کیے گئے تھے، لیکن اگر تنقیدی طور پر مغل تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مغل عہد میں زیادہ تر خواتین ابتدائی تعلیم سے آگے نہیں بڑھ پاتی تھیں۔ حکمراں اور امراء خاندان کی خواتین کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے بارے میں تاریخ سے ضرور کچھ شواہد ملتے ہیں۔۔

بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے 'ہمایوں نامہ' تحریر کیا، جس سے 'اکبر نامہ' کی تکمیل میں مدد ملی۔ گرچہ تاریخی شواہد سے کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی، جس سے یہ پتہ چلے کہ اس نے کس طرح کی تعلیم حاصل کی تھی تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک عالم خاتون تھی۔ تاریخی حوالوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے کتب خانے کے لیے کتابیں جمع کیا کرتی تھی۔ سلمیٰ سلطانہ جو ہمایوں کی بہن گل رخ کی بیٹی تھی، ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ اس نے کئی فارسی نظمیں اور غزلیں 'مخفی' تخلص کے ساتھ لکھی تھیں۔ اکبر کی دودھ پلانے والی دایہ ماہم انگا اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ خاتون تھی، اس نے دہلی میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر کے زمانے میں شاہی خاندان کی خواتین کو باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ فتح پور سیکری میں اکبر نے محل کے کچھ کمرے ان کی تعلیم کے لیے 'درس گاہ خواتین' کے نام سے علیحدہ کر رکھے تھے۔ نور جہاں جو جہاں گیر کی مشہور بیگم ہے، فارسی اور عربی علم و ادب میں بڑی دست گاہ رکھتی تھی اور اپنے شوہر کی زندگی میں وہ مملکت کا نظم و نسق بھی چلاتی تھی۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اتنی ذہین، قابل اور تعلیم یافتہ تھی کہ مملکت کے تمام محکموں کے معاملات کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتی تھی۔ شاہ جہاں کی عزیز بیوی ممتاز محل فارسی زبان میں بہت کامل تھی اور اس زبان میں شعر کہہ سکتی تھی۔ شاں جہاں کی سب سے بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم بھی تعلیم یافتہ تھی اور اس زمانے کے علماء کو انعامات اور وظائف دے کر ان کی ہمت افزائی کیا کرتی تھی۔ ستی النساء جو اس عہد کی ایک فاضل خاتون تھی، جہاں آرا بیگم کی استانی تھی۔ وہ قرآن کی قاری کے ساتھ ساتھ فارسی میں اچھی مہارت رکھتی تھی۔ وہ ممتاز محل کی سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔ زیب النساء بیگم جو اورنگ زیب کی لڑکیوں میں سب سے بڑی تھی، نہایت تعلیم یافتہ شہزادی تھی۔ وہ علم القرآن میں کامل مہارت رکھتی تھی، فارسی اور عربی خوب جانتی تھی اور فن خطاطی میں بہت اچھی مہارت رکھتی تھی، اس کے یہاں بہت سے علماء، شعراء اور انشاء پرداز ملازم تھے اور اس کے نام سے بے شمار تالیفات و تصنیفات منسوب کی گئی تھیں۔ اوپر بیان کردہ مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغل عہد میں عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں غفلت نہیں برتی گئی تھی۔ کیوں کہ بعض اوقات انہوں نے ایسی علمی ترقی اور مہارت کا ثبوت دیا جو واقعی قابل داد ہے۔

14.2.6 علمی و سائنسی اور تکنیکی ترقی

مغل سلاطین، امراء اور صوبے دار سبھی علم و ادب کے بڑے سرپرست تھے اور علم و ادب و تعلیم کی سرپرستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغل عہد میں بڑے بڑے صاحب کمال عالم اور ادیب پیدا ہونے لگے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دور میں جس کثرت سے اہل علم پیدا ہوئے،

اس کی مثال ہندوستانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس دور کے علماء میں سب سے اہم شخصیت شیخ احمد سرہندی کی ہے۔ انہوں نے اصلاح معاشرہ کا بیڑہ اٹھایا اور مسلم معاشرے میں پھیلے بدعات و خرافات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ شیخ احمد سرہندی کی سب سے پہلی دستیاب تحریر 'رسالہ رڈروافض' میں شیعہ اعتقاد کی تردید کی کوشش ہے۔ شریعت کے سلسلے میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے ان کا ٹکراؤ حکومت وقت سے بھی ہوا، جس کا اظہار اکبر کے انتقال کے بعد ان کے ذریعے لکھے گئے خطوط سے ہوتا ہے۔ انہوں نے ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کا مطالعہ کیا اور اس سلسلے میں وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ شیخ سرہندی کو ان کے انہیں اصلاحی کارناموں کی وجہ سے مجدد الف ثانی کا خطاب دیا جاتا ہے۔

مغل دور کی علمی شخصیت میں دوسرا اہم نام شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ہے۔ وہ مسلم قانون اور شریعت کے موضوع پر بے شمار تحریروں کے مصنف اور حدیث کے مستند عالم تسلیم کیے جاتے تھے۔ انہوں نے عربی اور فارسی زبانوں میں تقریباً ایک سو سے زیادہ کتابیں اور رسائل تحریر کیے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ برصغیر میں علم حدیث کو رواج دینا ہے۔ انہوں نے علم حدیث کے موضوع پر بہت سی کتابیں تحریر کیں اور حدیث کی مشہور کتاب مشکوۃ کی شرح لکھی۔ ان کی تحریر کردہ 'مدارج النبوۃ' سیرت کے موضوع پر ایک اہم کتاب شمار کی جاتی ہے۔ اسی طرح سے ان کی ایک دوسری کتاب 'اخبار الاخیار' ہے، جس میں مسلم ہندوستان کے اولیا اور بزرگوں کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ ملا عبدالحکیم سیال کوٹی بھی مغل عہد کے اہم علما میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ سیال کوٹ اور آگرہ کے مدرسوں میں طلبا کو تعلیم دیتے تھے اور تفسیر، فقہ اور علم کلام کی بہت سی کتابوں پر حاشیے لکھے ہیں۔ صدیوں تک ان کی کتابیں ہندوستان، مصر اور ترکی کی مدرسوں کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔

قاضی محب اللہ بہاری اورنگ آباد کے عہد میں لکھنؤ کے قاضی تھے۔ اصول فقہ اور منطق کے اہم عالموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اصول فقہ کے موضوع پر ان کی کتاب 'مسلم الثبوت' اور منطق میں 'مسلم العلوم' کافی اہم شمار کی جاتی ہیں۔

مغل سلطنت کے علماء و مصلحین میں سب سے اہم نام شاہ ولی اللہ کا ہے۔ ان کا تعلق مغل سلطنت کے عہد زوال سے ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنی تصنیف و تالیف میں اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور ان کے اندر کی اخلاقی خرابیاں دور ہوں۔ انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی حیثیت سے مضبوط بنانے کے لیے بادشاہوں اور امراء سے خط و کتابت بھی کی۔ دہلی پر احمد شاہ ابدالی کا حملہ انہیں کے ایک خط کی تحریک پر ہوا تھا، جس میں پانی پت کی جنگ میں اس نے مراٹھوں کو شکست دی تھی۔ شاہ ولی اللہ نے سماجی اصلاحی کے کام بھی بڑے پیمانے پر کیے۔ مسلمانوں میں معاشرتی اثرات کے پیش نظر بیوہ عورتوں کی شادی کو معیوب سمجھا جانے لگا تھا، انہوں نے اس رسم کی کھل کر مخالفت کی۔ اسی طرح سے انہوں نے نکاح میں بڑے بڑے مہر باندھنے اور خوشی و غم کے موقعے پر لوگوں کو فضول خرچی سے روکا۔ ساتھ ہی انہوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس بات پر زور دیا کہ اختلاف کی صورت میں انتہا پسندی کے بجائے اعتدال کا راستہ اختیار کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ قرآن مجید کے علاوہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور تصوف پر مختلف کتابوں کے مصنف ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے بڑے بیٹے شاہ عبد العزیز عربی اور فارسی کے بڑے انشا پرداز اور عالم تھے۔ ہندوستان میں تقریباً ساٹھ سال تک وہ دینی علوم اور احادیث کی تعلیم دیتے رہے۔ شاہ ولی اللہ کے دوسرے بیٹے شاہ رفیع الدین نے پہلی مرتبہ اردو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ خدا کے کلام کو سمجھ سکیں۔ شاہ ولی اللہ کے تیسرے بیٹے شاہ عبد القادر کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کی اردو تفسیر ہے۔

شاہ ولی اللہ کی اولاد میں شاہ اسمٰعیل شہید کا مقام بھی بہت بلند ہے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے شاہ عبد الغنی کی اولاد تھے۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی اصلاح اور قرآن و حدیث کی تعلیم عام کرنے کا جو کام شروع کیا تھا، اس کو سب سے زیادہ ترقی شاہ اسمٰعیل نے دی۔ اسی وجہ سے وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالموں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں اردو میں لکھی گئی 'تقویۃ الایمان' سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کتاب نے برصغیر کے مسلمانوں کے عقیدے اور عمل کی اصلاح میں وہی کام کیا جو عرب میں محمد بن عبد الوہاب کی کتاب 'کتاب التوحید' نے کیا۔ ان کی دوسری کتابوں میں فارسی میں لکھی گئی 'منصب امامت' اور 'عبقات' بہت اہم ہیں۔ شاہ اسمٰعیل نے اپنے ایک ساتھی مولانا عبد الحئی کے ساتھ مل کر سید احمد شہید کے اقوال و ارشادات بھی فارسی زبان میں 'صراط مستقیم' کے نام سے مرتب کیے۔ اس کتاب میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کرکے ان کو دور کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ مغل سلطنت کے دور زوال کی آخری بڑی علمی اور عملی شخصیت سید احمد شہید کی ہے۔ یہ شاہ عبد العزیز کے شاگرد تھے۔ انہوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی اور اپنے مقاصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے 'تحریک جہاد' کی بنیاد ڈالی، جسے تاریخ میں 'تحریک شہیدین' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

دینی علوم کے بعد مغل دور میں سب سے اہم کتابیں تاریخ کے موضوع پر لکھی گئیں۔ دینی علوم پر لکھی جانے والی کتابیں عام طور پر عربی زبان میں تھیں، لیکن تاریخ کے موضوع پر کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئیں۔ مغل دور کے تاریخ نگاروں میں ابو الفضل کو سب سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ ابو الفضل اکبر کا وزیر تھا، اس نے 'اکبر نامہ' اور 'آئینِ اکبری' کے نام سے اس دور کی دو تاریخ کی کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کتابوں میں مغلوں کے انتظام حکومت اور صوبوں کے تذکرے کے ساتھ ہندوستانی ثقافت اور علوم و فنون کا بیان ملتا ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں 'اکبر نامہ' کے طرز پر اور بھی کئی دوسری کتابیں تیار کی گئیں، جن میں قابل ذکر عبد الحمید لاہوری اور محمد وارث کی لکھی ہوئی سرکاری تاریخیں ہیں جنہیں 'بادشاہ نامہ' کے عنوان سے یاد رکھا گیا ہے۔ اسی طرح اورنگ زیب کے عہد کے ابتدائی دس برسوں کے دوران لکھی گئی محمد کاظم کی 'عالم گیر نامہ' ہے۔ سترہویں صدی میں لکھی گئی ان کتابوں میں تفصیلات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، جغرافیائی حالات اور واقعات کے تسلسل کو نہایت صحت کے ساتھ درج کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں، لیکن پھر بھی وہ بنیادی طور پر کسی سرکاری گزٹ سے زیادہ مشابہ ہیں۔

تاریخ نویسی کے میدان میں بابر کی 'تزک' کے ساتھ ایک نئی صنف وجود میں آگئی۔ یہ کتاب ابتداً چغتائی ترکی میں تالیف کی گئی تھی، لیکن عبد الرحیم خان خاناں کے فارسی میں لفظی ترجمہ کے بعد اس کا شمار فارسی تحریروں میں ہونے لگا۔ جہاں گیر کی 'تزک' بھی 'بابر نامہ'

کی طرح نہایت سادہ طرز میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں بابر کی سی صاف گوئی کے ساتھ فنون اور فطرت میں بھی دلچسپی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس میں ڈرامائی عنصر مفقود ہے، جو بابر کی جاں بازی سے عبارت واقعات کے بیان کی وجہ سے اس کی 'تزک' میں پیدا ہو گیا ہے۔ مختلف علاقوں کی تفصیلی تاریخیں تاریخی ادب میں ایک نیا اضافہ ہیں، جو اس زمانے میں لکھی جانا شروع ہوئیں۔ ان میں میر معصوم کی لکھی ہوئی 'سندھ کی تاریخ' اور علی محمد خان کی 'تاریخ گجرات' کافی اہم ہیں۔ اسی عہد میں ہندوستان میں مجموعی تاریخوں کے لکھنے کا چلن بھی شروع ہوا اور نظام الدین احمد کی 'طبقات اکبری' اس قسم کی کتابوں کے لیے رہنما ثابت ہوئی۔ محمد قاسم فرشتہ کی 'گلشن ابرار' کو نہایت احتیاط کے ساتھ جمع کیے گئے ماخذ کی مدد سے تیار کیا گیا۔ تاریخی ادب میں اس کتاب کو بڑی شہرت ملی۔ عبدالقادر بدایونی کی 'منتخب التواریخ' کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا جائے گا۔ بدایونی کی یہ کتاب اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ زبان کی سلاست، دلچسپ انداز بیان، ناقدانہ نقطۂ نظر اور معلومات کی کثرت کے لحاظ سے ضیاء الدین برنی کی 'تاریخ فیروز شاہی' کے علاوہ عہد وسطیٰ کی کوئی تاریخ کی کتاب اس کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ کتاب اکبر کی پالیسیوں کی تیز طرار تنقید کے لیے بھی مشہور ہے۔ اس دور کی علمی و ادبی تاریخ کے لیے یہ ایک بہترین مآخذ ہے۔

دورِ زوال کے ممتاز مورخوں میں محمد ہاشم خوافی خاں کا نام کافی اہم ہے۔ انہوں نے 'منتخب اللباب' کے نام سے ہندوستان میں مغلوں کی ایک مفصل اور مستند تاریخ لکھی ہے، جس میں بابر سے محمد شاہ کے عہد تک کی تاریخ درج ہے۔ یہ کتاب مغلوں کے دور زوال کی تاریخ کا بہترین ماخذ ہے اور مسلم ہندوستان میں لکھی جانے والی چند اچھی تاریخی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ مغل عہد کی تاریخ نگاری میں تذکرہ نگاری کی صنف بھی موجود ہے اور اس قسم کا سب سے اہم تذکرہ شاہ نواز خاں کی تصنیف 'مآثر الامراء' ہے۔ اس کتاب میں مغل امراء کی سوانح درج کی گئی ہے۔ اس کتاب کی ابتداء 1742ء میں ہوئی اور مصنف کے انتقال کے کافی عرصے بعد یعنی 1780ء میں اختتام کو پہنچی۔ اس کتاب کے آخری حصے کو پورا کرنے میں آزاد بلگرامی اور عبدالحئی نے ہاتھ بٹایا۔

اس دور کی ایک اہم تصنیف 'دبستان مذاہب' ہے جس کے مصنف کا نام وثوق کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب کو علم تقابل ادیان کی ایک بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف مذاہب کی تعلیمات، عقائد اور رسوم و رواج کو خاصی غیر جانب داری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ہندو مذہب اس کے مختلف فرقوں اور سکھوں کے عقائد سے تفصیلی بحث کی گئی۔ ساتھ ہی ہندوستان میں پیدا ہونے والے مسلم فرقوں اور دین الٰہی کا تذکرہ بھی ہے۔

مغل دور کے فلسفیوں میں ملا محمود جونپوری کا نام بھی کافی اہم ہے۔ انہیں طبعی فلسفے کے ساتھ ساتھ علم فلکیات میں بھی کافی مہارت حاصل تھی۔ طبعی فلسفے اور منطق پر ان کی بہت سی کتابیں شمار کی جاتی ہیں، جن میں سب سے مشہور کتاب 'شمس بازغہ' ہے۔ اپنی اس کتاب میں انہوں نے کائنات کی تخلیق کے بارے میں ایرانی فلسفی میر داماد کے 'حدوث دہری' کے نظریے کی تردید کی ہے۔ اپنی کتاب میں وہ فلکیات سے متعلق بطلیموسی نظریے پر بھی شکوک ظاہر کرتے ہیں۔

شیخ محب اللہ الہ آبادی کا نام بھی مغل دور کے علماء، صوفیاء اور فلسفیوں میں کافی اہم شمار کیا جاتا ہے۔ وہ شیخ فرید الدین گنج شکر کے خلیفہ اور مغل عہد کے مشہور صوفی عالم ہیں، ان کی زیادہ تر تحریریں متصوفانہ فلسفے سے متعلق ہیں۔۔ شیخ محب اللہ کی موجود تحریروں میں:

شرح فصوص الحکم، عبادۃ الخواص، ہفت احکام، غایۃ الغایات، تسویۃ، مفاتح العاشقین، ترجمۃ الکتاب اور ’انفاس الخواص‘ کافی اہم شمار کی جاتی ہیں۔ میر محمد زاہد الہروی مغل عہد میں فلسفہ، منطق اور علم کلام کے اہم عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ اورنگ زیب کے عہد میں محتسب کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے علم کلام میں شریف جرجانی کی مشہور کتاب ’شرح مواقف‘ اور منطق کی دوسری کتابوں پر جو حاشیے لکھے ہیں۔

مغل دور میں علوم ریاضی اور فلکیات پر خصوصی توجہ دی گئی۔ 1587 میں بھاسکر آچاریہ کی مشہور کتاب ’لیلاوتی‘ کا اکبر کے درباری شاعر ابوالفیض فیضی نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ ایک ایرانی تارک وطن فتح اللہ شیرازی کی مغل دربار میں بڑی پذیرائی ہوئی، کیوں کہ وہ ریاضی اور فلکیات میں دست رس رکھتا تھا، حکیم فتح اللہ نے حکومت کے حکم پر ایک صحیح نظام تقویم یا الٰہی کلنڈر تیار کیا، جسے 1584ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے سرکاری کلنڈر قرار دیا گیا۔ فتح اللہ نے کئی تکنیکی آلات بھی ایجاد کیے تھے، جن میں سے بعض کو ابوالفضل نے اکبر کی طرف منسوب کیا ہے۔ شاہ جہاں کی زیر سرپرستی عطاء اللہ رشدی نے الجبرا پر بھاسکر آچاریہ کی کتاب ’بیج گنت‘ کا ترجمہ کیا۔ ایک دوسرا قابل ذکر کام صادق اصفہانی کا اٹلس تھا، جو اس نے 1647ء میں جون پور میں تیار کیا تھا۔ اس اٹلس میں کل 33 نقشے ہیں، جو مشرقی نصف الارض پر مشتمل ہیں، ان نقشوں کو بطلیموسی اصولوں کے مطابق بنایا گیا ہے۔

مغل دربار سے متعلق ایک اہم امیر اور آمیر کے راجہ سوائی جے سنگھ کی فلکیات کے میدان میں کارگزاریاں ہندوستانی سائنس کے ایک روشن پہلو کی نشان دہی کرتی ہیں۔ انہوں نے جے پور، دہلی، اجین، متھرا اور بنارس میں رصد گاہیں تعمیر کیں، جن میں اینٹ اور چونے کی مدد سے بڑے بڑے آلات تعمیر کیے گئے تھے۔ ان آلات کی تعمیر میں جے سنگھ کے سامنے پندرہویں صدی عیسوی میں سمرقند میں تیموری حکمراں الغ بیگ کے ذریعے بنوائے ہوئے آلات کی مثال تھی۔ اینٹ اور گارے کے ان آلات کی تعمیر کے پیچھے جواز یہ تھا کہ لکڑی اور لوہے کے بنے ہوئے چھوٹے آلات مثلاً اصطرلاب میں غلطی کا امکان زیادہ رہ جاتا ہے۔ جے سنگھ کو فلکیات سے متعلق یورپی مشاہدات کی صحت کے بارے میں علم ہوا تو اس نے ڈی لاہیر (de La Hire) کے مشاہدات کا ریکارڈ حاصل کر لیا اور اس کی مدد سے انہوں نے انعطاف (Refraction) کا جدول تیار کر لیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کی تحقیق کے نتائج ڈی لاہیر کے ریکارڈ سے زیادہ درست ہیں۔ جے سنگھ کے ماہرین فلکیات نے ایک یورپی دوربین کی مدد سے زہرا کا اس حالت میں مشاہدہ کیا جب وہ چاند کی روشن سمت میں ہوتا ہے۔ ان مشاہدات کے نتائج ان کی اہم کتاب ’زیج محمد شاہی‘ میں بیان کیے گئے ہیں۔ عام طور پر جے سنگھ نے مسلم فلکیات سے ہی استفادہ کیا تھا۔

مغل دور میں طبی سہولیات بھی بڑی منظم تھیں اور بڑے پیمانے پر ان کو رواج دینے کی کوشش بھی کی گئی۔ دارالسلطنت اور ملک کے تمام بڑے شہروں میں باتنخواہ ملازمین کے ساتھ مستقل شفاخانے قائم تھے۔ تاریخی حوالوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ بابر کو طب کے فن میں دلچسپی تھی اور اس کے دربار میں طبیبوں کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی تھی۔ بابر کے امراء میں میر خلیفہ نامی ایک امیر اپنے عہد کا ایک اہم دانشور اور ماہر طبیب تھا۔ اسی طرح امیر ابوالبقا بھی بابر کا طبیب تھا۔ بابر اور ہمایوں کے عہد کے اہم اطباء میں یوسف بن محمد بن یوسف کا نام کافی اہم ہے، جسے طب کے مختلف شعبوں میں مہارت حاصل تھی۔ اسے طب یونانی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی طریقہ علاج میں

بھی کمال حاصل تھا۔ طب سے متعلق اس کی کتابوں میں 'جامع الفوائد'، 'فوائد الاخیار'، 'طب یوسفی' اور 'علاج الامراض' کافی اہم ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ اس نے اپنی شاعری کے نمونوں میں بھی حفظان صحت سے متعلق باتیں کیں ہیں، جن میں 'قصیدۃ فی حفظ الصحہ' اور 'ریاض الادویۃ' کو اہم شمار کیا جاتا ہے۔ ہمایوں کے عہد میں طب سے متعلق کوئی قابل ذکر کام انجام نہیں دیا گیا۔ اس کی سب سے اہم وجہ اس عہد کی سیاسی افراتفری کو شمار کیا جاسکتا ہے لیکن ہمایوں کے دور حکومت کے آخری سالوں میں بہت سے اطباء نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی اور انہوں نے بعد کے ادوار میں ہندوستان کی طبی تاریخ میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اکبر کا عہد مغل تاریخ میں طبی ترقیات کے اعتبار سے سنہرا دور شمار کیا جاسکتا ہے۔ ابوالفضل نے مسلم اور غیر مسلم طبیبوں کی فہرست دی ہے جنہیں سرکاری خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی اور ان میں سے کچھ کو منصب بھی عطا کیا گیا تھا۔ اکبر کے عہد میں سرکاری شفاخانوں کے علاوہ طبیبوں کے اپنے ذاتی مطب بھی ہوا کرتے تھے، جو بنا کسی بھید بھاؤ کے ہمیشہ عوام الناس کی خدمت کے لیے کھلے رہتے تھے۔ پروفیسر شری رام شرما کا بیان ہے کہ اس عہد میں کوی چندرا، وڈیاراجہ، ٹوڈرمل اور نیل کنٹھ نے طب کے موضوع پر اپنی تحریریں مرتب کیں۔ بلاشبہ اس عہد کے اطباء میں حکیم علی حسین گیلانی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے طب کے موضوع پر ابن سینا کی مشہور کتاب 'القانون' کی شرح لکھی جو 'قانون' کی سب سے اچھی شرح شمار کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے طبی تجربات کو ایک کتاب کی شکل میں مدون کیا جو 'مجربات علی گیلانی' کے نام سے مشہور ہے۔ اس عہد کے اطباء میں حکیم مسیح الدین ابوالفتح گیلانی کا نام بھی کافی اہم ہے۔ وہ اکبر کے دربار میں اہم منصب پر فائز تھے۔ انہوں نے 'فتاحی' کے نام سے طب کے موضوع پر ایک کتاب لکھی، ساتھ ہی 'قیاسیۃ' کے نام سے 'اخلاق ناصری' کی شرح لکھی۔ ان کے دو بھائی حکیم نجیب الدین ہمایوں اور حکیم نورالدین قراری بھی اس عہد کے اطباء میں شمار ہوتے ہیں۔ دور اکبری کے طبیبوں میں مظفر بن محمد الحسینی الشفائی، کا نام بھی کافی اہم ہے۔ وہ ایرانی صفوی حکمراں شاہ عباس صفوی کے عہد کے مشہور دواساز شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی دوسری تحریروں کے علاوہ 1556ء میں 'طب شفائی' کے نام سے علم الادویہ کی ایک کتاب بھی ترتیب دی تھی۔

حکمراں بننے کے بعد جہاں گیر نے جو فرامین جاری کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ''ہر بڑے شہر میں شفاخانے قائم کیے جائیں، بیماروں کے علاج کے لیے ان میں طبیبوں کی تعیناتی کی جائے اور تمام اخراجات سرکاری خزانے سے ادا کیے جائیں۔'' اسی طرح اس نے اپنی تزک میں، جو اس نے تخت شاہی پر متمکن ہونے کے بعد لکھی تھی، نباتات، جانور طب سے متعلق بہت سے مشاہدات درج کیے ہیں، جن کی بنا پر اسے نیچر اور طب کے ایک واقف کار کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اس عہد کے اطباء میں حکیم روح اللہ کافی نمایاں شمار کیے جاتے ہیں، جن کا تذکرہ جہاں گیر نے اپنی تزک میں بھی کیا ہے۔ عہد جہاں گیر میں طبی تصنیفات مدون کرنے میں مہابت خاں کے بیٹے حکیم امان اللہ نے کافی اہم کردار ادا کیا، انہوں نے 'گنج بادا ورد' کے نام سے مفرد اور مرکب ادویہ پر ایک مبسوط تحریر ترتیب دی۔ یہ کتاب ادویہ سازی کا انسائیکلوپیڈیا شمار کی جاتی ہے، جس میں مفرد ادویہ کے ساتھ ساتھ مرکب ادویہ سازی کے طریقے اور مشہور و معروف اطباء کے تجربات و مشاہدات بھی درج کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تحریروں میں 'ام العلاج' اور 'دستور الہند' ہیں۔ آخر الذکر کتاب 'مدن نبد' نامی ایک سنسکرت تحریر کا فارسی ترجمہ ہے۔

عوام الناس کو طبی سہولیات فراہم کرنے کے لیے اپنے پیش روؤں کی طرح شاہ جہاں بھی کوشاں رہا۔ اس کے عہد میں ملک کے طول و عرض میں شفاخانے قائم کیے گئے۔ 'بادشاہ نامہ' کے مصنف کے مطابق دہلی کی جامع مسجد کے پاس عوام الناس کو طبی سہولیات فراہم کرنے کے لیے ایک بڑا شفاخانہ قائم کیا گیا اور اس میں ملک کے باصلاحیت اور مشہور طبیبوں کی تعیناتی کی گئی۔ ہندوستان میں مغل دربار نے سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایران سے آنے والے دانشوروں، سائنس دانوں اور طبیبوں کو پناہ دی۔ ان میں سے ایک اہم نام حکیم عین الملک شیر ازی کا ہے جو داراشکوہ کے ذاتی طبیب تھے۔ وہ ایک مشہور ماہر امراض چشم تھے اور ساتھ ہی جراحی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی ایک اہم تصنیف 'الفاظ الادویۃ' ہے، جو انہوں نے شاہ جہاں کے لیے لکھی تھی۔ ان کی سب سے اہم تصنیف 'طب داراشکوہی' ہے۔ مورخین کے بیان کے مطابق اس کتاب میں جراحی کا بمشکل ہی تذکرہ کیا گیا ہے، یہاں تک کہ موتیابند کا علاج بھی دواؤں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ آتشک کے مرض کے لیے ایک باب مخصوص کیا گیا ہے اور اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر مرض کے پیدا ہونے کی وجوہات اور ظاہر ہونے کی علامات کے تذکرے کے بعد مصنف نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات بیان کیے ہیں اور پھر اس کا علاج بتایا ہے۔ 'بادشاہ نامہ' کے مصنف کے مطابق اس عہد کے دوسرے اہم طبیب حکیم میر محمد ہاشم تھے، جنہیں شاہ جہاں نے احمد آباد کے شفاخانے کا منتظم اور نگران اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ اورنگ زیب نے انہیں اپنے عہد میں تین ہزاری منصب سے نوازا اور 'مسیح الزماں خان بہادر' کا خطاب عطا کیا۔ اس عہد کے اطباء میں حکیم محمد داؤد تقرب خاں کا نام بھی اہم ہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ کو خود پیشاب رکنے کا مرض لاحق ہوا اور علاج کے ساتھ ساتھ مرض میں قبض کا بھی اضافہ ہو گیا۔ بہت سے طبیبوں نے علاج کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا، جب حکیم تقرب خاں نے علاج شروع کیا تو انہوں نے نسخے میں 'شیر خشت' کا اضافہ کیا۔ بادشاہ کو اس سے بڑا افاقہ ہوا اور مرض جاتا رہا۔ شاہ جہاں کا عہد اس لحاظ سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس عہد میں ستی النساء خانم نامی ایک ممتاز خاتون طبیبہ تھی۔

اورنگ زیب کے عہد میں بھی دارالسلطنت اور دور دراز کے شہروں میں مریضوں کے علاج کے لیے شفاخانے قائم کیے گئے۔ ملک کے مال دار اور صاحب حیثیت لوگوں نے بھی اپنے ذاتی خرچ پر شفاخانے قائم کیے۔ مثال کے طور پر نواب خیر اندیش خاں نے اٹاوہ میں ایک اچھا شفاخانہ قائم کیا، جو خود بھی ایک تجربہ کار طبیب اور صاحب طرز مصنف تھے۔ انہوں نے 'خیر التجارب' کے نام سے طب کی ایک کتاب بھی تحریر کی۔ اس شفاخانے میں یونانی اور ہندوستانی دونوں طرح کے طریقۂ علاج اپنائے گئے تھے۔ اس شفاخانے کے اطباء میں عبد الرزاق نیشاپوری، عبد الماجد اصفہانی، مرزا محمد علی بخاری، محمد عادل، محمد اعظم، کنول نین، سکھانند اور نین سکھ کا نام شمار کیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کے دور کے اطباء میں محمد اکبر ارزانی کا نام بھی اہم ہے۔ وہ فارسی زبان میں بہت سی طبی کتابوں کے مصنف شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی طبی تحریروں میں 'طب اکبر، میزانِ طب، طب نبوی، مفرح القلوب، قرابادین قادری، مجربات اکبری، حدود الامراض' اور 'طب ہندی' اہم ہیں۔ اسی عہد میں حکیم محمد رضا شیرازی نے 'تحفۃ الاطباء' اور 'ریاض عالم گیری' نام سے دو کتابیں تحریر کیں۔ اس عہد کے اطباء میں محمد مہدی کا نام بھی اہم ہے، جنہوں نے شہزادے محمد اعظم کا علاج کیا اور 'حکیم الملک' کے خطاب سے نوازے گئے۔ اورنگ زیب کا عہد مغل تاریخ میں طبی ترقیات کے اعتبار سے بہت اہم دور شمار کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں نہ صرف اہم کتابیں تصنیف کی گئیں بلکہ دوسری زبانوں سے اہم

طبی کتابوں کے فارسی میں ترجمے بھی کیے گئے۔

محمد شاہ کے عہد حکومت میں دہلی میں ایک بڑا شفاخانہ واقع تھا، جس کے مہتمم اعلیٰ حکیم قوام الدین تھے، اس شفاخانے کا سالانہ خرچ تین لاکھ روپیہ تھا۔ مرزا محمد ہاشم خان علوی اس عہد کے اہم اطباء میں شمار ہوتے تھے، جنہیں محمد شاہ کے ذریعے 'معتمد الملک' کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ حکیم ہاشم خاں نے بہت سی طبی تحریریں چھوڑیں، جن میں 'کتاب النبت، جامع الجوامع، خلاصۃ التجارب، مطب علوی خان، تحفۂ محمد شاہی، احوال عضوء النفس' اور 'خلاصہ' 'قوانین علاج' اہم ہیں۔ ان تحریروں میں 'جامع الجوامع' سب سے اہم ہے، جو طب کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ اس کتاب کو وہ اپنی زندگی میں مکمل نہیں کر سکے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے خاندان کے ایک دوسرے شخص محمد حسین خاں نے اس کی تکمیل کی۔ احمد شاہ کے دور حکومت میں حکیم اسکندر نے 'قرابادین حکیم اسکندر' کے نام سے ان شاہی اور لاطینی طبی اصطلاحات کا ایک فرہنگ تیار کیا جو عہد وسطی سے ان کے عہد تک مغرب میں استعمال ہوتے تھے۔ حکیم محمد شریف خان کا نام شاہ عالم دوم کے دور کے اہم اطباء میں شمار کیا جاتا ہے۔ بادشاہ نے انہیں اپنا درباری طبیب متعین کیا تھا اور انہیں 'اشرف الحکماء' کے خطاب سے نوازا تھا۔ انہوں نے طب کے موضوع پر 'علاج الامراض، تالیف شریفی، علاج نافعۃ، حاشیۃ نفیسی، تحفۂ عالم شاہی اور 'شرح حمیات قانون' نامی کتابیں تحریر کیں۔ اودھ کے حکیم شفائی خان ارشد بھی اس عہد کے نامور اطباء میں شمار ہوتے ہیں، جو حکیم شریف خاں کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے 'شفاء الجمیل' نامی ایک کتاب بھی تحریر کی تھی۔ ہندوستانی طبی تحقیق میں ان کا سب سے اہم کارنامہ ان کے ذریعے تیار کی گئی ایک دوا ہے جو 'خمیرہ آبریشم حکیم ارشد والا' کے نام سے مشہور ہے، ان کے ذریعے تیار کیا گیا یہ 'خمیرہ' دل کے امراض میں بڑا مفید ہے۔

مغل دور حکومت میں جس طرح علمی و تعلیمی اور سائنسی ترقی پر زور دیا گیا اسی طرح سے تکنیکی و میکانکی ترقی اور آلات و مشینوں کے اختراع پر خصوصی توجہ صرف کی گئی۔ سولہویں صدی عیسوی کے ابتدائی عہد میں بابر نے پانی نکالنے کے ایک طریقے کا ذکر کیا، جس میں کیل دار پہیوں پر مشتمل گراری کام کرتی تھی۔ ہندوستان میں اسے 'پرشین وہیل' کہا گیا اور تکنیکی تاریخ کے ماہر اسے 'ساقیہ' کے نام سے جانتے ہیں۔ مغل عہد کے کئی مصوروں نے ساقیہ کی تصویر بنائی ہے۔ اس مشین کی ایجاد کا سہرا درباری مورخ نے اکبر کے سر باندھا ہے لیکن ان میں سے بعض یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مشین فتح اللہ شیرازی کی اختراع تھی۔ اکبر کے عہد کی ایجادات میں وہ مشین بھی شامل ہے، جس کی مدد سے توپوں کی نالیوں کو اندر سے ہموار کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ ایک ہوائی چکی بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ اسی طرح پانی نکانے کا وہ پیچیدہ نظام بھی ہے جو فتح پور میں لگایا گیا تھا۔ اس میں کئی گراری دار پہیوں کی مدد سے پانی اوپر پہنچایا جاتا تھا۔ اکبر کے نام یہ بھی منسوب کیا گیا ہے کہ اس نے شورے کی مدد سے پانی کو ٹھنڈا کرنے کی ترکیب ایجاد کی، جو اس کے بعد ہندوستان میں بہت عام ہوگئی۔ اکبر کے اسلحہ خانہ میں ایک بندوق بنائی گئی جو ابوالفضل کے مطابق خود بادشاہ کی کارآگہی کا ثبوت تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ حکیم فتح اللہ شیرازی نے ایک ایسی بندوق بنائی جو یکے بعد دیگرے بارہ گولیاں چلا سکتی تھی۔ وہ مغل دور کے بہت اہم ماہر طبیعیات شمار کیے جاتے ہیں۔ مغل دور میں کئی اہم تکنیکی آلات اور ترکیبیں پہلی بار رائج ہوئیں، جن کے بارے میں کسی نے ایجاد کی دعوے داری نہیں کی ہے۔ ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یقینا یہ ان گمنام دست کاروں کی دین ہیں جنہوں نے انہیں یہاں متعارف کرایا۔ استاد کبیر حسین اکبر کے عہد کے مشہور بندوق ساز

تھے۔ اکبر کے عہد میں طرح طرح کی بندوقیں اور توپیں بنائی گئیں اور فن اسلحہ سازی کو بڑے پیمانے پر ترقی دی گئی۔

میکانکی آلات میں سب سے اہم ایک مخصوص قسم کا پینچ (Screw) تھا جو الٹے سے سیدھے کی طرف گھمایا جاتا تھا۔ اس کو بنانے کے لیے کھانچے کاٹنے کے بجائے ایک کیل پر دھات کا بنا ہوا تار لپیٹ دیا جاتا تھا۔ ایسے پینچ کا ذکر پہلی بار 1666ء میں ملتا ہے۔ اس پینچ کی مدد سے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لکڑی کے دو بیلنوں پر مشتمل کولہو میں وہی اصول کارفرما تھا جس کی جھلک پینچ میں ملتی ہے، جو اسی زمانے میں استعمال ہونا شروع ہوا تھا۔ اس آلے میں استعمال ہونے والے بیلنوں پر پینچ کے جیسے کھانچے بنے ہوئے تھے جو آپس میں پیوست ہو کر بیلنوں کو مخالف سمتوں میں گھماتے تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں ایک اور اوزار کا ذکر ملتا ہے جو ہاتھ سے ڈور کھینچ کر چلنے والا برما تھا، جو ہیروں کو تراشنے کے کام آتا تھا۔ اس نئے برمے نے قدیم زمانے کے کمان سے چلنے والے برمے کی جگہ لے لی تھی۔

تعمیرات کے میدان میں بھی جدید تکنیکی طریقے اختیار کیے گیے۔ خاص طور پر دوہرا پیاز نما گنبد بنانے کی صلاحیت پیدا ہونا، محراب کے اصول کو تعمیرات میں استعمال کرنے کی صلاحیت میں ایک قابل ذکر پیش رفت کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ تکنیک تاج محل کے مشہور گنبد میں اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ یقینی طور پر یہ نئی کاری گری وسط ایشیا سے ہندوستان آئی تھی، لیکن یہاں آنے کے بعد اس میں کسی قدر بہتری بھی ہوئی۔ اس قسم کی مہارت پانی کو دور تک لے جانے کی غرض سے بنائی گئی اونچی نالیوں کی تعمیر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے نمونے شاہ جہاں کی بنوائی ہوئی مشہور مغربی جمنا نہر کے بعض حصوں میں ملتے ہیں۔ جہاز سازی میں عام خیال کے برخلاف ناریل کے ریشوں سے جوڑ پُر کرنے کے بجائے اکبر کے آخری زمانے سے خاصے بڑے پیمانے پر لوہے کا استعمال شروع ہو گیا تھا اور سترہویں صدی عیسوی کی ابتدا سے جہازوں کے بنیادی ڈھانچے میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ کپڑے کی بنائی کے کام میں پھولوں سے سجی ہوئی بنائی لوم کے اندر موجود کشیدہ کاری کے فریم کی مدد سے پیدا کی جانے لگی، یعنی اب اس کے لیے تیلیاں ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

14.2.7 زبان وادب

مغل دور میں علوم و حکمت کے دوسرے شعبوں کی طرح زبان وادب کو بھی بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ اس کی بنیادی وجہ عام طور پر یہ شمار کی جاسکتی ہے کہ تقریباً سبھی مغل حکمراں تعلیم یافتہ تھے، انہوں نے علوم وفنون اور زبان وادب کے فروغ میں نہ صرف خود بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ علماء و فضلاء اور دانشوروں و ادیبوں کی سرپرستی بھی کی۔ فارسی زبان نہ صرف مغل سلطنت اور دکنی ریاستوں میں اونچی سطح کے دفاتر کی زبان تھی بلکہ اس کا دائرہ پھیل کر راج پوت ریاستوں کے درباروں تک پہنچ گیا تھا۔ اس وجہ سے اس کے طرزِ بیان اور لغت نے دفاتر میں استعمال ہونے والی زبان کو گہرے طور پر متاثر کیا، اس صورت حال کا اندازہ سترہویں صدی عیسوی کے راجستھانی اور مراٹھی دستاویزوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ فارسی نے کئی ہندوستانی زبانوں کی ادبی روایتوں کو بھی متاثر کیا اور اس کے نتیجے میں ہی ایک نئی زبان یعنی اردو وجود میں آئی، لیکن اس کے باوجود بھی فارسی ہندوستان کے کسی بھی حصے میں عام بول چال کی زبان نہیں بن سکی۔ مغل دور میں فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیا گیا۔ فارسی لغت نویسی کے میدان میں مغل دور کی عمدہ مثالیں جمال الدین

حسین انجونی کی 'فرہنگ جہاں گیری' اور عبد الرحمان تھٹوی کی 'فرہنگ رشیدی' ہیں۔ بالآخر یہ سلسلہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر ٹیک چند بہار کی 'بہارِ عجم' کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس لغت کا شمار بلاشبہ فارسی زبان کی سب سے زیادہ جامع لغات میں کیا جانا چاہیے۔ بہار نے اپنی اس تالیف میں ہر لفظ کے ضمن میں ماضی کے شعراء اور ادیبوں کی نگارشات کے حوالے تاریخی تسلسل میں دیے ہیں اور اسی طرح الفاظ کے استعمال میں آنے والی تبدیلیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ سراج الدین آرزو اس دور میں زبان و قواعد اور صرف و مستعملات کے بہت بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'چراغِ ہدایت' میں یہ نظریہ پیش کیا کہ ہندی اور فارسی میں بعض بنیادی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کا یہ نظریہ ولیم جونس (William Jounes) کی انڈو یورپی زبانوں کی بابت انکشافات سے تقریباً پچاس برس قبل منظر عام پر آچکا تھا۔ اسی طرح میرزا جان نے اپنی کتاب 'تحفۃ الہند' میں نہ صرف ہندوستان کے ادبی اسالیب اور موسیقی وغیرہ کا جائزہ لیا بلکہ اس کے تتمہ میں برج بھاشا کی مصطلحات کی ایک طویل فہرست بھی دی۔

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ شمالی ہندوستان میں مسلم حکمرانی کی وجہ سے سنسکرت ادب جنوب میں چلا گیا تھا، مگر اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ مغل سلطنت میں سنسکرت ادب برابر پھلتا پھولتا رہا۔ اس زمانے کی زیادہ تر سنسکرت تحریریں مذہبی امور، فلسفہ اور قانون سے متعلق تھیں۔ اس کے ساتھ ہی زبان و ادب پر بھی مختلف کتابیں تحریر کی گئیں۔ ناگو جی بھٹ (وفات 1700ء) اپنی لاتعداد تصنیفات کے لیے جانے جاتے ہیں، انہوں نے پتانجلی کی 'مہابھاشیہ' جیسی مشہور اور قدیم سنسکرت گرامر پر شرح لکھی۔ شاہ جہاں کے درباری شاعر جگن ناتھ پنڈت نے نقدِ شعر کے موضوع پر 'رس گنگا دھارا' نامی ایک ضخیم کتاب تصنیف کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے 'بھامنی ولاس' جیسی مشہور کتاب تصنیف کی، جو ایک ہی وقت میں عشقیہ نظم، مرثیہ اور حکیمانہ مقولوں کا مجموعہ قرار دی گئی ہے۔ کہانیاں، افسانے اور روایات سنسکرت میں برابر قلم بند ہوتے رہے۔ بلال سین نے سولہویں صدی میں راجہ بھوج کے دربار کے بارے میں پر لطف روایتیں اپنی کتاب 'بھوج پربندھ' میں یکجا کی تھیں۔ سترہویں صدی میں نرائن نے مقفع نثر میں اگنی دیوتا کی بیوی سواہا اور چندرما کے عشق کا ذکر کیا ہے۔ کام سوتر کے انداز میں عشق کے فن کا بیان کلیان مل کی 'انگ رنگ' میں ملتا ہے، جو سولہویں صدی کی تصنیف ہے۔

سنسکرت ادب کی ایک دوسری صنف جس کو پڑھنے والے اور پروان چڑھانے والے برابر ملتے رہے، تاریخ کے متعلق 'کاویہ' یعنی شعری بیان ہے۔ کلہن کی لکھی ہوئی کشمیر کی عظیم تاریخ کے بیان میں شعری اوزان کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسی طرزِ تحریر کو جاری رکھنے کی کوشش اکبر کے عہد میں پراجایا بھٹ اور شوکا نے 'راجاوالی پٹاکا' کے عنوان سے کی تھی۔ مغل دربار میں موجود مدح خواں اور اسی قسم کے وہ لوگ بھی جو راج پوت اور مراٹھا درباروں میں موجود تھے، اس مرصع لیکن اکھڑی ہوئی سی بیانیہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے اسی طرح کی مصنوعی زبان استعمال کرتے رہے۔ اس دور میں سنسکرت کا دوسری کلاسیکی زبانوں سے لین دین کا تعلق بھی رہا۔ اکبر کے دور میں کرشن داس نے 'پارسی پرکاش' نامی تصنیف تیار کی، جو فارسی اور سنسکرت زبان کی ایسی پہلی لغت ہے جس کا ذکر ملتا ہے۔

سنسکرت زبان کے سائنسی ادب میں قابلِ قدر اضافہ ان تحریروں کے ذریعے بھی ہوا، جن میں یونانی اور عربی علوم کو پیش کیا گیا تھا۔ یہ علوم یہاں تک فارسی زبان کے توسط سے پہنچے تھے۔ ان میں سب سے اہم اکبر کے دربار کے منجم نیل کنٹھ کی کتاب 'تاجیک نیل

کنٹھی' تھی۔ 1643ء میں وید انگارایا نے اپنی کتاب 'پارسی پرکاش' تصنیف کی، جو علم فلکیات سے تعلق رکھنے والے الفاظ کی فارسی سنسکرت فرہنگ ہے۔ اٹھارہویں صدی میں سمراٹ جگن ناتھ نے بطلیموس کی کتاب 'المجسطی' اور اقلیدس کی 'ہندسہ' سے متعلق تحریر کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ ان تحریروں کے عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے مثنویوں کا بھی ترجمہ کیا گیا۔

14.3 فنون لطیفہ

فنون لطیفہ یا فن تعمیر کے وہ نمونے جو قوموں اور تہذیبوں کی تمدنی تاریخ کے ارتقائی مراحل میں رونما ہوتے ہیں، وہ اپنے قوم و ملک کی تہذیبی و تمدنی تاریخ کا آئینہ دار ہوتے ہیں، جن سے اس قوم کے سیاسی عروج، معاشرتی ارتقا، تہذیبی و تمدنی ترقی اور معاشی خوش حالی کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں مغل دور حکومت کا اگر اس اعتبار سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مغل حکمرانوں نے اس ملک اور عالمی فنون لطیفہ کے میدان میں بہت سی اہم یادگاریں چھوڑی ہیں، جو نہ صرف ان کی تمدنی ترقی کا آئینہ دار ہیں بلکہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی فروغ کا ثبوت بھی ہیں۔

14.3.1 فن مصوری

مصوری فنون لطیفہ کا ایک ایسا شعبہ ہے جس میں ہندوستان کی مغل حکومت نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ مینا طوری مصوری (Miniature Painting) جو پوری طرح کاغذ پر بنائی جاتی ہے، اسے مغل بادشاہوں نے بڑے پیمانے پر ترقی دی۔ شروع میں یہ فن ایرانی مصوری کا ایک حصہ تھا جس میں لکیروں کی صفائی اور تفصیلات کی صحت پر زور دیے جانے کے ساتھ تناظر سے ارادتاً گریز کیا جاتا تھا۔ اس فن کے دو ابتدائی استاد عبد الصمد اور میر سید علی تھے۔ یہ دونوں ہمایوں کے ساتھ ایران سے آئے تھے۔ اکبر نے اپنے عہد میں فنون لطیفہ خاص طور پر مصوری کی طرف خصوصی دھیان دیا اور اس نے ان ایرانی مصوروں کے ارد گرد فن کاروں کا ایک نیا گروہ تیار کرلیا، جن میں کچھ کر گزرنے کی صلاحیت اور حوصلہ تھا۔ اس مقصد سے اس نے مصوری کے ایک اسکول کی بنا ڈالی، جس میں 'حمزہ نامہ' کی تصویریں بنانے کا کام شروع ہوا۔ اس کے بعد نہ صرف عیسائیت سے مستعار مذہبی پیکر بلکہ یورپی نشاۃ ثانیہ کے دور کے دوسرے عوامل بھی مغل مصوری میں جھلکنے لگے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ مغل مصوری میں تناظر اور تناسب پر خاص توجہ دی جانے لگی تھی۔

جہاں گیر کے عہد میں ہر اعتبار سے مغل مصوری اپنے کمال پر پہنچ گئی تھی۔ اس دور میں کتابوں کی تزئین و آرائش سے ہٹ کر مصوروں نے البم اور افراد کے اشکال تیار کرنے شروع کر دیے تھے۔ جہاں گیر کو افراد کی شکلیں (Portrait) تیار کروانے اور جانوروں، پیڑوں، پودوں اور پھولوں کے خاکے (Sketch) بنوانے میں خاصی دلچسپی تھی۔ خاکے تیار کرنے میں منصور کو استاد کا درجہ حاصل تھا۔ اس قسم کی مغل مصوری کس حد تک دل کو چھو جانے والی ہوسکتی تھی، اس بات کا اندازہ مرض الموت سے دوچار ایک شخص کی شبیہ سے لگایا جاسکتا ہے، جو کسی نامعلوم مصور نے جہاں گیر کے حکم سے تیار کیا تھا۔ اس شبیہ کی خاص بات یہ ہے کہ جذبات کو چھو لینے کی صلاحیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مغل طرز کی مخصوص انفرادیت بھی موجود ہے۔

شاہ جہاں کے دور حکومت (59-1628ء) خصوصاً داراشکوہ کی زیر سرپرستی فن مصوری ترقی کے تمام مدارج طے کر چکا تھا۔ گرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور میں مصوری کے نمونوں کی فراوانی اور ان کی کل تعداد میں کچھ کمی آگئی تھی۔

14.3.2 فن موسیقی اور رقص

مغل عہد میں ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کو بہت ترقی ملی۔ خاص طور پر اس عہد میں موسیقی کو ہندو مسلم اتحاد کا ایک اہم ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستانی موسیقی کے ان نظری اصولوں کو بخوبی سمجھا جانے لگا، جن کا ذکر سنسکرت تحریروں میں موجود ہے۔ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں ان اصولوں کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس نے موسیقی کے 36 ان استادوں کے نام دیے ہیں، جو اکبر کی ملازمت میں تھے۔ ان میں مغنی اور سازندے دونوں شامل ہیں۔ ان میں سب سے اہم نام تان سین کا ہے۔ اکبر کے دربار میں تان سین کی بڑی پذیرائی ہوئی، جو بہت سے راگوں کا موجد شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے مغل عہد میں موسیقی کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تان سین کے ذریعے مغل عہد میں موسیقی کے ایک اسکول کی بنیاد پڑ گئی۔ روایتی طور پر یہ خیال ہے کہ کلاسیکی موسیقی میں 'کنڑا زبان' کی جگہ شمالی ہندوستان کی زبان اور خاص طور پر گوالیار کی بولی کا استعمال پندرہویں صدی کے اواخر میں گوالیار کے راجہ مان کے زمانے سے شروع ہوا۔ اب اس عہد میں 'دھرپد' موسیقی کا سب سے مقبول طرز بن گیا۔ نائک بخشو کو اس طرز کا استاد شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سولہویں صدی کے اوائل سے ایک نیا طرز وجود میں آیا، جس کو 'خیال' کا نام دیا گیا۔

موسیقی کی ترقی میں اکبر کے جانشینوں جہاں گیر اور شاہ جہاں نے اسی کی پیروی کی، ساتھ ہی مغل امراء نے بھی موسیقی کے فروغ میں اہم کردار نبھایا۔ اورنگ زیب کے ذریعے موسیقی کا جنازہ نکالنے سے متعلق تاریخی کتابوں میں بہت سی غیر مستند روایتیں موجود ہیں۔ مگر جدید تحقیقات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے دربار میں مغنیوں پر پابندی عائد کی نہ کہ موسیقی کے آلات پر۔ اورنگ زیب خود ایک باکمال وینا ساز تھا۔ اسی طرح سے اورنگ زیب کے دور حکومت میں کلاسیکی ہندوستانی موسیقی پر فارسی زبان میں متعدد کتابیں تحریر کی گئیں۔ اس بنا پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی ملک میں موسیقی کا فروغ ہوتا رہا۔ مغل عہد میں موسیقی کے شعبہ میں آخری اہم کام اٹھارہویں صدی عیسوی میں محمد شاہ کے دور حکومت میں ہوا۔

مغل مصوری کے نمونوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح مغل دربار میں آہستہ آہستہ وسط ایشیا کے سازوں اور رقاصی کی جگہ ہندوستانی سازوں اور رقص کے طریقوں نے لے لی۔ 'بابرنامہ' کی ایک تصویر میں بابر کو ہمایوں کی پیدائش کے موقع پر جشن مناتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر میں چار مرد اور تین عورتیں مختلف قسم کے ساز بجاتے ہوئے دکھائے گئے ہیں اور ایک مرد ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے ایک عورت کے ساتھ جو سر سے پیر تک ڈھیلے ڈھالے لباس میں ہے، سازوں کی تال پر رقص کر رہے ہیں۔ رقص کے اس وسط ایشیائی منظر کا مقابلہ 'پادشاہ نامہ' کی ایک تصویر سے کیا جاسکتا ہے، جس میں شاہ جہاں کی بیالیسویں سال گرہ کی تقریب دکھائی گئی ہے۔ 'پادشاہ نامہ' کی تصویر میں پندرہ سے زیادہ مرد بیٹھے ہوئے یا کھڑی حالت میں مختلف قسم کے ساز بجا رہے ہیں اور تین مرد اور ایک لڑکا کچھ گا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے دس عورتیں ہیں، جن میں ایک کے سوا سب کی سب ہندوستانی لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں۔

14.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مغل دور حکومت میں پورے ملک میں علمی و عملی سرگرمیاں انجام دی گئیں۔ اس کے لیے ملک کے ہر حصے میں اسکول و مدارس کا جال بچھایا گیا، اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کیے گئے، طلبہ کے لیے رہائش گاہوں اور کتب خانوں کا انتظام کیا گیا اور انہیں ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ ملک میں تعلیمی فضا ہموار ہو۔ ملک میں علمی و تعلیمی فضا ہموار کرنے میں حکمراں، امراء اور عوام الناس سبھی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیے۔
- علمی کارنامے علم کے تمام شعبوں پر محیط ہیں، چاہے وہ مذہبی علوم ہوں یا فنی اور سائنسی۔ غرض کہ چند ہی دنوں میں علماء، فضلاء اور دانشوروں کا پورا ایک قافلہ رواں دواں نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پورے ملک میں ادبی سرگرمیوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہو۔ اس ادبی سیلاب سے ملک کی تمام زبانیں اور بولیاں سیراب ہو رہی ہیں، چاہے وہ سرکاری یا قومی زبانیں ہوں چاہے صوبائی یا علاقائی۔
- مغل عہد حکمت میں ان علمی، تعلیمی، سائنسی اور ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ فن لطیفہ کے تمام شعبوں میں بھی بڑے پیمانے پر کارنامے انجام دیے گئے۔ ہندوستان نے مغل دور حکومت میں مصوری کے میدان میں عالمی شہرت حاصل کی۔ اسی طرح موسیقی، خطاطی اور صنعتی فنون کو بھی اس عہد میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔

14.5 نمونہ امتحانی سوالات

14.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. ان میں سے کس حکمراں نے اپنی آپ بیتی تحریر کی؟

(a) بابر　　(b) جہانگیر　　(c) دونوں　　(d) سب غلط

2. ---------- بادشاہ کی زیر سرپرستی عطاء اللہ رشدی نے الجبرا پر بھاسکر آچاریہ کی کتاب 'بیج گنت' کا ترجمہ کیا۔

(a) شاہ جہاں　　(b) جہانگیر　　(c) اکبر　　(d) ہمایوں

3. ابو الفضل اور فیضی کس مغل حکمراں کے دربار سے وابستہ تھے؟

(a) بابر　　(b) ہمایوں　　(c) اکبر　　(d) جہانگیر

4. بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے ---------- تحریر کیا، جس سے 'اکبر نامہ' کی تکمیل میں مدد ملی۔

(a) 'ہمایوں نامہ　　(b) تزک بابری　　(c) تزک جہانگیری　　(d) سب غلط

5. 'اکبرنامہ' اور 'آئینِ اکبری' کے نام سے اس دور کی دو تاریخ کی کتابیں کس نے مرتب کیں؟

(a) فیضی (b) ابوالفضل (c) ضیاء الدین برنی (d) سب صحیح

14.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. فنون لطیفہ میں مغلوں کی حصہ داری کی وضاحت کیجیے۔
2. اکبر کے دور میں علمی ترقی پر ایک نوٹ تحریر کیجیے
3. مغل حکمراں جہانگیر کے دور میں کس علوم کی زیادی سرپرستی کی گئی اور اس کے کیا نتائج سامنے آئے؟ لکھیے۔
4. مغل حکمراں اورنگ زیب کے دور میں علوم کے ارتقا پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
5. مغل دور کے ابتدائی حکمراں بابر اور ہمایوں کے علمی ذوق کے بارے میں ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

14.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مغل دور کی تعلیمی صورت حال کا جائزہ لیجیے۔
2. مغل عہد کی علمی و سائنسی ترقی پر ایک مضمون لکھیے۔
3. مغل دور میں علوم کے ارتقا کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

14.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. عہد اسلامی میں تعلیمی ترقی : پروفیسر این این لا، اردو ترجمہ: اخلاص حسین زبیری و سلطان فاطمہ
2. عہد وسطیٰ کا ہندوستان، ایک تہذیب کا مطالعہ : عرفان حبیب، اردو ترجمہ: اقتدار عالم خاں، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، 2010ء
3. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، جلد دوم : ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
4. اسلامی ہند میں علوم عقلیہ : شبیر احمد خاں غوری، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1997ء
5. رودِ کوثر : شیخ محمد اکرام، ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی
6. ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

اکائی 15: مغلیہ حکومت میں فن تعمیر

اکائی کے اجزا:

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 مغلیہ سلطنت میں فن تعمیر

15.3 تعمیراتی ترقی میں مغل حکمرانوں کا کردار

15.3.1 ظہیر الدین محمد بابر

15.3.2 نصیر الدین محمد ہمایوں

15.3.3 جلال الدین محمد اکبر

15.3.4 نورالدین محمد جہاں گیر

15.3.5 شہاب الدین محمد شاہ جہاں

15.3.6 محی الدین اورنگ زیب عالم گیر

15.3.7 عہد زوال کے حکم رانوں کے دور میں فن تعمیر

15.4 مغلیہ دور کی چند اہم عمارتیں

15.4.1 ہمایوں کا مقبرہ، دہلی

15.4.2 بلند دروازہ، فتح پور سیکری

15.4.3 اکبر کا مقبرہ، سکندرہ

15.4.4 اعتمادالدولہ کا مقبرہ، آگرہ

15.4.5 جامع مسجد، دہلی

15.4.6 تاج محل، آگرہ

15.4.7 بادشاہی مسجد، لاہور

15.4.8 بی بی کا مقبرہ، اورنگ آباد

15.5 مغل فن تعمیر کی خصوصیات اور اثرات

15.6 کلیدی الفاظ

15.7 اکتسابی نتائج

15.8 نمونہ امتحانی سوالات

15.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

فن تعمیر یا دوسرے وہ فنون لطیفہ، جو قوموں کی تمدنی تاریخ کے ارتقائی مراحل میں رونما ہوتے ہیں، اپنے ملک و قوم، مذہب و ملت اور علاقے کی تہذیبی و تمدنی عروج کا آئینہ ہوتے ہیں، جس سے اس قوم کی سیاسی حیثیت، معاشرتی ارتقاء، تہذیبی و تمدنی ترقی اور معاشی خوش حالی کا بآسانی پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ قوموں کے یہ مجسم تہذیبی و تمدنی آثار، جو حوادث زمانہ کی ستم ظریفیوں سے باقی رہ جاتے ہیں، ان کی مذہبی اساس، معاشرتی مراسم، دانش ورانہ زندگی اور عظیم الشان ترقی کی ایسی نادر تاریخیں ہوتی ہیں، جن سے ان کی مذہبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

برصغیر ہند میں مسلم فن تعمیر بالخصوص مغلیہ عہد کی شاندار باقیات اب بھی سیاحوں کی توجہ کا مرکز اور انہیں حیرانی میں ڈالنے کا ایک ذریعہ بنتی ہیں۔ فن تعمیر میں زینت و آرائش اور لطافت سے برصغیر کے مسلمانوں کا خاص شغف ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے پلوں کے محراب اور پرکاری کے نقش و نگار ایجاد کیے اور اپنی عمارتوں میں محراب و گنبد سے ندرت، ان میں بیل بوٹوں، پھول پتیوں کے نقش و نگار سے حسن اور آیات قرآنی کی خطاطی سے تقدس پیدا کیا، جس کی وجہ سے ان کے تعمیراتی نمونوں میں ایسا حسن پایا جاتا ہے، جس میں کبھی قدامت کا تاثر نہ پیدا ہوگا۔ مغل عہد کے حکمرانوں اور ماہرین فنون نے اپنی تخلیقات میں ہمیشہ فطرت کو سنوارنے اور اس کے تزئین کی کوشش کی۔ ان کے فنون خاص طور پر فن تعمیر میں اس فطرت کا ظہور تقدس، تخیل، حسن وزیبائی، شوخ و منور، مزین و مرصع اور نزاکت و نفاست کی صورت میں ہوتا ہے۔ انہوں نے عمارت سازی میں پتھر کے ایسے نادر نمونے تعمیر کیے، جو دیکھنے والوں کو سونے اور جواہرات سے مرصع و مرمریں عمارتیں معلوم ہوتی ہیں۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو مغل عہد کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کے ایک اہم گوشے یعنی فن تعمیر سے روشناس کرانا ہے تاکہ انہیں اسلامی فن تعمیر میں بالعموم اور برصغیر ہند کی فن تعمیر میں بالخصوص مغل عہد کی خدمات کا علم ہوسکے، وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہوسکیں کہ فن تعمیر کیا ہے اور ملک و قوم کی زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ تاکہ طلبہ مغل عہد کہ فن عمارت سازی سے نہ صرف واقف ہوجائیں، بلکہ انہیں اس عہد کی فن تعمیر کی خصوصیات سے بھی آگہی ہوسکے۔

ساتھ ہی اس اکائی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مغل دور کے ان تعمیراتی نمونوں سے طلبہ کو متعارف کرایا جائے، جن کا ظہور مغل دور میں ہوا تاکہ طلبہ اس بات کو بآسانی سمجھ سکیں کہ وہ کون سے تعمیراتی مادے، سامان اور اجزائے ترکیبی تھے، جن سے مغل عہد کی عمارتیں تعمیر کی گئیں؟ مغل عہد کے حکم رانوں اور ماہرین تعمیرات نے کس قسم کی عماتوں کو تعمیر کرنے میں دلچسپی دکھائی؟ تاکہ وہ مغل دور کی اس ثقافتی ترقی سے بخوبی واقف ہوسکیں جو مغل سلطنت کا ایک شان دار باب رہی ہیں اور جو آج بھی اپنے زائرین اور دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کردیتی ہیں۔

15.2 مغلیہ سلطنت میں فن تعمیر

فن لطیفہ کے میدان میں ہندستانی مغل حکم رانوں کے سب سے اہم اور یادگار نمونے فن تعمیر کے شعبے میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ اس عہد میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کی جس بڑے پیمانے پر منصوبہ سازی کی گئی اور ان میں پائی جانے والی عمارتی وفنی تفصیلات یعنی ان کی نفاست، آرائش وزیبائش اور ان کا جمال دیکھنے والوں کو آج بھی حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ مغل عہد میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کی بنیادی تکنیک اور ان کے مختلف النوع خاکوں کو مختلف عناصر سے اخذ کیا گیا ہے۔ ان میں ایک بڑا حصہ ان اشکال اور اجزا کا ہے، جن کو سلطنت کے فن عمارت سازی نے عطا کیا تھا۔ اس سلسلے میں گنبد، محراب، مینار اور قوسی چھت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مغلوں نے بہت سی نئی جہات اور عمارتی اجزا و اشکال ان صوبائی طرز تعمیر سے مستعار لیں، جو سلطنت کی عمارتوں سے شروع ہوکر گجرات، راجستھان، مالوہ، شرقی سلطنت اور بنگال میں نمایاں ہوتی گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی متعدد نئے تعمیراتی اجزا اور آرائشی طریقے وسط ایشیا، ایران اور عرب علاقوں سے یہاں لائے گئے، جن میں ابھرے ہوئے گنبد، پچی کاری، عربی طرز آرائش وزیبائش اور مربع قطعات میں باغات کی ترتیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک عمارت سازی میں پانی کی موجودگی سے لطیف کیفیات پیدا کرنے کا تعلق ہے تو ہندوستان، ایران، وسط ایشیا اور عرب تمام جگہوں کی مسلم تعمیراتی روایتوں میں یہ خصوصیت مشترک ہے، لیکن مغل عمارتوں میں ان روایتوں کو نہ صرف ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا گیا ہے، بلکہ اس کا زیادہ دل کش پہلو تجربہ اور ندرت سے عبارت وہ رجحان ہے، جو مغل تعمیراتی روایت میں جاری وساری نظر آتا ہے۔ دور اکبر کے محل نما شہر فتح پور سیکری میں یہ رجحان نہایت تابناک انداز میں ملتا ہے۔ یہاں پر محراب اور کڑیوں سے عبارت تعمیراتی اصولوں کو نہایت سلیقے سے یکجا کرکے بہت خوب صورت اور دل کش عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں۔ شاہ جہاں کا تاج محل ایک مستند تعمیراتی کارنامہ ہے،

جس میں ہر وہ خوبی اور حسن موجود ہے، جسے مغل حکمراں اپنی عمارتوں میں پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے۔ مغل فن تعمیر کا دور تقریباً تین صدیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے، جو واضح طور پر سولہویں صدی میں ہمایوں کے مقبرے کی تعمیر سے شروع ہو کر انیسویں صدی کے نصف اول تک جاری رہتا ہے۔ عمارتوں کے اعتبار سے مغل حکمرانوں نے برصغیر ہند میں بہت سے تعمیراتی نمونے چھوڑے۔ ان تعمیراتی نمونوں میں مساجد و مدارس، محل و قصور، مقبرے، شہروں کی بناو آبادکاری، باغات و سرائے، شکار گاہ، سڑکوں و شاہراہوں کی تشکیل و درستی، نہروں، بندوں اور پلوں وغیرہ کی تعمیر شامل ہے۔

15.3 تعمیراتی ترقی میں مغل حکمرانوں کا کردار

مغل فن تعمیر کے بنیادی اجزا اور اس کا اصل خمیر وسط ایشیا اور ایران سے اخذ کیا گیا تھا، جسے ہندستان میں اس حکومت کے بانی بابر نے برتا، یہ مسلم طرز تعمیر کا وہی تعمیراتی نمونہ تھا، جو وسط ایشیا کے مختلف شہروں مثلاً سمرقند، بخارا اور ہرات وغیرہ میں سلجوقی اور تیموری حکومتوں کے تحت پروان چڑھا۔ مغل عہد کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مغل حکمرانوں نے ہندستانی علاقوں میں اپنی آمد کے ساتھ ہی ان تمام تعمیراتی نمونوں کو برتنا شروع کیا، جسے ان کے اجداد نے ترقی دی تھی۔ ہندستان میں مغل فن تعمیر کی ابتدا عہد بابر سے شمار کی جاسکتی ہے۔

15.3.1 ظہیر الدین محمد بابر

وسط ایشیائی شہروں بالخصوص سمرقند اور ہرات میں بابر کے مختصر قیام کے باوجود بھی اس کے ذہن و دماغ پر ان شہروں کا اثر بہت گہرا تھا۔ سمرقند اور ہرات میں موجود عہد تیموری دور کی شان دار باقیات یعنی باغات، مساجد، مدارس اور مقبروں نے فن تعمیر کے تعلق سے بابر کے رویوں اور زاویوں کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان شہروں میں موجود باغات اور شان دار عمارتوں کے تذکرے بابر کی تزک میں درج ہیں۔ یہ صرف عمومی وطائرانہ تذکرے نہیں ہیں، بلکہ ان میں فطرت کا بغور اور تفصیلی مشاہدہ شامل ہے۔ اسی وجہ سے یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کہ کابل کے علاقے میں بابر کا پہلا تعمیراتی نمونہ مسقف عمارتوں اور رواں آبشاروں سے مرصع باغات پر مشتمل تھا، جسے بلاشبہ سمرقند اور ہرات کے باغات کا اثر قرار دیا جاسکتا ہے، ساتھ ہی فطرت سے بابر کی گہری محبت کی دلیل بھی ہے۔ تزک بابری سے پتہ چلتا ہے کہ بابر کے یہاں باغات کی تعمیر کے مقابلے میں مستقل عمارتوں کی تعمیر کی اہمیت کم تھی۔ بابر کی تزک اور مغل تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بابر نے مستقل طور پر کسی تعمیر شدہ محل میں رہائش کے بجائے باغات میں قیام کو ترجیح دی۔ اپنی مختصر عہد حکومت کے دوران اس نے یا تو پہلے سے موجود باغات کی تجدید کی یا نئے تعمیر کیے۔ تزک بابری سے اندازہ ہوتا ہے کہ کابل اور اس کے اطراف میں تعمیر ہونے والے باغات میں ''باغ وفا'' اس کا سب سے پسندیدہ باغ رہا ہوگا، کیوں کہ اس کا تذکرہ متعدد بار کیا گیا ہے۔ ہندستانی سرزمین پر بابر کے ذریعے لگائے جانے والے باغات میں سب سے پہلا باغ، چہار باغ ہے، جو پنجاب کے علاقے میں Ghaggar ندی کے کنارے واقع تھا۔ اس باغ کا خاکہ خود بابر نے تیار کیا تھا اور اس کی تکمیل 1528-29 میں ہوئی۔

بابر نے پانی پت کی جنگ میں فتح کے بعد ہندستان کی گرمی، گرد و غبار، مکھیوں اور شدید قسم کی گرم ہواؤں سے بچاؤ کے لیے باغات، حمام اور باؤلیاں تیار کرائیں۔ بابر نے آگرہ میں ہشت بہشت نام سے ایک باغ تیار کرایا، جو دریائے جمنا کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ تزک بابری سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اس کی مرکزی رہائش گاہ اور دربار کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک حمام، ایک باؤلی، ایک دیوان عام اور بادشاہ کی ذاتی رہائش گاہ تھی۔ ایک دوسرا باغ شہر کے پرانے قلعہ کے اندر تعمیر کیا گیا، جس میں 1526ء کے آخر تک ایک مسجد کچھ پتھروں کے رہائشی مکانات اور ایک کنواں تیار ہو چکا تھا۔ تاریخی کتب میں بابر کے دو باغوں کا تذکرہ عام طور پر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک آگرہ میں واقع ہے، جو اب رام باغ کے نام سے مشہور ہے۔ شاید کہ اس کا اصل نام گل افشاں باغ تھا، مگر کچھ لوگ اسے آرام باغ بھی کہتے ہیں۔ بابر کے جسد خاکی کو کابل منتقل کرنے سے پہلے عارضی طور پر اسی باغ میں دفن کیا گیا تھا۔ دوسرا باغ دھول پور، موجودہ راجستھان کے بھرت پور ضلع میں واقع ہے۔ تزک بابری کے مطابق اس کا نام باغ نیلوفر ہے۔ تاریخی شواہد کی بنیاد پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندستان میں مغل حکومت کے بانی بابر کے دور حکومت (30-1526ء) میں بہت سی عمارتیں تعمیر کی گئیں لیکن اس عہد کی باقی بچی عمارتوں میں صرف چند مسجدوں کا نام لیا جاسکتا ہے ایک پانی پت میں واقع ہے اور دوسری سنبھل میں۔ عہد بابری میں ہی ایک مسجد ایودھیا میں بھی تعمیر کی گئی، جس کا تعمیری کام 29-1528 میں بابر کے ایک امیر میر باقی کے ذریعے انجام دیا گیا۔ بابر کے عہد میں تعمیراتی کاموں کو انجام دینے کے لیے تقریباً 1500 سنگ تراشوں کو ملازمت دی گئی تھی۔ ہندستانی ماہرین فن کے علاوہ وسط ایشیائی عمارت سازوں نے بھی بابر کے عہد میں اپنے فن کے جوہر دکھائے، جن میں میر میرک غیاث اور استاد شاہ محمد کا نام قابل ذکر ہے۔

15.3.2 نصیر الدین محمد ہمایوں

یہ حقیقت ہے کہ ہمایوں کو اپنے زمانے کے سیاسی حالات کے پیش نظر بہت زیادہ عمارتیں تعمیر کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن اس کے باوجود بھی اس نے دہلی، آگرہ اور چند دوسرے شہروں میں تعمیراتی کام انجام دیے۔ مورخین آگرہ اور فتح آباد حصار میں اس کے ذریعے بنوائی گئی کچھ مسجدوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ دہلی میں دین پناہ کے نام سے ایک قلعہ بند شہر اور چند شاہی محلوں کی تعمیر بھی اسی عہد کی بیان کی جاتی ہے، جسے اب قلعہ کہنہ یا پرانا قلعہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمایوں کے دور حکومت میں گوالیار، آگرہ اور دہلی میں مزید روایتی محل تعمیر کیے گئے، مگر اب یہ محل حوادث زمانہ کے پیش نظر ناپید ہو چکے ہیں۔ مغل عہد حکومت کے ابتدائی دور یعنی بابر اور ہمایوں کے دور حکومت میں اس عہد کے امراء اور روساء کے ذریعہ بھی چند تعمیراتی کام انجام دیے گئے، جن میں نظام الدین اولیاء کے مقبرے کے احاطے میں واقع امیر خسرو کے مقبرے کی بحالی شامل ہے۔ اس قسم کی دوسری عمارتوں میں پالم ہوائی اڈے کے پاس واقع غضنفر مسجد، مالویہ نگر میں شیخ فرید الدین گنج شکر کی یاد میں بنائی گئی خانقاہ قابل ذکر ہیں۔

15.3.3 جلال الدین محمد اکبر

حقیقی طور پر مغل فن تعمیر کی تاریخ کی ابتدا اکبر کے دور حکومت (1605-1556ء) سے ہوتی ہے۔ اکبر نے اپنی عظیم الشان سلطنت کے قیام کے ساتھ ساتھ ملکی صلاحیتوں کو استعمال کرنا اور ہندستانی فن تعمیر کے نمونوں سے فیض اٹھانا شروع کیا۔ حقیقت میں اکبر ہی

مغل عہد کا ایسا پہلا حکم راں ہے، جسے اس قسم کے مواقع میسر آئے اور اس کے عہد میں سلطنت کے مختلف شہروں میں قلعوں، شاہی محلوں، مسجدوں، مقبروں، مدرسوں اور دوسرے قسم کی عمارتوں کا ایک سیلاب نظر آتا ہے۔ عہد اکبری کی ابتدائی عمارتیں دہلی میں تعمیر ہوئیں، جو 1565 تک اکبر کا دارالسلطنت رہا۔ اس عہد کی دہلی کی عمارتوں میں مسجد و مدرسہ خیر المنازل، مقبرہ نظام الدین اولیاء کی دوبارہ تعمیر، اتگہ خان کا مقبرہ، سبز برج اور ادہم خان کا مقبرہ اور مسجد شیخ عبد النبی شامل ہیں۔ اکبر کے دور میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کا دوسرا اہم مرکز آگرہ ہے، جو ایک لمبے وقت تک اکبر کا دارالحکومت رہا۔ اسی زمانے میں اکبر نے آگرہ کے قلعے کو دوبارہ تعمیر کروایا، جس میں زیادہ تر لال رنگ کا ریتیلا پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اکبر کے عہد میں آگرہ کے قلعے میں تقریباً 500 عمارتیں تعمیر کی گئیں، لیکن ان میں سے آج صرف چند ہی محفوظ ہیں۔ عہد اکبری کی عمارتوں کا تیسرا اہم مرکز فتح پور سیکری ہے۔ سیکری کے قلعے میں اکبر کے ذریعہ بڑے پیمانے پر عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ یہاں کی اہم عمارتوں میں جامع مسجد، بلند دروازہ، شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ، عیسیٰ خاں کا مقبرہ، دیون عام، دیوان خاص، شاہی محل، پنچ محل، سرائے اور حمام کو شمار کیا جاسکتا ہے۔

اکبر کے عہد میں مختلف صوبائی شہروں میں بھی قلعے، مسجدیں، محل اور دوسری قسم کی عمارتیں بڑے پیمانے پر تعمیر کی گئیں۔ ان میں اجمیر میں واقع اکبری محل، الہ آباد کا قلعہ، لاہور کا قلعہ اور راجستھان، ہریانہ، اتر پردیش اور بہار و بنگال کے قلعے اور دوسری عمارتیں شمار کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح عہد اکبری کے امراء نے بھی عمارت سازی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، نتیجے کے طور پر مغل فن تعمیر کو دارالسلطنت سے دور دوسرے شہروں میں بھی پروان چڑھنے کا موقع ملا۔

15.3.4 نورالدین محمد جہاں گیر

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ فن مصوری میں جہاں گیر (1605-28ء) کی حد درجہ دلچسپی کی وجہ سے عہد اکبری کے مقابلے اس عہد میں فن عمارت سازی اور اس کی سرپرستی کو نقصان پہنچا۔ مزید یہ کہ جہاں گیر کی باثر ملکہ نور جہاں سے متعلق عمومی نظریہ، جو اس عہد میں فنی و جمالیاتی اعتبار سے اعلیٰ ذوق کی حامل تھی، کہ اسی نے عہد جہاں گیری میں تعمیراتی رجحان کو تحریک عطا کی۔ فن تعمیر کے ایک سرپرست کے طور پر نور جہاں کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن جہاں گیر کی تزک کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے بائیس سالہ دور حکومت میں بہت سے باغات، قلعے، مسجدیں، مقبرے، محل اور مختلف قسم کی عمارتیں تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح اس بات کے بھی شواہد ملتے ہیں کہ اس عہد میں شہروں کی آبادکاری، سرائے اور باغات کی تعمیر اور خانقاہوں کے لیے اوقاف متعین کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر امراء کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ عہد جہاں گیری کی زیادہ تر عمارتیں الہ آباد، آگرہ، دہلی، لاہور اور سری نگر (کشمیر) میں تعمیر ہوئیں۔ ان کے علاوہ اجمیر، پشکر (راجستھان)، مانڈو (مدھیہ پردیش)، احمد آباد (گجرات) چنار (اتر پردیش)، منیر، چمپانگر، بہار شریف، سہسرام، خرم آباد، پٹنہ (بہار)، ڈھاکہ (بنگلہ دیش) اور شیخوپورہ (پاکستان) میں بھی اس عہد کی چند عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

15.3.5 شہاب الدین محمد شاہ جہاں

شاہ جہاں کا دور حکومت (1628-58ء) مغل فن تعمیر کا عہد زریں شمار کیا جاتا ہے۔ شاہ جہاں نے بطور شہزادہ ہی مختلف قسم کی

عمارتوں اور باغات کی تعمیر میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی تھی اور حکمراں بننے سے پہلے بابر کے ذریعہ تعمیر کردہ کابل کے قلعے میں کئی رہائشی مکانات تعمیر کرائے تھے۔ ساتھ ہی آگرہ کے قلعے میں کئی عمارتوں کی تشکیل و تعمیر نو کی۔ اسی عہد میں شاہ جہاں نے احمد آباد میں شاہی باغ کی تعمیر کی اور اودے پور کی ایک پہاڑی پر 1613ء میں کئی عمارتیں بنوائیں۔ دکن میں برہان پور کے قریب شاہ جہاں نے ایک مصنوعی جھیل پر ایک عمدہ شکار گاہ بنوایا، جسے اس نے اپنے عہد سے پہلے تعمیر کیے گئے ایک باندھ میں دوسرے باندھ کا اضافہ کر کے بنایا تھا۔ آگرے کے قلعے کی عمارتوں میں کئی قابل ذکر اضافے کیے، جن میں موتی مسجد اور مثمن برج کافی اہم شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ مسجد زیادہ تر سنگ مرمر کی ہے اور بعض لوگوں کے خیال میں دنیا کی خوب صورت ترین مسجد ہے۔ اسی طرح شاہ جہاں نے دہلی میں جمنا کے کنارے ایک نیا شہر آباد کیا، جو تاریخ میں شاہ جہان آباد کے نام سے مشہور ہے۔ لال قلعہ دہلی میں شاہ جہاں کے ذریعے بسائے گئے نئے شہر کا حصہ تھا۔ لال قلعے کے اندر اس نے بڑے پیمانے پر خوب صورت محل اور عمدہ عمارتیں تعمیر کیں۔ ان عمارتوں میں دیوان عام، دیوان خاص، شاہی محل، سبز برج، نقار خانہ، نہر بہشت، امتیاز محل، مسقف بازار اور قلعے کے دونوں داخلی دروازے قابل ذکر ہیں۔

غرض کہ شاہ جہاں نے اپنے دور حکومت میں دہلی، آگرہ اور لاہور کے علاوہ سلطنت کے دوسرے شہروں مثلاً اجمیر، انبالہ، سری نگر، ٹھٹھہ، احمد آباد، تھانیسر، پانی پت، پٹنہ، بہار شریف، کھڑگ پور، اکبر پور اور ڈھاکہ میں خوب صورت تعمیرات کا اس قدر اضافہ کیا، جس کی مثال اس سے پہلے کے ادوار میں نہیں ملتی۔ اسی وجہ سے شاہ جہاں کے عہد کو بجا طور پر تعمیراتی ترقی کے اعتبار سے عہد زریں شمار کیا جاتا ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں تعمیر ہونے والی تمام عمارتوں کے میر عمارت اس عہد کے مشہور ماہر تعمیر استاد احمد شمار کیے جاتے ہیں، خاص طور پر تاج محل، دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد انہی کے زیر نگرانی تعمیر کیے گئے۔

15.3.6 محی الدین اورنگ زیب عالم گیر

اورنگ زیب کے عہد حکومت (1659ء-1707ء) میں بھی تعمیرات کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عہد میں قدیم عمارتوں بالخصوص مسجدوں کی مرمت اور تزئین کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیا گیا۔ اورنگ زیب نے اپنے تمام پیش روؤں سے زیادہ مسجدوں کی مرمت کا کام انجام دیا۔ اس عہد میں نہ صرف مغل مساجد کی مرمت کی گئی بلکہ ان مسجدوں کی بھی مرمت اور تزئین کی گئی، جو لودی، تغلق، خلجی اور دکنی سلاطین کے عہد میں تعمیر ہوئی تھیں۔ اس زمانے کی تعمیر شدہ عمارتوں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کی بنا پر ان کو فن تعمیر کی تاریخ میں کوئی خاص مقام مل پاتا۔ اس عہد کی قابل ذکر عمارتوں میں دہلی کے لال قلعے میں تعمیر ہونے والی موتی مسجد، لاہور کی بادشاہی مسجد اور اورنگ آباد میں تعمیر کیا گیا رابعہ درانی کا مقبرہ ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ رابعہ درانی کے مقبرے کو تاج محل کے طرز پر تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اورنگ زیب کے عہد میں تعمیراتی کام دہلی، لاہور، اورنگ آباد، خلد آباد، احمد آباد، متھرا، اجمیر، گوالیار، بنارس، داود نگر، بہار شریف، پٹنہ، ڈھاکہ، بیجاپور اور اجین میں انجام دیا گیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں تعمیر ہونے والی زیادہ تر عمارتوں کے معمار استاد احمد کے بیٹے استاد عطاء اللہ تھے۔

15.3.7 عہد زوال کے حکم رانوں کے دور میں فن تعمیر

1707 میں اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی مغل حکومت کا عہد زوال شمار کیا جاتا ہے، جو 1857ء میں ان کی حکومت کے خاتمے پر منتج ہوا۔ یہ زمانہ مغلوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ تہذیبی و ثقافتی زوال کا بھی ہے۔ اسی لیے اس عہد میں فن تعمیر کو بھی زوال آیا اور تعمیراتی کاموں میں کمی واقع ہوئی، ساتھ ہی یہ تعمیراتی نمونے فنی اعتبار سے بھی زوال کا شکار ہوئے۔ مگر ان سب کے باوجود بھی عہد زوال کے حکم رانوں نے اپنی وسعت کے اعتبار سے تعمیراتی کاموں میں حصہ لیا۔ اس عہد کی زیادہ تر عمارتیں دہلی میں تعمیر کی گئیں۔ ان میں مسجدوں اور مقبروں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس عہد کی عمارتوں میں شاہ عالم بہادر شاہ کے ذریعے تعمیر ہونے والی مسجد اہم ہے، جو موتی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد مہرولی میں قطب الدین بختیار کاکی کے مقبرے کے پاس واقع ہے۔ عمارت سازی کے اعتبار سے عہد زوال کے حکم رانوں میں محمد شاہ کا دور بھی اہم شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں شاہ جہاں آباد میں کئی قابل ذکر اضافے ہوئے، جن میں روشن الدولہ کی تعمیر کردہ سنہری مسجد، فخر المساجد اور نواب شرف الدولہ مسجد و مدرسہ اہم ہیں۔ احمد شاہ کے دور کی عمارتوں میں قدسیہ باغ اور اس کی مسجد، قدسیہ بیگم اور جاوید خاں مسجد، جسے سنہری مسجد بھی کہا جاتا ہے اور شاہ مرداں اہم ہیں۔ مغل عہد زوال کی عمارتوں میں صفدر جنگ کا مدرسہ بھی تعمیری خصوصیت کے اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے علاوہ مغل عہد زوال میں مسجدیں اور چند دوسری عمارتیں اجمیر اور لاہور میں بھی تعمیر ہوئیں۔ اسی عہد میں مغل سلطنت کی کمزوری کی وجہ سے علاقائی حکومتوں کا ظہور ہوا اور انہوں نے بھی اپنی تعمیرات میں مغل طرز کو اپنایا۔ ان میں نوابین اودھ کے تحت لکھنو اور فیض آباد کی عمارتوں، نوابین بنگال کے تحت مرشد آباد کی عمارتوں اور بنارس و پٹنہ کی چند دوسری عمارتوں کو شمار کیا جاسکتا ہے، جو مغل حکومت کے عہد زوال میں تعمیر کی گئیں۔ اسی طرح علاقائی ہندو راجپوت حکومتوں جیسے کی بھرت پور، جودھ پور اور جے پور کی تعمیرات میں بھی مغل طرز تعمیر کے اثرات اور اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

15.4 مغلیہ دور کی چند اہم عمارتیں

فن تعمیر میں برصغیر ہند کے مغل حکم رانوں کی خدمات اور ان کے ذریعے ظہور میں آنے والی مختلف قسم کی تعمیرات کے تذکرے کے بعد اب اس عہد کی چند اہم عمارتوں کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا۔ اس زمرے میں ان عمارتوں کی شمولیت مقصود ہے، جن کے ذریعے مغل فن تعمیر کی شناخت ہے۔ یہ عمارتیں نہ صرف مغل عہد کی بلکہ ہند اسلامی فن تعمیر اور عالمی فن تعمیر میں اپنا ایک مقام و مرتبہ رکھتی ہیں۔

15.4.1 ہمایوں کا مقبرہ، دہلی

مغل طرز تعمیر کا پہلا اہم نمونہ ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ ہم عصر مغل حوالوں کے مطابق اس کی تعمیر دہلی میں 1562ء سے 1571ء کے درمیان ہوئی۔ عہد اکبری کے ابتدائی دور کی اس عمارت کو ہمایوں کی وفات کے بعد اس کی ایک بیوی حمیدہ بانو بیگم نے تعمیر کرایا۔ کچھ حوالے اس مقبرے کی تعمیر کے اصل سرپرست کے طور پر اکبر کا نام بھی پیش کرتے ہیں، مگر یہ مقبرہ اکبر کے دیگر تعمیراتی نمونوں میں کسی سے بھی مشابہت نہیں رکھتا۔ اس عمارت کے بارے میں عام طور سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس عمارت کا تصور ایرانی ہے لیکن کاری گری

ہندوستانی۔ یہ خوب صورت مقبرہ ایرانی ماہر فن تعمیر میرک مرزا غیاث اور میرک سید غیاث کی زیر نگرانی ہندوستانی کاری گروں اور راج گیروں کے ذریعے تعمیر کیا گیا۔ مذکورہ دونوں ایرانی معمار تیموری روایت اور طرز تعمیر کے تربیت یافتہ تھے، ان کا یہ شاہ کار اٹھارہویں صدی تک مغل مقبروں کے خاکوں اور طرز تعمیر میں اثرانداز ہوا۔ مقبرے کی اصل عمارت چاروں اطراف سے 45 میٹر لمبائی پر مشتمل اپنے خاکے کے اعتبار سے مربع نما ہے، جس کے اوپر سفید سنگ مرمر کا پیازی گنبد اور چاروں طرف چھتریاں اور کوشکیں ہیں۔ مقبرے کی یہ عمارت ایک بڑے اور اونچے چبوترے پر کھڑی ہے، جس کے تمام اطراف کی لمبائی 99 میٹر ہے۔ پوری عمارت سرخ ریتیلے پتھروں اور سنگ مرمر سے تعمیر کی گئی ہے۔ مقبرہ باہر سے سادہ مگر اندر سے مزین ہے۔

زمینی سطح پر مقبرے میں ایک مرکزی ہشت پہلو ایوان ہے، جس میں قبر اور کتبہ ہے۔ یہ مرکزی ایوان مزید آٹھ ذیلی ایوانوں سے گھرا ہوا ہے اور راہ داریوں کے ذریعے ان ذیلی ایوانوں کو مرکزی ایوان اور باہر سے جوڑا گیا ہے۔ مقبرے کی بالائی سطح بھی زمینی سطح کے مشابہ ہے۔ عموماً مذکورہ وسیع انتظام ہندسی اصولوں پر مبنی ہوتا ہے اور مسلم فن تعمیر میں اس کا اولین نمونہ تیموری تعمیرات میں عشرت خانہ میں نظر آتا ہے، جو تقریباً 1464 میں تعمیر کیا گیا اور خواتین کے لیے خاندانی مقبرے کے طور پر مستعمل ہوا۔ اس مقبرے میں ان آٹھ ذیلی ایوانوں کے استعمال کا مقصد اسلامی کونیات کی جنتوں کو ابھارنا ہے۔ اسی طرح ایوانوں کو جوڑنے والی راہداریوں کے استعمال کا مقصد شاید مرکزی ایوان میں موجود قبر کے طواف کی سہولت بہم پہنچانا ہے۔ صوفی رسومات سے ماخوذ یہ رسم مغل شاہی مقبروں کی عام روایت تھی۔

مقبرے کا ہندسی اصولوں پر مبنی ہونا اور اس کی اندرونی تنظیم کی پیچیدگی تیموری روایت کا واضح اثر ہے۔ اس میں کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے، کیوں کہ معماروں نے بخارا میں ایک لمبے وقت تک کام کیا تھا، جو تیموری فنی روایات کا آخری مرکز رہا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمایوں اور اس کی ملکہ ایک مدت تک ایران میں جلاوطن رہنے کی وجہ سے اپنے اندر ایرانی جمالیات کی ایک حس پیدا کر چکے تھے، جس کا اظہار مقبرے کی ظاہری ہیئت سے بخوبی ہوتا ہے۔ چند تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ ہمایوں کے مقبرے کا تصور سمرقند میں موجود عظیم تیموری خاندان کے مقبرے گور میر کے طور پر کیا گیا تھا۔ تاہم، اگرچہ شاہی گھرانے کے چند افراد کو یہاں پر مدفون کیا گیا، مگر اس کا استعمال بعد کے حکم رانوں کے مقبرے کے طور پر نہیں ہوا۔

خاکے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقبرہ ایک مربع نما آراضی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ مرکزی عمارت کے چاروں طرف ایک چوگشہ باغ ہے، جو دیوار سے گھرا ہوا ہے۔ اس باغ کو سیراب کرنے کے لیے نالیاں بنی ہوئی ہیں، جو ایک دوسرے میں سے گزرتی ہوئی مختلف سمتوں میں نکل جاتی ہیں۔ مقبرے کی عمارت کا باغ کے مرکزی حصے میں واقع ہونا بھی مسلم فن تعمیر کی ایک خصوصیت بیان کی جاتی ہے، جس کے ذریعے خاکے اور اصل عمارت میں توازن کو برقرار رکھا جاتا تھا۔ ساتھ ہی مقبرے کی مرکزی عمارت کی ظاہری ہیئت بھی اس امر پر دال ہے کہ وہ چاروں طرف سے یکساں اور متوازی نظر آتی ہے۔ اسی طرح یہ مقبرہ اسلامی تصور جنت کی ایک پیش کش کے طور پر بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اپنی انہیں خصوصیات کی بنا پر اسے ہند، ایرانی فن تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ شمار کیا جاتا ہے۔

15.4.2 بلند دروازہ، فتح پور سیکری

فتح پور سیکری شہر کی بنیاد 1570ء میں پڑی، یہاں بھی لال ریتیلا پتھر زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ مختلف قسم کی عمارتوں اور محلوں کے اس انبوہ کا خاکہ اکبر نے اس وقت تیار کیا تھا، جب اس کے مذہبی افکار و خیالات میں اس قسم کی تبدیلیاں نہیں رونما ہوئی تھیں، جو بالآخر بعد کے دور میں وقوع پذیر ہوئیں۔ اس لیے فنون لطیفہ کے بعض مورخین کا یہ کہنا پوری طرح صحیح نہیں ہے کہ یہاں محراب اور کڑیوں سے عبارت تعمیرات کے اصولوں کو یکجا کرنے کے پیچھے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا جذبہ کارفرما تھا۔ حقیقت میں اس بات کی بھی کوئی سند موجود نہیں ہے کہ تعمیرات کے ان اصولوں کی ہندو اور مسلم خانوں میں تقسیم کا اکبر کو احساس بھی تھا۔ لیکن اتنا ضرور واضح ہے کہ اسے عمارتوں کو صرف محرابی یا خمیدہ اشکال میں ہی دیکھنا پسند نہیں تھا۔ اس کے لیے شاید ان کا تنوع زیادہ دل فریب تھا۔ ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں پر کس طرح اس نے ایسی تعمیرات کو بکھرے ہوئے تناسب کی حامل عمارتوں کے درمیان رکھ کر ایک عمدہ معیار کی چیز بنا دی ہے، جو اپنی جگہ پر بے مثال اور غیر معمولی ہیں۔

فتح پور سیکری کی عظیم مسجد کا مغل طرز میں بنا ہوا جنوبی داخلی دروازہ، جو بلند دروازہ کے نام سے مشہور ہے، سامنے کی طرف یوں کھڑا ہے کہ اس کی مدد سے محلوں اور اس کے احاطوں اور تالابوں کی قطار بندی کی جا سکتی ہے۔ یہ دروازہ 54 میٹر اونچا ہے اور کافی فاصلے سے دکھائی دیتا ہے۔ یہ عظیم الجثہ دروازہ یقینی طور پر مسجد کے احاطے کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا۔ اگرچہ، عمومی طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ یہ دروازہ سترہویں صدی کے اوائل تک تعمیر نہیں کیا گیا تھا۔ یقینی طور پر اس دروازے کی تعمیر 1587ء سے پہلے ہوئی تھی، کیوں کہ اسی سال مشہور خطاط احمد چشتی کی وفات ہوئی، جو اس دروازے پر یادگار قرآنی آیتوں کی کندہ کاری کے اصل ذمہ دار و نگراں تھے۔ یہ دروازہ غالباً 1573ء میں اکبر کی گجرات مہم کی کامیابی کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا، اسی وقت سے سیکری کو فتح پور سیکری کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ تاہم، اس یادگار دروازے کی تعمیر کا مقصد شاید چشتیہ صوفی سلسلے کے ساتھ اکبر کے روابط کی وضاحت کے مقابلے فوجی فتح کی یادگار بنانا تھا۔ یہ دروازہ سرخ اور شتری ریتیلے پتھروں سے بنا ہوا ہے، جسے سفید اور سیاہ سنگ مرمر سے مزین کیا گیا ہے۔ یہ دروازہ متوازن و متناسب اور ایستادہ ہے، اس کے اوپر اونچی اونچی کوشک و برجیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ دروازہ اپنے منصوبے کے اعتبار سے نیم ہشت پہلو ہے، جس کے دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے تین منزلہ بازو ہیں۔ دروازے کے اوپری حصے پر تین متوازی شکل کے گنبد نما کوشک ہیں، جن کے سامنے تیرہ گنبد نما چھوٹے چھوٹے کوشک ہیں۔ دروازے کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے منارچے بنائے گئے ہیں۔ دروازے کی وسعت کو محراب دار طاقوں، چھوٹے پیش طاقوں اور سنگ مرمر کی تزئین کاری سے کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو جامع مسجد کے صحن کو نمایاں کرتا ہے۔ مرکزی محراب تین نمائشی سمتوں کے درمیان کھڑا ہے اور اس کے اوپر ایک گنبد ہے۔ مرکزی محراب کو چھوٹے محراب دار قطاروں اور عمودی سطحوں کے ذریعے تین درجوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ یہ بلند دروازہ اپنے آپ میں سادہ ہے، سادہ سرخ ریتیلے پتھروں کی قوسی محرابوں کو سفید سنگ مرمر کے ساتھ مزین کیا گیا ہے، جس میں محراب کی چوٹی پر دونوں جانب سفید سنگ مرمر سے پھول کی طرح کے آرائشی نقوش کی کندہ کاری کے ساتھ اوپر مرکزی حصے میں چپٹے گلاب کی آرائش کی گئی ہے۔ یہ ابھرواں راسی نقوش حقیقت میں بڑے اور

نمایاں ہیں، لیکن نیچے سے دیکھنے پر چھوٹے اور نازک معلوم ہوتے ہیں۔ اس دروازے کی سطح قرآنی آیتوں کی کندہ کاری کی ہوئی سنگ مرمر کی سلوں سے ڈھکی ہوئی ہے، جو سچے مومنوں کے لیے جنت کا وعدہ کرتی ہیں۔ یہ آیتیں ایک ایسی خانقاہ اور عمارت میں داخلے کے لیے موزوں ہیں، جن کا مقصد عبادت و ریاضت اور تقرب الی اللہ ہو۔

15.4.3 اکبر کا مقبرہ، سکندرہ

سکندرہ میں واقع اکبر کا مقبرہ، جو اس کے بیٹے جہاں گیر کے عہد (1605-27ء) میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، کسی طرح بھی کم ندرت کا حامل نہیں ہے۔ چار باغ کے اندر اکبر کے بڑے اور کثیر منزلہ مقبرے کی تعمیر جہاں گیر کا سب سے اہم تعمیراتی منصوبہ تھا۔ اگرچہ، جہاں گیر کے دور میں تکمیل ہونے والے اکبر کے اس مقبرے کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا اکبر کے عہد میں ہی ہوئی تھی۔ تاہم، اکبر کے عہد حکومت کی کسی بھی معاصر تاریخ میں اس کے آغاز کا ذکر نہیں ملتا۔ اکبر نامہ سے صرف اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ کو آگرہ کے نواحی علاقے سکندرہ میں بہشت آباد نامی ایک باغ میں دفن کیا گیا تھا۔ اس عہد کے دیگر مصنفین مثلاً، محمد باقر نجم ثانی نے اس مقبرے کی ادبی تعریف میں صرف جہاں گیر کو اس کا سرپرست اور منصوبہ ساز بتایا ہے۔ جہاں گیر نے اپنی تزک میں متعدد بار اکبر کے مقبرے کا تذکرہ کیا ہے۔ پہلا اور سب سے تفصیلی تذکرہ سال 1608 کے واقعات کا ہے، جب جہاں گیر نے پہلی مرتبہ اس مقبرے کو دیکھا اور اس کے طرز تعمیر پر شدید عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ اس نے لکھا ہے کہ معماروں نے مقبرے کو اپنے منصوبے کے مطابق تعمیر کیا تھا۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ مختلف تجربہ کار لوگوں سے صلاح و مشورے کے بعد متعینہ منصوبے اور خاکے کے مطابق تجربہ کار معماران اس کی دوبارہ سنگ بنیاد رکھیں۔ اس طرح منصوبے کے مطابق باغ کے درمیان مقبرے کی شاندار عمارت ایک بڑے اور ایستادہ دروازے کے ساتھ تیار ہوئی۔ دروازے پر سفید پتھروں سے بنے ہوئے چار میناروں کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس مقبرے کی تعمیر میں کئی سال صرف ہوئے۔ جنوبی دروازے، جو مقبرے میں داخلے کا مرکزی دروازہ بھی ہے، کے تاریخی کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تکمیل 1612 سے 1614 کے درمیان ہوئی۔

مقبرے کے باغ کی ترتیب اسی بنیادی خاکے کی پیروی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جسے ہمایوں کے مقبرے کے ذریعے قائم کیا گیا تھا۔ یعنی دیواروں سے گھرا ہوا مربع باغ جنت کا تصور پیش کرنے والی آبی نالیوں کے ذریعے چار بڑے حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ اس طرح استعاراتی طور پر یہ مقبرہ بہشت آباد میں واقع ایک جنتی باغ کے درمیان واقع ہے۔

اگرچہ، اس مقبرے کے باغ کی ترتیب ہمایوں کے مقبرے کے عین مطابق ہے۔ تاہم، مقبرے کی اصل عمارت ہمایوں کے تیموری طرز کے مقبرے سے بہت زیادہ مشابہت نہیں رکھتی۔ اکبر کا مقبرہ پانچ منزلہ ہے۔ مغل عہد میں اس سے قبل بھی کثیر منزلہ مقبرے تعمیر ہو چکے تھے، جیسے گوالیار میں محمد غوث کا مقبرہ اور الہ آباد میں شاہ بیگم کا مقبرہ، ان مقبروں نے اکبر کے مقبرے کی ظاہری ہیئت پر اثر ڈالا، مگر اس مقبرے کی معاصر محل طرز تعمیر سے مشابہت، اسے سابقہ مقبروں سے ممتاز بناتی ہے۔ مقبرے کی ستونوں والی چھتیں اور اوپری منازل کی گنبد والی چھتریاں اپنی ظاہری شباہت سے فتح پور سیکری میں واقع پنچ محل کا ایک لطیف سا احساس پیدا کرتی ہیں۔

مقبرے کی پہلی منزل، جس کی پیائش فی جانب تقریباً105 میٹر ہے، اوپر کی چار منزلوں کے لیے ایک وسیع مربع چبوترے کا کام کرتی ہے۔ اس کے اندر ایک مربع مرکزی ایوان میں قبر موجود ہے، ساتھ ہی بقیہ پوری عمارت میں گنبدی اور محرابی ایوانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ مقبرے کے چاروں طرف کا مرکزی حصہ ایک بلند پیش طاق سے منفرد کیا گیا ہے، جس کے اوپر ایک مستطیل چھتری بنی ہوئی ہے۔ سبھی مرکزی پیش طاق کے اطراف میں ہندسی اشکال کی پٹیاں بنانے اور قوسوں میں عربی طرز آرائش وزیبائش کے لیے سفید سنگ مرمر کی کندہ کاری کا وافر مقدار میں استعمال ہوا ہے۔ پوری عمارت میں سرخ ریتیلے پتھروں کا ڈھانچہ سنگ مرمر کے لیے پس منظر کا کام کرتا ہے۔ چار پیش طاقوں کے پیچھے واقع اندرونی محرابی ایوانوں میں سے جنوبی ایوان، جو ایک پتلی راہداری کے ذریعے مرکزی گنبد والے ایوان کی طرف جاتا ہے، زیادہ وسیع ومزین ہے۔ دیواروں کے نچلے حصے میں فتح پور سیکری میں واقع شیخ سلیم چشتی کے فرش کی طرح بھورے، پیلے اور کالے پتھروں کے جڑاؤ کام کیے گئے ہیں، جب کہ اوپری دیوار اور چپٹے گنبدوں والی چھت پر کندہ کاری اور کثیر الالوان گچ کاری کے ذریعہ پھول پتیوں، بیل بوٹوں کے نقش ونگار بنائے گئے ہیں اور عربی طرز آرائش وزیبائش سے آراستہ کیا گیا ہے۔ گہرے نیلے رنگ کے پس منظر میں مختلف قرآنی آیتوں کی سونے کے رنگ سے خطاطی کی گئی ہے۔ ان میں وہ آیتیں شامل ہیں، جو اللہ کی لاثانی ولازوال طاقت وقوت اور جاہ وجلال کو بیان کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ایسی آیتیں بھی ہیں، جن میں جنت کے باغات کو سچے مومن کے لیے انعام کے طور پر عطا کرنے کا وعدہ شامل ہے۔ ایک لمبی تنگ راہداری ایک اندرونی گنبد والے ایوان کی طرف لے جاتی ہے، جس میں اکبر کے قبر کی تعویذ موجود ہے۔ یہ مربع کمرہ تقریباً18 میٹر اونچا ہے، جو مقبرے کی تیسری منزل تک پہنچتا ہے۔

مقبرے کی ابتدائی تین منزلیں، جو زمینی سطح سے اوپر کی طرف اٹھتی ہیں، ہر ایک اپنی سابقہ منزل سے چھوٹی ہے۔ تمام منزلوں کی بیرونی دیواروں پر سرخ ریتیلے پتھروں کی نازک چھتریاں وقفے وقفے کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں۔ عمارت کی بالائی منزل بلا گنبد اور غیر مسقف ایک مربع وسیع دیوار پر مشتمل ہے، جس کی تعمیر سفید سنگ مرمر سے ہوئی ہے۔ اس عہد میں شاہی مقبروں کے لیے سنگ مرمر کا استعمال عام ہوگیا تھا۔ ہر کونے پر ایک بڑی گنبد والی چھتری ہے۔ برآمدہ نما راہداری کے محرابی داخلی دروازوں کے اوپر کتبے ہیں، جن میں متوفی بادشاہ کی مدح اور توصیف کی گئی ہے۔ مقبرے کی بالائی منزل آسمان کے نیچے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ مرکز میں سفید سنگ مرمر سے بنی ہوئی منقش قبر کی تعویذ ہے، جس کے شمالی جانب سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا اور باریک نقش ونگار سے مزین ایک چراغ دان موجود ہے۔ مقبرے کے داخلی دروازے پر فارسی زبان میں ایک تحریر لکھی ہوئی ہے:۔اس (اکبر) کی روح خدا کی روشنی میں سورج اور چاند کی کرنوں کی طرح چمکے۔ مقبرے کے احاطے میں داخل ہونے والے دروازے پر 1612-13 اور 1613-14 کی تاریخیں درج ہیں۔ یہ داخلی دروازہ ایک بڑے جوف دار مرکزی محراب اور دہرے محراب دار بغلی محرابوں پر مشتمل ہے۔ دروازے کے اوپری چاروں کونوں پر سنگ مرمر سے بنے ہوئے چار بلند وبالا مینار کھڑے ہیں۔ اس دروازے کی تزئین کاری مقبرے کی زینت سے زیادہ وسیع ہے۔ ہندسی اشکال اور بڑے بڑے پھولوں وبیل بوٹوں کے نقش ونگار سفید سنگ مرمر اور کثیر الالوان پتھروں کی کندہ کاری کے ذریعہ سرخ ریتیلے پتھروں کے پس منظر میں ترتیب دیے گئے ہیں۔ سفید سنگ مرمر کی نوشتہ دار غیر منقطع پٹیاں شمال اور جنوب دونوں اطراف میں جوف دار محراب کے شکل کی پیروی

کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔اس دروازے کی تزئین کاری اور اس پر خطاطی کا کام عبد الحق شیر ازی نے کیا تھا، جو بعد میں امانت خان کے نام سے مشہور ہوئے۔ دروازے کے شمالی جانب، جس کا رخ مقبرے کی طرف ہے، لکھے گئے کتبے بجا طور پر متوفی شہنشاہ کی ثناخوانی کرتے ہیں۔ تاہم، جنوبی جانب کے کتبے بڑے پیمانے پر اس مقبرے کے سرپرست جہاں گیر کی مدح سرائی کرتے ہیں اور اس کتبے کا خاتمہ ایک نظم پر ہوتا ہے، جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مغل مقبروں پر موجود بصری استعارے حقیقت میں جنت کا حوالہ ہیں:

جنت کے باغ سے زیادہ مبارک جگہ کو سلام

عرش الٰہی سے اونچی عمارتوں کو سلام

ایک جنت، جس کے باغ میں ہزاروں رضوان خادم ہیں

ایک باغ، جس کی زمین کے لیے ہزاروں جنتیں ہیں

فرمان الٰہی کے کاتب نے اپنے دربار پر لکھا ہے

یہ عدن کے باغات ہیں، ان میں داخل ہو کر ہمیشہ زندہ رہو

15.4.4 اعتمادالدولہ کا مقبرہ، آگرہ

آگرہ میں واقع اعتماد الدولہ (وفات 1622ء) کا نہایت خوب صورت مقبرہ جہاں گیر کے عہد میں تعمیر کیا گیا۔ یہ مقبرہ جہاں گیر کی ملکہ نور جہاں نے آگرہ میں اپنے والدین کے لیے تعمیر کیا تھا۔ فنی اعتبار سے نور جہاں کے تعمیراتی کاموں میں سب سے زیادہ اہم اور محفوظ حالت میں یہی مقبرہ ہے، جو آج تک سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ سفید سنگ مرمر سے تعمیر شدہ یہ مقبرہ اعتمادالدولہ کے مقبرے کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقبرے میں نور جہاں کے والدین یعنی والدہ عصمت بیگم اور والد اعتماد الدولہ دونوں مدفون ہیں۔ نور جہاں نے اس مقبرے کی تعمیر کے لیے بے انتہا دولت صرف کی، جس سے اپنے والدین سے اس کی الفت و محبت کا پتہ چلتا ہے۔ مقبرہ کے کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مقبرہ تقریباً چھ سال میں مکمل ہوا۔

سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا یہ مقبرہ ایک چھوٹی سی دو منزلہ عمارت ہے، جو جمنا ندی کے کنارے ایک مربع چار باغ کے درمیان واقع ہے۔اس مقبرے کے احاطے میں داخل ہونے کے لیے مشرقی جانب سرخ ریتیلے پتھر کا بنا ہوا ایک داخلی دروازہ ہے۔ مقبرے کے مغربی جانب کا دروازہ دریا کی طرف کھلتا ہے۔ اسی طرح کے سرخ ریتیلے پتھروں سے بنے ہوئے ڈھانچے شمال اور جنوب کی طرف بھی ہیں، جو اصل داخلی راستے نہیں ہیں۔ چاروں دروازوں پر سفید سنگ مرمر کے ساتھ سرخ پتھروں کی کندہ کاری کی گئی ہے، جو مغل طرز تعمیر کا ایک اہم خاصہ ہے۔ یہ مقبرہ، جو شان دار خاکے اور منصوبے کے ساتھ سفید سنگ مرمر سے تیار ہوا ہے، چاروں طرف سے تقریباً سات میٹر لمبا ہے اور اس کے اندر قیمتی پتھروں سے جڑاؤ کام کیا گیا ہے۔اس مقبرے کی تعمیر سرخ ریتیلے پتھروں کے ایک نچلے چبوترے پر کی گئی ہے۔ مقبرے کی پہلی منزل کے چاروں کونوں پر ایک ہشت پہلو منارچہ تعمیر کیا گیا ہے۔ مقبرے کے تمام اطراف میں ایک محرابی داخلی

دروازہ ہے، جس کے دونوں جانب مقبرے کے اندرونی حصے میں روشنی بہم پہنچانے کے لیے محرابی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ اس مقبرے کو اندرونی ترتیب کے اعتبار سے ہمایوں کے مقبرے کے طرز پر تعمیر کیا گیا ہے، جس کے اندرون میں نو حصے ہیں۔ تاہم ہمایوں کے مقبرے میں پائے جانے والے مثمن خاکے پر مبنی شعاعی منصوبے کے برعکس، یہاں مرکزی محرابی ایوان کے اطراف میں آٹھ کمرے، ہر سمت میں دو کمروں کے اعتبار سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ یہ خاکہ اس سے پہلے اکبر کے اجمیر محل میں دکھائی دیتا ہے اور اسے ہند-اسلامی تناظر میں مغلوں کے محل طرز تعمیر سے اخذ کیا گیا ہے۔ ان تمام کمروں کی دیواروں پر پھول پتیوں، بیل بوٹوں، گل دانوں، صنوبر کے پودوں اور شراب کے برتنوں کی بھرپور تصویر کشی کی گئی ہے اور مرکزی ایوان، جس میں دو قبروں کی تعویذیں ہیں، کی تزئین اور آرائش وزیبائش بہت زیادہ اسراف کے ساتھ فراخ دلانہ انداز میں کی گئی ہے۔ مقبرے کی اندرونی چھت پر متنوع رنگوں کے استعمال کے ذریعہ اعلیٰ قسم کی جالی دار محرابی تزئین کاری اور ستارہ نما آرائش وزیبائش ہے۔

دوسری یا اوپری منزل کے چاروں کونوں پر منارچہ کے اوپر چھتری بنی ہوئی ہے اور مرکز میں ایک ایوان ہے، جو ایک تراشیدہ مخروطی قبے سے گھری ہوئی ہے۔ اوپری منزل کی دیواروں کی تشکیل کے لیے بنیادی طور پر شیخ سلیم چشتی کے مقبرے کی طرح سنگ مرمر کی اعلیٰ قسم کی تراشیدہ جالیوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ مقبرے کے بیرونی حصے کے ساتھ ساتھ دوسری منزل کے اندرونی حصے میں بھی سفید سنگ مرمر میں قیمتی پتھروں کا جڑاو کام کیا گیا ہے۔ بالائی منزل کی باہری دیواروں پر کم قیمتی پتھروں سے جو سجاوٹ کی گئی ہے، وہ اکبر کے مقبرے کے بیرونی دروازے کی آرائش سے مشابہ ہیں۔ بالائی منزل کی سجاوٹ کے لیے بھی پھلوں، پھول پتیوں، صنوبر کے درختوں اور شراب کے برتنوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ قرآنی تصور جنت اور فارسی شاعری سے ماخوذ یہ آرائشی اشیاء ہند-اسلامی ثقافت میں پہلے سے رائج تھیں، مگر مغل فن تعمیر میں ان کا استعمال شاید صفوی وایرانی اثرات کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر اصفہان میں واقع علی قاپو محل کی چھت اور شاہ عباس دوم کے محل کے داخلی دروازے میں شراب کے برتنوں کی آرائش موجود ہے، یہ عمارتیں سترہویں صدی کے آغاز میں تعمیر ہوئی تھیں۔ اگرچہ یہ آرائشی اشکال اپنی ابتدا کے اعتبار سے صفوی عہد سے متعلق ہیں، لیکن انہیں بہشتی اور الوہی علامتوں کے طور پر دیکھا اور جانا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کا تذکرہ بڑے پیمانے پر قرآنی آیتوں اور فارسی صوفی شاعری میں نظر آتا ہے۔

اگرچہ، عام طور پر اس مقبرے کو صفوی اثرات کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے، تاہم یہ واضح رہے کہ یہ اثرات صرف آرائشی اشیاء کے انتخاب اور استعمال تک محدود ہے۔ مقبرے کی مجموعی ظاہری شکل مکمل طور پر ہندستانی ہے۔ مثال کے طور پر فتح پور سیکری میں واقع اکبر کے دیوان خاص کے بیرونی حصے کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اکبر کے مقبرے کی طرح اعتمادالدولہ کا مقبرہ بھی ہم عصر تفریحی محلوں کے تعمیری نمونے پر مبنی ہے۔ بالائی منزل پر واقع سنگ مرمر کی پرپیچ تراشیدہ جالیاں، شیخ سلیم چشتی کے مقبرے سے مشابہت رکھتی ہیں، جو کمرے کو روشنی سے منور کردیتی ہیں اور اس طرح اندرونی منظر سحر انگیزی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ روشنی کے متعلق مغل حکم رانوں کی فسوں سازی اور خاص طور پر روشنی کی عکاسی کے تعلق سے نور جہاں اور جہاں گیر کے جنون نے یہاں روشنی کو دانستہ طور پر بڑی حکمت اور ہنر مندی سے استعمال کیا ہے۔ مغلوں کے لیے روشنی نے الوہی استعارے کے طور پر بھی کام کیا ہے، جو خدا کی موجودگی کی علامت ہے۔ کمرے کے سخت

اور جامد سنگ مرمر پر روشنی کے اس کھیل کا مقصد ایک یاددہانی کے طور پر بھی ہو سکتا ہے کہ حقیقت صرف خدا کی ذات ہے، جسے یہاں علامتی طور پر روشنی کے ذریعہ دکھایا گیا ہے،بقیہ سب فریب نظر ہے۔ مقبرے کے سفید سنگ مرمر کے فرش پر پیلے اور بھورے رنگ کے قیمتی پتھروں کی کندہ کاری کے ذریعہ پھول پتیوں، بیل بوٹوں اور عربی طرز آرائش و زیبائش کے پیچ نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ یہ آرائشی طرز قیمتی قالینوں کے نقش و نگار کی یاد دلاتے ہیں، جن کی تصویر کشی ہم عصر درباری مصوری میں کی گئی ہے۔

15.4.5 جامع مسجد، دہلی

شاہ جہاں کے ذریعہ تعمیر کی گئی دہلی کی جامع مسجد بلاشبہ مغلوں کی بنائی ہوئی مسجدوں میں عظیم ترین مسجد ہے۔ یہ مسجد لال قلعہ سے تھوڑے سے فاصلے پر مغربی سمت میں شاہ جہان آباد شہر کے اندر بنائی گئی۔ اسے آج بھی دہلی کی جامع مسجد کے طور پر دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ ستمبر 1650ء میں شاہ جہاں نے اس مسجد کو دیوان اعلیٰ سعد اللہ خان اور خانساماں فضل خان کی نگرانی میں تعمیر کرنے کے احکامات صادر کیے اور یہ مسجد چھ سال بعد 1656ء میں مکمل ہوئی۔ شاہ جہاں اسے مسجد جہاں نما کے نام سے یاد کرتا تھا اور اس کا دعوی تھا کہ اس نے اسے فتح پور سیکری میں واقع اکبر کی مسجد کے طرز پر تعمیر کیا ہے۔ حالاں کہ مسجد کا اندرونی حصہ آگرہ کی جامع مسجد سے مشابہت رکھتا ہے۔ برسوں پہلے جہاں گیر نے شہزادہ شاہ جہاں کو فخر کے ساتھ فتح پور سیکری کی اس مسجد کو دکھایا تھا، جو بجا طور پر مغل ورثہ اور فخر کی علامت بنی ہوئی تھی۔ فتح پور سیکری مسجد کی طرح شاہ جہاں کی جامع مسجد دہلی بھی ایک چھوٹی پہاڑی کے اوپر واقع ہے، جو اسے ایک بڑے فاصلے سے قابل دید بناتی ہے۔ اپنی تعمیر کے وقت یہ مسجد پورے برصغیر کی سب سے بڑی مسجد تھی اور آج بھی رقبے کے اعتبار سے صرف اورنگ زیب کی لاہور کی جامع مسجد اس سے بڑی ہے۔

فتح پور سیکری کی مسجد کی طرح ہی اس مسجد میں بھی اونچی عمودی سیڑھیوں کے ذریعہ ہی پہنچا جاسکتا ہے۔ اس مسجد کا اندرونی صحن اور آگے کا حصہ بھی فتح پور سیکری کی مسجد سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس مسجد کو بنیادی طور پر سرخ ریتیلے پتھروں اور سنگ مرمر سے تیار کیا گیا ہے، ساتھ ہی جابجا سنگ موسی کی آویزش نظر آتی ہے، جو مسجد کے حسن میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ نماز کی ادائیگی کا مرکزی ایوان سرخ ریتیلے پتھروں اور وسیع پیمانے پر سفید سنگ مرمر کے تراشوں سے تیار کیا گیا ہے، جو متعدد داخلی محرابوں سے مزین ہے۔ مرکزی نماز گاہ میں 11 داخلی دروازے ہیں، مرکزی داخلی دروازہ محرابی شکل کا بہت ہی بلند و بالا ہے، جس کے دونوں جانب پانچ پانچ چھوٹے محرابی دروازے ہیں۔ ان تمام چھوٹے داخلی دروازوں کے اوپر سنگ مرمر کے کتبے لگے ہوئے ہیں، جن پر خطاط نور اللہ احمد کے ذریعہ سنگ موسی سے بڑے پیمانے پر فارسی تحریریں کندہ کی گئی ہیں۔ یہ تحریریں مسجد کی عظمت کو بیان کرتی ہیں اور بھرپور انداز میں شاہ جہاں کی مدح سرائی کرتی ہیں۔ مرکزی داخلی دروازے کے سامنے 1829ء میں ایک مقبرہ تعمیر کر دیا گیا تاکہ تمام نمازیوں تک امام کی آواز پہنچائی جاسکے۔ ان داخلی دروازوں کے دونوں کونوں یعنی ایوان کے جنوبی و شمالی سروں پر دو بلند و بالا اور خوش نما مینار کھڑے ہیں، جن کی لمبائی 40 میٹر ہے۔ میناروں کے اوپر سنگ مرمر کی نہایت دل کشا بارہ دری کی برجیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان دونوں میناروں کے اندر اوپر تک جانے کے لیے زینے بنے ہوئے ہیں۔

سنگ مرمر سے بنے ہوئے تین پیازی گنبد مسجد کا تاج ہیں۔ مرکزی نماز گاہ کا فرش سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے، جس میں سنگ موسی کی پچی کاری سے مصلے بنائے گئے ہیں۔ اس مسجد کا منبر سنگ مرمر کا ہے۔ مسجد کا مربع صحن سرخ ریتیلے پتھروں سے بنا ہوا ہے، جس کے ایک طرف کی لمبائی تقریبا99 میٹر ہے۔ صحن کے مرکزی حصے میں سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا17 میٹر لمبا اور 15 میٹر چوڑا حوض موجود ہے۔ مسجد کے چاروں کونوں پر چار برجیاں بنی ہوئی ہیں، جن کا نچلا حصہ سرخ ریتیلے پتھروں کا اور بالائی حصہ یعنی چھتری سنگ مرمر کی ہے، جس میں سنگ موسی کی دھاریاں بنی ہوئی ہیں۔ مسجد میں داخلے کے لیے سرخ ریتیلے پتھروں سے بنے ہوئے تین عالی شان محرابی دروازے بنائے گئے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں تین منزلہ مشرقی دروازہ ہے، جو شاہی اور وزراء و امراء کے استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ بقیہ دو دروازے مسجد کے جنوبی اور شمالی جانب واقع ہیں، جو دو منزلہ ہیں اور عوام الناس کے استعمال کے لیے تھے۔ اس مسجد کی لطافت و نزاکت اور خوبی و خوش نمائی اعلیٰ درجے کی ہے۔ اس مسجد میں سرخ ریتیلے پتھروں اور سنگ مرمر کو نہایت موزوں تناسب میں استعمال کیا گیا ہے اور جا بجا سنگ موسی کی پچی کاری کی گئی ہے۔ اس مسجد کے در و دیوار، طاق و محراب، مرغولے و کنگورے اور مینار و برجیاں، غرض کہ کوئی بھی حصہ توازن و تناسب کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ دراصل پتھروں کے استعمال میں یہ تناسب اور موزونیت شاہ جہاں کی تمام عمارتوں میں نظر آتی ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں مغل طرز تعمیر کے خط و خال اپنے کمال کو پہنچ چکے تھے۔

15.4.6 تاج محل، آگرہ

شاہ جہاں کا دور حکومت (58-1628ء) مغل فن تعمیر کا عہد زریں شمار کیا جاتا ہے۔ تمام مغل یادگاروں میں سب سے زیادہ مشہور تاج محل جنت کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ شاہی جذبے کی بہترین نمائندگی بھی کرتا ہے۔ آگرہ میں واقع یہ مقبرہ، بنیادی طور پر، شاہ جہاں کی محبوب ترین ملکہ ممتاز محل کے لیے بنایا گیا تھا، مگر شاہ جہاں کی وفات کے بعد اسے بھی یہیں پر دفن کیا گیا، جیسا کہ اس کا پہلے سے ہی یہ ارادہ تھا۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں نے دریا کے دوسری جانب سیاہ پتھر سے تاج محل جیسا ڈھانچہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، مگر اس نظریہ کی تائید کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ آگرہ میں واقع ممتاز محل اور شاہ جہاں کا یہ مقبرہ اب تاج محل کے نام سے مشہور ہے۔ عصر حاضر میں تاج محل دنیا کی مشہور ترین یادگاروں میں سے ایک بن گیا ہے۔ سفید سنگ مرمر سے تعمیر شدہ ایک چہار باغ کے شمالی سرے اور اونچے چبوترے پر واقع یہ مقبرہ جنت کے باغات کی تمثیل پیش کرتا ہے۔ مقبرے اور اس کے باغات کو 549 میٹر لمبی اور 305 میٹر چوڑی دیوار سے احاطے کی شکل فراہم کی گئی ہے۔ مقبرے کے احاطے کے باہر ایک چھوٹا سا شہر آباد ہے، جسے ممتاز آباد کہا جاتا تھا۔ اس کا خاکہ نہایت اچھے طریقے سے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں پر نوکروں کے لیے رہائشی مکانات، دکانیں اور کارواں سرائے وغیرہ موجود ہیں۔ یہ مقبرہ بھی اسی شہر کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے، انہیں ایک چوکور نقشے کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ مقبرے اور ممتاز آباد شہر کی دوسری شاہی عمارتوں کی دیکھ ریکھ 30 گاوں کی آمدنی سے پوری کی جاتی تھی، جو خصوصی طور پر اس کے لیے وقف کیے گئے تھے۔ تاج محل کا نام مغل تاریخی حوالوں میں نہیں ملتا، لیکن ہندستان میں معاصر یورپی مصنفین اور سیاحوں کے ذریعہ یہ نام استعمال کیا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقبرے کا مشہور نام تھا۔ ہم عصر تحریروں میں اسے عمومی طور پر روضہ منورہ کہا گیا ہے۔

اس مقبرے کے تعمیر کی ابتدا1632ء کے اوائل میں ہوئی اور تکمیل 1643ء میں ہوئی، مقبرے سے ملحقہ دوسری عمارتوں کی تعمیر اس کے بعد بھی جاری رہی اور اس پورے احاطے کی تکمیل 1653ء میں ہوئی۔ تاج محل کی تعمیر میں حصہ لینے والے متعدد معماروں اور فن کاروں کے نام معاصر تاریخی حوالوں میں ذکر کیے گئے ہیں، جن میں مکرمت خان، جنہوں نے بعد میں شاہ جہان آباد کی تعمیر میں بطور نگراں کام انجام دیا، معمار عبدالکریم، جو جہاں گیر کے عہد کے ایک ماہر معمار شمار کیے جاتے تھے اور استاد احمد لاہوری، جو اس مقبرے کی تعمیر کے بنیادی معمار تھے، کا نام شامل ہے۔ اس مقبرے میں تزئین و آرائش اور خطاطی کا کام اس عہد کے مشہور خطاط عبدالحق شیرازی نے انجام دیے، جو امانت خان کے نام سے بھی مشہور تھے۔ مقبرے کی مرکزی عمارت، اس کے پورے احاطے اور تمام متعلقہ اجزاء کو متناسب اقلیدسی اصولوں کے مطابق مربوط سلسلہ وار انداز میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اس لیے نہ صرف مقبرے کی مرکزی عمارت بلکہ پورے احاطے میں کامل توازن نظر آتا ہے۔

اس مقبرے کے احاطے کا ابتدائی حصہ دیواروں والے باغ کے جنوب میں سرخ ریتیلے پتھروں کا بنا ہوا چوک جلو خانہ ہے۔ مقبرے کا یہ حصہ، جہاں گیر کے مقبرے کے مماثل، شاہی خدم و حشم کے لیے بنایا گیا تھا۔ سرخ ریتیلے پتھروں کا بنا ہوا30 میٹر اونچا ایک شان دار داخلی دروازہ مقبرے کی طرف جاتا ہے، جو بیرونی احاطے کی شمالی دیوار کا بھی کام کرتا ہے۔ یہ داخلی دروازہ ایک جوف دار مرکزی محراب کے اندر واقع ہے، جس کے بالائی حصے پر چھوٹی گنبد والی چھتریاں بنی ہوئی ہیں، جو فتح پور سیکری میں واقع اکبر کی جامع مسجد کے بلند دروازے کی یاد دلاتی ہیں۔ پورے مرکزی پیش طاق پر سفید سنگ مرمر کی زمین میں سنگ موسی سے مکمل سورۃ الفجر کی کندہ کاری کی گئی ہے، جس کی آخری آیتیں مومنین کو الوہی جنت میں داخلے کی دعوت دیتی ہیں۔

اس بیرونی احاطے سے آگے ایک چہار باغ ہے، جسے چوڑے آبی گزر گاہوں کے ذریعہ چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ آبی گزر گاہیں باغات کے مرکز میں موجود ایک حوض سے ملتی ہیں۔ یہ باغ اور نہریں واضح طور پر قرآن میں مذکور تصور جنت کی عکاسی کرتی ہیں۔ باغ کے شمالی سرے پر دریا کے بالکل کنارے شاندار مقبرہ واقع ہے۔ اس کے دونوں بازوؤں کی سمت میں سرخ ریتیلے پتھروں کی عمارتیں ہیں۔ ان میں سے مغربی عمارت مسجد ہے، جس کی بالائی سطح پر سنگ مرمر کے تین گنبد بنے ہیں اور مشرقی جانب بھی اسی طرز اور ساخت کی عمارت موجود ہے، جسے معاصر تحریروں میں مہمان خانہ کا نام دیا گیا ہے۔ مسجد کے باہری سامنے کے حصے میں سفید سنگ مرمر اور محراب کے قوس میں رنگین پتھروں کی عمدہ قسم کی کندہ کاری کی گئی ہے، جب کہ اندرونی حصے کی تزئین کے لیے متنوع رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

ممتاز محل کا شان دار اور متناسب مقبرہ ایک اونچے مربع سنگ مرمر کے چبوترے کے درمیان واقع ہے، جو مقبرے کو باغ سے بلند کرتا ہے۔ مقبرے کا یہ چبوترہ دریا کے کنارے بنا ہوا ہے، اس وجہ سے سیلاب کے اثرات سے دفاع اور اس کی تلافی کے لیے اس کی بنیاد کو گہرائی میں زمین دوز کنوؤں کے اندر بنایا گیا ہے۔ اس چبوترے کے چاروں کونوں پر چار منزلہ سنگ مرمر کے مینار کھڑے ہیں، جو تیموری عہد کے مقبرہ طرز تعمیر کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ مقبرے کے درمیانی بالائی حصے میں سفید رنگ کا ہی ایک پیازی گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ مقبرہ اپنے منصوبے کے اعتبار سے بنیادی طور پر مربع ہے، مگر چاروں کونوں کو صفائی کے ساتھ تراش کر کے اسے بغدادی مثمن یا سلامی دار بنا دیا گیا

ہے۔ مقبرے کے چاروں طرف باہری سامنے کے حصے میں ایک مرکزی پیش طاق ہے، جس کے دونوں جانب گہری جوف دار محرابی جالیاں ہیں۔ مقبرے کا منصوبہ غیر معمولی حد تک متناسب اور متوازن ہے، جو ایک نادر تعمیراتی اختراع شمار کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ اسے دنیا کے عجائبات میں سے ایک سمجھتے ہیں۔ مقبرے کی باہری دیوار چاروں طرف مشجر آرائشی اشیاء اور پھول پتیوں و بیل بوٹوں کے نقش و نگار سے آراستہ کی گئی ہے۔ پھولوں کے مکمل پودوں کے ساتھ ساتھ، پھولوں اور پتیوں سے آراستہ ڈالیوں کی کندہ کاری بڑی ہی نفاست کے ساتھ کی گئی ہے۔ کندہ کیے گیے پھولوں میں گلاب، نرگس، گل لالہ کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے پھول اور ان کے پودوں کی سجاوٹ کی گئی ہے۔ یہ پھول فارسی تہذیب و ثقافت کا حصہ رہے ہیں اور ان کا تذکرہ بہشتی پھولوں کے طور پر بھی ہوا ہے۔ مزید بر آں، یہ ایسے پھول ہیں، جو فارسی صوفیانہ شاعری میں محبوب کی خصوصیات کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ محبوب عشق کی اعلیٰ سطح پر پہنچ کر خدا کا استعارہ بن جاتا ہے اور اس سے شہنشاہ کی ملکہ کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے، جو اس مدفن کے اندر آرام فرما ہے۔

مقبرے کی زمینی سطح کی ترتیب ہمایوں کے مقبرے سے ملتی جلتی ہے، تاہم، مضافاتی ایوان یہاں پر آپس میں اور مرکزی ایوان سے زیادہ بہتر طریقے سے منسلک ہیں۔ ہمایوں کے مقبرے کی طرح آٹھ مضافاتی ایوان اسلامی کونیات کی آٹھ جنتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور مرکزی ایوان ہشت پہلو ہے۔ اس کے مرکز میں سنگ مرمر کی قبر کی شان دار تعویذ بنی ہوئی ہے، جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ اس کی نچلی سطح پر ممتاز محل کی میت کو دفن کیا گیا ہے۔ ملکہ کی قبر کے مغرب میں اسی طرح سے مزین و آراستہ شاہ جہاں کے قبر کی تعویذ واقع ہے۔ شاہ جہاں اور ممتاز محل کی قبروں کی تعویذ کے اطراف میں سنگ مرمر کی منقش جالیاں لگی ہوئی ہیں، جسے شاہ جہاں نے اپنے ماہر سنار بے بدل خاں کو سونے کی جالیوں سے تبدیل کرنے کا حکم دیا تھا، مگر شاہ جہاں کو یہ فکر لاحق ہوئی کی سونا لوٹ لیا جائے گا۔

مقبرے کے بیرونی حصے کی طرح اندرونی حصے میں بھی مستطیل پٹیوں پر قرآنی آیتوں کی اتنے بڑے پیمانے پر خطاطی کی گئی ہے، جتنی اس سے پہلے کسی بھی مغل عمارت میں نظر نہیں آتی۔ مقبرے کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے پیمانے پر قرآنی آیتیں اور اکثر مکمل سورتیں مقبرے کی مرکزی عمارت اور دوسری مختلف عمارتوں میں کندہ کی گئی ہیں۔ ان تمام آیتوں کا، جنہیں یہاں پر شامل کیا گیا ہے، ایک ہی موضوع ہے، یعنی قیامت کے دن مومنین سے کیے گئے وعدے کا دائمی انعام اور خدا کی نافرمانی کرنے والوں کے لیے ابدی عذاب۔ اس موضوع کی آیتوں کو مقبرے کی تعمیر کے لیے بڑی ہی مناسب اور موزوں شمار کیا جاتا ہے۔ قرآنی آیتوں کی تعداد اور یوم قیامت پر ان کے شدید زور میں مقبرے کا مقام اور اس کی ظاہری ہیئت و وسعت مزید اضافہ کرتی ہے، جن کی کندہ کاری نہ صرف جنتی باغات کے آخر اور چبوترے پر بھی نظر آتی ہے۔ یہ مقام عرش الٰہی کے مقام سے میل کھاتا ہے، جو اسلامی روایات کے مطابق جنت کے باغات کے اوپر ہو گا۔ تاج محل میں پچی کاری کا کام اور اس میں جڑے ہوئے نگینوں اور قیمتی پتھروں کا استعمال، خاص طور پر سنگ مرمر میں تراشے ہوئے حسین نقش و نگار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کام کے لیے کاری گروں کی ایک بڑی جماعت کو لگایا گیا تھا، جن میں ہندوستانی اور ایرانی دونوں طرح کے کاری گر شامل رہے ہوں گے۔ اس منفرد مقبرے کے تمام معماران نہ صرف ریاضی، علم نجوم، فن تعمیر، تکنیکی علوم بلکہ ادب اور بلاشبہ علوم دینیہ میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اسی بنا پر وہ اس مقبرے کے علامتی خاکے یعنی زمین پر جنت کے حتمی تصور کو عملی جامہ پہنانے

میں کامیاب ہوسکے۔

15.4.7 بادشاہی مسجد، لاہور

لاہور کے قلعہ سے متصل اور اس کے مغرب میں اورنگ زیب (1658-1707ء) کے عہد حکومت میں تعمیر کی گئی بادشاہی مسجد برصغیر ہند کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ مشرقی داخلی دروازے کے ایک کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر 1673ء میں ہوئی اور اس مسجد کو شہنشاہ نے اپنے رضاعی بھائی اور لاہور کے گورنر مظفر حسین جو فدائی خان کوکا کے نام سے بھی مشہور ہیں، کی نگرانی میں تعمیر کروایا تھا۔ اسی کتبے سے اس مسجد کے نام کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس مسجد کا مکمل نام "مسجد ابوالمظفر محی الدین محمد عالم گیر بادشاہ غازی" ہے، جو بعد کے ادوار میں "بادشاہی مسجد" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس سے پہلے لاہور میں کوئی اس قسم کا یادگاری تعمیری نمونہ نہیں تھا، جو مذہبی اعتبار سے آبادی کی ضروریات کو پوری کرسکے۔ اورنگ زیب کے ذریعہ تعمیر کردہ اس مسجد کو شاہ جہاں کے اس عمل کا تتبع قرار دیا جاسکتا ہے، جو اس نے دہلی اور آگرہ کے قلعوں کے پاس بڑی مساجد تعمیر کرکے انجام دیا تھا۔ اورنگ زیب کی تعمیر کردہ یہ مسجد، اگرچہ، اپنی وسعت اور رقبے کے اعتبار سے بہت بڑی ہے، مگر اس کا بنیادی خاکہ دہلی میں واقع شاہ جہاں کی مسجد جہاں نما سے اخذ کیا گیا معلوم ہوتا ہے۔

بادشاہی مسجد مغل فن تعمیر کا ایک اہم اور عمدہ نمونہ ہے، جس کے ذریعہ مسجد کے طرز تعمیر میں وسعت مکانی کے ساتھ ساتھ مرصع کاری اور جمالیاتی نمونوں کے نئے طرز متعارف ہوئے۔ اس مسجد کا بنیادی تعمیری سامان سرخ ریتیلا پتھر اور سنگ مرمر ہے، مسجد کے بیرونی واندرونی حصے کو سرخ ریتیلے پتھروں میں سنگ مرمر کی کندہ کاری کے ذریعے بڑے پیمانے پر مزین کیا گیا ہے۔ فتح پور سیکری اور دہلی کی مساجد کی طرح یہ مسجد بھی ایک اونچے چبوترے پر واقع ہے۔ اس مسجد میں مغل دور کی دوسری بڑی مساجد کے برعکس صرف ایک داخلی دروازے کا استعمال کیا گیا ہے، جو مسجد کی مشرقی دیوار کے مرکزی حصے میں واقع ہے۔ سرخ ریتیلے پتھروں سے بنا ہوا یہ دومنزلہ محراب دار دروازہ بیرونی جانب سے مختلف قسم کے نقش ونگار سے آراستہ ہے۔ اس دروازے کی سب سے اہم خصوصیت مقرنس کا استعمال ہے، جو مسلم فن تعمیر میں سجاوٹ اور آرائش وزیبائش کا ایک اہم لازمہ رہا ہے۔

یہ دروازہ ایک بہت بڑے صحن میں کھلتا ہے، جس کا فرش سرخ ریتیلے پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ بادشاہی مسجد کی مرکزی نماز گاہ بھی دہلی کی جامع مسجد کے خاکے پر تیار کی گئی ہے، مگر وسعت کے اعتبار سے اس سے بہت بڑی ہے۔ مسجد کی مرکزی عمارت بھی سنگ سرخ سے تعمیر ہوئی ہے، جس میں سفید سنگ مرمر کی کندہ کاری کی گئی ہے۔ مسجد کی مرکزی عمارت میں داخلے کے لیے ایک مرکزی محراب ہے، جس کے دونوں جانب پانچ چھوٹے محراب ہیں، جو حجم میں مرکزی محراب کے تہائی حصے کے برابر ہیں۔ مرکزی محراب کے بالائی حصے پر دو چھوٹی چھوٹی چھتریاں بنی ہوئی ہیں۔ مسجد کے مرکزی ایوان کے چاروں کونوں پر سنگ سرخ سے چار مینارچہ تعمیر کیے گئے ہیں، جن کے بالائی حصے پر سنگ مرمر کی چھتریاں بنائی گئی ہیں۔ ان مینارچوں کی تعمیر وسط ایشیائی طرز تعمیر کے اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، جس کا اظہار مغل عہد کے مقبروں کی تعمیر میں بھی نظر آتا ہے۔ اس کی ایک اہم مثال آگرہ میں واقع اعتمادالدولہ کے مقبرے کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ مرکزی ایوان کے بالائی حصے پر سنگ مرمر کے بنے ہوئے تین پیازی گنبد مسجد کا تاج ہیں۔ مسجد کے اندرونی وبیرونی حصے میں سنگ سرخ کے پس منظر میں مشجر

اشکال، نوکیلے محراب اور مختلف قسم کی مرصع کاری کے ساتھ سفید سنگ مرمر کی کندہ کاری کی گئی ہے۔ اس مسجد کے اندر جس قسم کی مشجر اشکال کی آرائش وتزئین کاری کی گئی ہے، اس سے پہلے کی کسی مغل مسجد میں نظر نہیں آتی۔ ساتھ ہی آرائش وزیبائش اور تزئین کاری کے لیے بڑے پیمانے پر شوخ رنگوں کا بھی استعمال کیا گیا ہے، جن میں سرخ، پیلے اور بھورے رنگوں کا بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ مسجد کا اندرانی حصہ سجاوٹ کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ چھت سے لے کر محراب اور دیوار تک کوئی بھی حصہ مشجر اشکال کی آرائش سے خالی نہیں دکھائی دیتا۔ بادشاہی مسجد کے نقش ونگار کو مغل فن تعمیر کا منفرد اور بے مثال کام تصور کیا جاتا ہے۔ سنگ سرخ سے بنے ہوئے تین منزلہ ہشت پہلو مینار مسجد کے چاروں کونوں پر ایستادہ ہیں۔ ان میناروں کی لمبائی 60 میٹر ہے اور ان کے بالائی حصے میں سنگ مرمر کی چھتریاں بنی ہوئی ہیں۔

15.4.8 بی بی کا مقبرہ، اورنگ آباد

اورنگ زیب کے دور حکومت میں شاہی خاندان کے بیشتر افراد عظیم الشان عمارتوں اور باغات کی تعمیر سے زیادہ علوم وفنون، زبان وادب اور بالخصوص مذہبی علوم کی سرپرستی میں مصروف رہے۔ تاہم شاہی خاندان کے ذریعہ متعدد قابل ذکر مسجدیں اور مقبرے تعمیر کیے گئے، جن میں بی بی یا ملکہ رابعہ درانی کا مقبرہ، جو اورنگ آباد میں تعمیر کیا گیا تعمیری خصوصیات کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سفید سنگ یادگار مقبرہ 1660-61ء میں مکمل ہوا، جسے اورنگ زیب کی ملکہ رابعہ درانی، جو دل رس بانو بیگم کے نام سے بھی جانی جاتی تھیں، کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ اورنگ زیب کے حکم پر بڑے شہزادے اعظم شاہ نے اس مقبرے کی تعمیر تاج محل کے خاکے پر کروائی تھی۔ مقبرے کے جنوبی داخلی دروازے پر موجود فارسی کتبے میں معمار عطاء اللہ، نگراں آقا ابوالقاسم بیگ اور انجینئر ہسپت رائے کے نام درج ہیں۔ دیگر معاصر دستاویزوں سے پتہ چلتا ہے کہ مقبرے کی تعمیر کے لیے متعین کیے گئے تمام افراد مستقل جائے وقوع پر موجود رہے۔ اس لیے ملکہ کی وفات کے چار سال کے اندر یہ مقبرہ مکمل ہو سکا۔ تاج محل سے اس مقبرے کی مشابہت کے لیے یہ امر کافی ہے کہ مقبرے کے معمار استاد عطاء اللہ تاج محل اور شاہ جہان آباد قلعے کے معمار استاد احمد لاہوری کے بیٹے تھے۔

رابعہ درانی کا مقبرہ مغل دور کے روایتی شاہی مقبروں کی طرح ایک بڑے چہار باغ کے درمیان میں واقع ہے، جس کی لمبائی 458 میٹر اور چوڑائی 275 میٹر بیان کی جاتی ہے۔ مقبرے کے احاطے کو اونچی دیوار سے محفوظ کیا گیا ہے، جس میں نوک دار محراب بنے ہوئے ہیں۔ مقبرے کے اس بڑے احاطے میں داخلے کے لیے جنوبی سمت میں ایک نیم ہشت پہلو دو منزلہ مرکزی دروازہ تعمیر کیا گیا ہے، جس پر بیرونی طرف سے پیتل کی تختیوں پر بیل بوٹوں اور پھول پتیوں کی آرائش کی گئی ہے۔ داخلی دروازے سے گزرنے کے بعد مقبرے کی مرکزی عمارت سے پہلے ایک چھوٹا حوض واقع ہے، ساتھ ہی دونوں جانب کم اونچائی کی جالی دار دیواریں بنائی گئی ہیں، جو مقبرے کی مرکزی عمارت تک پہنچانے کے لیے راستے کا کام کرتی ہیں۔

مقبرہ ایک اونچے مربع چبوترے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اصل عمارت داخلی اعتبار سے دو منزلہ شمار کی جاسکتی ہے، جس کے چاروں کونوں پر تاج محل کی طرح چار مینار کھڑے ہیں۔ مقبرے کی نچلی سطح اور گنبد سنگ مرمر سے بنائے گئے ہیں اور بقیہ حصے کی تعمیر سنگ سیاہ سے

کی گئی ہے۔اس سنگ سیاہ کے اوپر ایک عمدہ قسم کا سفید لیپ اور شان دار صیقل گری کی گئی ہے، ساتھ ہی اعلیٰ قسم کی گچ کاری کی آرائش وزیبائش کے ذریعہ پوری عمارت کے اندرونی وبیرونی حصے کو مزین کیا گیا ہے۔رابعہ درانی کی قبر زمینی سطح پر واقع ہے، جسے ایک ہشت پہلو سنگ مرمر کی جالیوں سے گھیرا گیا ہے، قبر تک زینے کے ذریعہ پہنچا جاسکتا ہے۔قبر کی چھت، جسے مقبرے کی چبوترے والی منزل شمار کیا جاتا ہے، زمینی سطح سے مماثلت رکھتی ہے۔اس منزل پر قبر کے اوپر اندرون مقبرہ ہی ایک ہشت پہلو کھلا حصہ چھوڑ کر اور اسے ایک برآمدے کی شکل دے کر قبر کے دیدار کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔اس اعتبار سے یہ مقبرہ اپنی اندرونی بناوٹ کے اعتبار سے مغل عہد کے دوسرے مقبروں سے مختلف نظر آتا ہے کہ اس میں قبر کی بالائی تعویذ کا استعمال نہیں ہے۔مقبرے کو ایک گنبد کا تاج پہنایا گیا ہے، جس کے اندرونی حصے کی سجاوٹ گچ کاری اور پھول پتیوں کے ذریعہ کی گئی ہے۔

تاج محل کے مقابلے پیمائش اور حجم میں تقریباً نصف بی بی کا یہ مقبرہ کئی اعتبار سے مختلف اور منفرد ہے۔رابعہ درانی کے اس مقبرے میں مختلف اجزاء کے درمیان متناسب توازن اور ترتیب کے بجائے عمارت کے عمودی پن پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔مغل فن تعمیر میں یہ تبدیلی اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد وقوع پذیر ہوئی، جس نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں تعمیری نمونوں کے نئے طرز متعاف کرائے۔تعمیری اشیاء سے متعلق رابعہ درانی کے اس مقبرے کے بارے میں یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ اس کا بنیادی سامان گچ کاری ہے۔صرف گنبد کے اندرونی حصے میں سنگ مرمر کا استعمال کیا گیا ہے۔اسی طرح مقبرے میں کسی قسم کی کندہ کاری نہیں کی گئی ہے۔کندہ کاری کے بجائے مقبرے کے باہری اور اندرونی حصے کی مرصع کاری کے لیے گچ کے پر پیچ مشجر تزئین کاری کی گئی ہے۔اگرچہ، مقبرے میں مصوری کا استعمال نہیں کیا گیا ہے، مگر متنوع رنگوں کے استعمال کے ذریعہ داخلی دروازے اور دوسرے حصوں کی آرائش کا کام لیا گیا ہے۔گچ کاری کے ذریعہ آرائشی اشکال بنانا، متنوع اور شوخ رنگوں کا استعمال اور مقبروں کے عمودی پن پر زور یہ سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے مقبروں وشاہی محلوں کے تعمیراتی نمونوں کی بنیادی خصوصیت رہی ہے۔رابعہ درانی کا مقبرہ مغل شاہی خاندان کا آخری مقبرہ ہے، جسے روایتی انداز میں چہار باغ کے درمیان گنبد نما تعمیر کیا گیا۔ظاہری طور پر تاج محل سے مشابہت رکھنے کی وجہ سے یہ مقبرہ عوام الناس میں دکنی تاج کے نام سے بھی مشہور ہے۔

15.5 مغل فن تعمیر کی خصوصیات اور اثرات

مغل طرز تعمیر کی خصوصیات کو شمار کرتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مغلوں نے مختلف علاقے کے تعمیری نمونوں کو یکجا کرکے ایک نئی طرز کی بناڈالی، جسے سلطانی یا مغلیہ طرز کا نام دیا جاتا ہے۔اس طرز تعمیر کی بنیادی خصوصیات میں چہار باغ کے درمیان عمارتوں کا تعمیر ہونا، عمارتوں اور اس کے خاکے میں توازن، متناسب اور مساوی اجزاء کا استعمال، شوخ رنگوں، قیمتی پتھروں اور سنگ مرمر کے ذریعہ آرائش وتزئین کاری اور اپنی عمارتوں کے ذریعہ قرآنی تصور جنت کی عکاسی کو شمار کیا جاسکتا ہے۔مغل طرز تعمیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی عمارتیں صرف مسجدوں، مقبروں، قلعوں اور شاہی محلوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں رفاہ عامہ سے متعلق مختلف قسم کی عمارتیں تعمیر کروائیں اور یہ تمام فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ شمار کی جاتی ہیں۔یہ بڑی اہم بات ہے کہ مغل طرز تعمیر کے نمونے

صرف دارالسلطنتوں اور بڑے شہروں تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ پورے ملک کے دور دراز علاقوں تک میں پھیلے ہوئے تھے۔

مغل عمارت سازی کی ایک ندرت ان کے ذریعے تعمیر کیے گیے باغات بھی ہیں۔ یہ باغات عام طور پر مغلوں کی بڑی عمارتوں خاص طور پر مقبروں کا حصہ ہوا کرتے تھے۔ ایسے باغات عام طور پر چار حصوں میں منقسم ہوتے تھے۔ ہر حصے میں پھولوں کی کیاریاں اور پھلوں کے درخت، ان کی آبیاری کے لیے حوض، تالاب، کنویں اور پختہ نالیاں بنی ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ان کے درمیان ایسے بنگلے یا شہ نشین بنے ہوتے تھے، جن میں کمرے ہوں اور ان پر گنبد کا چھت ہو۔ زیادہ تر ایسے باغات ذاتی ملکیت میں تھے، لیکن بعض میں عام لوگوں کو اندر جانے کی اجازت تھی۔ مغل فن تعمیر کا ایک اہم کارنامہ مغربی جمنا نہر بھی ہے۔ یہ نہر شاہ جہاں کے عہد میں بنائی گئی تھی۔ 250 کلو میٹر لمبی مغربی جمنا نہر اینٹ اور چونے سے بنی ہوئی بھاری بھاری نلکیوں کے ذریعے دہلی تک جمنا ندی کی سطح سے کافی اونچائی پر پہنچتی تھی۔ مغلوں نے اپنے دور حکومت میں بہت سے پل بھی تعمیر کروائے۔ ان پلوں میں جون پور میں گومتی ندی پر بنا ہوا پل سب سے اہم شمار کیا جاتا ہے۔ اس پل کی تعمیر 1567-68ء میں ہوئی تھی۔ اس طرح سے مغل عمارت سازی کا ایک اہم شعبہ سرائے کی تعمیر ہے۔ ان کی تعمیر کی ہوئی بے شمار سرائیں موجود ہیں۔ یہ سرائیں عام طور پر چوگوشہ عمارتیں ہوا کرتی تھیں، جن میں وسیع آنگن کے چاروں طرف کمروں اور ان کے سامنے بنے ہوئے دالانوں کی قطاریں ہوا کرتی تھیں۔

مغل طرز تعمیر کی انہیں خصوصیتوں کی بنا پر اس عہد میں مغل طرز تعمیر کی نقالی کا عام رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں آمبیر کے حکمرانوں نے خاص کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے پہلے پہل سترہویں صدی عیسوی میں مشرقی راجستھان میں آمبیر کے محلوں کا پورا سلسلہ تعمیر کیا اور پھر اٹھارہویں صدی عیسوی میں جے پور کا پورا نیا شہر آباد کیا۔ اس کے علاوہ 1590ء میں متھرا کے قریب ورندابن کے مقام پر اکبر کے امیر آمبیر کے حکمراں مان سنگھ نے گووند دیو کا مندر تعمیر کرایا، جس میں مغل طرز تعمیر پوری طرح جھلکتا ہے۔ اس بڑی عمارت کو گنبد اور ڈاٹوں سے اس طرح ڈھکا گیا ہے کہ مرکزی کمرے کے اوپر بنے ہوئے گلیارے ایک صلیب کی شکل اختیار کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ عمارت کسی کلیسا سے مشابہ نظر آتی ہے۔ جہانگیر کے عہد میں بیر سنگھ بندیلہ کے ذریعے بنوائے گئے چتر بھُج کے مندر میں بھی مغل طرز تعمیر کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ امرتسر میں واقع سکھوں کے ہر مندر جو گولڈن ٹمپل کے نام سے مشہور ہے، میں بھی مغل طرز تعمیر کی بنیادی خصوصیت یعنی محراب اور گنبد کے ساتھ ساتھ بہت سارے مغل طرز تعمیر کے نمونوں کی جھلک صاف دکھائی پڑتی ہے۔

مغل طرز تعمیر کی اپنی خوبیوں کے باوجود اس عہد یعنی سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں دکن کی سلطنتوں میں فروغ پانے والے طرز تعمیر کو کسی بھی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ 1591ء کا بنا ہوا حیدرآباد کا چار مینار ایک دروازے کی عمارت ہے، جس میں چاروں سمتوں میں باہر جانے کا راستہ ہے۔ ایک دوسرے پر کھڑے ستونوں کی قطاروں کے ذریعے اس عمارت کی کئی منزلیں اوپر اٹھتی ہیں اور اس کے چاروں کونوں پر چار بھاری بھرکم مینار ہیں، جو اس شہر کی پہچان بن گئے ہیں۔

بیجاپور میں محمد عادل شاہ (وفات 1656ء) کا مقبرہ واقع ہے، جس کو لوگ گول گنبد کے نام سے جانتے ہیں۔ اس عمارت کا ایک فنی

امتیاز یہ ہے کہ اس کا گنبد ہندستان میں تعمیر شدہ سب سے بڑا صحیح گنبد ہے۔ اس عہد میں جنوبی ہندستان کے مندروں کی تعمیر میں دراوڑی طرز ہی نمایاں رہا۔ اس بات کا اندازہ مدورا کے میناکشی سندریشور کے مندر اور رامیشورم کے لنگیشور مندر سے لگایا جا سکتا ہے، جو بالترتیب سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئے۔ آخر الذکر مندر میں 650 میٹر طویل ایک اندرونی غلام گردش ہے، جس کی چھت سنگ تراشی سے مزین بھاری ستونوں پر استوار ہے۔ دراوڑی طرز تعمیر کیرل میں بھی جا پہنچا تھا۔ تری ونت پورم میں تعمیر شدہ پدم نبھ سوامی کا مندر اسی طرز کا بنا ہوا ہے۔ اس مندر میں بڑے پیمانے پر لکڑی کا استعمال کیا گیا ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تنجاور کا ایک مندر گرچہ باہر سے عام مندروں کی مانند ہے، لیکن 60 میٹر اونچائی والے اس مندر کے بالائی حصے پر کسی قلعے کی برجی کی شکل کو تعمیر کرنے کے لیے محرابی طرز تعمیر بروئے کار لایا گیا ہے۔

15.6 کلیدی الفاظ

فن تعمیر	:	عمارتیں بنانے کا فن
معمار	:	عمارتیں بنانے والے
تعویذ	:	قبر کی شبیہ یا نقلی قبر، جو عموماً مقبروں کے اوپری حصے میں پتھروں سے بنائی جاتی تھی۔
کندہ کاری	:	پتھروں پر کھدائی کر کچھ لکھنا یا نقش و نگار بنانا

15.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- فن تعمیر کے شعبے میں مغل حکمرانوں نے سب سے اہم اور یادگار نمونے چھوڑے ہیں۔ اس عہد میں تعمیر ہونے والی عمارتیں اپنی منصوبہ سازی اور فنی و عمارتی تفصیلات کے اعتبار سے بہت ہی زیادہ پختہ اور ترقی یافتہ تھیں۔ اسی لیے ان کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے اور یہ عمارتیں آج بھی اپنے دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈالنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔
- مغل طرز تعمیر کے بنیادی اجزاء وسط ایشیاء اور ایران کے ساتھ ساتھ عرب اور ہندستان کے مختلف علاقوں سے اخذ کیے گئے تھے۔ مغل حکمرانوں نے ان تمام تعمیراتی اجزاء سے ایک ایسا مرکب تیار کیا، جو بعد میں مغل فن تعمیر کے نام سے جانا گیا۔ اس طرز تعمیر میں مختلف علاقائی نمونوں کے ساتھ ساتھ فکر اسلامی کی وحدت بھی شامل تھی اور اسی فکر نے ان تمام اجزاء کو خالص بنا کر ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔
- مغل عہد کے حکمرانوں نے فن تعمیر کو فروغ دینے کے لیے بڑے پیمانے پر حصہ لیا۔ ان کی اس دلچسپی کے نتیجے میں برصغیر ہند کے الگ الگ علاقوں میں مختلف قسم کی تعمیرات کا ظہور نظر آتا ہے۔ مغل حکومت کے تعمیری نمونوں کے ظہور کے کچھ خاص مراکز

نظر آتے ہیں، جن میں دہلی، آگرہ، فتح پور سیکری، اجمیر، لاہور، الہ آباد اور سری نگر کو خصوصیت کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔

- فن تعمیر کے فروغ کے سلسلے میں اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں کے عہد کو خصوصیت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ مغل عہد کے زیادہ تر تعمیراتی نمونے اور یادگاریں انہی ادوار میں تعمیر کی گئیں۔ مثلاً ہمایوں کا مقبرہ، آگرہ کا قلعہ اور اس کی عمارتیں، فتح پور سیکری کا قلعہ اور اس کی مختلف عمارتیں، الہ آباد کا قلعہ، لاہور کا قلعہ، اکبر کا مقبرہ، اعتمادالدولہ کا مقبرہ، جہاں گیر کا مقبرہ، دہلی کا لال قلعہ اور شاہ جہان آباد کی عمارتیں، آگرہ کا تاج محل اور دہلی کی جامع مسجد وغیرہ۔

15.8 نمونہ امتحانی سوالات

15.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جامع مسجد دہلی کی تعمیر کس سن میں مکمل ہوئی؟

(a). 1656 (b). 1650 (c). 1643 (d). 1632

2. بلند دروازہ کس نے تعمیر کروایا؟

(a). ہمایوں (b). جہاں گیر (c). اکبر (d). شاہ جہاں

3. فن تعمیر کے اعتبار سے کس مغل حکمراں کے دور حکومت کو عہد زریں شمار کیا جاتا ہے؟

(a). اکبر (b). شاہ جہاں (c). جہاں گیر (d). اورنگ زیب

4. اکبر کا مقبرہ کہاں واقع ہے؟

(a). دہلی (b). لاہور (c). فتح پور سیکری (d). سکندرہ

5. تاج محل پر خطاطی کا کام کس نے کیا؟

(a). عبدالرشید دیلمی (b). محمد حسین کشمیری (c). عبدالحق شیرازی (d). عبدالرحیم

6. تاج محل کے داخلی دروازے پر کس سورۃ کی کندہ کاری کی گئی ہے؟

(a). سورہ ملک (b). سورہ یٰسین (c). سورہ حشر (d). سورہ فجر

7. ہمایوں کا مقبرہ کس نے تعمیر کرایا؟

(a). جہاں سلطان بیگم (b). سکینہ بانو بیگم (c). حمیدہ بانو بیگم (d). امینہ بانو بیگم

8. اورنگ زیب کے ذریعہ بادشاہی مسجد کہاں تعمیر کی گئی؟

(a). لاہور (b). دہلی (c). آگرہ (d). اورنگ آباد

9. جامع مسجد دہلی کی مرکزی نماز گاہ کا فرش کس پتھر کا بنا ہوا ہے؟

(a). سرخ رنگ (b). سنگ مرمر (c). سنگ زخام (d). سنگ موسی

10. آگرہ کے قلعہ میں واقع موتی مسجد کی تعمیر کس بادشاہ کے عہد میں ہوئی؟

(a). شاہ جہاں (b). اکبر (c). جہاں گیر (d). اورنگ زیب

15.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

11. برصغیر ہند میں مغل فن تعمیر کے ابتدائی نمونوں کے حوالے سے بابر کی خدمات پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

12. جامع مسجد دہلی کی تعمیری خصوصیات کو شمار کرتے ہوئے اس کی تاریخ کا اختصار کے ساتھ ذکر کریں۔

13. مغل فن تعمیر میں باغوں کی تعمیر کا مختصراً جائزہ پیش کریں۔

14. مغل فن تعمیر میں ہمایوں کے کارناموں کی وضاحت کریں۔

15. مغل تعمیری خصوصیات کا اختصار کے ساتھ تجزیہ کریں۔

15.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. دور اکبری کی عمارتوں کے حوالے سے ہندستانی فن تعمیر میں مغلوں کی خدمات کا جائزہ پیش کریں۔

2. ”مغل تاریخ میں تعمیری ترقیات کے اعتبار سے شاہ جہاں کا دور عہد زریں شمار کیا جاتا ہے“۔ وضاحت کریں۔

3. اکبر اور اعتمادالدولہ کے مقبرے کے حوالے سے مغل عہد کے مقبروں کی فنی خصوصیات کا تجزیہ کریں۔

15.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. جیمس فرگسن: اسلامی فن تعمیر ہندستان میں، اردو ترجمہ: سید ہاشمی فرید آبادی، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، 1932ء

2. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 15، دانش گاہ پنجاب، لاہور، طبع اول، 1964ء متعلقہ ابواب

3. ہندستان کے مسلمان حکم رانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، جدید ایڈیشن، 2013ء

4. دلی کے آثار قدیمہ (فارسی تاریخوں میں)، ترجمہ و ترتیب: خلیق انجم، فینس بکس، اردو بازار، لاہور، طبع اول، 1989ء

5. Catherine Ella Blanshard Asher: Architecture of Mughal India (The New Cambridge history of India) Volume 1:4, Cambridge University Press, 2008

6. Percy Brown: Indian Architecture (Islamic Period), D B Taraporevala Sons & Co. PVT LTD. Bombay, Seventh Reprint 1981

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 16: مغلیہ حکومت کازوال

اکائی کے اجزا:

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 سلطنت مغلیہ کازوال

16.2.1 دورزوال کے حکمراں

16.3 مغل سلطنت کے زوال کے اسباب

16.3.1 اورنگ زیب کی دکنی پالیسی

16.3.2 اورنگ زیب کے نااہل اور کمزور جانشین

16.3.3 مغل حکمرانوں اور امراء کی بتدریج اخلاقی گراوٹ

16.3.4 بیرونی حملے

16.3.5 مغل حکومت کی وسعت

16.3.6 اندرونی بغاوتیں

16.3.7 اٹھارہویں صدی میں خودمختار ریاستوں کا ظہور

16.3.8 برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج

16.4 اکتسابی نتائج

16.5 نمونہ امتحانی سوالات

16.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

16.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

16.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

16.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید

پچھلی اکائیوں میں آپ ہندوستان میں مغل حکومت کے قیام، عروج و استحکام اور مسلم و ہندوستانی تہذیب و تمدن میں ان کے ذریعے کیے گیے اضافے کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس مطالعے کے بعد آپ بخوبی واقف ہو چکے ہوں گے کہ ہندوستانی تاریخ اور تہذیب و ثقافت میں مغلوں کا اضافہ غیر معمولی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ گزشتہ حکومتوں سے زیادہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایک ایسی حکومت، جس نے اپنے عروج و استحکام کے زمانے میں ترقی کے اعلیٰ منازل کو طے کیا تھا، 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی زوال کا شکار ہو گئی۔ پھر اس کے بعد اس سلطنت میں کوئی بھی ایسا حکمراں نہیں پیدا ہو سکا جو اس زوال اور سکوت کو روک سکے بلکہ دھیرے دھیرے سلطنت مغلیہ سمٹتی گئی اور 1857ء میں پوری طرح سے اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ برصغیر ہند میں قائم ہونے والی عظیم الشان مغل حکومت کے زوال کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکیں۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اسباب زوال کا تنقیدی جائزہ لے سکیں۔

16.2 سلطنت مغلیہ کا زوال

یہ نہ صرف ایک تاریخی حقیقت بلکہ قانون فطرت بھی ہے کہ ہر عروج کے لیے زوال ہے اور اس بات کا اطلاق فرد کی انفرادی زندگی سے لے کر سماج اور قوم کی اجتماعی زندگی تک ہر سطح پر ہوتا ہے، اگر ہم اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے بھی تاریخ کے کسی دور میں ترقی اور عروج کے منازل طے کیے ایک خاص سطح پر پہنچنے کے بعد ان کا زوال شروع ہو گیا۔ حکومتوں اور قوموں کی ترقی و خوش حالی اور عروج و استحکام کے زمانے میں ارباب اختیار و اقتدار کی جانب سے جو بے اعتدالیاں ہوتی ہیں، اگر وقت پر ان کے تدارک کے اقدامات نہیں کیے جاتے، تو بہت جلد وہ مرض کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ یہی مرض ان کے زوال و ادبار اور ہلاکت و خاتمے کا سبب بن جاتا ہے۔ ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کے عروج و زوال میں بھی یہی فطری قانون پنہاں نظر آتا ہے۔

عام طور پر مغل سلطنت کے زوال کی ابتدا 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات سے تصور کی جاتی ہے، اس کی علامتیں، خاص طور پر زرعی بد عملی اور جاگیر داری نظام کی بڑھتی ہوئی پریشانیوں کی صورت میں بہت پہلے شمالی ہند میں ظاہر ہونا شروع ہوئیں۔ مغل حکمرانوں نے عام بے چینی کو دور کرنے کی غرض سے بعض رعایتیں دیں۔ مثلاً 1713ء میں جزیہ موقوف کر دیا گیا۔ بہادر شاہ اول نے مراٹھوں کو خوش کرنے کے لیے شیوا جی کے پوتے شاہو کو قید سے آزاد کر دیا۔ راج پوت سرداروں کا اونچے منصبوں اور گورنروں کے عہدوں پر تقرر کیا گیا، لیکن ان تمام کے باوجود بھی دربار میں اندرونی خلفشار بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہر نئے حکمراں کے تخت پر آنے کے وقت مختلف دعوے داروں کے

درمیان جنگوں نے اس خلفشار کو بڑھاوا دیا۔ محمد شاہ کے عہد میں مرکزی حکومت بتدریج کمزور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ گورنروں نے اپنے تبادلے کے احکام کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا شروع کر دیا اور خود مختار بنتے چلے گئے۔ یہ بات خاص طور پر دکن کے وائس رائے اور بنگال و اودھ کے صوبے داروں پر صادق آتی ہے۔

ان حالات کے پیدا ہونے سے مغلوں کی عسکری طاقت کمزور ہوگئی۔ مختلف قسم کے آتشی ہتھیاروں مثلاً توپ بندوق وغیرہ کی بڑھتی ہوئی قوت اور میدان جنگ میں گھڑ سوار تیر اندازوں کی برتری تیزی کے ساتھ ماند پڑنے لگی۔ اس وجہ سے منصب داری ایک عسکری نظام کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھوتی جارہی تھی۔ 1737ء میں ایک لمبی جدوجہد کے بعد مراٹھوں نے مالوہ اور گجرات پر قبضہ جمالیا۔ اب وہ ان علاقوں پر مغل بادشاہوں کے حکمرانی کے دعوے کو برائے نام ہی قبول کرتے تھے۔ اس کے کچھ عرصے بعد یعنی 1739ء میں نادر شاہ ایرانی کے حملے نے مغل سلطنت کی حالت کو مزید ابتر کر دیا۔ دہلی پوری طرح سے تاراج کر دیا گیا اور وہاں پر جو دولت موجود تھی اسے لوٹ لیا گیا۔ اسی طرح سے دریائے سندھ کے مغرب میں واقع صوبہ کابل کا پورا علاقہ اب مغلوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اس کے ساتھ سندھ کا صوبہ بھی چلا گیا۔ اس تباہی نے مغل سلطنت کے زوال کے عمل کو مزید تیز کر دیا۔ پنجاب میں سکھوں کی بغاوتیں بھڑک اٹھیں۔ روہیلہ سرداروں نے دہلی کے مشرق میں واقع علاقوں پر اپنا دبدبہ قائم کر لیا۔ جاٹوں نے اپنے سردار سورج مل کی رہنمائی میں دہلی کے جنوب میں حکومت قائم کرلی۔ دور دراز کے صوبوں پر بھی اب عملی طور پر کنٹرول ختم ہوچکا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل میں مراٹھا طاقت تیزی سے ابھری اور 1771ء سے 1803ء تک مغل شہنشاہ مراٹھا سرداروں کے کنٹرول میں رہا۔ 1803ء میں انگریزوں نے انہیں دہلی سے بے دخل کر دیا اور اب مغل شہنشاہ انگریزوں کے کنٹرول میں آگیا۔ بالآخر 1857ء میں انگریزوں نے مغل سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

16.2.1 دورزوال کے حکمراں

اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی اس کے بیٹوں میں جانشینی کے لیے جنگ شروع ہوگئی۔ جس کا خاتمہ بڑے بیٹے محمد معظم کی فتح اور جانشینی کے ساتھ ہوا۔ جس وقت محمد معظم مغل سلطنت کا حکمراں بنا اس وقت اس کی عمر 65 سال تھی۔ محمد معظم (1707ء-1712ء) نے بہادر شاہ اول اور شاہ عالم اول کے نام سے پانچ سال تک حکومت کی۔ اس عہد میں آسام بھی سلطنت مغلیہ میں شامل ہوگیا تھا، جب کہ دیگر بہت سے علاقے مغل سلطنت سے الگ ہونا شروع ہوگئے۔ اورنگ زیب کے سخت گیر دور حکومت کی گھٹن کے نتیجے میں ملک بھر میں بغاوتیں سر ابھارنے لگی تھیں۔ جنوب اور مغرب میں مراٹھوں، شمال میں پٹھانوں، سکھوں اور جاٹوں کی بغاوتیں شدید ہوگئیں۔ بہادر شاہ اوّل نے مفاہمت اور مصالحت کی پالیسی اختیار کی اور اس نے راجپوتوں، مراٹھوں، بندیلوں، جاٹوں اور سکھوں سے مصالحت اور تال میل کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود بھی اس دور میں مراٹھے اور سکھ طاقتور ہوتے گئے۔

جانشینی کے لیے جنگ مغلیہ خاندان کا ایک خاصہ تھی اور بہادر شاہ اول کے انتقال کے بعد اس میں مزید شدت آئی۔ اس کی سب سے بنیادی وجہ امراء و رؤسا کا طاقتور ہونا شمار کیا جاتا ہے، حکومت میں اعلیٰ مناصب کے حصول کے لیے امراء کے مختلف گروہ جانشینی کے الگ الگ دعوے داروں کا ساتھ دیتے، جس کا آخری فیصلہ جنگ کے ذریعہ ہوتا۔ جہاں دار شاہ جو بہادر شاہ اول کا جانشین ہوا وہ ایک کمزور اور نااہل

حکمراں تھا، مغل حکمرانوں میں اس کا شمار ایک کٹھ پتلی بادشاہ کے طور پر ہوتا ہے۔ بادشاہ کی نااہلی اور مضبوط قیادت کے بحران کی وجہ سے دربار میں سازشیں عروج پر پہنچ گئی تھیں، جہاں دار شاہ نے صرف ایک سال حکومت کی اور مغل سلطنت کے اگلے حکمراں یعنی فرخ سیر کے ذریعہ قتل کر دیا گیا۔ فرخ سیر اس دور کی درباری سازشوں کا پیداوار تھا اور خود بھی اسی کا شکار ہوا۔ فرخ سیر نے درباری سازشوں سے وجود میں آنے والی خفیہ بادشاہ گر طاقت یعنی سادات برادران کی مدد سے اپنے پیش رو کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کیا اور چھ سالوں تک انہیں کے اشاروں پر ناچتا رہا، جو اس عہد میں مغلیہ سلطنت کے حقیقی حکمراں تصور کیے جاتے تھے۔ بالآخر جب فرخ سیر نے ان سے نجات کی کوشش کی تو نہ صرف حکمرانی سے برطرف ہوا بلکہ انہیں کے ہاتھوں قتل بھی کیا گیا، اس دور کی ایک اہم بات یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ایک فرمان جاری کیا گیا، جس میں انہیں بنگال میں بلا محصول تجارت کی اجازت دی گئی تھی۔

مغلیہ سلطنت پر سادات برادران کی پوری گرفت قائم ہو چکی تھی اور انہوں نے ایک ہی سال میں چار بادشاہ تبدیل کیے تھے، تاریخ میں جن کے نام رفیع الدرجات، رفیع الدولہ یا شاہجہاں دوم، نیکوسیار محمد اور محمد ابراہیم تحریر کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بہادر شاہ اول کا 18 سالہ پوتا محمد شاہ سید برادران کی مدد سے تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے ہی محسنوں کو انجام تک پہنچا کر درباری سازشوں کا قلع قمع کر دیا۔ یہ بھی اپنے آباو اجداد کی تمام خوبیوں سے محروم تھا۔ آرام طلبی اور عیش پسندی اس کے یہاں بڑے پیمانے پر تھی انتظامی صلاحیت، تدبر اور دوراندیشی سے کوسوں دور تھا۔ اس لیے اسے تاریخ میں بجا طور پر محمد شاہ رنگیلا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ محمد شاہ کا 30 سالہ دور حکومت سلطنت مغلیہ کو دوبارہ مستحکم کرنے کا آخری موقع تھا۔ کیوں کہ اس عہد کی ابتدا تک سلطنت مغلیہ کے اثر و رسوخ اور سیاسی اقتدار میں کوئی فرق نہ آیا تھا، یہ سلطنت اب بھی اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود بھی عوام الناس میں اپنا ایک سیاسی مقام رکھتی تھی اور ایک مضبوط، طاقت ور اور اولوالعزم حکمراں مغلیہ خاندان کی حکومت کو بچا سکتا تھا لیکن محمد شاہ اس اہم کام کے لیے کسی بھی طرح موزوں نہ تھا۔ حکومتی و انتظامی امور میں اس کی کوئی بھی دلچسپی نہ تھی اور اس نے کبھی بھی لائق و فائق وزراء کو مکمل تعاون نہ دیا۔ محمد شاہ کی اس کمزور حکمرانی اور امراء و رؤسا کی آپسی چپقلش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چند مضبوط علاقائی امیروں نے اپنی خود مختار اور آزاد ریاستوں کی بنیاد ڈالی، جن میں حیدرآباد، بنگال، اودھ اور روہیل کھنڈ کی ریاستیں قابل ذکر ہیں۔ یہ ریاستیں اپنے آپ میں خود مختار تھیں لیکن اس کے باوجود بھی سلطنت مغلیہ کی بالادستی کو تسلیم کرتی تھیں اور اس کی وفادار تھیں۔

محمد شاہ کے جانشین احمد شاہ عالم گیر دوم اور شاہ عالم دوم مغل سلطنت کے اس زوال کو نہ روک سکے۔ ان حکمرانوں کی حیثیت امرائے سلطنت کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔ ساتھ ہی یہ امراء مختلف گروہوں میں منقسم تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔ یہ امراء اپنے مقاصد کے حصول اور مخالف کو شکست دینے کے لیے اپنے دشمنوں سے مدد لینے میں بھی کوئی عار یا ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ اسی دور میں شہاب الدین نامی ایک امیر کا اثر و رسوخ مغل دربار میں اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس نے پہلے احمد شاہ کو معزول کر کے اسے اندھا کر دیا اور پھر اس کے جانشین عالم گیر دوم کو قتل کر کے اس کے لڑکے شاہ عالم دوم کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ لیکن شاہ عالم خوف کی وجہ سے دہلی سے فرار ہو کر الہ آباد چلا گیا اور وہاں پہلے اودھ کے نوابوں اور پھر انگریزوں کی پناہ حاصل کی، جو بنگال پر قبضہ

کرنے کے بعد الہ آباد تک پہنچ چکے تھے۔ جہاں ایک طرف مشرق سے انگریز دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے، وہیں دوسری طرف شمال مغرب سے احمد شاہ ابدالی، جو نادر شاہ کے بعد افغانستان کا حکمراں بن چکا تھا، دہلی سلطنت کے صوبوں پر حملے کر رہا تھا۔ وہ 1756ء میں دہلی پر قابض بھی ہو چکا تھا اور شہاب الدین کو دہلی سے بے دخل کر کے واپس بھی چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی پر شہاب الدین نے مراٹھوں کی مدد سے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ہندوستانی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مراٹھے دہلی میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ لاہور تک بڑھتے چلے گئے اور ابدالی کے عہدے داروں کو لاہور سے نکال دیا۔ مراٹھوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت سے ہندوستانی مسلم دانشوروں اور امراء کو تشویش لاحق ہوئی۔ خاص طور پر شاہ ولی اللہ دہلوی، روہیلہ سردار نواب نجیب الدولہ اور چند دوسرے امراء نے مراٹھوں کا زور توڑنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ ابدالی اس دعوت پر ایک بار پھر ہندوستان آیا۔ دہلی کے قریب پانی پت کے میدان میں جنوری 1761ء کو ابدالی اور مراٹھوں کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں مراٹھوں کو شکست ہوئی اور ان کے کئی بڑے بڑے سپہ سالار مارے گئے۔ پانی پت کی اس جنگ میں فتح یاب ہونے کے باوجود بھی احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم نہیں کی بلکہ اس نے شاہ عالم کو جو ان دنوں انگریزوں کی پناہ میں الہ آباد میں تھا تخت پر بحال رکھا۔ اودھ کے شجاع الدولہ کو اس کا وزیر اور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا اور احمد شاہ ابدالی خود افغانستان واپس چلا گیا۔

1498ء میں پرتگالی ملاح واسکوڈی گاما کے ذریعے مغرب سے ہندوستان کا نیا بحری راستہ دریافت کرنے کے بعد جنوبی ایشیا کی طرف یورپی تاجروں کی آمد کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جن میں پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز سبھی شامل تھے۔ مغل سلطنت کے دور عروج میں ہی انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک میں تجارت کی اجازت حاصل کر لی تھی اور انہوں نے کولکاتہ، ممبئی اور چنئی وغیرہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی تھیں۔ انہوں نے دھیرے دھیرے اپنی ان تجارتی کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کر لیا اور وہ یہاں پر ہر قسم کا اسلحہ جمع کرنے لگے۔ کولکاتہ میں ہگلی ندی کے قریب پرتگالیوں کی بھی اسی طرح کی ایک بستی تھی، شاہ جہاں کے عہد میں انہوں نے ہنگامہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن شاہی فوجوں نے ان کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں انگریزوں نے ممبئی میں ہنگامہ برپا کیا، لیکن ان کو بھی ناکامی ہوئی اور معافی تلافی کے بعد اورنگ زیب نے انہیں قیام کی اجازت دے دی، مگر دھیرے دھیرے جب مغل سلطنت زوال پذیر ہوئی اور پورا ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی مراد بر آئی۔ انہوں نے اپنے تجارتی قلعوں میں فوجوں کی تعداد بڑھالی اور کچھ علاقوں پر قبضہ بھی کر لیا۔ انہوں نے سب سے زیادہ طاقت کرناٹک کے علاقے میں حاصل کی، جہاں چنئی شہر ان کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جب اس علاقے میں وہ طاقت ور ہو گئے، تو انہوں نے بنگال پر حملہ کیا۔ یہ عالم گیر دوم کا دور تھا اور اس وقت بنگال کا حکمراں نواب سراج الدولہ تھا۔ 1757ء میں پلاسی کے مقام پر سراج الدولہ اور انگریزوں کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ چند سالوں بعد 1764ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں نے بنگال کے سابق نواب میر قاسم اور اودھ کے نواب کو شکست دے کر الہ آباد پر بھی قبضہ کر لیا۔ شاہ عالم نے 1765 میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا کر دی تھی، جس نے ان علاقوں سے محصول اکٹھا کرنے کا حق کمپنی کو دے دیا۔

پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی کے ذریعہ گرچہ مراٹھوں کو شکست فاش ہوئی تھی اور چند سالوں کے لیے ان کا زور ٹوٹ گیا تھا، لیکن ان کی یہ شکست دائمی نہیں تھی۔ چند سالوں بعد مراٹھوں نے پھر شمال کی جانب سے دہلی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اور 1772ء میں وہ پھر دہلی پر قابض ہوگئے۔ شاہ عالم دوم جو اب تک انگریزوں کی سرپرستی اور پناہ میں تھا اب اس نے خود کو مراٹھوں کے حوالے کر دیا اور الہ آباد سے دہلی آگیا۔ اس دوران جاٹوں اور سکھوں کی بغاوتیں اور ان کے حملے جاری رہے۔ شاہ عالم دوم کے عہد میں مرزا نجف خان کی سربراہی میں مغل فوج کو مضبوط بنانے اور ان کی تنظیم نو کی بھی کوشش کی گئی، مگر اس کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نظر نہ آیا۔ 1788ء میں روہیلہ سردار غلام قادر نے دہلی پر قبضہ کر کے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دیں۔ دہلی پر روہیلہ سردار غلام قادر کے قابض ہونے کے بعد فوراً مراٹھوں نے مہادجی شندے کی سربراہی میں جوابی کارروائی کی اور غلام قادر روہیلہ کو دہلی سے نکال کر شاہ عالم کو دوبارہ تخت پر بحال کیا۔ لیکن اب حقیقی حکومت مراٹھوں کی تھی، شاہ عالم صرف نام کا بادشاہ تھا۔ اسی لیے تاریخ میں یہ مثل مشہور ہے۔ ''سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم۔''

اس یوروپی نوآبادیاتی دوڑ میں یورپ کے مختلف ممالک پوری دنیا میں اپنی نوآبادیاں بڑھانے میں لگے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کے لیے خطرہ بھی بن رہے تھے۔ اس کے اثرات ہندوستان میں بھی ظاہر ہوئے کہ جب اٹھارہویں صدی کے اخیر میں انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا کہ فرانسیسی یورپ اور دنیا کے تمام ممالک میں ان کے لیے خطرہ بن رہے ہیں اور اس کے نتائج ہندوستان میں بھی ظاہر ہوسکتے ہیں۔ کیوں کہ دہلی کی مغل سلطنت پورے طور پر زوال پذیر ہو چکی ہے اور اس کے اندر کسی بھی حملے کی طاقت نہیں ہے۔ 1795ء کے بعد مراٹھے بھی خانہ جنگی میں مبتلا ہوگئے اور 1799ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد برصغیر ہند میں کوئی ایسی طاقت نہ رہی جو باہری حملے کا مقابلہ کر سکے۔ انگریز مشرق کی طرف سے بڑھتے بڑھتے تقریباً پورے ہندوستان پر قابض ہوتے جا رہے تھے۔ دکن کے نظام اور مراٹھوں کے ایک گروہ نے انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی تھی۔ 1803ء میں دہلی کے پاس انگریزوں نے مراٹھوں کے ایک دوسرے گروہ کو شکست دے کر دہلی، آگرہ اور علی گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مراٹھوں نے بھی مکمل طور پر انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی۔ اب مغل سلطان شاہ عالم انگریزوں کی حفاظت میں چلا گیا اور انگریزوں نے لال قلعے میں بھی فوجی دستے تعینات کر دیے۔

شاہ عالم کے بعد اس کے دو جانشین اکبر شاہ دوم اور بہادر شاہ ظفر بھی صرف لال قلعے کے حکمراں رہے اور انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنشن خوار بنے رہے۔ 1857 میں جب انگریزی فوج کے ہندوستانی دستوں نے بغاوت کی تو انہوں نے دہلی پر قبضہ کر کے بہادر شاہ کو جنگ آزادی کی قیادت سپرد کرنی چاہی، لیکن بوڑھے بادشاہ کے اندر اس کام کی سکت نہ تھی۔ نتیجتاً بغاوت یا پہلی جنگ آزادی ناکام ہوگئی۔ انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر کے 22 ستمبر 1857ء کو بہادر شاہ، ظفر کو گرفتار کر لیا۔ لال قلعے میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور بغاوت کے جرم میں 9 مارچ 1858ء کو رنگون جلاوطن کر دیا گیا، جہاں 7 نومبر 1862ء کو انتقال ہوا۔ اس طرح 1857ء میں اس مغل سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، جس کی ابتداء 1526ء میں بابر کے ذریعہ ہوئی تھی۔

16.3 مغل سلطنت کے زوال کے اسباب

مورخین اور تاریخی تجزیہ نگاروں نے اپنے مطالعے کے مطابق مغل سلطنت کے زوال کے بہت سے اسباب اپنی تحریروں میں بیان کیے ہیں۔ ان اسباب میں سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور انتظامی تقریباً سبھی طرح کے اسباب وعوامل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان تاریخی کتابوں میں جو ہندوستانی تاریخ کے عہد وسطیٰ سے متعلق ہیں، ان میں حکمرانوں کی بے اعتدالیوں اور ان کی ان پالیسیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جن کی وجہ سے مغل سلطنت روبہ زوال ہوئی۔ ذیل میں مؤرخین اور تجزیہ نگاروں کے ذریعہ پیش کردہ ان اسباب وعوامل کا ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ طلبہ مغل سلطنت کے زوال کے اسباب سے واقف ہوسکیں۔

جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی

مغلوں کے یہاں جانشینی کا کوئی واضح قانون نہ تھا، اس وجہ سے تقریباً سبھی حکمرانوں کی وفات کے وقت جانشینی کے لیے اس کے بھائیوں اور بیٹوں میں جنگ چھڑ جاتی تھی، کیوں کہ سبھی شہزادے اپنے آپ کو جانشینی کا اہل سمجھتے تھے۔ اس جانشینی کا آخری فیصلہ تلوار کے ذریعے ہوتا۔ جانشینی کے اس قانون کی عدم موجودگی میں درباری امراء اس کا غلط فائدہ اٹھاتے تھے اور اس طرح امراء کے درمیان گروہ بندی کی نوبت آتی تھی، جو اپنے ذاتی فائدے کے لیے مختلف طرح کی سازشیں کرتے تھے۔ اس بات کی واضح اور بین مثالیں ہم مغل تاریخ میں دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ شاہ جہاں کے آخری دور میں کس طرح مغل دربار منقسم تھا؟ اورنگ زیب کو حکمراں بننے کے لیے اپنے بھائیوں سے جنگ اور باپ کو قید کرنا پڑا۔ 1712ء میں بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد جانشینی کے لیے ہونے والی جنگ میں ذوالفقار خان نے بادشاہ گر کا کردار ادا کیا۔ اسی طرح سے 1713ء سے 1720ء تک سید برادران بادشاہ گر کا کردار نبھاتے رہے اور اس دور میں انہوں نے چار حکمرانوں کو تخت شاہی پر متمکن اور پھر اس سے معزول کیا۔ مغل دربار کے منظرنامے سے سید برادران کے غائب ہونے کے بعد میر محمد امین اور آصف جاہ نظام الملک بادشاہ گر کا کام کرتے رہے۔ اس لیے بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی نے مغل حکومت کے زوال میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی

1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی مغل حکومت افتراق و انتشار کا شکار ہوگئی۔ تاریخی واقعات کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اورنگ زیب اس بات کو محسوس کرنے میں ناکام رہا کہ اس عظیم مغل سلطنت کا قیام و استحکام عوام الناس کے تعاون پر منحصر ہے، جس کے لیے ان کے جذبات و احساسات کا خیال رکھنا حکومت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ لیکن بعض مؤرخین کی نظر میں اورنگ زیب کی مذہبی پالیسیاں ملک کے اکثریتی فرقے یعنی ہندوؤں کے خلاف رہیں، جن کی وجہ سے حکومت کو نہ صرف اس گروہ کا تعاون نہیں ملا بلکہ وہ حکومت مخالف سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اس لیے اورنگ زیب کی یہ مذہبی پالیسیاں مغل سلطنت کے زوال کی سب سے اہم وجہ بیان کی جاتی ہیں۔ اورنگ زیب کی انہیں مذہبی پالیسیوں کی وجہ سے ہندو معاشرے میں بہت سے افراد اورنگ

زیب کے نام سے بھی اسی طرح متنفر ہوتے ہیں، جس طرح انہیں محمود غزنوی اور محمد غوری کے ناموں سے نفرت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی بہت سارے لوگ ہندوؤں کے سیاسی حقوق کے نام پر بھی اورنگ زیب کو برا بھلا کہتے ہیں۔

مذہبی معاملات میں اورنگ زیب کی منفرد پالیسیوں کی ابتدا اس کے حکمراں بننے کے ساتھ ہی ہو جاتی ہے۔ 1658ء میں حکمراں بننے کے ایک سال کے بعد ہی عوام الناس کی اخلاقی صورت حال کی دیکھ ریکھ کے لیے اس نے ملک کے تمام بڑے شہروں میں محتسب متعین کر دیے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ تمام معاملات میں اسلامی شریعت کی پابندی کی جائے اور وہ اعمال جو اسلامی شریعت میں ناپسندیدہ ہیں، جیسے شراب نوشی اور جوا وغیرہ، ان کے کھلے عام استعمال پر پابندی عاید کر دی گئی۔

فتح پور سیکری، آگرہ اور دہلی کے وہ تعمیراتی نمونے، جو فن تعمیر میں اپنی ایک مخصوص پہچان رکھتے ہیں، ان میں اورنگ زیب کے لیے کوئی دلچسپی اور کشش نہ تھی۔ اس طرح سے وہ موسیقار جو اورنگ زیب کے پیش روؤں کے دربار سے منسلک تھے، اس عہد میں انہیں دربار سے الگ کر دیا گیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی حکومت کے حصول کی کوشش میں اورنگ زیب کا وہ رویہ جو اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ اختیار کیا اور ان کے ساتھ جس طرح کا برتاؤ کیا، وہ اورنگ زیب کی شخصیت کو مجروح کرنے کے لیے کافی تھا، کیوں کہ وہ خود کو حقیقی شریعت کے پابند کے طور پر پیش کرتا تھا۔

ہندو عوام سے متعلق اورنگ زیب کی پالیسیوں کے اثرات 1668ء سے ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ 1668ء میں ہندو مذہبی میلے غیر قانونی قرار دے دیے گئے اور 1669ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے نئے ہندو مندروں کی تعمیر اور قدیم مندروں کی مرمت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ 1669ء میں ہی اورنگ زیب نے اس شاہی درشن کی رسم کو بھی ختم کر دیا، جس کی ابتدا اکبر کے عہد میں ہوئی تھی کہ بادشاہ اپنی عوام کے سامنے ظاہر ہو کر انہیں اپنا 'درشن' یعنی دیدار کراتا تھا اور نیک خواہشات و دعائیں دیتا تھا۔ 1679ء میں ملک کی غیر مسلم عوام پر جزیہ نافذ کر دیا گیا، ایک تاریخی ماخذ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لال قلعے کے اطراف میں ہاتھیوں کو تعینات کیا گیا کہ اگر کوئی جزیہ وصول کرنے والوں کو جزیہ دینے سے منع کرتا ہے تو اسے کچل کر مار دیا جائے۔ مؤرخ John F Richards کا مجہول سا خیال ہے کہ ''اورنگ زیب کا حقیقی مقصد غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنا تھا۔ جب بھی موقع ملتا بادشاہ نومسلموں کو عزت و احترام، قیمتی تحائف اور اعلیٰ عہدوں سے نوازتا۔ اس طرح جلد ہی یہ بات عام ہو گئی کہ بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تبدیلی مذہب سب سے اچھا طریقہ تھا۔''

سکھوں کے معاملے میں بھی اورنگ زیب کی پالیسیوں کو مغل حکومت کے لیے سود مند نہیں سمجھا جاتا۔ خاص طور سے گرو تیغ بہادر کی پھانسی کو بہت بڑی حکومتی غلطی شمار کی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ گرو تیغ بہادر کو پھانسی دے کر اورنگ زیب نے تمام سکھوں کو مغل سلطنت کا دشمن بنا دیا، جنھوں نے بعد کے ادوار میں گرو گوبند سنگھ کی سربراہی میں نہ صرف بڑی فوجی طاقت حاصل کر لی بلکہ مغل حکمرانوں کے لیے مصیبتیں بھی کھڑی کیں اور حکومت کے زوال کا سبب بنے۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق اسی طرح مذہبی تشدد کی پالیسی مراٹھوں کے ساتھ بھی اپنائی گئی، جس نے انہیں شیواجی کی سربراہی میں ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس تشدد آمیز اور متعصبانہ رویے نے

ہندوؤں کے کردار کو سخت بنادیا اور وہ مغلوں کے سخت دشمن بن گئے۔ لین پول کے مطابق ”شیواجی سے متعلق اورنگ زیب کی پالیسی نے طاقت و قوت کے ایک مرکز کو پنپنے کا موقع فراہم کیا، جو اس کی سلطنت کے لیے ایک کامیاب حریف ثابت ہوئے۔“

اگر تاریخی حقائق اور ماخذ کا موازنہ اور تجزیہ کیا جائے تو شاید یہ بات مشتبہ معلوم ہو کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسیاں ہندوؤں، سکھوں اور دوسری غیر مسلم اقوام کے لیے امتیاز پر مبنی تھیں۔ پروفیسر عرفان حبیب لکھتے ہیں کہ ”مغل بادشاہ مذہبی قوانین اور مروجہ دستوروں اور ضوابط کو تبدیل کرنا اپنی ذمے داری نہیں سمجھتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جن معاملات میں مذہبی قوانین ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے، وہاں شہنشاہ کو کچھ اختیار تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر اور جہاں گیر کے عہد میں بعض علاقوں میں گائے کشی پر پابندی تھی جو ہندوؤں کے رواج کے مطابق تھا۔ دوسری طرف اورنگ زیب کا ہندوؤں پر جزیہ نافذ کرنا مسلم قانون کے مطابق تھا۔ یہی بات اورنگ زیب کے ہاتھوں بعض مندروں کے منہدم کیے جانے کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ عورتوں کو زبردستی ستی پر مجبور کیے جانے کے خلاف حکم یقیناً ایک علیحدہ قسم کا قدم تھا۔ اس کے پیچھے کوئی مذہبی ہدایت نہیں تھی بلکہ صرف انسانیت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔“

بہر حال تاریخی ادب سے بہت سے خلاصے اور تجزیے تیار کیے گئے ہیں، جن پر تاریخی مآخذ اور حقائق شاید نہیں ہیں۔ گرچہ بہت سے مؤرخین نے ہندوؤں کی تبدیلی مذہب پر اپنی تحریریں چھوڑی ہیں، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ شواہد بہت کم ہیں۔ اگر پیشکش کا کوئی ثبوت موجود بھی ہے تو یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ کتنے ہندوؤں نے مذہب تبدیل کیا اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کیا ایک بھی کوئی ایسی سرکاری پالیسی تھی جو ہندوؤں کے تبدیل مذہب کی حوصلہ افزائی کرتی تھی؟ اسی طرح اورنگ زیب کی اس تصویر اور شبیہ کی حقیقت کیا ہے کہ وہ ایک زبردست مندر شکن اور بت شکن تھا؟ دکن میں اورنگ زیب کی وسیع فوجی مہمات کے باوجود بھی شاید ہی کبھی اس علاقے میں ہندو مندر مسمار کیے گئے ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ شمالی ہندوستان میں بلاشبہ کچھ ہندو مندروں کو ڈھادیا گیا، لیکن زیادہ اہم اور ضروری کام ان وجوہات کی حقیقی نشان دہی ہے جن کے تحت عین مطابق حالات قائم رکھنے کے لیے اس طرح کی تباہی کے کام انجام دیے گئے۔ متھرا کا مشہور کیشورائے مندر اس طرح کے مندروں میں سے ایک ہے، لیکن یہاں اورنگ زیب کی مسمارانہ پالیسی انتقامی کارروائی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، جہاں سے اس علاقے میں جاٹوں کو بغاوت کے لیے شہ مل رہی تھی۔ اپنے پیش روؤں کی طرح اورنگ زیب نے بھی ہندو مندروں، جیسے کہ الہ آباد میں سومیشور ناتھ مہادیو مندر، بنارس میں جنگم باڑی شیو مندر اور گوہاٹی میں امانند مندر کو جاگیریں عطا کرنے کی پالیسی برقرار رکھی۔ اگر کوئی بھی شخص حکمراں کے اس عمل کو صرف مصلحت قرار دیتا ہے تو ٹھیک اسی طرح سے مندروں کی مسماری کے معاملے کو حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی کے بجائے مصلحت کا معاملہ کیوں نہیں تصور کیا جاسکتا؟ مزید برآں موجودہ تاریخی مآخذ اس بات کے شاہد ہیں کہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندو منصب داروں، عدالتی حکام، ریاستی منتظمین اور دوسرے سرکاری عہدے داروں کی تعداد 24.5 فیصد تھی، جب کہ اورنگ زیب کے عہد کی چوتھی دہائی میں یہ تعداد بڑھ کر 33 فیصد ہوگئی تھی۔ اسی طرح یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ ایک راسخ العقیدہ سنی کے طور پر اورنگ زیب نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کیا، جس طرح اس نے ہندو اور دوسری غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ معاملہ کیا تھا۔ کوئی بھی آدمی بآسانی اس بات پر زور دے سکتا ہے اور یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی مسلم

قوم کے مفادات کو محفوظ کرنے، ان میں اضافہ کرنے اور سنی علما کی مراعات کو بحال کرنے کے لیے کام کیا، لیکن ہندوؤں، شیعوں اور دوسرے لوگوں سے متعلق اورنگ زیب کے فرامین اور کارنامے اتنے واضح ہیں کہ ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر ستیش چندرا کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو اس وقت کے سیاسی، سماجی اور معاشی سیاق میں دیکھا جانا چاہیے۔

16.3.1 اورنگ زیب کی دکنی پالیسی

اورنگ زیب کی دکنی پالیسی بھی مغل حکومت کے زوال کے لیے کچھ حد تک ذمہ دار ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں مراٹھوں کے لیے امداد کا ماخذ ہیں، جہاں پر وہ بڑے پیمانے پر ملازم تھے۔ ان دونوں ریاستوں میں مراٹھے شہری اور انتظامی امور کے اہم عہدوں پر فائز تھے اور ان ریاستوں کی فوجوں میں بھی ان کی بڑے پیمانے پر بھرتی ہوتی تھی۔ اورنگ زیب کا خیال تھا کہ اگر ان دونوں ریاستوں کا صفایا کر دیا جائے تو مراٹھوں کو حاصل ہونے والے تعاون کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مزید برآں یہ دونوں ریاستیں شیعی مسلک کی پیروکار تھیں، اس کے مقابلے میں مغل حکومت سنی مسلک کی سربراہی کر رہی تھی۔ ان دونوں ریاستوں سے مغل حکومت کی دشمنی کی ایک اہم وجہ مسلکی منافرت بھی تھی۔ اس وجہ سے اورنگ زیب کا خیال تھا کہ اگر یہ دونوں ریاستیں ختم ہو جائیں تو مراٹھوں کو سیدھا مغل حکومت سے نبرد آزما ہونا پڑے گا اور اس کی ان کے پاس طاقت نہیں ہے۔ اپنے ان مقاصد کے تحت اورنگ زیب خود دکن پہنچا اور اس نے بالترتیب 1686ء اور 1687ء میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کا خاتمہ کر دیا۔ بجا طور پر دکن کی دونوں شیعہ ریاستوں کے خاتمے کا سہرا اورنگ زیب کے سر جاتا ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے اس کام کو انجام دے کر بہت بڑی بھول کی تھی کیوں کہ اگر وہ مراٹھوں کے خلاف ان دونوں ریاستوں کو تعاون دیتا اور پھر بعد کے ادوار میں ان سے نبرد آزما ہوتا تو اس میں مغل حکومت کو کم نقصان اٹھانا پڑتا۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کو ختم کرنے کے بعد اورنگ زیب نے مراٹھوں کی طاقت کو کچلنے کی کوشش کی۔ شیواجی کا بیٹا سمبھا جی پکڑا گیا اور اسے مار دیا گیا۔ اسی طرح سے اس کا پوتا شاہو بھی پکڑا گیا اور وہ 1707ء تک مغلوں کی قید میں رہا۔ لیکن اس کے باوجود بھی مراٹھوں نے شیواجی کے دوسرے بیٹے راجہ رام اور اس کی بیوہ تارا بائی کی سرکردگی میں مغلوں کے خلاف اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ 1707ء میں جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا اس وقت تک مراٹھوں کی طاقت ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس میں اور بھی اضافہ ہوا تھا۔ اورنگ زیب کی دکنی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے وی، اے، اسمتھ لکھتا ہے کہ ”دکن اورنگ زیب کی شہرت اور اس کے جسم دونوں کا مرقد بن گیا۔“

16.3.2 اورنگ زیب کے نااہل اور کمزور جانشین

مغل سلطنت کے زوال کی ایک اور اہم وجہ اورنگ زیب کے جانشینوں کی نااہلی اور کمزوری ہے۔ اگر وہ اہل، ہوشیار اور سمجھ دار ہوتے تو وہ مغل حکومت کے زوال کو روک سکتے تھے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان جانشینوں میں سے اکثر نااہل تھے، وہ صرف اپنی عیش پرستی اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مشغول رہے اور مغل سلطنت کی سیاست میں ابھرنے والی بیماری کے لیے کسی طرح کا کوئی علاج نہ کرسکے۔ 1707ء میں بہادر شاہ اول جب تخت شاہی پر متمکن ہوا تو اس وقت اس کی عمر 63 سال تھی۔ اس کے پاس اتنی طاقت ہی نہیں تھی کہ وہ حکومتی ذمے داریوں کو انجام دے سکے۔ اسی طرح جہاں دار شاہ، فرخ سیر، محمد شاہ، احمد شاہ، اکبر شاہ دوم اور بہادر شاہ ظفر

وغیرہ بھی اچھے حکمراں ثابت نہیں ہوسکے۔ ان میں سے زیادہ تر امراء اور وزراء کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی تھے۔

16.3.3 مغل حکمرانوں اور امراء کی بتدریج اخلاقی گراوٹ

مغل سلطنت کے زوال کی ایک اور وجہ مغل حکمرانوں کی اخلاقی گراوٹ بھی شمار کی جاتی ہے۔ مؤرخین اور سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو کابل سے نکلنے کے بعد دہلی کے راستے میں پڑنے والی تمام ندیوں اور رکاوٹوں کو پار کیا اور دہلی کے قریب پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دی۔ وہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے بہت مضبوط انسان تھا۔ وہ اپنے بغل میں ایک انسان کو دبا کر قلعے کی دیوار پر دوڑ سکتا تھا۔ ہمایوں کی قوت ارادی اتنی مضبوط تھی کہ سامنے پڑنے والی پریشانیوں اور مصیبتوں سے بے پروا ہو کر اس نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرلی۔ اسی طرح کی مضبوط قوت ارادی اور جاں فشانی اکبر کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہے کہ اپنی انہیں خوبیوں کے نتیجے میں اس نے نہ صرف پورے شمال ہندوستان بلکہ دکن کے بھی ایک حصے پر اپنی مضبوط حکومت قائم کی۔ گھوڑے کی کتنی بھی لمبی سواری اسے تھکاتی نہیں تھی۔ وہ میلوں پیدل چل سکتا تھا۔ مغل سلطنت میں اورنگ زیب کے عہد تک یہ تمام خوبیاں حکمرانوں کے اندر پائی جاتی تھیں، لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکمرانوں میں سہل پسندی اور بزدلی در آئی۔ ان کے حرم، غلاموں، باندیوں اور خداموں سے پُر رہنے لگے۔ وہ تقریباً مدہوشی میں چلے گئے اور ایک ایسے ملک میں جہاں کی اکثریت مغل حکومت سے نفرت کرنے لگی ہو بمشکل ہی حکمرانی کے قابل رہے۔ یہ بعد کے ادوار میں مغل حکمرانوں کی اخلاقی گراوٹ ہی کا نتیجہ تھا کہ انہیں لوگوں نے رنگیلا جیسے خطاب سے نوازا اور آج بھی تاریخ میں انہیں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

جدید اسلحوں اور فوجیوں کی عدم فراہمی

ہندوستان میں دولت وثروت کی افراط، آرام دہ زندگی اور شراب کے استعمال نے مغل فوج پر اپنے برے اثرات ڈالے اور ساتھ ہی فوجیوں کی کمی کی روک تھام کا کوئی مناسب بندوبست نہیں کیا گیا۔ فوجیوں نے میدان جنگ جیتنے کے بجائے ذاتی آرام و آسائش میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ دنیا کے سامنے مغل فوج کی اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہو گیا تھا کہ جب مسلسل تین کوششوں کے باوجود بھی وہ قندھار کو دوبارہ فتح کرنے میں ناکام رہی۔ 1739ء میں نادر شاہ نے صرف پوری دہلی کو تباہ و برباد نہیں کیا بلکہ اس نے مکمل قتل عام کا حکم جاری کردیا تھا۔ جب اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں اور ان کے روک تھام کے لیے حکمراں اور فوج کے اندر طاقت نہیں بچتی تو فوج اور عوام دونوں پست ہمتی اور بزدلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عوام کے دلوں سے اپنی حکومت اور فوج سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے۔ سر اوسلے ہیگ کے خیال میں ”مغل حکومت کے انتشار و افتراق کی ایک اہم وجہ مغل فوج کی اخلاقی پستی اور ان کی پست ہمتی بھی تھی۔“

مغلوں کے طریقۂ جنگ اور ان کے اسلحوں کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ جدید تقاضوں اور طریقوں سے ہم آہنگ نہیں تھے بلکہ قدیم ہو چکے تھے۔ مغل فوج توپ خانوں (Artillery) اور گھڑسوار تیر اندازوں (Cavalry) پر زیادہ منحصر تھے۔ جب کہ عملاً توپ خانے کی مار زیادہ دور تک نہیں تھی اور اسے حرکت دینے میں بھی زیادہ طاقت اور وقت برباد ہوتا تھا۔ اس طرح کے طریقۂ جنگ کے لیے کیمپ کی شکل میں لازمی اشیاء اور معاونین کی ایک لمبی فہرست درکار ہوتی تھی، جو دیکھنے میں اپنی لوازمات کے

ساتھ پورا ایک شہر معلوم پڑتا تھا۔ ہر قسم کے لوگ، مرد و عورتیں، نوجوان و بوڑھے، فوجی و غیر فوجی، ہاتھی، گھوڑے اور بوجھ اٹھانے والے جانور، غرض مغل فوج کے ساتھ انسانوں، جانوروں اور اشیاء کا ایک بڑا کارواں ساتھ ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں دشمنوں کی فوج کم بوجھل اور سریع الحرکت ہوتی تھی، جو آندھی کی طرح مغل فوج پر حملہ آور ہوتے اور جب تک مغلوں کو سنبھلنے کا موقع ملتا دشمن اپنا کام پورا کر کے آگے بڑھ چکا ہوتا۔ بارتھولڈ کا یہ خیال درست ہے کہ ''ہندوستان میں مغلوں کا عروج بارود کے استعمال کا نتیجہ تھا تو بجا طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آتشیں ہتھیاروں یعنی توپ اور بندوق کے استعمال کا بڑھنا اور گھڑ سواروں کی جنگی افادیت کم ہونے کے نتیجے میں مغل فوجوں کا دبدبہ کم ہو گیا تھا۔''

بحری فوج کی جانب سے عدم توجہی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مغلوں نے بحری فوج کی جانب کوئی توجہ نہیں دی، اس وجہ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے خودکشی کو دعوت دی، مغل حکمرانوں خاص طور سے بعد کے دور کے حکمرانوں نے سمندری طاقت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور تمام ساحلی علاقوں کو غیر مسلح اور غیر محفوظ حالت میں چھوڑ دیا۔ یوروپی قوموں نے اپنے نو آبادیاتی دور میں مغلوں کی اس کمزوری کا پورا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام میں اس بات کا بڑا اہم رول رہا ہے کہ مغلوں کے یہاں بحری فوج نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور انہوں نے اس کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔

معاشی بدحالی اور مغل خزانے کا دیوالیہ پن

عام طور پر مغل سلطنت کے زوال کی ابتدا اورنگ زیب کی وفات سے متصور ہے، جب کہ اس کی علامتیں خاص طور پر زرعی بدعملی اور جاگیری نظام کی بڑھتی ہوئی دقتوں کی صورت میں بہت پہلے ظاہر ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ مغل سلطنت میں معاشی بدحالی کی اہم وجہ سیاسی اور سماجی اداروں میں گہرے تضادات کو شمار کیا جاسکتا ہے، جن کے زیر اثر جب ایک بار مغل سلطنت منتشر ہونا شروع ہو گئی تو پھر اس عمل کو روکنا مشکل ہو گیا۔ مغل حکومت میں سب سے اہم سماجی تضاد مغل حکمراں طبقہ یعنی امراء اور زمین داروں کے درمیان تھا۔ مغل امراء ایک طرف مطلق العنان حکومتی نظام کا حصہ تھے اور دوسری طرف اصل محصول کے بڑے حصے پر ان کا دعوی بھی تھا۔ جب کہ زمین دار موروثی حقوق رکھنے والوں کا ایک ایسا گروہ تھا جن کو زرعی پیداوار کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ملتا تھا، اس کے علاوہ ان کو زرعی محصول ادا کرنے اور مدد کے عوض بھی ایک مخصوص ادائیگی کرنا پڑتی تھی۔ جہاں ایک طرف مغل امراء کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی تو زیادہ تر زمین دار ہندو تھے۔ ان دونوں طبقات کے پاس اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ہتھیار بند لوگوں کی فوج موجود رہتی تھی۔ مغل حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ زمیندار طبقے کو اپنے چھوٹے حلیف کی طرح ساتھ رکھیں، کیوں کہ ان دونوں کا کسانوں کو دبائے رکھنے اور ان کے معاشی استحصال میں ہی فائدہ تھا۔ زمینداروں کو زرعی ٹیکس جمع کرنے کے ایک کارآمد آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ان کو رعایتیں بھی دی جاتی تھیں، لیکن کبھی کبھی ان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے سختی بھی کی جاتی تھی۔ زمیندار جن کے پاس ہتھیار بند ہم راہیوں کی ایک بڑی تعداد مہیا تھی، اپنے ذرائع آمدنی میں اضافے کی غرض سے ہر موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

مغلوں کی طاقت میں کسی بھی قسم کی کمزوری کا ایک مظہر زمین داروں کی بدلتی ہوئی وفاداریوں کی صورت میں ہی سامنے آتا تھا۔ ساتھ ہی اگر کوئی زرعی بحران پیدا ہوتا اور اس کی وجہ سے تباہ حال کسانوں سے زرعی ٹیکس کی وصول یابی مشکل ہو جاتی تو ایسی حالت میں زمین داروں کا رویہ یہ ہوتا تھا کہ وہ حکومت کی طرف سے زرعی ٹیکس وصول کرنے کی غرض سے کارروائی کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتے تھے کیونکہ ان حالات میں زرعی ٹیکس کی وصول یابی کے نتیجے میں زرعی پیداوار پر ان کا اپنا حق تلف ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں زمین داروں کی بغاوتیں زیادہ تواتر سے وقوع پذیر ہونے لگی تھیں۔

اس قسم کے زرعی بحران کے حالات اورنگ زیب کے عہد کے ابتدائی برسوں میں پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ برنیر نے یہ نوٹ کیا ہے کہ اس زمانے میں کاشت کاروں پر مالی دباؤ تواتر سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہ صورت حال جاگیروں کے بدلنے کا براہِ راست نتیجہ تھی۔ یہ تشخیص صرف برنیر ہی کی نہیں تھی۔ اورنگ زیب نے رسک داس کے نام 1666ء کے ایک فرمان میں زراعت کی ابتری اور ٹیکسوں کے ناقابل برداشت بوجھ کا ذکر کیا ہے، ان حالات میں کاشت کار اپنی زمین چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور ہوتے تھے۔ اس آخری صورت حال کی طرف اورنگ زیب نے محمد ہاشم کے نام 1668-69ء کے اپنے ایک فرمان میں خاص طور پر اشارہ کیا ہے، معاشی بدحالی کے ایسے حالات میں مختلف علاقوں میں کسان بغاوتیں بھی وقوع پذیر ہو رہی تھیں۔

16.3.4 بیرونی حملے

نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے مغلیہ سلطنت کی بچی کھچی طاقت اور وقعت کو بھی ختم کر دیا، ساتھ ہی رو بہ زوال مغل سلطنت کی ابتری میں مزید اضافہ کر دیا۔ دہلی پر نادر شاہ کی بآسانی فتح اور احمد شاہ ابدالی کے مکرر حملوں نے دنیا کے سامنے مغل سلطنت کی فوجی کمزوریوں کو واضح کر دیا۔ بیرونی حملہ آوروں نے نہ صرف ملک میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری مچائی بلکہ وہ بہت سارا قیمتی مال غنیمت بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ساتھ ہی بیرونی حملوں کا ایک منفی اثر عوام الناس پر یہ پڑا کہ ان کے دلوں سے مغل حکومت کا رعب و دبدبہ اور بھروسہ جاتا رہا۔ اب وہ اس مغل سلطنت کو بچانے کے بجائے اس کے خاتمے اور زوال کی کوششوں میں حصہ لینے لگے۔

16.3.5 مغل حکومت کی وسعت

اورنگ زیب کے عہد میں مغل حکومت بہت زیادہ وسیع ہو چکی تھی۔ ایک ایسے دور میں جب کہ ذرائع ابلاغ اور نقل و حمل کے ذرائع محدود تھے، کسی بھی حکمراں کے لیے ایک جگہ سے اتنی بڑی حکومت کو سنبھالنا مشکل تھا۔ ابتدائی عہد کے مغل حکمرانوں کا اپنے وزراء، امراء اور فوج پر مکمل اختیار اور کنٹرول حاصل تھا، جب کہ اس کے مقابلے میں بعد کے ادوار کے حکمراں کمزور منتظم ثابت ہوئے، جو اپنے وزراء کے ساتھ ساتھ اپنی فوج پر مکمل اختیار قائم نہ رکھ سکے۔ نتیجتاً دور دراز کے صوبے خود مختار ہونے لگے اور اس طرح آزاد و خود مختار ریاستوں کے ظہور نے مغل سلطنت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر ستیش چندرا کا خیال ہے کہ ”اگر اورنگ زیب اپنے بڑے بیٹے شاہ عالم کا مشورہ قبول کر لیتا اور بیجاپور و گولکنڈہ کی ریاستوں کو پوری طرح سے ختم کرنے کے بجائے انہیں صرف کچھ علاقوں سے بے دخل کرتا اور کرناٹک کے علاقے پر ان کی حکمرانی تسلیم کر لیتا، جو مرکز سے نہ صرف بہت زیادہ دوری پر واقع تھا بلکہ اس کا انتظام و انصرام بھی مشکل تھا

تو شاید مغل حکومت کے لیے بہتر ہوتا۔"

16.3.6 اندرونی بغاوتیں

مغل حکومت کے زوال کا ایک اور اہم سبب ملک کے مختلف صوبوں میں ابھرنے والی بغاوتیں ہیں۔ اورنگ زیب کے عہد تک کسی بھی صوبائی امیر یا گورنر میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مرکزی حکومت کو چیلنج دے سکے یا مرکزی حکومت سے بغاوت کی سوچ سکے۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ امراء یا صوبے دار اندرونی طور پر حکمرانوں سے دشمنی یا عناد رکھتے ہوں، لیکن اورنگ زیب کے عہد میں بھی کسی نے کھلے عام اس کی طاقت کو للکارنے کی ہمت نہیں کی۔ مزید برآں اس عہد میں بہت سے ایسے صوبے دار تھے جو اس سے اندرونی طور پر دشمنی رکھتے تھے، وہ تمام اپنی طاقتوں کو یکجا کرنے، حلیفوں کی تلاش اور اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس بات کے منتظر تھے کہ کب بوڑھا بادشاہ اس دنیا کو خیر آباد کہے۔

اورنگ زیب کے تمام بیٹے اس گروہ میں شامل تھے اور حکام میں سے بہادر خاں، دلیر خاں اور ذوالفقار خاں سبھی اس طرح کے مشتبہ خیالات اپنے دلوں میں رکھے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی مغل حکومت بکھرنے لگی اور بعد کے ادوار میں اس بکھراؤ اور زوال میں مزید اضافہ ہوا۔ پورے ملک میں بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، کہیں جاٹوں کی بغاوت تو کہیں راجپوتوں کی، کہیں افغانوں کی بغاوت تو کہیں سکھوں کی، کہیں روہیلوں کی بغاوت تو کہیں مراٹھوں کی۔

اسی طرح شمالی ہندوستان میں بندیلہ بغاوت کو بھی زمین داروں کی بغاوت قرار دیا جاسکتا ہے، جہاں تک جاٹوں کی اس بغاوت کا تعلق ہے، جو آگرہ کے آس پاس بھڑک اٹھی تھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے کسانوں کے ایک مخصوص گروہ کی ایسی بغاوت کی شکل اختیار کرلی تھی، جس کی رہنمائی زمینداروں کے ہاتھ میں تھی۔ اس بغاوت کے سب سے اہم رہ نما سورج مل کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمینداروں کا لباس پہنا کرتے تھے۔

بعض دوسری بغاوتوں میں ذات پات یا زمیندارانہ اثرات کے بجائے مذہب نے لوگوں میں اسی طرح کا اتحاد پیدا کرنے میں مدد دی، جس کے بغیر کسی معمولی سی کامیابی کی امید بھی نہیں کی جاسکتی۔ 1672ء میں ہریانہ کے علاقے میں کاشت کاروں اور چھوٹے کاروباریوں پر مشتمل جن ست نامیوں نے ایک خاصی بڑی بغاوت شروع کی تھی، وہ وحدانیت پر یقین رکھنے والوں کا ایک گروہ تھا، جو کبیر داس کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ اسی طرح جن سکھوں نے پنجاب میں گرو گوبند سنگھ کی سرکردگی میں ایک بڑی بغاوت شروع کی، وہ جاٹ کسانوں کے وسیع تر حلقے کا ایک جزء تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ 1709ء میں ان باغیوں کے رہ نما بندہ بہادر نے اپنی کمان میں عام آدمیوں کی ایک بہت بڑی فوج جمع کرلی تھی۔ پنجاب کے عظیم رہ نما رنجیت سنگھ نے مہاراجہ کا لقب اختیار کر لیا، جو بہت سے راج پوت سرداروں کی تمناؤں کا مرکز تھا۔

16.3.7 اٹھارہویں صدی میں خود مختار ریاستوں کا ظہور

مغل حکومت کے عہد زوال میں مختلف صوبوں نے اپنے آپ کو مغل سلطنت سے الگ کرلیا اور بہت سی خود مختار ریاستیں ظہور

پذیر ہوگئیں۔ ان ریاستوں نے نہ صرف مغل حکومت کے لیے پریشانیاں کھڑی کیں بلکہ اس کے زوال کو مزید تیز کر دیا اور مغل حکومت سمٹتے سمٹتے دہلی تک محدود ہو گئی۔ ذیل میں ان آزاد ریاستوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے جو مغل حکومت کے عہد زوال میں ظہور میں آئیں۔

حیدرآباد کی ریاست

حیدرآباد ریاست کا قیام قمرالدین صدیقی کے ذریعہ عمل میں آیا، جنہیں 1712 میں فرخ سیر کے ذریعہ 'نظام الملک' کے خطاب کے ساتھ دکن کا وائس رائے متعین کیا گیا تھا۔ اس نے تقریباً ایک خود مختار ریاست قائم کی لیکن محمد شاہ کے عہد حکومت میں دہلی واپس آیا۔ 1724ء میں 'آصف جاہ' کے خطاب کے ساتھ دوبارہ دکن کا وائس رائے متعین کیا گیا۔ اس نے آصف جاہی حکمراں خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس کے جانشینوں کو حیدرآباد کے نظام کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مغل سلطنت کے عہد زوال میں ہندوستان میں جو خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں، ان میں سب سے بڑی اور پائیدار ریاست حیدرآباد ہی کی تھی، آصف جاہ نے دکن میں مکمل آزادی اور خود مختاری کے ساتھ حکومت کی، بغاوتوں اور طاقت ور زمین داروں کا خاتمہ کیا اور اپنی حکومت میں ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ حیدرآباد کی اس آزاد ریاست کے حکمراں مغل بادشاہ کی بالادستی تسلیم کرتے رہے، انہیں کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری رکھا اور تخت نشینی کے وقت ان سے فرمان حاصل کرتے تھے۔

1748ء میں نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں کی آپسی لڑائی سے حیدرآباد کی اس ریاست کو بڑا نقصان پہنچا۔ آصف جاہ کے انتقال کے بعد پندرہ سال کے اندر ہی حیدرآباد ریاست کی حدود آدھی رہ گئیں۔ 1798ء میں حیدرآباد کے نظام نے انگریزوں کے فوجی امداد کے نظام یعنی Subsidiary System کو قبول کر کے انگریزوں کی بالادستی قبول کرلی۔ اس طرح حیدرآباد کی آصف جاہی حکومت اپنے قیام کے 74 سال بعد انگریزوں کے ماتحت ریاست بن گئی۔ 1800ء میں انگریزوں نے حیدرآباد کی تمام آزادی سلب کرلی اور اب حیدرآباد برطانوی ہندوستان کی ایک محکوم ریاست بن گئی۔

بنگال کی ریاست

اٹھارہویں صدی کا بنگال بہت بڑے علاقے پر مشتمل تھا، اس میں بنگال کے ساتھ ساتھ بہار اور اڑیسہ کے علاقے بھی شامل تھے۔ مرشد قلی خاں اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے دیوان تھے، جب کہ فرخ سیر نے 1717ء میں انہیں بنگال کا صوبے دار مقرر کیا۔ انہوں نے مرشد آباد کا شہر آباد کر کے بنگال کا دارالسلطنت ڈھاکہ سے مرشد آباد منتقل کر دیا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مرشد قلی خاں عملی طور پر خود مختار ہوگیا۔ مرشد قلی خاں اور اس کے جانشینوں شجاع الدین خاں اور علی وردی خاں نے ایک لمبی مدت تک بنگال کی ریاست کو ایک مضبوط، مستحکم اور پرسکون نظم و انصرام فراہم کیا۔ ان تینوں حکمرانوں نے ریاست میں نظم وضبط اور تجارت کو فروغ دیا لیکن باہری تجارتی کمپنیوں پر کڑی نگاہ رکھی۔ علی وردی خاں نے انگریزی اور فرانسیسی تجارتی کمپنیوں کو بنگال میں اپنے علاقوں کو قلعہ بند کرنے کی اجازت نہیں دی، مگر بعد کے حکمراں ریاست کی اس مضبوطی کو قائم نہ رکھ سکے۔ انہوں نے ریاست کی بری اور بحری فوجوں پر کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ نتیجتاً علی وردی خاں کے جانشین سراج الدولہ کے عہد میں انگریزوں نے صرف تین ہزار فوج کی مدد سے 1757ء میں

مرشد آباد کے قریب پلاسی کے میدان میں بنگال کی فوج کو شکست دے کر اس پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح بنگال ہندوستان اور مغلیہ سلطنت کا پہلا صوبہ تھا جو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں گیا۔

اودھ کی ریاست

مغل حکومت کے دورِ زوال میں جو آزاد ریاستیں قائم ہوئیں ان میں ایک اہم ریاست اودھ کی تھی۔ اس وقت اودھ کا صوبہ بنارس کے ساتھ ساتھ الہ آباد کے نزدیک چند ضلعوں کو بھی اپنے اندر شامل کیے ہوئے تھا۔ مغل حکمرانوں کے ذریعہ ایک ایرانی امیر سعادت خاں برہان الملک کو اودھ کا صوبے دار مقرر کیا گیا تھا، لیکن جلد ہی وہ خود مختار ہوگئے۔ سعادت خاں نے ایک مضبوط اور مستحکم ریاست کی بنیاد ڈالی، علاقائی زمین داروں کی طاقت ختم کرکے ریاست میں نظم وضبط اور امن وسکون قائم کیا۔ سعادت خاں کے جانشینوں صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کے زمانے میں اودھ کی ریاست کو مزید عروج واستحکام حاصل ہوا۔ 1764 ء میں بکسر کی جنگ میں انگریزوں سے شجاع الدولہ کی شکست کے بعد اودھ کی ریاست انگریزوں کے زیر اثر آگئی، لیکن انگریزوں نے اودھ ریاست کے وجود کو ختم نہیں کیا بلکہ اسے برقرار رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد یعنی 1774ء میں انگریزوں کی مدد سے روہیل کھنڈ کے حکمراں رحمت خاں کو شکست دے کر اس علاقے کو بھی ریاست اودھ میں شامل کرلیا گیا۔ شجاع الدولہ کے بعد اودھ ریاست پر انگریزی دباؤ بڑھنے لگا اور اودھ کے نواب انگریزوں کے آگے بے بس ہوگئے۔ دھیرے دھیرے اودھ ریاست کا دائرہ سمٹنے لگا، یہاں تک کہ 1856ء میں یہ ریاست ختم ہوکر برطانوی ہندوستان میں ضم ہوگئی۔

میسور کی ریاست

اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں میسور پر ایک ہندو راجہ کی حکمرانی تھی۔ اس ہندو راجہ کی فوج میں حیدر علی نام کا ایک سپاہی تھا، وہ اپنی بہادری اور قابلیت کی بنیاد پر جلد ہی راجہ کی فوج کا سپہ سالار بن گیا۔ حیدر علی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے راجہ اور اس کے وزراء نے اس کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اس کے بعد حیدر علی نے میسور کے تخت پر قبضہ کرلیا۔ میسور کی ریاست پر حیدر علی کی حکمرانی کا آغاز 1761ء میں ہوا۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی حیدر علی ایک زبردست اور کامیاب منتظم اور حکمراں ثابت ہوا۔ حیدر علی جس وقت ریاست کا حکمراں ہوا اس وقت تک میسور کی ریاست کمزور اور منقسم تھی۔ لیکن جلد ہی حیدر علی نے میسور کو ہندوستان کی بڑی طاقتوں میں شامل کردیا۔ اس نے اپنی فوج کو جدید اسلحوں سے آراستہ کیا اور جدید تقاضوں کے مطابق ان کی تنظیم نو کی۔ اس نے اپنی ریاست کو نہ صرف بڑے پیمانے پر وسعت دی بلکہ انگریزوں کے ایک بڑے حریف کے طور پر ابھرا۔ 1782ء میں حیدر علی کی وفات کے بعد اس کے جانشین فتح علی ٹیپو سلطان انگریزوں سے مستقبل نبرد آزما رہا۔ بالآخر 1799ء میں سرنگاپٹنم میں انگریزوں سے لڑتا ہوا مارا گیا اور اس کے بعد میسور کی ریاست پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

راج پوت حکومتیں

مغل حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے راج پوت علاقے عملی طور پر آزاد ہو گئے، لیکن راج پوت حکمراں اپنی پرانی روش کی طرح اب بھی منقسم ہی تھے۔ بہت سی راج پوت ریاستیں آپسی خانہ جنگیوں میں مشغول تھیں۔ لیکن ان تمام کے باوجود بھی انہوں نے مغل حکومت کو کمزور کرنے اور ان کے زوال میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آمبیر کے راجہ سوائی جے سنگھ (1743-1681ء) ایک مشہور اور نامور راج پوت راجہ رہے ہیں۔ انہوں نے جے پور شہر بسایا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اچھے اور جدید آلہ جات کے ساتھ دہلی، جے پور، اجین، بنارس اور متھرا میں رصد گاہیں قائم کیں۔ مراٹھوں کے ظہور اور عروج کے ساتھ ہی راج پوت ریاستیں دھیرے دھیرے ختم ہونے لگیں۔

پنجاب کی حکومت

سکھ مذہب کے دسویں اور آخری گرو، گرو گوبند سنگھ کی قیادت میں سکھ قوم ایک سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی تھی۔ ساتھ ہی نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملوں اور مغل حکومت کی مستقل کمزور پڑتی طاقت نے سکھوں کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔ 1765ء سے 1800ء کے درمیان انہوں نے پنجاب اور جموں کے علاقوں پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں سکھ قوم کے ایک مشہور سردار راجہ رنجیت سنگھ نے تمام سکھ سرداروں کو اپنے ماتحت کر لیا اور پنجاب میں ایک مضبوط و مستحکم سکھ حکومت قائم کی۔

رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ ریاست اندرونی انتشار کا شکار ہو گئی۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت جو اس گھات میں لگی ہوئی تھی کہ کس طرح اپنی سرحدوں کو وسیع کیا جائے؟ اس نے سکھ ریاست کے انتشار کا فائدہ اٹھایا اور 1839-40ء میں پنجاب کی سکھ حکومت کو شکست دے کر اس کا خاتمہ کر دیا۔

مراٹھوں کی حکومت

شیواجی کے بڑے بیٹے ساہو جی جنہیں اورنگ زیب نے قید کر کے جیل میں ڈال دیا تھا، 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد بہادر شاہ اول نے انہیں آزاد کر دیا۔ اس عہد میں مراٹھا ریاست کی حکمرانی تارابائی کے ذریعہ انجام دی جا رہی تھی۔ مغل قید سے رہائی کے بعد ساہو جی نے 1713ء میں بالاجی وشوناتھ کو اپنا پیشوا یعنی وزیر اعظم نامزد کیا۔ بالاجی وشوناتھ نے اپنے عہدے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پوری طاقت اپنے گرد جمع کر لی اور مراٹھوں کا حقیقی حکمراں بن گیا۔ اصل حکمراں کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ بالاجی وشوناتھ نے نہ صرف اپنی ریاست کو وسیع کیا بلکہ مراٹھا سرداروں کو چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کے لیے نئے اور علیحدہ علاقے فراہم کیے۔

بالاجی باجی راؤ (1761ء-1740ء) نے مراٹھوں کی ریاست کو مزید وسعت و استحکام بخشا۔ اس عہد میں مراٹھا حکومت اپنے عروج کو پہنچ گئی اور انہوں نے دہلی تک کا علاقہ فتح کر لیا اور مغلوں کو اپنی مدد کی پیش کش کی۔ مراٹھوں کے ذریعے پنجاب کے علاقے سے احمد شاہ ابدالی کے حاکموں کے نکالے جانے کے بعد مراٹھوں اور احمد شاہ ابدالی کا سیدھا ٹکراؤ ہوا۔ جنوری 1761ء میں پانی پت کے میدان میں

دونوں فوجوں کے بیچ فیصلہ کن جنگ ہوئی، جس میں مراٹھوں کو بری طرح شکست ہوئی، تقریباً 28,000 مراٹھا فوجی مارے گئے، جون 1761ء میں بالاجی راؤ پیشوا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس طرح پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مراٹھوں کی شکست سے ان تمام قیاس آرائیوں کا خاتمہ ہو گیا کہ ہندوستان میں مراٹھا قوم ایک بڑی اور مضبوط طاقت بن کر ابھرنے والی ہے۔ یہ جنگ انگریزوں کے لیے بھی بڑی مفید ثابت ہوئی اور مراٹھوں کی شکست نے ہندوستان میں برطانوی طاقت کے بڑھنے اور ان کی حکومت کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

16.3.8 برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام 31 دسمبر 1600ء کو ایک شاہی فرمان کے ذریعہ عمل میں آیا، جس کا مقصد جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی تجارت کو فروغ دینا تھا۔ شروع میں اس کمپنی نے ایک اجارہ دارانہ تجارتی کمپنی کی حیثیت سے کام کیا، لیکن اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں اس کمپنی نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ہندوستان میں برطانوی سامراج کے ایک کارندے کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ کمپنی ہندوستان میں تجارت کی غرض سے داخل ہوئی تھی اور انہوں نے مغل بادشاہوں سے برصغیر میں تجارت کی اجازت لے رکھی تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ہندوستان میں مختلف مقامات پر زمینیں لے کر تجارتی کوٹھیاں بنائی تھیں۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس قسم کی کوٹھیاں ممبئی، چنئی اور کولکاتہ میں بنا رکھی تھیں۔ بعد کے ادوار میں انہوں نے حفاظت کے بہانے ان کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کر لیا۔ جب مغل حکومت زوال پذیر ہوئی تو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان قلعوں اور بستیوں سے، جو فوجی چھاؤنیوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں، ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ کمپنی نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے ہندوستانی سیاسی حالات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی علاقائی توسیع نے مغل حکومت کی نشاۃ ثانیہ کے تمام راستے مسدود کر دیے۔ انہوں نے 1757ء میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال کو برطانوی نوآبادی کا حصہ بنا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی اس ریاست کو مزید وسعت دی، 1764ء میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ کو شکست دے دی۔ 1798ء میں حیدرآباد نے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بالادستی قبول کر لی اور 1799ء میں انہوں نے میسور کی ریاست کا خاتمہ کر کے اسے اپنی حکومت میں ضم کر دیا۔ اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے پورے ہندوستان پر اپنا سکہ جما لیا اور اس طرح انہوں نے مغل حکومت کے دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کی کوئی بھی گنجائش نہ چھوڑی۔

16.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ہندوستان میں مغل حکومت کی حکمرانی کا دور تقریباً تین صدیوں سے کچھ زیادہ عرصے 1526ء سے 1540ء اور 1555ء سے 1857ء پر محیط ہے اور اس میں ڈیڑھ سو سال 1707ء سے 1857ء عہد زوال کے شمار کیے جاتے ہیں۔ اس دور زوال کی ابتدا

1707ء میں اورنگ زیب کی وفات سے ہوتی ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کو جہاں ایک طرف مغل سلطنت کے عہد زرّیں کا خاتمہ شمار کیا جاتا ہے، وہیں دوسری طرف اسے دور زوال کی ابتدا بھی مانا جاتا ہے اور اسی وجہ سے مؤرخین اورنگ زیب کی وفات کو نہ صرف مغل تاریخ بلکہ ہندوستانی تاریخ کی بھی ایک حد فاصل شمار کرتے ہیں۔ یہیں سے ہندوستانی تاریخ میں عہد جدید کا آغاز بھی تصور کیا جاتا ہے۔

- مغل سلطنت اپنی وسعت و جسامت کے بوجھ تلے دب گئی۔ مغل حکومت کے زوال میں بہت سے اسباب و عوامل نے اپنے کردار ادا کیے، جن میں مغل حکمرانوں کے یہاں جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی، اورنگ زیب کی مذہبی و دکنی پالیسی، مرکز سے اس کا بہت دنوں تک دور رہنا، اورنگ زیب کے نااہل اور کمزور جانشین، مغل حکمرانوں اور امراء کی اخلاقی پستی، مغل فوجیوں میں کمی اور ان کی اخلاقی پستی، مغل سلطنت کی معاشی بدحالی، بیرونی حملے، اندرونی بغاوتیں اور خود مختار ریاستوں کا ظہور کافی اہم شمار کی جاتی ہیں۔
- مغل حکومت کے زوال میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی علاقائی توسیع نے تابوت میں آخری میخ کا کام کیا، جس کے بعد مغل سلطنت کا پورے طور سے خاتمہ ہو گیا۔

16.5 نمونہ امتحانی سوالات

16.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مغل سلطنت کے زوال کی ابتدا کب شروع ہوئی؟

(a) اورنگ زیب کی حکومت کا آغاز (b) اورنگ زیب کی وفات (c) بہادر شاہ ظفر کی وفات (d) سب غلط

2. مغل حکومت کے زوال کے اسباب کیا تھے؟

(a) بیرونی حملے (b) اندرونی بغاوتیں (c) جانشینی کا نظام (d) سب صحیح

3. ---------------- کا 30 سالہ دور حکومت سلطنت مغلیہ کو دوبارہ مستحکم کرنے کا آخری موقع تھا؟

(a) محمد شاہ (b) بہادر شاہ (c) فرخ سیر (d) مراد

4. شاہ ولی اللہ دہلوی نے ---------- کو ہندوستان پر حملے کے لیے دعوت دی۔

(a) نادر شاہ (b) احمد شاہ ابدالی (c) شیواجی (d) ایسٹ انڈیا کمپنی

5. کس مغل بادشاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے فرمان جاری کیا کہ وہ بغیر محصول ادا کرے تجارت کر سکتے ہیں؟

(a) اورنگ زیب (b) بہادر شاہ اول (c) فرخ سیر (d) شاہ عالم

16.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. مغل حکومت کے زوال میں اندرونی بغاوتوں اور علاقائی حکومتوں کے کردار کی وضاحت کیجیے۔
2. مغل حکومت کے زوال میں بیرونی حملوں کو کہاں تک ذمے دار قرار دیا جاسکتا ہے؟ وضاحت کیجیے۔
3. مغل دور حکومت کے زوال میں بیرونی مغربی اقوام کے رول پر ایک نوٹ تحریر کیجیے
4. مغل سلطنت کے زوال کے دوران کون سی علاقائی حکومتیں قائم ہوئیں؟
5. مغل حکومت کے زوال میں مرہٹھوں کے رول پر ایک نوٹ لکھیے۔

16.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مغل دور کے اسباب زوال میں سے تین اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. مغل حکومت کے زوال میں اورنگ زیب کی پالیسیاں کس حد تک ذمے دار ہیں؟ وضاحت کیجیے۔
3. مغل حکومت کے عہد زوال کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

16.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. مغل دربار کی گروہ بندیاں اوران کی سیاست : ڈاکٹر ستیش چندرا، اردو ترجمہ: محمد قاسم صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، طبع دوم، 2001ء
2. آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان : ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاؤس، لاہور، 1994ء
3. رودِ کوثر : شیخ محمد اکرام، ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی
4. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، جلد دوم : ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی

ایم۔اے، اسلامک اسٹڈیز

ساتواں پرچہ (اسلام ہندوستان میں)

جملہ نمبرات:70 **وقت:3 گھنٹے**

ہدایات:

1. **حصہ اول میں 10 لازمی سوال ہیں جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ کو پر کرنا / مختصر جوابات والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے ایک نمبر مختص ہے۔** 10x1=10

i. سندھ کی فتح کس دور میں ہوئی؟

(a). عہد نبوی (b). خلفائے راشدین (c). اموی (d). عباسی

ii. کس سلطان نے دہلی میں اپنے گورنر قطب الدین ایبک کے ذریعہ شمالی ہند میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی؟

(a) محمود غزنوی (b). شہاب الدین غوری (c). بابر (d). حسن گنگو بہمنی

iii. دہلی سلطنت میں غلام خاندان کے بعد کس خاندان نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی؟

(a). خلجی (b). تغلق (c). لودھی (d). سوری

iv. منگولوں کے خلاف ہندوستان کا دفاع کرنے میں کس کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی؟

(a). شہاب الدین غوری (b). علاؤالدین خلجی (c). فیروز تغلق (d). ابراہیم لودھی

v. دکن میں کس نے بہمنی حکومت قائم کی؟

(a). حسن گنگو (b). علاؤالدین خلجی (c). قطب الدین ایبک (d). ان میں سے کوئی نہیں

vi. بہمنی حکومت کی سب سے مشہور شخصیت علمی اور انتظامی اعتبار سے ---------------- کی تھی۔

(a). حسن گنگو (b). محمود گاواں (c). محمد شاہ (d). فیروز شاہ

vii. عماد شاہی حکومت کا دار الحکومت کس شہر میں تھا؟

(a). بیجاپور (b). گولکنڈہ (c). بیدر (d). برار

viii. مغل شہنشاہ ہمایوں کو دوبارہ حکومت حاصل کرنے میں کس نے مدد کی تھی؟

(a). سوری سلطنت (b). صفوی سلطنت (c). عثمانی سلطنت (d). بہمنی سلطنت

ix. تاج محل کی تعمیر کس بادشاہ نے کروائی؟

(a). بابر　(b). ہمایوں　(c). جہانگیر　(d). شاہ جہاں

x. کس کے عہد میں مغل سلطنت اپنی وسعت کے اعتبار سے سب سے زیادہ تھی؟

(a). اکبر　(b). جہانگیر　(c). اورنگ زیب　(d). بہادر شاہ ظفر

(ب) حصہ دوم آٹھ سوالات پر مشتمل ہے اور پانچ سوالات کے جوابات دینے ہیں ہر سوال کا جواب تقریبا200 لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے6 نمبر مختص ہیں۔ **6x1=6**

2. عرب و ہند کے قدیم تجارتی تعلقات پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
3. شمالی ہندوستان میں اولین مسلم آبادیوں کے قیام پر تبصرہ کیجیے۔
4. شہاب الدین غوری کے ہندوستان پر حملے کے اسباب و نتائج پر تجزیاتی مضمون تحریر کیجیے۔
5. سید خاندان کی حکومت کے عروج و زوال پر ایک معلوماتی مضمون تحریر کیجیے۔
6. دہلی سلطنت کے زوال کے اسباب پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
7. قطب شاہی دور کی علمی و ادبی ترقیات کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔
8. مغل بادشاہ جہانگیر کے دور کی انفرادی خصوصیات کا تعارف پیش کیجیے۔
9. دکنی تہذیب پر بہمنی حکومت کے اثرات کا جائزہ پیش کیجیے۔

(ج) حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریبا500 لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے10 نمبر مختص ہیں۔

10. سندھ کی فتح اور اسلامی حکومت کے برصغیر ہند میں قیام پر مضمون قلم بند کیجیے۔
11. دہلی سلطنت کے عروج میں کن خاندانوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ تجزیاتی مضمون قلم بند کیجیے۔
12. عادل شاہی حکومت اور اس کے اہم حکمرانوں کا تعارف پیش کیجیے۔
13. مغل دور حکومت میں انتظام حکومت کے احوال پر ایک جامع مضمون قلم بند کیجیے۔
14. مغل حکومت کے دور میں فن تعمیر کے ارتقا اور تعمیری خصوصیات پر تعریفی مضمون قلم بند کیجیے۔